وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر: ۲۲)

تفسیرِ کبیر

مصنفہ

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

جلد پنجم

سورۃ الرعد، سورۃ ابراہیم، سورۃ الحجر

ISLAM INTERNATIONAL PUBLICATIONS LTD

تفسیر کبیر

از حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعودؓ

(جلد پنجم۔ مشتمل بر سورۃ الرعد، سورۃ ابراہیم، سورۃ الحجر)

Tafsir-e-Kabir **(The Grand Exegesis)**

by Hazrat Mirza Bashir-ud-Deen Mahmood Ahmad,
Khalifatul-Masih II, al-Muslih al-Mauood (1889-1965),
may Allah be pleased with him.

Volume 5

(Sūrah ar-Raʿd, Ibrāhīm, al-Ḥijr)

(Complete Set – Volumes 1-15)

© Islam International Publications Ltd.

First published in India and Pakistan between 1940-1962 (11 Volume Set)
Second edition printed in Pakistan and the UK between 1986-1994 (10 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2004 (5 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2010 (10 Volume Set)
Digitally typeset edition published in UK, 2023 (15 Volume Set)

Published by:
Islam International Publications Limited
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, Surrey UK, GU9 9PS

Printed in the TURKEY at:
Pelikan Basim

No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronic or mechanical, including photocopy, recording or any information storage and retrieval system, without prior written permission from the Publisher.

For further information, please visit www.alislam.org

ISBN: 978-1-84880-274-2 (Set Vol. 1-15)
10 9 8 7 6 5 4 3 2 1

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلی عبدہ المسیح الموعود

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مامور حضرت اقدس مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عظیم الشان رحمت کے نشان کے طور پر پسر موعود کی بشارت عطا فرمائی جو حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کے وجود میں پوری ہوئی اور کلمات الہامیہ آپ کے وجود مسعود میں جلوہ گر ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ 'اسے علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔' قرآن مجید فرقانِ حمید کے وہ علوم و معارف بھی آپ کو سکھائے گئے جو اس سے پہلے منکشف نہ تھے۔ چنانچہ آپؓ نے تحریر فرمایا ہے کہ 'اس تفسیر کا بہت سا مضمون غور کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔' آپؓ نے قرآن کریم کی تفسیر تحریر فرمائی اور اس کے مطالب و معانی اور نکاتِ عجیبہ کو ظاہر و باطن میں پھر زندہ فرمادیا۔ یہ تصنیف لطیف موسوم بہ تفسیرِ کبیر اس مذکورہ بالا بشارت کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت اور شاہد ناطق ہے اور لاریب قرآنی علوم و معارف کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جو خدا تعالیٰ نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ظاہر فرمایا ہے۔

تفسیر کبیر کی پہلی جلد ۱۹۴۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ بعدہٗ مختلف وقتوں میں اس کی کل ۱۱ جلدیں شائع ہوئی تھیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اوائل خلافت میں ہی ارشاد فرمایا کہ تفسیر کبیر کی صد سالہ جوبلی کے تحت دوبارہ اشاعت کی جائے۔ چنانچہ اس کے پازیٹو بنوا کر گیارہ کی بجائے دس جلدوں میں شائع کیا گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اس علمی خزینہ کی اشاعت کا تازہ ایڈیشن طبع کروانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ پہلی طباعت کتابت ہو کر شائع ہوئی تھی اور باریک قلم سے لکھائی کی وجہ سے پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ ہر صفحہ پر دو کالم تھے۔ چنانچہ یہ نیا ایڈیشن حسب ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کمپوز کروایا گیا ہے، اس کا فونٹ سائز ۱۴ مقرر کیا گیا ہے اور دو کالموں کی بجائے عبارت کو ایک ہی سطر میں مسلسل کر دیا گیا ہے۔ نیز حضور انور کی ہدایت تھی کہ جلدوں کی ضخامت کو بھی متوازن اور ہلکا رکھا جائے تاکہ پڑھتے ہوئے ہاتھوں میں پکڑ کر سنبھالنے میں دقت نہ ہو۔ اس ہدایت پر عملدرآمد کے نتیجہ میں تفسیر کبیر کی جلدوں کی تعداد دس سے بڑھ کر پندرہ ہو گئی ہے۔ اس وجہ سے حلِ لغات کے مقامات میں بھی ادل بدل کرنا پڑا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ہدایت کے مطابق تفسیرِ کبیر عربی ایڈیشن کی طرز پر حوالہ جات کی تخریج کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تفسیرِ کبیر عربی ترجمہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ عربی عبارات بالخصوص حلِ لغات کے مواقع پر عربی عبارات جہاں اعراب کا اہتمام نہ تھا وہاں اعراب لگائے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ دعا ہے کہ اس تفسیر کی اشاعت کو 'دینِ اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر کرنے کا موجب بنائے۔'

اس ترتیب و طباعت کے مختلف مراحل پر جن احباب کو خدمت قرآن کا موقع نصیب ہوا، ان کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی توفیق میں برکت بخشے۔ آمین

خاکسار

منیر الدین شمس

ایڈیشنل وکیل التصنیف

اپریل ۲۰۲۳ء

سُوۡرَۃُ الرَّعۡدِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ رعد۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وَھِیَ مَعَ الۡبَسۡمَلَۃِ اَرۡبَعٌ وَّ اَرۡبَعُوۡنَ اٰیَۃً وَسِتَّۃُ رَکُوۡعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی چوالیس آیتیں ہیں اور چھ رکوع ہیں

سورۃ کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف سورۃ رعد کی نسبت حسن، عکرمہ، ابن جبیر کی تحقیق ہے کہ یہ ساری مکی ہے۔ عطاء کا قول ہے کہ سب مکّی ہے۔ سوائے وَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَسۡتَ مُرۡسَلًا والی آیت کے۔ بعض اور علماء کے نزدیک سب مکّی ہے سوائے ھُوَ الَّذِیۡ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ والی آیت کے جو لَہٗ دَعۡوَۃُ الۡحَقِّ والی آیت تک ختم ہوتی ہے۔ قتادہ سے بھی ایک روایت میں ہے کہ سب سورہ مکی ہے سوائے وَلَا یَزَالُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا والی آیت کے۔ حضرت علیؓ سے بھی یہی مروی ہے کہ یہ مکی ہے لیکن کلبی مقاتل اور ابن عباسؓ کا قول ہے کہ یہ مدنی ہے اور قتادہ سے بھی ایک روایت میں اس کا مدنی ہونا مروی ہے۔ قاضی منذر بن سعد کی بھی یہی تحقیق ہے حضرت ابن عباسؓ تین آیتوں کو بیچ میں سے مکی قرار دیتے ہیں۔ (۱و۲) وَلَوۡ اَنَّ قُرۡاٰنًا سُیِّرَتۡ بِہِ الۡجِبَالُ سے شروع کر کے دو آیتیں اور (۳) وَلَا یَزَالُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا۔ الآیۃ۔

سورۃ کے مضامین اس کے مکی ہونے پر دلالت کرتے ہیں عام محققین کا رجحان اس کے مکی ہونے کی طرف ہی ہے۔ اور اس کے مضامین اس کے مکی ہونے پر ہی دلالت کرتے ہیں۔

مدنی ہونے کا خیال پیدا ہونے کی وجہ اور غالباً اس کے مدنی ہونے کا خیال اس کی بعض آیتوں کی وجہ سے جو مدنی ہیں پیدا ہوا ہے۔ اس کے بارہ میں اکابر صحابہ میں سے صرف ایک کی شہادت ہے یعنی حضرت علی کی۔ اور وہ اسے مکی قرار دیتے ہیں۔ پس جبکہ اس کے مضامین بھی اس امر کے مؤید ہیں اس کا مکی ہونا یقینی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ چونکہ رسول کریمؐ کے زمانہ میں بچے تھے ان کی رائے حضرت علی کی شہادت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق یہ ہے کہ سورۃ یونس میں بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کے زمانہ میں دنیا کو دو طرح ہدایت کی طرف لاتا ہے۔ (۱) سزا سے اور (۲) رحم سے۔ اس کے بعد سورہ ہود میں سزا کے پہلو پر زور دیا اور سورہ یوسف میں رحم کے پہلو پر روشنی ڈالی گئی۔ اس سورۃ میں اس امر پر بحث

کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی کا اعلان جو پہلی تین سورتوں میں کیا گیا ہے وہ کس رنگ میں پورا ہوگا؟ کون سے ذرائع سے کام لے کر دوسرے مذاہب پر اور اپنی قوم پر ان کو غلبہ دیا جائے گا؟

سورۃ کے مضمون کا خلاصہ اس سورۃ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ غیر مرئی سامانوں سے کام لیتا ہے۔ انسان کو علم صرف نتائج کے ظہور پر ہوتا ہے۔ بظاہر ایک ہی قسم کی زمین ہوتی ہے اور ایک ہی قسم کا پانی مگر پھل مختلف ہو جاتے ہیں۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر پر قیاس نہ کرو۔ اس کی کامیابی پر تعجب نہ کرو۔ اس کی کامیابی قابل تعجب نہیں بلکہ ایسے وقت میں رسول نہ آتا تو قابل تعجب ہوتا۔ پھر بتایا کہ کامیابی کیسے ہوگی اور دشمنوں کی تباہی کیسے؟ اور بتایا کہ ان کی اولادیں مسلمان ہو جائیں گی۔ بڑے بڑے لوگوں سے اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت واپس لے لے گا۔ اور ان کا رعب جاتا رہے گا۔ قوانین قدرت اللہ تعالیٰ کے تابع ہیں وہ قانون قدرت کے ہر ایک شعبہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں لگا دے گا۔ تم جن کو پوجتے ہو وہ بے بس ہیں۔ وہ تمہاری نصرت نہ کریں گے۔ اس کو ایسی روحانی طاقتیں ملی ہیں کہ یہ اکیلا ہی جیت سکتا ہے۔ جیسے ایک بینا بہت سے اندھوں پر غالب آ جاتا ہے۔ اس کی توحید کی تعلیم کے مقابلہ میں تمہارے شرک کی تعلیم کیسے ٹھیر سکتی ہے؟ جس طرح کہ سیلاب یا پگھلے ہوئے سونے چاندی پر جھاگ بالا بالا دکھائی دیتی ہے اور نادان خیال کرتا ہے کہ شاید یہ جھاگ ہی جھاگ ہے وہی حال آپ کے دشمنوں کا ہے وہ اوپر کی جھاگ کو دیکھتے ہیں نیچے کے سیلاب یا سونے کو نہیں دیکھتے حالانکہ قانونِ قدرت کے مطابق جھاگ ضائع ہو جانے والی چیز ہے آخر پانی یا سونا ہی رہ جاتا ہے۔ پس ظاہری اور سطحی باتیں دیر تک نہیں رہ سکتیں۔ اس کی ٹھوس اور مفید تعلیم ہی باقی رہ جائے گی۔ اس کی تعلیم فطرت کے مطابق ہے اور آہستہ آہستہ طبعی مناسبتوں کی وجہ سے فطرتیں اسی کو قبول کریں گے۔ نیز اس تعلیم پر عمل کرنے والے اور اس کے رد کرنے والوں کی حالتوں میں فرق دیکھ کر بھی لوگوں کی آنکھیں کھلیں گی۔

سورۃ کا نام نیز قرآن کریم کے ذریعہ سے زبردست معجزات دکھائے جائیں گے اور دل فتح کئے جائیں گے۔ ظاہری نشانات بھی ہوں گے اور باطنی بھی۔ ان ظاہری نشانوں میں سے ایک یہ نشان بتایا کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ والے اپنے ملک سے نکال دیں گے اور آخر تلوار کی نوبت پہنچے گی۔ پہلے چھوٹی چھوٹی جنگیں ہوں گی پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غلبہ ملنا شروع ہوگا اور آخر فتح مکہ پر اس جنگ کا خاتمہ ہوگا۔ یہ سب معجزات خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوں گے نہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی طاقت سے۔ خدا تعالیٰ زبردست حملوں سے آپؐ کی سچائی کو ظاہر کر دے گا اور اپنے سچے دین کو قائم۔ اس مضمون کی مناسبت کی وجہ سے اس سورۃ کا نام رعد رکھا گیا ہے۔ گویا

یہ برسنے والا بادل جو آیا ہے اس کے ساتھ کڑک بھی چاہیے تھی۔ سو وہ بھی آ گئی ہے۔

ویری کا ایک غلط خیال رومن اردو قرآن کے مصنف ریورنڈ ویری صاحب لکھتے ہیں کہ اس سورۃ میں معجزات نہ دکھانے کی اس قدر معذرتیں آئی ہیں کہ اس کا نام بجائے رعد کے معذرتوں والی سورۃ ہونا چاہیے۔

(A Comprehensive Commentary on the Quran by Wherry, chapter 13)

میں کہتا ہوں کہ اس سورۃ میں اس قدر انذاری پیشگوئیاں ہیں کہ رعد اس کا طبعی نام ہے۔

سورۃ رعد اور پہلی تین سورتوں کے ابتداء میں فرق، کتاب کو بغیر صفت کے بیان کرنے کی وجہ سورہ یونس کے شروع میں کتاب کی صفت حکیم بیان فرمائی تھی۔ سورہ ہود میں فُصِّلَتۡ سورہ یوسف میں مُبِیۡن اور اس جگہ بغیر کسی صفت کے کتاب کو بیان کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سورہ یونس میں انذار و تبشیر دونوں پہلوؤں کو یکجا لیا گیا تھا اور بتایا تھا کہ حکیم خدا اپنی حکمتوں کے ماتحت موقع کے مطابق سلوک کرتا ہے۔ سورہ ہود میں سزا کے پہلو پر زور تھا۔ اس لئے فُصِّلَتۡ اس کی آیات کی صفت بیان ہوئی۔ کیونکہ تفصیل پھاڑنے اور جدا کرنے کے معنوں پر مشتمل ہے۔ سورہ یوسف میں ایک طرف غلبہ کے فوراً نہ حاصل ہونے کی حکمتوں کا بیان دوسری طرف عفو اور صلح پر زور تھا۔ اس لئے مُبِیۡنٌ کہا جو عذر و معذرت پر دلالت کرتا ہے۔

اَلۡکِتَابُ کے معنی یا تو کامل کتاب کے ہیں یا پہلی سورتوں کی طرف اشارہ ہے سورہ رعد میں چونکہ ذرائع حصول مطالب پر بحث تھی اس لئے بغیر صفت کے رکھا جس کی وجہ سے اَلۡکِتٰبُ کے معنے یا تو کامل کتاب کے ہو گئے یا پہلی تین سورتوں کی طرف اشارہ ہو گیا کہ وہ تین صفات جو پہلی تین سورتوں میں بتائی گئی تھیں وہ پورے طور پر اب اس سورۃ کے ذریعہ سے ظاہر کی جائیں گی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

میں اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر (شروع کرتا ہوں) جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

الٓمّٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ

الٓمّٓرٰ۔ یہ کامل کتاب کی آیات ہیں۔ اور جو (کلام) تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے وہ بالکل حق ہے۔

رَّبِّکَ الۡحَقُّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲﴾

لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

حلّ لُغات۔ تِلۡکَ اٰیٰتُ اور اَلۡکِتٰبُ کی تشریح کے لئے دیکھو سورہ یونس آیت ۲ اور ربّ کے معنوں کے لئے دیکھو سورہ یونس ۴۔

تِلۡکَ اسم اشارہ ہے۔ اور دور کی چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے آتا ہے۔

آیاتٌ آیَۃٌ کی جمع ہے۔ جس کے معنی علامت، نشان اور دلیل کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کے ہر اک ایسے ٹکڑے کو جسے کسی لفظی نشان کے ساتھ دوسرے سے جدا کر دیا گیا ہو آیَۃٌ کہتے ہیں (تاج)۔

آیت کی وجہ تسمیہ میرے نزدیک قرآنِ کریم میں وارد فقروں کا نام آیَۃٌ اسی حکمت سے رکھا گیا ہے کہ تا لوگ یہ سمجھ لیں کہ قرآن کریم کے مضامین میں مکمل ترتیب ہے اور ہر فقرہ دوسرے فقرہ کے معانی کے لئے بطور دلیل ہے۔ بغیر اس کے مدنظر رکھے مطلب پوری طرح نہیں سمجھ میں آسکتا۔ دوسرے اس لئے بھی کہ ہر ہر ٹکڑا خدا تعالیٰ کا ایک نشان ہے۔ عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن نے معجزات کا دعویٰ نہیں کیا۔ حالانکہ قرآن کریم تو اپنے ہر فقرہ کا نام آیت رکھ کر اسے معجزات پر مشتمل بلکہ خود معجزہ قرار دیتا ہے۔

اَلۡکِتَابُ مَصۡدَرٌ یہ لفظ دراصل کتب کی مصدر ہے۔ کَتَبَ الۡکَتِیۡبَۃَ جَمَعَھَا۔ لشکر کو جمع کر لیا۔ کَتَبَ السِّقَآءَ۔ خَرَزَہٗ بِسَیۡرَیۡنِ۔ چمڑے کی تنیوں کے ساتھ اسے سی دیا (تاج)۔ انہی معنوں کی رو سے کتاب کتاب کہلاتی ہے۔ کیونکہ اس میں مضامین کو جمع کر دیا جاتا ہے اور مختلف اوراق کو ایک جگہ اکٹھا کر کے سی دیا جاتا ہے۔ کتاب[۱] کے معنی اس خالی کاغذوں کے مجموعہ کے بھی ہوتے ہیں جس پر کچھ لکھا جائے اور کتاب[۲] تحریر کو بھی کہتے ہیں اور کتاب[۳] کے معنی فرض اور حکم اور اندازہ کے بھی ہوتے ہیں اور کتاب[۴] خط کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب)

اَلرَّبُّ مالک، آقا یا مطاع مستحق یا صَاحِبُ الشَّیْءِ یعنی کسی چیز والا۔ رَبَّ الشَّیْءَ۔ جَمَعَهٗ اس چیز کو جمع کیا مَلَکَهٗ اس کا مالک ہوا۔ اَلْقَوْمَ سَاسَھُمْ وَکَانَ فَوْقَھُمْ قوم پر حکومت اور سیاست کی۔ اَلنِّعْمَةَ۔ زَادَھَا نعمت کو بڑھایا۔ اَلْاَمْرَ۔ اَصْلَحَهٗ وَاَتَمَّهٗ کام کو درست اور مکمل کیا۔ اَلدُّھْنَ۔ طَیَّبَهٗ وَاَجَادَهٗ۔ تیل میں عمدگی اور خوبی پیدا کی۔ اَلصَّبِیَّ۔ رَبَّاہُ حَتّٰی اَدْرَکَ بچہ کی تربیت کی حتیٰ کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلی سورتوں کے مقطعات اور اس سورۃ کے مقطعات میں فرق (المر) پہلی تینوں سورتوں کے شروع میں الر تھا۔ اس سورہ کے شروع میں ان تینوں حروف میں میم زائد کر دیا گیا ہے۔ جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا مضمون پہلی تین سورتوں سے کسی قدر مختلف ہو گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ یونس کے شروع میں حروف مقطعات کی بحث میں بتایا گیا ہے۔

الٓمّٓرٰ کے معنی م، اعلم کا قائم مقام ہے۔ پس ان حروف کے معنے یہ ہوئے میں اللہ سب سے زیادہ جاننے والا اور دیکھنے والا ہوں۔ گویا دیکھنے کی صفت کے ساتھ علم کی صفت کو شامل کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اور انسان کے متعلق دیکھنے کے لفظ کے استعمال میں فرق یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کے متعلق جب دیکھنے کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد رنگ اور طول وعرض کا نظر آنا ہوتا ہے اور جاننا زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ کیونکہ ناک سے کان سے چھونے سے جن چیزوں کا پتہ لگتا ہے ان کے لئے بھی جاننے کا لفظ اسی طرح استعمال ہوتا ہے جس طرح دیکھی ہوئی چیزوں کے متعلق مگر سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو آنکھوں اور دوسرے حواس سے بے نیاز ہے اس کے متعلق جاننے اور دیکھنے کے الفاظ کن معنوں میں استعمال ہوتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے لئے مجازاً استعمال ہوتے ہیں اس لئے انسانی استعمال پر ان کا قیاس کر لینا چاہیے۔ پس جس طرح انسان کے لئے دیکھنے کا لفظ ایک محدود ظہور کے موقع پر بولا جاتا ہے اور جاننا باریک محسوسات کے لئے بھی۔ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ رؤیت کا لفظ بولتا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ جن چیزوں کو انسان دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اس سے بھی زیادہ دیکھتا ہے اور جن چیزوں کو انسان دوسرے حواس یا شعور سے محسوس کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ مکمل طور پر انہیں جانتا ہے۔ پس گو خدا تعالیٰ کے لئے سب چیزوں کا علم یکساں ہے مگر اس جگہ یہ دو لفظ انسان کی رؤیت اور اس کے علم کے مقابل پر استعمال ہوئے ہیں یعنی ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جنہیں انسان دیکھتا ہے اور ان کو بھی جن کو دوسرے حواس سے جانتا ہے خواہ ظاہری ہوں یا باطنی۔

تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ کے معنے تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ۔ یعنی وہ آیات جو اس سورۃ یا قرآن کریم میں مذکور ہیں اس موعود

کتاب کا حصہ ہیں جس کی نسبت سب دنیا کے ذہنوں میں انتظار چلا آ رہا تھا۔ یا اس کامل کتاب کی جس کی خبر پہلے دی جا چکی ہے۔ اس لئے تم اس کے مقابلے پر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیا جس چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ ہر نبی کی معرفت خبر دیتا چلا آیا ہے آج وہ اس کو یونہی چھوڑ دے گا۔ یا اس کے کمالات کے مقابلہ میں تمہارے غلط دعوے ٹھیر سکیں گے؟

وَالَّذِيٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ.... الْحَقُّ کی تشریح وَالَّذِيٓ اُنْزِلَ..... الْحَقُّ۔ فرماتا ہے کہ اس کتاب میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ آخر ہو کر رہنے والی ہیں۔ انہیں کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ساری آیت کا یہ مطلب ہے کہ انسان کی جستجو ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ مجھے صحیح علم حاصل ہو جائے لیکن ان لوگوں پر تعجب ہے کہ جب وہ کتاب انہیں ملی جو سب شبہات سے پاک ہے تو یہ اس پر ایمان لانے سے گریز کرتے ہیں اور یقین کو چھوڑ کر شکوک میں مبتلا ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ

اللہ (تعالیٰ) وہ ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر بلند کیا ہے جو تمہیں نظر آتے ہوں (اور) پھر وہ عرش پر

اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ

قائم ہوا ہے اور سورج اور چاند کو اس نے بغیر مزدوری کے (تمہاری) خدمت پر لگایا ہے (چنانچہ) ہر ایک (سیارہ)

يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

ایک معین میعاد تک (اپنی مقررہ گردش کے مطابق) چل رہا ہے وہ ہر امر کا انتظام کرتا ہے (اور) وہ (اپنی) آیات کو

لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝۳

کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم (لوگ) اپنے رب سے ملنے کا یقین رکھو۔

حلّ لُغات۔ عَمَدٌ عِمَادٌ کی اسم جمع ہے اور اَلْعِمَادُ کے معنی ہیں مَا يُسْنَدُ بِهٖ۔ وہ چیز جس پر سہارا لیا جائے۔ اَلْاَبْنِيَةُ الرَّفِيْعَةُ اونچی اونچی بلند دیواروں اور عمارتوں کو بھی عِمَاد کہتے ہیں۔ (اقرب)

سَخَّرَهٗ كَلَّفَهٗ عَمَلًا بِلَا اُجْرَةٍ۔ سَخَّرَهٗ کے معنے ہیں کہ اس کو بغیر اجرت یا بدلہ کے کسی کام پر لگا دیا۔ ذَلَّلَهٗ

اس کو مطیع کر دیا۔ وَکُلُّ مَقْهُوْرٍ لَا یَمْلِكُ لِنَفْسِہٖ مَا یُخَلِّصُہٗ مِنَ الْقَهْرِ فَذٰلِكَ مُسَخَّرٌ۔ اور ہر وہ شخص جو کسی کے قبضہ میں ہو اور آزاد رہنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اسے مسخر کہتے ہیں۔ (اقرب)

مندرجہ ذیل الفاظ کی تشریح کے لئے حل لغات کے دیگر مقامات کو دیکھئے۔ رَفَعَ یوسف ۹۷۔ اَلسَّمٰوٰت۔ اِسْتَوٰی۔ اَلْعَرْش یونس ۵۔ اَلْاَجَلُ یونس ۱۲۔ یُدَبِّرُ یونس ۴۔ یُفَصِّلُ یونس ۳۸۔

رَفَعَہٗ رَفْعًا ضِدُّ وَضَعَہٗ۔ رَفَعَ کے معنے ہیں بلند کرنا۔ زَیْدًا اِلَی الْحَکَمِ رَفْعًا وَرُفْعَانًا قَدَّمَہٗ اِلَیْہِ لِیُحَاکِمَہٗ زید کو حاکم کے سامنے مقدمہ کے فیصلہ کے لئے حاضر کیا۔ اِلَی السُّلْطَانِ رُفْعَانًا۔ قَرَّبَہٗ۔ بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ (اقرب)

اَلرَّفْعُ یُقَالُ تَارَۃً فِی الْاَجْسَامِ الْمَوْضُوْعَۃِ اِذَا اَعْلَیْتَهَا عَنْ مَقَرِّهَا وَتَارَۃً فِی الْمَنْزِلَۃِ اِذَا شَرَّفْتَهَا۔ رَفَعَ کا لفظ جب اجسام کے لئے استعمال ہو تو کبھی اس کے معنے ان کو ان کی اصل جگہ سے بلند کرنے کے ہوتے ہیں اور کبھی درجہ اور رتبہ میں فضیلت دینے کے۔ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ۔ اِشَارَۃٌ اِلَی الْمَعْنَیَیْنِ اِلٰی اِعْلَاءِ مَکَانِہٖ وَاِلٰی مَا خُصَّ بِہٖ مِنَ الْفَضِیْلَۃِ وَشَرَفِ الْمَنْزِلَۃِ چنانچہ آیت اِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ میں رفع کے دونوں مذکورہ بالا معنے مراد ہیں۔ بلندیٔ مکان اور فضیلت وشرف۔ (مفردات)

اَلسَّمٰوٰت سَمَآءٌ کی جمع ہے۔ اَلسَّمَآءُ۔ آسمان۔ کُلُّ مَا عَلَاكَ فَاَظَلَّكَ۔ ہر اوپر سے سایہ ڈالنے والی چیز۔ سَقْفُ کُلِّ شَیْءٍ وَکُلِّ بَیْتٍ چھت رُوَاقُ الْبَیْتِ برآمدہ۔ ظَهْرُ الْفَرَسِ گھوڑے کی پیٹھ۔ اَلسَّحَابُ۔ بادل۔ اَلْمَطَرُ بارش۔ اَلْمَطَرَۃُ الْجَیِّدَۃُ ایک دفعہ کی برسی ہوئی عمدہ بارش۔ اَلْعُشْبُ سبزہ وگیاہ۔ (اقرب)

اِسْتَوٰی اِعْتَدَلَ۔ اعتدال اختیار کیا۔ اَلطَّعَامُ۔ نَضِجَ پک کر تیار ہو گیا۔ اَلْعُوْدُ مِنْ اِعْوِجَاجٍ: اِسْتَقَامَ کجی دور ہو کر سیدھا اور درست ہو گیا۔ اَلرَّجُلُ: اِنْتَهٰی شَبَابُہٗ وَبَلَغَ اَشُدَّہٗ اَوْ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً وَاسْتَقَامَ اَمْرُہٗ نشوونما کے کمال کو پہنچ گیا۔ اپنی جسمانی ترقی کا کمال پالیا۔ اس کے امور کو درستی حاصل ہو گئی۔ عَلٰی ظَهْرِ دَآبَّۃٍ: اِسْتَقَرَّ قرار پذیر ہو گیا۔ متمکن ہو گیا۔ عَلَیْہِ: اِسْتَوْلٰی وَظَهَرَ استیلا اور غلبہ پالیا۔ لَہٗ وَاِلَیْہِ: قَصَدَ متوجہ ہوا۔ (اقرب)

عَرْش عَرْشًا۔ بَنٰی بِنَاءً مِنْ خَشَبٍ لکڑی کی عمارت بنائی۔ اَلْبَیْتَ: بَنَاہُ تعمیر کیا۔ اَلْکَرْمَ: رَفَعَ دَوَالِیَہٗ عَلَی الْخَشَبِ۔ بیل کو قرینے سے لگائی ہوئی لکڑیوں پر چڑھایا (اقرب) اَلْعَرْشُ سَرِیْرُ الْمَلِكِ اورنگ شاہی۔ اَلْعِزُّ۔ عزت وغلبہ۔ قِوَامُ الْاَمْرِ معاملات اور امور کی درستی کا ذریعہ اور مدار۔ رُکْنُ الشَّیْءِ سہارا۔ مِنَ

اَلْبَیْتِ سَقْفُہٗ چھت۔ اَلْخَیْمَۃُ خیمہ۔ اَلْبَیْتُ الَّذِیْ یُسْتَظِلُّ بِہٖ سایہ کا کام دینے والا گھر شِبْہُ بَیْتٍ مِنْ جَرِیْدٍ یُجْعَلُ فَوْقَہُ الثُّمَامُ جھونپڑی۔ (اقرب)

اَلْاَجَلُ مُدَّۃُ الشَّیْءِ وَوَقْتُہُ الَّذِیْ یَحِلُّ فِیْہِ۔ اَجَل اس وقت کو کہتے ہیں جس میں کوئی کام ہونا ہو۔ کہتے ہیں ضَرَبْتُ لَہٗ اَجَلًا۔ میں نے اس کے واسطے فلاں کام کے لئے ایک مدت مقرر کر دی ہے۔ (اقرب)

یُدَبِّرُ تدبیر سے فعل مضارع ہے۔ دَبَّرَ الْاَمْرَ: نَظَرَ فِی عَاقِبَتِہٖ وَتَفَکَّرَ انجام اندیشی کی اور سوچا۔ اِعْتَنٰی بِہٖ اس کی طرف توجہ دی اور اس کا اہتمام کیا۔ رَتَّبَہٗ وَنَظَّمَہٗ ترتیب دی۔ اَلْوَالِی اَقْطَاعَہٗ: اَحْسَنَ سِیَاسَتَھَا عمدہ نگرانی اور انتظام کیا۔ اَلْحَدِیْثَ۔ نَقَلَہٗ عَنْ غَیْرِہٖ بیان کیا۔ عَلٰی ھٰلَاکِہٖ: اِحْتَالَ عَلَیْہِ وَسَعٰی فِیْہِ۔ ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ (اقرب)

یُفَصِّلُ فَصَّلَ الشَّیْءَ جَعَلَہٗ فُصُوْلًا مُتَمَایِزَۃً کسی چیز یا کسی بات کے کئی حصے قرار دے کر انہیں ایک دوسرے سے ممتاز کر کے دکھایا۔ اَلْکَلَامَ بَیَّنَہٗ واضح اور روشن کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ آیت کے دو معنے اس آیت کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم دیکھتے ہو کہ آسمان بغیر ستونوں کے کھڑے ہیں اور ایک یہ کہ آسمان بغیر ایسے ستونوں کے کھڑے ہیں جنہیں تم دیکھ سکو یعنے سہارا تو ہے لیکن وہ سہارا تم کو نظر نہیں آتا اور یہ دونوں معنے ہی صحیح ہیں اور آیت کے مفہوم کے مطابق ہیں۔ اگر اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے کہ ستون عرف عام میں ان مادی ستونوں کو کہتے ہیں جو دوسری چیزوں کا وزن اپنے اوپر اٹھا لیتے ہیں تو آسمان بغیر ستونوں کے کھڑے ہیں اور اگر اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے کہ جس چیز کے ذریعہ سے کوئی چیز اپنی جگہ کھڑی ہے وہ مجازاً اس کا ستون ہے تو پھر آسمانی اجرام ایسے ستونوں پر کھڑے ہیں جو لوگوں کو نظر نہیں آتے جیسے کشش ثقل یا حرکات مخصوصہ۔ سیارگاں یا اور دوسرے ذرائع جو علماء طبیعیات نے دریافت کئے ہیں یا جو اب تک دریافت نہیں ہوئے۔

آیت میں کفار کے شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے اس آیت میں کفار کے اس شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے سامان ہیں فتح اور غلبہ کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ انہیں میسر نہیں ہیں۔ پھر وہ کس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

ہر چیز کا سہارا ایک قسم کا نہیں ہوتا اس شبہ کا ازالہ علاوہ پہلی آیت کے مضمون کے کہ جس میں الحق کہہ کر قرآن کریم کے قائم ہونے کی خبر دی گئی تھی اس طرح کیا گیا ہے کہ بے شک چیزوں کا قیام مناسب سہاروں کے اوپر ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ تمام چیزوں کا سہارا ایک قسم کا ہو مادی اجرام کا سہارا ستون ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی

چھت بغیر دیوار یا ستون کے کھڑی نہیں ہوسکتی لیکن اللہ تعالیٰ کی ایک اور صنعت دیکھو کہ کتنے کتنے بوجھل ستارے بغیر کسی ایسی چیز کے جسے عرف عام میں ستون کہہ سکیں یا بغیر کسی نظر آنے والے ستون کے اپنی اپنی جگہوں پر قائم ہیں اور ایک لمبا عرصہ گزرنے پر بھی ان کے نظام میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پس انسانی فعل اور خدائی فعل میں فرق ہے۔ انسان تو بے شک بغیر ستون کے چھت نہیں کھڑی کرسکتا لیکن اللہ تعالیٰ نے تو لاکھوں کروڑوں ستارے بغیر ستونوں کے کھڑے کر چھوڑے ہیں اور ایسے مخفی سہارے ان کے بنائے ہیں کہ جو انسان کو نظر بھی نہیں آتے۔ اسی طرح روحانی معاملات کو سمجھ لو کہ بے شک انسان جب اپنی کوشش سے غالب ہونا چاہے تو اس کے لئے ظاہری سامانوں کی ضرورت ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی کو غالب کرنا چاہے تو اس کے لئے ظاہری سامانوں کی ضرورت نہیں اس کے سامان باریک اور غیر مرئی ہوتے ہیں اور اسی وقت حقیقت کھلتی ہے جبکہ نتیجہ نکل آتا ہے اس سے پہلے سب لوگ نبی کے غلبہ کو ناممکن قرار دیتے چلے جاتے ہیں۔

کفار جن سامانوں کو کامیابی کے لئے ضروری سمجھتے تھے وہ سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۱۰ میں بیان ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں (۱) اس کے پاس آدمیوں اور جانوروں کے استعمال کے لئے چشمے ہوں۔ (۲) باغات کا مالک ہو اور زمینوں کے آباد کرنے کے لئے نہریں کھودے۔ (۳) اس کے دشمن فوراً برباد کئے جائیں اور پکڑے جائیں۔ (۴) خدا تعالیٰ اور فرشتے اس کی مدد کے لئے لوگوں کے بالمقابل آ کھڑے ہوں۔ (۵) دولت بے انتہا اس کے پاس ہو۔ (۶) وہ غیر معمولی طاقتوں کا مالک ہو۔ آسمان پر لوگوں کے سامنے چڑھ جائے اور وہاں سے لکھی ہوئی کتاب لے کر آئے جسے لوگ اپنے ہاتھوں میں پکڑ سکیں اور پڑھ سکیں یعنی یہ نہ کہے کہ مجھے زبانی حکم ملا ہے بلکہ لکھا ہوا پروانہ جسے لوگ خود پڑھ سکیں اس کے ساتھ ہو۔

کفار کے نزدیک غلبہ کے دو قسم کے ذرائع دنیوی و دینی ان مطالبات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے نزدیک غلبہ کے ذرائع دو قسم کے ہیں۔ ایک دنیوی یعنی زمینوں مال و دولت پانیوں اور سزا و جزا کی طاقت کا حاصل ہونا۔ دوسرے دینی یعنی غیر معمولی اور خارق سنت سامانوں کا پیدا ہونا۔ جیسے کہ خدا تعالیٰ کا ظاہر ہونا، فرشتوں کا ظاہر ہونا، آسمان پر جا کر لکھی ہوئی کتاب کا لے آنا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ ان دونو قسم کی طاقتوں سے محروم پاتے تھے۔ ان کے نزدیک بادشاہ کے پاس جو کچھ ہونا چاہیے وہ بھی آپؐ کے پاس نہ تھا۔ اور ایک نبی کے پاس جو کچھ ہونا چاہیے وہ بھی آپؐ کے پاس نہ تھا۔ پس وہ خیال کرتے تھے کہ یہ شخص ایک بے ستون اور بے سہارے کی چھت قائم کرنا چاہتا ہے۔ پس کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ شاید کہا جائے کہ دنیا میں بہت سے ایسے لوگ بادشاہ ہوئے ہیں جو

بے حیثیت تھے اور جن کو سامان میسر نہ تھے۔ جیسے قریب زمانوں میں نادر شاہِ ایران، یا نپولین شاہ فرانس اور ایسے لوگ ہمیشہ ہوتے رہے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے تعجب کی کیا وجہ تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ایسے لوگ کبھی کبھی دنیا میں ہوتے رہے ہیں لیکن ان کی ابتدائی حالت میں بھی لوگوں نے کبھی خیال نہیں کیا کہ وہ اس طرح بادشاہ ہو جائیں گے جب وہ بادشاہ ہو گئے۔ تبھی لوگوں کی آنکھ کھلی۔ علاوہ اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے ایسے لوگوں میں بہت بڑا امتیاز تھا۔ وہ لوگ جب بادشاہ ہو گئے تب انہوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اپنی ابتدائی حالت میں انہوں نے نہ یہ دعویٰ کیا اور نہ ان کو اس امر کا خیال ہی تھا۔ پس لوگوں میں تعجب پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ برخلاف اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو قبل از وقت دعویٰ کر رہے تھے جس کی وجہ سے عربوں کو اس عجیب دعویٰ پر حیرت ہو رہی تھی۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ جو لوگ ادنیٰ حالت سے بادشاہ بنتے ہیں وہ بادشاہ بننے کے ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً نادر شاہ نے ترقی کا ارادہ کیا تو ساتھ ہی کچھ نہ کچھ فوج اپنے اردگرد جمع کرنی شروع کی اور ڈاکے ڈالنے شروع کئے اور پہلے اردگرد کے چھوٹے رؤساء کو زیر کیا پھر بڑے رؤساء کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ ایران کا بادشاہ ہو گیا۔ یہی حال نپولین کا تھا کہ جہاں ذرہ حرکت دیکھتا بجلی کی طرح کوند کر جا پہنچتا۔ اور اس طرح اس نے حکومت وقت کو مرعوب کر کے اپنی جگہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کر لی اور فوج کی وفاداری حکومت فرانس سے ہٹ کر اس کے ساتھ ہو گئی۔ تمام ان لوگوں کی زندگیوں میں جو ادنیٰ سے اعلیٰ مقامات پر ترقی پاتے ہیں یہ اصول کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جن لوگوں نے اس طرح ترقی کی ان کی زندگیوں میں بھی یہ بات پائی جاتی تھی۔ پس اس تجربہ کی بناء پر مکہ کے لوگ آپ کے غلبہ پا جانے اور حاکم ہو جانے کے دعویٰ کے ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ غلبہ کے سامان یہ کیا جمع کرتا ہے اور جو کچھ ان کو نظر آتا تھا وہ یہ تھا کہ بڑے بڑے بہادروں اور جانبازوں کو آپ نرم دل اور مسکین بنا دیتے تھے۔ بجائے رعب بٹھانے کے اپنے ساتھیوں کو ظلم کی برداشت اور عفو کی تعلیم دیتے تھے کسی پر حملہ کرنا تو الگ رہا جہاں تک ہو سکے دوسرے کے حملہ کو خاموشی سے سہہ لینے کا ارشاد ہوتا رہتا تھا اور یہ تعلیم ایسی تھی کہ ان کے نزدیک اس رستہ پر چل کر بادشاہت کا دروازہ بند ہوتا تھا نہ کہ کھلتا تھا۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے حالات جانتا ہے وہ ان کے ظاہری اعتراضوں کے ساتھ ساتھ ان کے سلسلۂ خیالات کو بھی جانتا تھا۔ جن کے نتیجہ میں یہ اعتراض پیدا ہوتے تھے اور اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ یہ شخص روحانی آسمان کے قیام کا مدعی ہے نہ کہ کسی دنیوی عمارت کا۔ تمہاری ستونوں والی چھتیں تو آخر گر جاتی ہیں لیکن بغیر ستونوں والا آسمان بے شمار سالوں سے مضبوطی سے کھڑا ہے۔ اس کے سلسلہ کا بھی یہی حال ہے کہ آسمان کی طرح تمہاری

نظروں سے اوجھل سامان جو اندرونی بھی ہیں کہ خود اس تعلیم میں پائے جاتے ہیں جو یہ دیتا ہے اور بیرونی بھی ہیں کہ جو خدا تعالیٰ کی حفاظت سے تعلق رکھتے ہیں اس کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ پس اس کا سلسلہ ظاہری سامانوں کی احتیاج سے بالا ہے اور انسانی طاقت سے بالا یعنے آسمانی سامانوں پر قائم کیا گیا ہے اور اس پر تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ اجرام فلکی کی مادی مثال میں خدا تعالیٰ کی صفات کے اس قسم کے ظہور کی ایک بین دلیل موجود ہے۔

اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اول دنیا کے اجرام کو بغیر سہارے کھڑا کر کے پھر اپنی صفات کو کامل طور پر ظاہر کرنا شروع کیا اسی طرح اب روحانی دنیا میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے آسمان روحانی کی تکمیل ہو کر صفات الٰہیہ کا کامل ظہور ہوگا اور کامل تعلیم بنی نوع انسان کو دی جائے گی۔

عرش کے لفظ کا استعمال عرش کا لفظ قرآن کریم میں روحانی یا جسمانی قوانین کی تکمیل کے لئے بولا جاتا ہے اور یہ محاورہ دنیوی نظام سے مستعار لیا گیا ہے۔ دنیا میں بادشاہ جب کوئی خاص اعلان کرنا چاہیں تو تخت پر سے کرتے ہیں۔

اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے الفاظ صفات الٰہیہ کے کامل ظہور کے لئے آتے ہیں اسی محاورہ کے مطابق قرآن کریم میں صفات اللہ کے کامل ظہور کے لئے اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے الفاظ آتے ہیں۔

علّامہ راغب کی عرش کے متعلق بحث باقی رہا یہ کہ عرش الٰہی کیا ہے اور کس قسم کا ہے؟ اس کا عام جواب تو وہ ہے جو علّامہ راغب نے اس لفظ کے معنوں پر بحث کرتے ہوئے دیا ہے وہ لکھتے ہیں وَعَرْشُ اللّٰہِ مَالَا یَعْلَمُہٗ الْبَشَرُ عَلَی الْحَقِیْقَۃِ اِلَّا بِالْاِسْمِ وَلَیْسَ کَمَا تَذْھَبُ اِلَیْہِ اَوْھَامُ الْعَامَّۃِ فَاِنَّہٗ لَوْکَانَ کَذٰلِکَ لَکَانَ حَامِلًا لَہٗ تَعَالٰی عَنْ ذٰلِکَ لَا مَحْمُوْلًا وَاللّٰہُ تَعَالٰی یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَا اِنْ اَمْسَکَھُمَا مِنْ اَحَدٍ مِنْ بَعْدِہٖ۔ (مفردات) یعنی اللہ تعالیٰ کا عرش ایک ایسی چیز ہے جس کی حقیقت کو انسان نہیں جانتا صرف نام جانتا ہے لیکن بہرحال وہ اس قسم کا نہیں جیسا کہ عام لوگ خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ کوئی تخت کے قسم کی چیز ہو تو اس کے یہ معنے بنیں گے کہ اللہ تعالیٰ کو اس نے اٹھایا ہوا ہے اور خدا تعالیٰ نے اس کو نہیں اٹھایا ہوا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں صاف فرماتا ہے کہ آسمان وزمین کو اللہ تعالیٰ نے ہی اٹھایا ہوا ہے۔ ورنہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں اور اگر وہ ہٹ جائیں تو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی ان کو ان کی جگہ پر نہیں رکھ سکتا۔

عرش کے لغوی معنے عرش کے لغوی معنے درحقیقت چھت کے ہیں اور تمام معنے اس کے ہر پھر کر چھت کے معنوں

کی طرف لوٹ آتے ہیں۔تخت کے معنے بھی چھت سے ہی مستنبط ہیں کیونکہ عرش سلطانی بھی تخت کا نام ہوتا ہے اور تخت چند پاؤں پر ایک چھت ڈالنے سے بنتا ہے۔غرض عرش کے اصل معنے چھت کے ہیں خواہ سر پر سایہ کے لئے ہو خواہ زمین پر ذرا اونچی کر کے بیٹھنے کے لئے ڈالی جائے۔

کنایۃً عرش کے معنے علاوہ ان معنوں کے عرش کنایۃً عزت،حکومت،غلبہ اور قوام امر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔(تاج العروس) اور یہ معنی بھی چھت کے لفظ سے ہی نکالے گئے ہیں۔کیونکہ پرانے زمانہ میں بڑے لوگ اونچی جگہیں بنا کر یا چھت دار کرسیوں یا تختوں پر بیٹھتے تھے۔قرآن کریم میں یہ لفظ چھت کے معنوں میں بھی آیا ہے۔جیسے فرمایا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا (البقرة:۲۶۰) یعنی گاؤں اپنی چھتوں کے بل گرا ہوا تھا۔ اور تخت کے معنوں میں بھی آیا ہے جیسے سورہ یوسف میں آتا ہے وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ (یوسف:۱۰۱) اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا۔انہی معنوں میں چار دفعہ سورۂ نمل میں ملکہ سبا کے ذکر میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ان کے علاوہ ۲۱ جگہ اس خاص عرش کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہے جس کے معنوں کے لئے دیکھو آیت نمبر ۴ سورہ یونس۔

روح المعانی میں عرش کے معنی حکومت کرنے اور تدبیر امور کرنے کے لکھے ہیں تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کا قول ہے کہ اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے معنے صرف حکومت کرنے اور تدبیر امور کرنے کے ہیں اور اس کی سند وہ یہ پیش کرتے ہی کہ سورہ یونس میں اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ آتا ہے اور يُدَبِّرُ الْاَمْرَ اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کی تفسیر ہے جو معنے يُدَبِّرُ الْاَمْرَ کے ہیں وہی معنے اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے ہیں۔

اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اور يُدَبِّرُ الْاَمْرَ کے ایک معنی درست نہیں مصنّف روح المعانی نے اس قول کے قائل کا نام نہیں لکھا بعض نئے مفسرین نے بھی ان معنوں کو نقل کیا ہے مگر یہ معنے درست نہیں۔اس لئے کہ عرش کا ذکر اس قدر تواتر سے قرآن کریم اور احادیث میں آتا ہے اور ایسے ایسے رنگ میں آتا ہے کہ یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کی مراد عرش سے محض حکومت کرنا ہے بالکل بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔

اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اور يُدَبِّرُ الْاَمْرَ کے ایک معنی نہ لینے کی وجوہات اور جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سورۂ یونس کی آیت میں يُدَبِّرُ الْاَمْرَ جملہ تفسیر یہ کے علاوہ اِسْتَوٰى کی ضمیر کا حال اور اِنَّ رَبَّكُمُ کی خبر ثانی بھی بن سکتا ہے اور اس کے یہ معنے ہو سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ عرش پر قائم ہوا اس حال میں کہ اس نے تمام نظام عالم کی تدبیر شروع کی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین پیدا کئے اور عرش پر قائم ہوا۔اور وہ تمام امور کا انتظام بھی کرتا ہے تو

یہ معنی اور بھی کمزور ہو جاتے ہیں اور پھر جب ہم دیکھتے ہیں کہ گو سورۂ رعد کی آیت زیر بحث میں بھی یُدَبِّرُ الْاَمْرَ کے الفاظ ہیں لیکن اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے معًا بعد نہیں بلکہ دوسرے جملوں کے بعد آئے ہیں۔ پس اس جگہ یہ الفاظ اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے لئے جملہ مفسرہ نہیں بن سکتے۔

عرش سے مراد کوئی مادی چیز نہیں غرض اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے نہ تو یہ معنے ہیں کہ عرش کوئی مادی شئے ہے اور نہ اس سے یہ مراد ہے کہ عرش کوئی چیز ہی نہیں صرف حکومت کے معنوں میں اس لفظ کو استعمال کر لیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے مراد صفات تنزیہیہ کا مجموعی نظام ہے جس کے لئے صفات تشبیہہ بطور حامل کے ہیں۔ یا یوں کہو کہ بطور پاؤں کے ہیں۔ آسمان و زمین کو بغیر ستونوں کے کھڑا کرنے کے ذکر کے بعد پھر عرش پر قائم ہونے کا ذکر یہ بتانے کے لئے کیا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ایک نیا آسمان زمین تیار کرتا ہے تو اس کی صفات کامل طور پر ظاہر ہوتی ہیں اور کسی ایک صفت کا ظہور نہیں ہوتا۔ بلکہ صفات تنزیہیہ کے مرکز کے تابع جس قدر صفات تشبیہہ ہیں سب کی سب اپنے کام میں لگ جاتی ہیں گویا جس طرح بادشاہ خاص اعلان تخت پر بیٹھ کر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی خاص فیوض صفات تنزیہیہ کے مرکز سے نازل کرتا ہے تا سب صفات تشبیہہ اس کے تابع ہونے کے سبب سے کامل طور پر ظاہر ہونے لگیں اس سے یہ اشارہ کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کسی ایک صفت کے ذریعہ سے نہ ہوگی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات جو بندے سے تعلق رکھتی ہیں آپ کی تائید میں لگ جائیں گی۔

پھر فرمایا کہ آسمانوں کے بغیر ستون کھڑے ہونے کے علاوہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح سورج چاند کو بغیر کسی اجرت کے تمہارے کام پر لگایا ہوا ہے تمہارے تنخواہ دار نوکر چون و چرا کر سکتے ہیں مگر یہ اجرام فلکی کامل اطاعت سے تمہاری خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ آخر وہ کون سا ظاہری خوف یا لالچ ہے جو ان کو درست رکھ رہا ہے۔ خدا تعالیٰ کا ایک قانون ہی ہے نہ وہی قانون اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں جاری ہو کر ہر شئے کو اس کے تابع کر دے تو اس میں کیا استعجاب ہے؟

پھر فرمایا کہ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یعنی جس طرح یہ دنیوی قانون جاری ہے اور بغیر بظاہر نظر آنے والے ستونوں کے چل رہا ہے اسی طرح تمہارے دلوں میں یقین اور ایمان پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کو جاری کرے گا اور کھلے کھلے نشانات اس کی تائید میں ظاہر کرے گا یا یہ کہ تمام عالم کو اس کی تائید کے لئے واضح احکام دے گا اور عالم کا ذرہ ذرہ اس کی تائید میں لگ جائے گا۔

وَ هُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ

اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا ہے اور اس میں استحکام کے ساتھ ٹھہرے رہنے والے پہاڑ اور (نیز) دریا بنائے

مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ

ہیں اور اس میں تمام (اقسام کے) پھلوں سے دونوں قسمیں (یعنی نر و مادہ) بنائی ہیں۔ وہ رات کو دن پر لا ڈالتا

النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴﴾

ہے۔ جو لوگ سوچتے ہیں ان کے لئے (بلا شک وشبہ) اس (بات) میں کئی نشان (پائے جاتے) ہیں۔

حل لغات ۔مَدَّ مَدَّہٗ۔ بَسَطَہٗ۔ مَدَّہٗ کے معنے ہیں اسے پھیلایا۔ اَلْمَدْیُوْنَ۔ اَمْھَلَہٗ۔ اگر یہ لفظ مَدْیُوْنَ کے ساتھ استعمال ہو تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ اس کو ڈھیل دی۔ مَدَّ اللّٰہُ عُمُرَہٗ۔ اَطَالَہٗ۔ اس کی عمر لمبی کی۔ مَدَّ الشَّیْءَ۔ جَذَبَہٗ۔ کسی چیز کو کھینچا۔ اَلْقَوْمَ۔ صَارَلَھُمْ مَدَدًا۔ قوم کی مدد کی۔ وَاَغَاثَھُمْ بِنَفْسِہٖ۔ اور خود اس کی اعانت کے لئے پہنچا۔ وَفِی اللِّسَانِ مَدَدْتُ الْاَرْضَ مَدًّا اِذَا زِدْتَ فِیْھَا تُرَابًا اَوْ سَمَادًا مِنْ غَیْرِھَا۔ لِیَکُوْنَ اَعْمَرَ لَھَا وَاَکْثَرَ رَیْعًا۔ لِزَرْعِھَا۔ لسان العرب میں ہے کہ مَدَدْتُ الْاَرْضَ اس وقت بولا جائے گا جب اس میں باہر سے کچھ مٹی اور کھاد وغیرہ ڈالی جاوے۔ تاکہ وہ زمین اچھا غلہ پیدا کرنے لگ جائے۔ (اقرب) تو معنے یہ ہوئے کہ وہ خدا ہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور وسیع کیا ہے اور وہ خدا ہی ہے جس نے زمین میں باہر سے لاکر اور مٹی ڈالی تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ قابل پیدائش بن سکے۔ یہ بات جغرافیہ سے ثابت ہے کہ اس زمین پر دوسرے کروں کے باریک باریک ذرات پڑ رہے ہیں جن کی وجہ سے یہ زمین زیادہ پیدائش کے قابل ہو رہی ہے اور زمین کی مدد کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں غیر محدود سامان رکھے ہیں تاکہ اس میں رہنے والے تباہ نہ ہوں۔

الرَّوَاسِي اَلْجِبَالُ الثَّوَابِتُ الرَّوَاسِخُ (اقرب) مضبوط پہاڑ۔ ان معنوں کے لحاظ رواسی کا مفرد نہیں آتا۔

تفسیر ۔مَدَّ الْاَرْضَ میں آسمان اور زمین کے مل کر کام کرنے کی طرف اشارہ ہے مَدَّ الْاَرْضَ میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ آسمان و زمین مل کر کام کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا رَفَعَ السَّمٰوٰتِ آسمان کو بلند کیا۔ اور مَدَّ الْاَرْضَ زمین کو نیچے بچھا دیا ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح یہ دونوں آپس میں زوج ہیں جن کے ملنے سے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ کل کاروبار زمینی اور آسمانی طاقتوں کے ملنے سے چلتے ہیں اور اسی طرح روحانی عالم کا حال ہے۔

روحانی زمین اور روحانی آسمان کی ضرورت اس میں بھی ایک روحانی آسمان اور ایک روحانی زمین کی ضرورت ہے۔ یعنی ایک طرف قبول کرنے والی طبائع کی اور دوسری طرف آسمانی پانی اور آسمانی نور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جس طرح آسمانی پانی کے نزول کے بعد قابل زمین اپنے خزانے نکالنے سے رک نہیں سکتی اسی طرح وہ طبائع جو کہ اس روحانی سماء کے لئے بمنزلہ زمین ہوتی ہیں آسمانی پانی کے نزول کے بعد اپنے خزانوں کو روک نہیں سکتے اور جس طرح لوہا مقناطیس کے پیچھے چلا آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نبی کے پیچھے چلے آتے ہیں۔ پس محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے پھیلنے پر تعجب کی بات نہیں۔ اگر نہ پھیلے تو تعجب ہے کہ اچھی زمین نے عمدہ بارش کے نازل ہونے کے بعد سبزہ کیوں نہیں اگایا؟

ظاہری پہاڑوں اور دریاؤں کی طرح روحانی دنیا میں پہاڑ اور دریا ہوتے ہیں پھر فرماتا ہے زمین میں ہم نے پہاڑ بنائے ہیں جن کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ان میں برف جم کر پانی کا ذخیرہ رکھتی ہے اور سال بھر چشموں اور دریاؤں کی صورت میں وہ پانی دنیا کو سیراب کرتا ہے اگر وہ برفوں کا ذخیرہ ختم ہو جائے تو چشمے اور دریا بھی بند ہو جائیں اور زمینیں بھی خشک ہو جائیں۔ یہی حال روحانی دنیا کا ہے۔ اس میں بھی بعض وجود پہاڑ کی طرح ہوتے ہیں کہ خدا کے کلام کے لئے ذخیرہ کے طور پر ہوتے ہیں اور بعض وہ وجود ہیں جو فائدہ تو پہنچاتے رہتے ہیں مگر جمع نہیں کر سکتے مگر ایک وہ ہیں جو صرف فائدہ ہی اٹھا سکتے ہیں۔

انبیاء پہاڑ کی طرح ہوتے ہیں اور علماء نہروں کی طرح پہاڑ تو انبیاء ہیں اور نہریں علماء ہیں اور عام لوگ زمین کی طرح ہیں جو ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پس رواسی کو اگر اڑا دیا جائے تو پانی نہ رہے گا اور دنیا تباہ ہو جائے گی۔

ہر چیز کا جوڑا ہوتا ہے وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ۔ اور تمام پھلوں سے اس نے جوڑے یعنی نر و مادہ بنائے ہیں۔ گو یہاں صرف پھلوں کا ذکر کیا ہے مگر دوسرے مقامات سے ثابت ہے کہ ہر چیز کا جوڑا ہے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس کے اظہار میں قرآن کریم منفرد ہے۔ عربوں نے سب سے پہلے کھجور کے نر و مادہ کا علم حاصل کیا مگر اس سے زیادہ وہ دریافت نہ کر سکے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ سب پھل دار درختوں کے جوڑے ہیں بلکہ ہر شئے کے جوڑے ہیں۔ جس وقت یہ سچائی نازل ہوئی دنیا اس کی حقیقت کے سمجھنے سے قاصر تھی۔

سائنس کی تحقیق کہ ہر چیز کا جوڑا ہوتا ہے مگر اب سائنس تیرہ سو سال بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ تمام اشیاء کے جوڑے ہیں حتیٰ کہ جمادات کے ذرات تک میں نر و مادہ کی دریافت ہو رہی ہے۔ اس مثال سے بھی یہ بتایا ہے کہ جس طرح باقی ہر چیز کو خدا تعالیٰ نے جوڑا بنایا ہے۔

دماغ کا جوڑا الہام آسمانی ہے اسی طرح انسانی دماغ کا حال ہے۔ جب تک اس پر خدا تعالیٰ کا نور نازل نہ ہو۔ اسے صحیح معرفت جو الہام اور عقل کا نتیجہ ہے حاصل نہیں ہوتی۔ اور اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ جب عقل صحیح اور الہام آسمانی مل جاویں تو انہیں باردار ہونے سے بھی کوئی روک نہیں سکتا۔ پس جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کے بغیر معرفت الٰہی کا پیدا ہونا ناممکن تھا اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ کا لایا ہوا کلام صحیح طریق پر پہنچنے کے بعد انسانی عقول اسے قبول کرنے سے باز رہ سکیں۔

قرآن کریم کے پھیلنے کی مثال يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ سے ایک اور مثال تعلیم قرآن کے پھیل جانے کی دی۔ موجودہ تاریکی سے یہ دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کہ قرآنی تعلیم کس طرح پھیل سکے گی۔ جس طرح روحانی دنیا میں تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ رات کو دن کے بعد لاتا ہے اگر رات مستقل وجود ہوتو اس کا ہٹنا مشکل ہو لیکن تاریکی کا زمانہ بھی خدا تعالیٰ کے قانون کے ماتحت ہے اور اس کے حکم سے آتا ہے پس جو چیز تابع ہے اس کے متعلق کس طرح خیال کیا جاسکتا ہے کہ حکم کے باوجود ٹھہری رہے گی۔ سورج کی ایک شعاع تاریکی کے بادلوں کو پھاڑ دیتی ہے۔ اسی طرح اب ہوگا۔ خدا تعالیٰ کے قبضہ میں نور ہی نہیں تاریکی بھی ہے۔ پس جب وہ چاہے کہ تاریکی ہٹ جائے تو تاریکی قائم نہیں رہ سکتی۔ جو لوگ فکر کرنے والے ہوں وہ ان مثالوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اٹھائیں گے۔ باقی وہ گروہ جو دوزخ کے بھرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہا ہے وہ بے شک رہ جائے گا۔

وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ

اور زمین میں ایک دوسرے کے پاس پاس کئی (اقسام کے) قطعات ہیں۔ اور کئی (طرح کے) انگوروں کے باغات

زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ

اور (کئی قسم کی) کھیتی اور (طرح طرح کے) کھجور کے درخت (جن میں سے بعض) ایک ایک جڑ سے کئی کئی نکلنے

وَّاحِدٍ قف وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ط اِنَّ فِيْ

والے (ہوتے ہیں) اور (بعض) ایک ایک جڑ سے کئی کئی نکلنے والوں کے خلاف (ایک ہی تنے کے ہوتے) ہیں

ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۵

جنہیں ایک ہی (طرح کے) پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔اور (باوجود اس کے) پھل کے لحاظ سے ہم ان میں سے بعض (درختوں) کو بعض پر فضیلت دیتے ہیں اس میں (بھی) ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں کئی نشان (موجود) ہیں۔

حلّ لُغات۔قِطَعٌ کا مفرد اَلْقِطْعَةُ ہے جس کے معنی ہیں اَلْحِصَّةُ مِنَ الشَّیْءِ۔یعنی ساری چیز کا ایک جز و قطعہ کہلاتا ہے۔(اقرب) مُتَجَاوِرَاتٌ۔ تَجَاوَرَ سے ہے اور تَجَاوَرَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں جَاوَرَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا۔ کہ ایک قوم دوسری قوم کی ہمسایہ بن گئی۔(اقرب) وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ کے معنی ہیں کہ زمین میں ایسے ٹکڑے ہیں جو ایک دوسرے کے آس پاس ہیں۔صِنْوَانٌ کا مفرد صِنْوٌ ہے اور اَلصِّنْوُ کے معنے ہیں اَلْاَخُ الشَّقِيْقُ۔ حقیقی بھائی۔اَلْاِبْنُ بیٹا۔اَلْعَمُّ چچا۔وَاِذَا خَرَجَ نَخْلَتَانِ اَوْ اَكْثَرُ مِنْ اَصْلٍ وَاحِدٍ فَكُلٌّ وَاحِدَةٍ مِنْهُنَّ صِنْوٌ وَصُنْوٌ۔ اور جب کسی کھجور سے دو یا دو سے زیادہ تنے نکل پڑیں تو ہر ایک کو صنو کہتے ہیں۔ وَالْاِثْنَانِ صِنْوَانِ وَصِنْيَانِ مُثَلَّثَيْنِ وَالْجَمْعُ صِنْوَانٌ اور دو کو صِنْوَانِ یا صِنْيَانِ کہتے ہیں اور اس کی جمع صِنْوَانٌ ہے۔وَقِيْلَ الصِّنْوُ عَامٌّ فِيْ كُلِّ فَرْعَيْنِ يَخْرُجَانِ مِنْ اَصْلٍ وَاحِدٍ فِي النَّخْلِ وَغَيْرِهٖ۔اور بعض کے نزدیک صنو عام ہے۔صرف کھجور سے تعلق نہیں رکھتا۔پس صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ کے معنے یہ ہوئے کہ ایسے کھجور کے درخت جو دو یا دو سے زائد تنوں والے ہیں۔(اقرب) اَلْاُكُلُ۔ اَلثَّمَرُ۔ اُكُلٌ کے معنی ہیں۔پھل۔اَلرِّزْقُ الْوَاسِعُ۔ وسیع رزق۔(اقرب) وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ کے معنے ہوئے کہ ایک کا میوہ اعلیٰ اور زیادہ ہوتا ہے اور دوسرے کا اعلیٰ بھی نہیں ہوتا اور زیادہ بھی نہیں ہوتا۔

تفسیر۔ آنحضرتؐ کے نبی بن جانے پر ایک لطیف دلیل یعنی یہ نہ سمجھو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے ہی شخص ہے جس طرح یہ عبدالمطلب کا پوتہ ہے اور بھی کئی اس کے پوتے ہیں۔پس ان سب کو پیچھے چھوڑ کر یہ کیسے آگے نکل جائے گا؟

زمین کے مختلف حصوں کی مختلف طاقتیں یاد رکھو ایک ہی جگہ کی زمین کی مختلف ٹکڑوں میں مختلف طاقتیں ہوتی ہیں۔ایک زمین کے پاس ہی دوسری زمین ہوتی ہے لیکن ایک ٹکڑے میں ایک درخت پیدا ہوتا ہے اور دوسرے میں نہیں ہوتا۔یہ نظارہ کشمیر میں خوب نظر آتا ہے۔کہ ایک خاص زمین میں زعفران ہوتا ہے اور بالکل

متصل ساتھ ہی کی زمین میں زعفران نہیں ہوتا۔ اسی طرح صوبہ سرحد میں ایک ٹکڑا زمین کا ہے جسے غالباً باڑہ کہتے ہیں اس میں خاص قسم کے اعلیٰ چاول ہوتے ہیں۔ پاس کے کھیتوں میں وہ چاول نہیں ہوتے۔ زمینوں کو چھوڑ کر جانوروں کو لے لو۔ مشک کا ہرن ایک خاص علاقہ میں اچھا مشک دیتا ہے۔ وہاں کے پاس ہی دوسرے علاقہ میں لے جاؤ تو پہلے تو مشک ناقص ہونے لگے گا پھر بالکل مشک ہی پیدا نہ ہوگا۔

تو فرمایا جب مٹی میں ہی ایسے فرق ہو جاتے ہیں تو انسانوں میں کیوں نہیں ایسا فرق ہوسکتا کہ ایک آسمانی بن جائے اور ایک زمینی۔ یُسْقٰی کے لفظ سے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ چیزیں باوجودیکہ ان کو ایک ہی پانی ملتا ہے۔ مختلف رنگ و مزے کی ہوتی ہیں۔ لیکن تم کو تو پانی بھی علیحدہ علیحدہ قسم کا پلایا جاتا ہے۔ اس کو آسمانی پانی ملتا ہے اور تم کو تو شیطانی کیونکہ تم تو اس کلام کو سننے سے انکاری ہو اور شیطانوں کی باتیں سنتے رہتے ہو۔

سامان سے ہر شخص حسب استعداد فائدہ حاصل کرتا ہے یُسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ ہمارے جیسا آدمی اور ہمارے جیسے ہی سامانوں والا ہم سے آگے کیسے نکل جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کیا ایک ہی پانی پی کر مختلف بیج مختلف مزے نہیں پیدا کر دیتے۔ پس یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ سامان ایک قسم کے ہیں بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ سامان کو استعمال کرنے کی قابلیت مختلف ہے۔ ایک تلوار ایک اناڑی کے ہاتھ میں بیکار ہوتی ہے وہی تلوار شمشیر زن کے ہاتھ میں فتح و شکست کی ضامن ہو جاتی ہے۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ انہی مکہ والوں میں سے تھے جب تک ان کے ساتھ رہے معمولی آدمی رہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آئے دنیا کے بہترین دماغ بن گئے اور دوست و دشمن نے انہیں خراج تحسین دیا اور دے رہے ہیں۔

وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ

اور (اے مخاطب) اگر تجھے (ان منکران حق پر) تعجب آئے تو (وہ بجا ہے کیونکہ) ان کا (یہ) کہنا (کہ) جب ہم

خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ

(مرکر) مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں واقع میں (پھر) کسی نئے جنم میں آنا ہوگا (واقعی) عجیب (قول) ہے۔ یہ وہ

الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا انکار کر دیا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق (پڑے) ہوں گے اور

فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۶﴾

(یہ لوگ دوزخ کی) آگ (میں پڑنے) والے ہیں وہ اس میں رہا کریں گے۔

حل لغات۔ اَلْغُلّ طَوْقٌ مِنْ حَدِیْدٍ اَوْ قِدٍّ یُجْعَلُ فِی الْعُنُقِ اَوْ فِی الْیَدِ۔ غُلّ اس طوق کو کہتے ہیں جو لوہے یا چمڑے کا ہوتا ہے۔ اور ہاتھ میں یا گردن میں ڈالا جاتا ہے وَمِنْهُ قِیْلَ لِلْمَرْأَةِ السَّیِّئَةِ الْخُلُقِ غُلٌّ قَمِلٌ۔ انہی معنوں میں بدخلق عورت کو غُلٌّ قَمِلٌ کہتے ہیں۔ وَاَصْلُهُ اَنَّ الْغُلَّ کَانَ یَکُوْنُ مِنْ قِدٍّ وَعَلَیْهِ شَعْرٌ فَیَقْمَلُ فِیْ عُنُقِ الْاَسِیْرِ فَیُؤْذِیْهِ فَیَکُوْنُ الْغُلُّ الْقَمِلُ اَنْکٰی مِنْ غَیْرِهٖ۔ اور اصل اس کی یوں ہے کہ غُلّ ایسے چمڑے سے ہوتا تھا جس میں بال ہوتے تھے اور قیدی کی گردن میں ڈالنے کے بعد اس میں جوئیں پڑ جاتی تھیں اور وہ طوق اسے تکلیف دیتا اس طرح وہ جوؤں والا غل زیادہ تکلیف دِہ ہو جاتا تھا۔ وَجَمْعُهٗ اَغْلَالٌ وَغُلُوْلٌ۔ اس کی جمع اَغْلَالٌ بھی آتی ہے اور غُلُوْلٌ بھی۔ اور جب یہ محاورہ بولتے ہیں کہ هٰذَا غُلٌّ فِیْ عُنُقِكَ تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہ عمل تیرے گلے کا ہار بن گیا ہے اور تجھ کو اس کے بدلے میں عذاب ملے گا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی میں اور ان کے ذریعہ سے دنیا کی اصلاح ہونے میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔

آنحضرتؐ کے مخالفین کا آپ کی ترقی پر تعجب تعجب تو اس بات پر ہونا چاہیے کہ دنیا اس قدر خراب ہو جائے اور اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کی فکر نہ کرے۔ یہ امر خلاف سنت ہے کہ آنکھ تو ہو مگر اس سے کام لینے کے لئے روشنی نہ ہو۔ مادہ تو ہو مگر اس کی طاقتوں کو ظاہر کرنے کے لئے نر نہ ہو پھر تعجب اس امر پر تو ہو سکتا ہے کہ نر و مادہ ملیں مگر نتیجہ پیدا نہ ہو۔ اس پر کیا تعجب ہے کہ ان دونوں کے ملنے سے بچہ کس طرح ہو گیا؟ پس اس پر تعجب نہ کرو کہ اس کے ذریعہ سے دنیا کی اصلاح کس طرح ہو گی؟ تعجب تو تم کو اپنے اس احمقانہ خیال پر کرنا چاہیے کہ ہم گرنے کے بعد اٹھیں گے کس طرح؟ مرنے کے بعد زندہ کس طرح ہوں گے۔ جب آسمانی سہارا آ جائے جب زندگی کا پانی مل جائے پھر ان باتوں میں کیا تعجب ہے؟

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ الآیۃ۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ یہ مایوسی خدا تعالیٰ کے فضلوں سے کفر اور انکار کی وجہ سے ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے طریق کو چھوڑ کر خود ساختہ قواعد کی اتباع ناکام کرتی ہے جو لوگ خود ساختہ قواعد کی اتباع کرتے اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریق کو چھوڑتے ہیں ان کے لئے مایوسی کا شکار ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں۔ اور مایوسی کا لازمی نتیجہ ناکام ہونا اور حسرتوں کے جہنم میں جلنا ہے۔ افسوس کہ اس وقت یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریق کو چھوڑ کر خود ساختہ علاجوں کی طرف متوجہ ہیں۔ بجائے اشاعت اسلام اصلاح اخلاق دعا اور انابت اور تسلیم لامر اللہ کے سود اور بنک اور انگریزی تعلیم اور بیمہ اور کیا کیا علاج تجویز کر رہے ہیں؟ حالانکہ ان میں سے بعض خلاف اسلام اور مضر ہیں اور بعض بغیر روحانی طاقتوں کے غیر مفید ہیں۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ

اور وہ نیک جزا پر سزا کو مقدم کرتے ہوئے تجھ سے (اس کے) جلدی (آنے) کا مطالبہ کر رہے ہیں حالانکہ ان سے

مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ

پہلے (ایسے لوگوں پر) تمام (قسم کے) عبرتناک عذاب آچکے ہیں اور تیرا رب لوگوں کو ان کے ظلم کے باوجود (بھی)

عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۷

بلاشک وشبہ (بہت ہی) بخشنے والا ہے اور (اسی طرح) تیرا رب یقیناً سخت سزا دینے والا (بھی) ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلْمَثُلٰتُ اس کا مفرد اَلْمَثُلَۃُ ہے جس کے معنے ہیں۔ اَلْعُقُوْبَۃُ۔ سزا۔ یُقَالُ حَلَّتْ بِهِ الْمَثُلَۃُ اور حَلَّتْ بِهِ الْمَثُلَۃُ کا محاورہ مذکورہ بالا معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے کہ اس پر سزا وارد ہوئی۔ وَمَا اَصَابَ الْقُرُوْنَ الْمَاضِيَةَ مِنَ الْعَذَابِ وَهِيَ عِبَرٌ۔ يُعْتَبَرُ بِهَا۔ اور گزرے ہوئے لوگوں پر جو عذاب نازل ہوئے اور جو دوسری اقوام کے لئے موجب عبرت ہیں ان کو بھی مَثُلَۃٌ کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے اپنے اَغلال کو دور نہ کیا اور خدا تعالیٰ کے سامانوں سے فائدہ نہ اٹھایا اور اپنی طاقتوں سے کام نہ لیا تو تم خشک لکڑی کی طرح ہو جاؤ گے۔ جس کا کام سوائے جلنے کے اور کچھ

نہیں۔تو جھٹ کہہ دیتے ہیں کہ اچھا پھر وہ آگ لاؤ جس میں ہم نے جلنا ہے ہم جو نیکی کی بات بتاتے ہیں اس کو تو قبول نہیں کرتے اور جو عذاب کا ڈراوا دیتے ہیں اس کو جلدی مانگنے لگ جاتے ہیں۔حالانکہ نبیوں کے ساتھ عذاب بھی آتا ہے اور اب بھی آئے گا۔مگر انہیں یہ نہ چاہیے تھا کہ بجائے اصلاح کر کے فضل الٰہی طلب کرنے کے ضد کر کے عذاب طلب کرتے۔

انبیاء کے دشمن ہمیشہ فضل کے بجائے عذاب ہی کے طالب ہوتے ہیں ہر نبی کے وقت میں ایسا ہی ہوتا ہے ان کے نادان دشمن فضل نہیں مانگتے یہ نہیں کہتے کہ سچا ہے تو ہمیں اس کی اطاعت نصیب ہو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ سچا ہے تو ہم پر عذاب نازل ہو۔

انبیاء کے بھیجنے سے لوگوں کو تباہ کرنا مقصود نہیں ہوتا وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ ۔اس آیت میں اس عظیم الشان حکمت کو بیان فرماتا ہے کہ ہماری غرض انبیاء کے بھیجنے سے لوگوں کو تباہ کرنا نہیں بلکہ انہیں بچانا ہے۔دنیا کے لوگ ظلم پر ظلم کرتے چلے جاتے ہیں۔پھر بھی ہم مغفرت سے کام لیتے جاتے ہیں۔پس تمہارے عذاب جلدی مانگنے سے ہم عذاب جلدی نہ لے آئیں گے کیونکہ یہ ہماری سنت کے خلاف ہے۔ہماری خواہش تو یہ ہے کہ تم کو بخشش ملے۔پس انہی ذرائع کو ہم کام میں لائیں گے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو نجات دینے کا موجب ہوں۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے تم بچ جاؤ گے۔تمہاری اصلاح کی پوری کوشش کی جائے گی لیکن تم نے اصلاح نہ کی تو پھر خدا تعالیٰ سزا بھی ضرور دے گا۔اور اس کی سزا کی شدت کا مقابلہ کوئی اور عذاب نہیں کر سکے گا۔

اللہ تعالیٰ کا عذاب دوسروں کے عذاب سے سخت ہوتا ہے اس جملہ کے یہ معنی نہیں کہ خدا تعالیٰ عذاب دینے میں سختی سے کام لیتا ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب دوسروں کے عذاب سے سخت ہوتا ہے۔کیونکہ وہ جن راہوں سے عذاب محسوس کرا سکتا ہے انسان نہیں کرا سکتے۔

عِقاب کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا عذاب بلا وجہ نہیں ہوتا عِقَاب کے لفظ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کا عذاب بلا وجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کے اعمال کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ عقاب اس چیز کو کہتے ہیں جو ایڑیوں سے لگی ہوئی ہو یعنی اپنے کئے کا نتیجہ ہو جیسے بچہ ماں کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ

اور جن لوگوں نے انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں (کہ) اس (شخص) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشان کیوں نہیں

اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۠ ۸ ع

اتارا گیا (حالانکہ) تو صرف آگاہ اور (ہشیار) کرنے والا ہے اور ہر ایک قوم کے لئے (خدا تعالیٰ کی طرف سے) ایک راہنما (مقرر) ہے۔

تفسیر۔ کفار کے نزدیک نشان سے مراد عذاب ہوتا ہے باوجود بار بار نشانات ظاہر ہونے کے اور آئندہ کے لئے نشانات کی خبر دینے کے کفار کہتے کہ نشان تو کوئی دکھاتے نہیں ہم مانیں کیونکر؟ اور اس نشان سے ان کی مراد عذاب الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک نشان یہی تھا کہ وہ تباہ ہوجائیں۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار جب بھی آیت کا مطالبہ کریں جب تک کوئی دوسرا قرینہ اور معنوں پر دلالت نہ کرے ہمیشہ اس کے معنے عذاب کے ہوتے ہیں۔

اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ۔ فرمایا۔ یہ نادان سوچتے نہیں کہ تیرا تو ایک نام منذر ہے۔ بلکہ نہ ماننے والوں کے لئے تیرا یہی نام ہے۔ پس جو بات تیرے نام ہی سے بتا دی گئی ہے اب یہ اس کی اور وضاحت کیا چاہتے ہیں؟ مگر ساتھ ہی ان کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ ہر قوم کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ مامور بھیجتا ہے۔ اگر ہدایت سے پہلے عذاب آجائے تو ھاد کی صفت باطل جائے۔ پس صبر کریں۔ پہلے یہ ہادی بن جائے۔ اس کے بعد جو رہ جائیں گے ان کے لئے منذر بن جائے گا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایسا ہی ہوتا رہا۔ کچھ عرصہ تک آپؐ کے ذریعہ سے لوگ ہدایت پاتے پھر اس طبقہ کے بچے کھچے لوگ عذاب سے تباہ ہوجاتے۔ پھر ایک اور طائفہ ہدایت پاتا پھر ان کے سرکردہ عذاب میں مبتلا ہوتے۔ اسی طرح آخر تک ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کے آخری فیصلہ نے تمام غلبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کو بخش دیا۔ اور آپؐ کے دشمن بالکل تباہ ہوگئے۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ

اللہ (خوب) جانتا ہے اسے (بھی) جو ہر مادہ اٹھاتی ہے اور جسے رحم ناقص کر (کے گرا) دیتے ہیں اور (اسے بھی)

مَا تَزْدَادُ ؕ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ﴿۹﴾

جسے وہ بڑھاتے ہیں اور ہر چیز ہی اس کے پاس ایک بڑے اندازہ میں موجود ہے۔

حلّ لُغات۔ تَغِيْضُ غَاضَ ماضی سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اور غَاضَ الْمَاءُ غَيْضًا کے معنی ہیں۔ نَقَصَ۔ پانی کم ہوگیا۔ اَوْ غَارَ فَذَهَبَ فِي الْاَرْضِ۔ یا جذب ہوکر زمین کی تہ میں چلا گیا۔ وَفِي الصِّحَاحِ: قَلَّ فَنَضَبَ اور صحاح میں غَاضَ الْمَاءُ کے یہ معنی کئے گئے ہیں کہ پانی کم ہوکر خشک ہوگیا۔ ثَمَنُ السِّلْعَةِ۔ نَقَصَ جب غَاضَ کا لفظ ثَمَن کے ساتھ استعمال ہو تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ سامان کی قیمت جو پہلے زیادہ تھی کم ہوگئی۔ وَيُقَالُ غَاضَ الْمَاءَ وَالثَّمَنَ۔ اور جب غَاضَ کا لفظ متعدّی ہوکر استعمال ہو اور اس کا مفعول اَلْمَآءُ اور اَلثَّمَنُ ہو تو یوں معنے کئے جائیں گے کہ سامان کی قیمت کو گرا دیا اور پانی کو کم کر دیا۔ وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ - اَيْ مَا تَنْقُصُ تِسْعَةَ اَشْهُرٍ۔ پس اقرب الموارد والے نے مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ کے معنے یہ کئے ہیں کہ (اللہ خوب جانتا ہے) رحم اپنی مقررہ مدت ولادت میں جو کمی کرتے ہیں۔

نیز اَلْغَيْضُ جو غَاضَ کا مصدر ہے اس کے ایک معنی لغت میں یہ بھی کئے گئے ہیں اَلسِّقْطُ الَّذِيْ لَمْ يَتِمَّ خَلْقُهٗ۔ کہ غیض اس بچے کو کہتے ہیں جس کی پیدائش ابھی مکمل نہ ہوئی ہو اور وہ ناقص ہونے کی حالت میں گر جائے۔ پس غَيض کے اس معنے کو ملحوظ رکھتے ہوئے مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ کے معنے یہ ہوں گے کہ اللہ اسے خوب جانتا ہے جسے رحم ناقص کر کے گرا دیتے ہیں۔ (اقرب)

تَزْدَادُ اِزْدَادَ ماضی سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اِزْدَادَ، زَادَ سے بنا ہے جس کے معنے ہیں زیادہ ہوگیا۔ یا زیادہ کر دیا۔ اور اِزْدَدْتُّ مَالًا وَازْدَادَ الْاَمْرُ صُعُوْبَةً کے معنے ہیں میں نے مال کو بڑھایا اور معاملہ پیچیدگی اور مشکل میں بڑھ گیا۔ یعنی یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور جب اِزْدَادَ الرَّاهِنُ دَرَاهِمَ مِنَ الْمُرْتَهِنِ کا محاورہ بولا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اَخَذَهَا زِيَادَةً عَلٰى رَأْسِ الْمَالِ کہ رہن رکھنے والے نے مُرْتَهِن سے اصل مال پر بطور نفع کچھ رقم زیادہ لی۔ اور جب کوئی چیز دینے والا

لینے والے کو کہے هَلْ تَزْدَادُ تو اس کے معنے ہوتے ہیں هَلْ تَطْلُبُ زِيَادَةً عَلٰى مَآ اَعْطَيْتُكَ کیا اس کے علاوہ جو تجھے دیا گیا تو اور زیادہ طلب کرتا ہے؟ پس مَا تَزْدَادُ کے معنے یہ ہوں گے کہ (اللہ خوب جانتا ہے) رحم اپنی مقررہ مدت ولادت میں جو زیادتی کرتے ہیں۔(اقرب)

اَلزِّيَادَةُ نیز اَلزِّيَادَةُ جو زَادَ کا مصدر ہے اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اَنْ يَّنْضَمَّ اِلٰى مَا عَلَيْهِ الشَّيْءُ فِيْ نَفْسِهٖ شَيْءٌ اٰخَرُ۔ کہ جن عام حالتوں میں کوئی چیز پائی جاتی ہو اس پر بطور زیادتی کوئی اور چیز اس کے ساتھ مل جائے پس ان معنوں کے مدنظر مَا تَزْدَادُ کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ اسے خوب جانتا ہے جسے رحم اصل چیز میں بڑھاتے اور زیادہ کرتے ہیں۔(اقرب) مقدار کے معنے میں ''بڑا'' کا لفظ تنوین کا ترجمہ ہے جو کبھی بڑے کے معنے دیتی ہے۔

تفسیر ۔ پہلے بتایا تھا کہ ہم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید مخفی ذرائع سے کریں گے۔ اسی کے ذکر میں یہ بھی بتایا تھا کہ تمام دنیا میں جوڑے پیدا کئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ زمین و آسمان بھی گویا ایک قسم کے جوڑے ہیں۔ ایک اثر ڈالتا ہے اور دوسرا اسے قبول کرتا ہے۔ ایک مخفی ذرائع سے دوسرے کی حیات کو قائم رکھتا ہے اور دوسرا قائم رہتا ہے۔ ایسا ہی روحانی سلسلہ میں بعض لوگ نر کا درجہ رکھتے ہیں اور بعض مادہ کا۔ اول الذکر اثر ڈالتے ہیں اور ثانی الذکر قبول کرتے ہیں۔

اب فرمایا کہ اس قانون کے ماتحت اب بھی ایک شخص کا ظہور ہوا ہے۔ جو روحانی طور پر نر کا مقام رکھتا ہے جس سے تعلق کے بغیر کوئی روحانی درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى کا مطلب اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى۔ یعنی ہم جانتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن اپنے اندر کیا رنگ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر کون سے مادہ کو قبول کیا ہے۔ روحانیت کا یا شیطنت کا۔ اور یہ کہ کس کا مادہ بڑھے گا اور کس کا گھٹے گا؟ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کو قبول کرنے والے ہیں وہ بڑھیں گے اور ان کے اندر اعلیٰ قابلیتیں پیدا ہوں گی۔ اور جو آپؐ کے مقابل شیطانوں کے اثر قبول کر رہے ہیں ان کی ظاہری اور باطنی نسل تباہ ہوگی۔

مَا تَحْمِلُ سے ظاہری حمل بھی مراد ہوسکتا ہے ظاہری حمل بھی اس جگہ مراد ہوسکتا ہے اور اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ ہمیں معلوم ہے کہ تمہاری قوم کی آئندہ نسلیں کیا بننے والی ہیں۔ آئندہ تمہاری عورتوں کے ہاں وہی اولاد ہوگی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گزار ہوگی۔ آپؐ کی مخالف اولاد ضائع ہی ہوجائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مکہ کی نئی نسل کثرت سے آپؐ کے خدام میں داخل ہوئی۔ اور بزرگ ان کو دیکھ دیکھ کر جلتے رہے۔ ان کے ظلم

اور قبھر نئی نسل کو ایمان لانے سے روک نہ سکے۔ یہ تدبیر بھی آپؐ کی ترقی کے لئے نہایت ممد ہوئی۔ گو ابتداءً اس کو جانچنے کے لئے کفار کے پاس کوئی سامان نہ تھے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ⑩

وہ غائب اور حاضر (دونوں) کا جاننے والا ہے بڑے مرتبہ والا (اور) بڑی شان والا ہے۔

حلّ لُغات -اَلْغَيْبُ یہ غَابَ. يَغِيْبُ کا مصدر ہے۔ اور غَابَتِ الشَّمْسُ وَغَيْرُهَا- اِذَا اسْتَتَرَتْ عَنِ الْعَيْنِ۔ غَابَ کا لفظ سورج کے لئے یا کسی اور چیز کے لئے اس وقت بولتے ہیں کہ جب سورج غروب ہو جاوے۔ یا کوئی اور چیز آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ وَاسْتُعْمِلَ فِيْ كُلِّ غَائِبٍ عَنِ الْحَاسَّةِ جو بات حواس سے بالا اور پوشیدہ ہو اس پر بھی غیب کا لفظ اطلاق پاتا ہے۔ اور شہادۃ کا لفظ غیب کے بالمقابل بولا جاتا ہے۔ (مفردات)

غیب اور شہادت کے دو معنی پس غیب اور شہادت کے دو معنی ہیں۔ (۱) شہادۃ جو لوگ ظاہر کرتے ہوں۔ اور غیب جسے وہ چھپاتے ہوں۔ (۲) جو حواس ظاہری سے معلوم ہو سکے وہ شہادت ہے اور جو باتیں حواس سے بالا اور پوشیدہ ہیں، وہ غیب ہیں۔ تو عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم تمہاری ہر ایک تدبیر کو جانتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنے دشمن کی باتوں کو نہ جانتا ہو لیکن دشمن اس کی باتوں سے واقف ہو تو وہ انسان اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پس تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔

اَلْمُتَعَالُ تَعَالٰی- اِرْتَفَعَ- تَعَالٰی کے معنے ہیں بلند ہوا۔ وَالْمُتَعَالُ- رَفِيْعُ الشَّانِ۔ بڑی شان والا- اَلْكَبِيْرُ ذُوالْكِبْرِ- کبیر کے معنے ہیں کبر والا۔ اور کبر کے معنے ہیں اَلشَّرْفُ بزرگی اَلرِّفْعَةُ فِي الشَّرْفِ- شرف کے لحاظ سے رفعت اَلْعَظْمَةُ وَالتَّجَبُّرُ- عظمت و جبروت (اقرب) پس کبیر کے معنی ہوں گے بزرگی والا۔ عظمت و جبروت والا۔ شرف کے لحاظ سے رفعت والا۔

کبیر اور مُتَعال میں فرق کبیر اور مُتَعال دونوں میں یہ فرق ہے کہ کبیر اس بڑائی پر دلالت کرتا ہے جس سے دوسروں پر اثر ڈالنے والی بلندی مراد ہو جیسے متکبر ہوتا ہے۔ یعنی دوسروں کے مقابلہ میں بڑا بننا چاہتا ہے۔ ایسا ہی کبیر میں خدا تعالیٰ کی وہ بڑائی مراد ہے جو بہ نسبت اس کی مخلوق کے ہے۔

مُتَعَال اس بڑائی پر دلالت کرتا ہے جو تنزہ والی ہوتی ہے۔یعنی اس کی ایسی ارفع شان ہے کہ بندوں سے واسطہ ہی نہیں رہتا۔پس جو رفعت استغناء پر دلالت کرتی ہے وہ مُتَعَال کے لفظ سے بیان کی گئی ہے۔اور جو رفعت بندوں سے تعلق پر دلالت کرتی ہے اس کو الکبیر کے لفظ سے واضح فرمایا ہے۔

ان دونوں کے اس جگہ پر ذکر کرنے کی یہ وجہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ ہم کبیر ہیں۔تمہاری طاقتیں ہمارے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ہم تمہاری مخالف کوششوں کو بالکل ذلیل وحقیر بنا کر بیکار کر دیں گے یعنی جب چاہیں گے پیس ڈالیں گے اور ہم غنی ہیں۔تمہاری تباہی سے ہماری حکومت میں کوئی کمی نہ آوے گی۔

تفسیر۔دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کا گر اس آیت میں یہ گر بتایا ہے کہ دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس کی تدابیر کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔اگر ہم اس کی کوششوں سے واقف ہیں تو ان کے اثر کو دور کر سکیں گے ورنہ ہر وقت خطرہ میں رہیں گے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ کہنے کا مطلب عٰلِمُ الْغَيْبِ کہہ کر بتایا کہ اے نادانو! اتنا تو سوچو تمہارا مقابلہ کس ہستی سے ہے۔کیا اس خدا سے کہ جو تمہاری تدبیروں کو جانتا ہے اور پھر وہ کبیر ہے۔تمہاری تمام تدابیر کو ایک منٹ میں توڑ کر رکھ سکتا ہے۔پھر اس کی شان تمہارے علم سے نہایت ارفع ہے۔یعنی وہ تمہاری تدابیر کو جانتا ہے اور تم کو علم نہیں کہ وہ تمہارے ہلاک کرنے کے کیا کیا سامان کر رہا ہے؟ پس غور کرو کہ کیا تم ایسی ذات کا مقابلہ کر سکتے ہو!

کبیر کے لفظ سے ان کی تدابیر کے توڑنے پر دلالت کی ہے۔اور متعال سے بتایا کہ تم خدا کی تدابیر سے واقف نہیں ہو سکتے۔پھر اسی کی تشریح میں آگے فرمایا۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ

جو تم میں سے بات چھپاتا ہے اور وہ بھی جو اسے ظاہر کرتا ہے (اس کے علم کے لحاظ سے دونوں) برابر ہیں نیز وہ بھی جو

مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴿۱۱﴾

رات کو چھپ رہتا ہے اور جو دن کو چلتا ہے۔

حلّ لُغات۔سَارِبٌ سَرَبَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔اور سَرَبَ الْبَعِيْرُ سُرُوْبًا کے معنی ہیں تَوَجَّهَ لِلرَّعْيِ۔اونٹ چرنے کے لئے گیا۔(اِبِلٌ سَارِبَةٌ) مُتَوَجِّهَةٌ لِلرَّعْيِ۔اور اِبِلٌ سَارِبَةٌ ان اونٹوں کو کہتے

ہیں جو چرنے کے لئے جا رہے ہوں۔ اَلْمَاءُ۔ جَرٰی اور جب سَرَبَ الْمَاءُ کا فقرہ استعمال کیا جائے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے پانی بہہ پڑا۔ فُلَانٌ فِی الْاَرْضِ۔ ذَھَبَ عَلٰی وَجْھِہٖ فِیْھَا وَمَضٰی اور جب سَرَبَ فُلَانٌ فِی الْاَرْضِ کہا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ زمین میں چلا۔ (اقرب)

تفسیر۔ آنحضرتؐ کے مقابل کفار کے دو طریق کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں دو ہی طریق استعمال کیا کرتے تھے۔ کبھی پبلک میں دھمکیاں دیا کرتے تھے کہ ہم اس اس طرح آپؐ کو تباہ کر دیں گے تا آپؐ ڈر جائیں اور کبھی مخفی طور پر مشوروں اور منصوبوں کے ذریعہ سے آپؐ کو ہلاک کرنے کی کوششیں کرتے تھے۔ کبھی آپؐ پر دن کو حملہ کرتے تھے۔ جیسا کہ اوجھری کے سر پر ڈال دینے (بخاری کتاب الوضوء باب اذا القی علی ظھر المصلی قذر او جیفۃ۔۔) یا آپؐ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کے واقعات میں اور کبھی رات کو حملہ کرتے تھے جیسا کہ ہجرت کی رات کو وہ حملہ آور ہوئے تھے۔ اور دنیا میں دشمن کو خوف زدہ کرنے کے یہی دو طریق ہوا کرتے ہیں۔ یعنی علی الاعلان دھمکیاں یا مخفی مشورے و منصوبے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا مقابلہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ پھر تمہارے ظاہری اور مخفی حملے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ

اس کی (یعنی اللہ کی) طرف سے اس کے آگے بھی اور اس کے پیچھے بھی (ایک دوسرے کے) پیچھے آنے والی (ایک

مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا

ملائکہ کی) جماعت (حفاظت کے لئے) مقرر ہے جو اس کی اللہ کے حکم سے حفاظت کر رہے ہیں اللہ (تعالیٰ) کبھی بھی

بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ

کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی اندرونی حالت کو نہ بدلے۔ اور جب اللہ (تعالیٰ) کسی قوم کے

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۲﴾

متعلق عذاب کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس (عذاب) کو ہٹانے والا کوئی نہیں ہوتا اور اس (یعنی اللہ) کے سوا ان کا اور کوئی (بھی) مددگار نہیں (ہوسکتا)۔

حلّ لُغات۔ مُعَقِّبَاتٌ عَقَّبَ میں سے ہے اور عَقَّبَہٗ کے معنے ہیں جَاءَ بِعَقِبِہٖ۔ اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ اَتٰی بِشَیْءٍ بَعْدَہٗ۔ یا اس کے بعد کوئی کام کیا۔ عَقَّبَ فُلَانٌ کے معنے ہیں غَزَا عَلَی الْعَدُوِّ ثُمَّ ثَنّٰی مِنْ سَنَتِہٖ کہ دشمن پر ایک حملہ کرنے کے بعد پھر اسی سال دوسرا حملہ کیا۔ اور جب عَقَّبَ فِی الْاَمْرِ کہا جاوے تو اس کے معنے ہوتے ہیں تَرَدَّدَ فِیْ طَلَبِہٖ مُجِدًّا کسی بات کی تلاش میں بار بار کوشش کی۔ علاوہ ازیں عَقَّبَ کے کئی اور استعمال ہیں۔ مثلاً عَقَّبَ فِی الصَّلٰوۃِ۔ صَلّٰی فَمَکَثَ فِیْ مَوْضِعِہٖ یَنْتَظِرُ صَلٰوۃً اُخْرٰی۔ نماز پڑھ کر اپنی جگہ بیٹھ کر دوسری نماز کا انتظار کرتا رہا اَلْحَاکِمُ عَلٰی حُکْمِ سَلَفِہٖ۔ حَکَمَ بَعْدَ حُکْمِہٖ بِغَیْرِہٖ۔ حاکم نے اپنے سے پہلے کے فیصلہ کے بعد کوئی اور فیصلہ کر دیا۔ اور اَلْمُعَقِّبَاتُ کے معنی ہیں مَلَائِکَۃُ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ۔ دن اور رات کے فرشتے۔ اَلتَّسْبِیْحَاتُ یَخْلُفُ بَعْضُھَا بَعْضًا۔ تسبیحات۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے بعد آتی ہیں۔ اَللَّوَاتِیْ یَقُمْنَ عِنْدَ اَعْجَازِ الْاِبِلِ الْمُعْتَرِکَاتِ عَلَی الْحَوْضِ فَاِذَا انْصَرَفَتْ نَاقَۃٌ دَخَلَتْ مَکَانَھَا اُخْرٰی وہ اونٹنیاں جو اونٹوں کے پانی پر ازدحام کے وقت پیچھے کھڑی رہتی ہیں اور جب ایک اونٹنی پانی پی کر چلی جاتی ہے تو دوسری اس کی جگہ آ جاتی ہے۔ (اقرب)

معقبات سے مراد اس جگہ معقبات سے مراد پہرہ دار اور توابع آگے پیچھے چلنے والے ہیں۔

لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَ مِنْ خَلْفِہٖ اَیْ مَلَائِکَۃٌ یَتَعَاقَبُوْنَ عَلَیْہِ حَافِظِیْنَ۔ مُعَقِّبَاتٌ سے مراد وہ فرشتوں کی جماعت ہے جو حفاظت کے لئے یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ (مفردات)[1]

مَرَدٌّ رَدَّ کا مصدر ہے اور رَدَّ عَنْ وَجْھِہٖ کے معنے ہیں صَرَفَہٗ اس کو پھیر دیا۔ عَلَیْہِ الشَّیْءَ۔ لَمْ یَقْبَلْہُ رَدَّ عَلَیْہِ الشَّیْءَ کے معنے ہیں۔ عطیہ کو قبول نہ کیا اور واپس کر دیا۔ اِلٰی مَنْزِلِہٖ۔ اَرْجَعَہٗ اس کو واپس اس کے مکان

---

[1] پس لَہٗ مُعَقِّبَاتٌ کے معنے ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے آگے پیچھے فرشتوں کی ایک جماعت ہے۔ (۲) اس کے لئے دشمنوں کے حملوں کو روکنے والے اور اس کی تائید میں بار بار حملے کرنے والے مقرر ہیں۔ (۳) لَہٗ کی ضمیر کا مرجع مَنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ میں لفظ مَنْ ہو تو یہ مراد ہوگی کہ ہر انسان کی حفاظت کے لئے خدا نے پہرہ دار مقرر کر رکھے ہیں۔

کی طرف لوٹا دیا۔ پس مَرَدٌّ مصدر کے جو اسم فاعل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یہ معنے ہوں گے ہٹانے والا، واپس کرنے والا۔ (اقرب) اور لَامَرَدَّ لَہٗ کے معنے ہوں گے اسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔

وَالٍ وَلِیَ سے اسم فاعل ہے اور وَلِیَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں مَلَكَ اَمْرَہٗ وَقَامَ بِہٖ۔ کسی بات کا مالک بنا اور اس کی ذمہ داری کو اٹھایا۔ فُلَانًا وَعَلَیْہِ۔ نَصَرَہٗ۔ اور وَلِیَ فُلَانًا کے معنے ہیں اس کی مدد کی۔ فُلَانًا وَلَایَۃً۔ اَحَبَّہٗ اور جب وَلَایَۃٌ مصدر ہو تو اس کے معنے ہوں گے محبت کی۔ (اقرب) پس وَالٍ کے معنے ہوں گے (۱) مددگار۔ (۲) نگران (۳) محافظ۔

تفسیر۔ لَہٗ مُعَقِّبَاتٌ کی ضمیر آنحضرتؐ کے لئے ہے لہ کی ضمیر میرے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات کی طرف پھرتی ہے یعنی جیسے بادشاہوں کے گرد پہرہ دار ہوتے ہیں ویسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے پیچھے مُعَقِّبَاتٌ ہیں۔

آنحضرتؐ کی حفاظت کا ثبوت ان معنوں کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ابونعیم نے الدلائل میں اور طبرانی نے اپنی معجم کبیر میں نقل کیا ہے کہ عامر ابن طفیل اور عربد ابن قیس دو شخص حضورؐ کے پاس آئے۔ عامر نے کہا کہ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو کیا ولایت امر یعنی اپنے بعد خلافت مجھے دے دی جائے گی؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تمہاری اس شرط کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خلافت تمہیں اور تمہاری قوم کو کبھی نہ ملے گی۔ اس نے اس بات سے ناراض ہو کر کہا کہ پھر میں ایسے سوار لاؤں گا کہ تم یاد رکھو گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تمہیں اس کی توفیق ہی نہ دے گا۔ اس پر وہ دونوں ناراض ہو کر چلے گئے۔ راستہ میں عربد نے کہا آؤ پھر واپس چلیں۔ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو باتوں میں لگاؤں گا تم پیچھے سے تلوار کے ذریعہ سے ان کا کام تمام کر دینا۔ عامر نے کہا کہ اس طرح بڑا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور آپؐ کے ساتھی ہمیں قتل کر دیں گے اس نے جواب دیا کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ ہم دیت دے دیں گے۔ چنانچہ وہ دونوں واپس آئے۔ عربد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرنے لگا اور عامر نے چاہا کہ آپؐ کو پیچھے سے تلوار مار دے مگر وہ تلوار سونت کر رہ گیا اور وار نہ کر سکا۔ حدیثوں میں تو آتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر فالج گرا۔ لیکن چونکہ انہی حدیثوں میں یہ ذکر بھی ہے کہ بعد میں وہ سوار ہو کر گیا اور ہاتھ کا استعمال کرتا رہا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فالج نہیں گرا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل پر رعب طاری کر دیا اور اسے حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رعب سے اس کا ہاتھ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ لکھا ہے کہ اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مڑ کر دیکھا تو اس نے ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رکھا ہوا تھا۔ حضور اس کے

ارادہ کو بھانپ گئے اور پیچھے ہٹ گئے۔ مگر ان دونوں سے کچھ تعرض نہ کیا۔ اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ عربد پر راستہ میں بجلی گری اور عامر کاربنکل سے ہلاک ہوگیا۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم اس واقعہ پر لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ والی آیت چسپاں کیا کرتے تھے۔ (روح المعانی زیر آیت ھٰذا)

صحابہ لَہٗ مُعَقِّبَاتٌ والی آیت آنحضرت صلعم کے لئے خاص سمجھتے تھے اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ اس آیت کو عام سمجھنے کی بجائے خاص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سمجھا کرتے تھے۔

آنحضرتؐ کی حفاظت فرشتے کرتے تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام زمانہ نبوت اس حفاظت کا ثبوت دیتا ہے۔ چنانچہ مکہ معظّمہ میں آپؐ کی حفاظت فرشتے ہی کرتے تھے ورنہ اس قدر دشمنوں میں گھرے ہوئے رہ کر آپؐ کی جان کس طرح محفوظ رہ سکتی تھی۔ ہاں مدینہ تشریف لانے پر دونوں قسم کی حفاظت آپ کو حاصل ہوئی۔ آسمانی فرشتوں کی بھی اور زمینی فرشتوں یعنی صحابہؓ کی بھی۔

بدر کی جنگ اس ظاہری اور باطنی حفاظت کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔ حضور جب مدینہ تشریف لے گئے تھے تو آپؐ نے اہل مدینہ سے معاہدہ کیا تھا کہ اگر آپ مدینہ سے باہر جا کر لڑیں گے تو مدینہ والے آپؐ کا ساتھ دینے پر مجبور نہ ہوں گے۔ بدر کی لڑائی میں آپؐ نے انصار اور مہاجرین سے لڑنے کے بارہ میں مشورہ فرمایا۔ مہاجرین بار بار آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے پر زور دیتے تھے لیکن حضور ان کی بات سن کر پھر فرما دیتے کہ اے لوگو! مشورہ دو۔ جس پر ایک انصاری (سعد بن معاذ) نے کہا کیا حضور کی مراد ہم سے ہے۔ حضور نے فرمایا ہاں! اس نے کہا کہ بے شک ہم نے حضور سے معاہدہ کیا تھا کہ اگر باہر جا کر لڑنے کا موقع ہوگا تو ہم حضور کا ساتھ دینے پر مجبور نہ ہوں گے لیکن وہ وقت اور تھا۔ جبکہ ہم نے دیکھ لیا کہ آپؐ خدا کے رسول برحق ہیں تو اب اس مشورہ کی کیا ضرورت ہے؟ اگر حضور ہمیں حکم دیں تو ہم اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال دیں گے۔ ہم اصحاب موسیٰؑ کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ تو اور تیرا رب جا کر لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ بلکہ ہم حضور کے دائیں بائیں، آگے اور پیچھے لڑیں گے اور دشمن آپ تک ہرگز نہ پہنچ سکے گا جب تک کہ وہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گزرے (بخاری کتاب المغازی باب قول اللہ تعالیٰ اذ تستغیثون ربکم۔۔)۔

معقبات میں صحابہ بھی داخل ہیں یہ مخلصین بھی میرے نزدیک ان معقبات میں سے تھے جو خدا تعالیٰ نے حضور کی حفاظت کے لئے مقرر فرما دیئے تھے۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں تیرہ جنگوں میں شریک ہوا ہوں۔ مگر میرے دل میں بارہا یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ میں بجائے ان لڑائیوں میں حصہ

لینے کے اس فقرہ کا کہنے والا ہوتا جو سعد بن معاذ کے منہ سے نکلا۔ (بخاری کتاب المغازی)۔

مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ۔ خدا کے حکم کے ماتحت حفاظت کرتے ہیں۔ یعنی قومیت یا ضد کے خیال سے نہیں کرتے اور نہ رشتہ داری یا حکومت کے خوف سے۔ بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے۔ دین کے سوا کوئی چیز ان کو جمع کرنے والی نہیں تھی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر ایک کافر کو یہ امر محسوس بھی ہوا اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہہ بھی دیا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں پر اعتماد نہ کرنا یہ بن بن کی لکڑیاں تیرے کس کام آئیں گی (سیرت النبی لابن ھشام زیر عنوان امر الحدیبیة) مگر باوجود کسی دنیوی واسطہ کی عدم موجودگی کے وہ لوگ سب سے زیادہ وفادار ثابت ہوئے۔

مُعَقِّب کے معنے روکنے والے کے بھی ہوتے ہیں معقب کے معنے روکنے والے کے بھی ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے آیت کا یہ مطلب ہوا کہ اس کے لئے دشمنوں کے حملہ کو روکنے والے اور اس کی تائید میں بار بار حملہ کرنے والے مقرر ہیں۔

له کی ضمیر کا مرجع سواء منکم بھی ہوسکتا ہے لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ ہر انسان کی حفاظت کے لئے بھی خدا نے پہرہ دار مقرر کر رکھے ہیں۔ اس صورت میں له کی ضمیر کا مرجع سَوَآءٌ مِّنۡكُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ ہوگا۔

اگر انسان غور کرے تو اسے معلوم ہو جائے کہ ہر لحظہ اس کے اندر کس قدر زہر جا رہا ہے۔ ایک دوسرے کے سانس کے زہریلے کیڑے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان تمام زہروں کے لئے ایسا قانون مقرر کر دیا ہے کہ جو جسم میں داخل ہوتے ہی زہر کو تباہ کر دیتا ہے۔ انسان کے لئے ہر آن ہزاروں خطرات ہیں۔ بیماریاں، عقل کے صدمات، اموال کے نقصان اور عزت کے صدمات وغیرہ طرح طرح کے خطرات ہر وقت پیش آتے رہتے ہیں۔ ان سب سے اللہ تعالیٰ ہی انسان کی حفاظت فرماتا ہے اور جب کسی پر موت یا کوئی اور صدمہ آنا ہوتا ہے تو وہ اپنی حفاظت اٹھا لیتا ہے۔

اس مضمون سے کافروں کو ایک سبق اس مضمون سے کافروں کو یہ سبق دیا ہے کہ اگر تم شرارتوں میں ہی بڑھتے رہو گے تو یاد رکھو! تمہارا آرام سب ہماری ہی حفاظت کے سبب سے ہے۔ اس صورت میں ہم اپنی حفاظت تم سے واپس لے لیں گے اور تم تباہ ہو جاؤ گے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ بروں کے ساتھ نیک

سلوک نہیں کرتا بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ نیکوں کے متعلق اپنے رویہ کو نہیں بدلتا۔ جب تک ان میں تبدیلی واقع نہ ہو جائے اور وہ برے نہ بن جائیں۔ یعنی برے کے ساتھ تو خدا کا سلوک نیک ہو سکتا ہے مگر نیک کے ساتھ برا نہیں ہوا کرتا۔ جب تک وہ خود بدل نہ جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

پراگندہ کر دینے والے ابتلاء آنا قوم کی حالت کے تغیر پر دال ہے جب کسی قوم کی حالت خراب ہو رہی ہو اور اسے ایسے ابتلا پیش آویں جو اسے پراگندہ کر دیں اور تباہ کر دیں جیسا کہ تغیر کا حقیقی منشاء ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس قوم کی حالت بدل چکی ہے۔

مِنْ وَّالٍ کے معنے۔ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ۔ سوء کے معنے بدی یا تکلیف کے ہوتے ہیں۔ فرمایا اگر اللہ تعالیٰ تمہیں تکلیف دینے کا فیصلہ کرے تو پھر کوئی اس کو روکنے والا نہ ہوگا۔ وَلِیُّ الْاَمْرِ کے معنے مَلَکَہٗ آتے ہیں۔ تو فرمایا کہ خدا کے مقابلہ میں کوئی ان کا نگران والی ومحافظ نہ ہوگا۔ اس میں وحدت ملکیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی جب ایک ہی مالک ہے تو اس کی چھوڑی ہوئی چیز کو کون حفاظت میں لے سکتا ہے۔ پس اگر ہم چھوڑ دیں گے تو پھر بے مدد ہی رہ جاؤ گے کیونکہ دوسرا کوئی آقا تو ہے نہیں۔ اس آیت میں صاف طور پر کفار کو بتلا دیا گیا کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو حفاظت کروں گا مگر تم سے حفاظت کو چھین لوں گا۔

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنْشِئُ

وہی ہے جو تمہیں بجلی (کی چمک) دکھاتا ہے خوف کے لئے (بھی) اور طمع کے لئے (بھی)

السَّحَابَ الثِّقَالَ ۚ ﴿۱۳﴾

اور بھاری بادل اٹھاتا ہے۔

حلّ لغات۔ اَنْشَاَ یُنْشِئُ اَنْشَاَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَنْشَاَهٗ اِنْشَاءً کے معنی ہیں رَبَّاهُ۔ اس کی پرورش کی۔ الشَّیْءَ اَحْدَثَهٗ اور اَنْشَاَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں کسی چیز کو بنایا۔ اَللّٰهُ الشَّیْءَ۔ خَلَقَهٗ اللہ نے کسی کو پیدا کیا۔ اور اَنْشَاَ اللّٰهُ الْخَلْقَ کے معنی ہیں اِبْتَدَاَ خَلْقَهُمْ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے کی ابتداء کی۔ فُلَانٌ الْحَدِیْثَ۔ وَضَعَهٗ جب حدیث کے لئے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں کوئی بات بنائی۔ اللّٰهُ السَّحَابَةَ رَفَعَهَا اور اَنْشَاَ اللّٰهُ السَّحَابَةَ کے معنی ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بادلوں کو بلند کیا۔ فُلَانٌ دَارًا۔

بَدَأَ بِنَاءَهَا مکان کے بنانے کی ابتداء کی۔ زَيْدٌ أَنْشَدَ شِعْرًا أَوْ خَطَبَ بِخُطْبَةٍ فَأَحْسَنَ فِيهِمَا۔ زید نے اچھی طرح شعر کہے اور لیکچرار نے بلند پایہ تقریر کی۔ (اقرب) پس يُنْشِئُ السَّحَابَ کے معنے ہوں گے (۱) بادلوں کو بناتا ہے۔ بادلوں کو اٹھاتا ہے۔

السَّحَابُ اَلْغَيْمُ كَانَ فِيْهِ مَاءٌ أَوْلَمْ يَكُنْ فِيْهِ۔ السَّحَاب۔ سَحَابَةٌ کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں بادل۔ خواہ وہ برسنے والا ہو یا نہ ہو۔ اَلْوَاحِدَةُ سَحَابَةٌ۔ یہ اسم جنس ہے۔ مفرد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اَلسَّحَابُ الْمُسَخَّرُ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ میں واحد ہے اور وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ میں جمع۔ ثِقَالٌ کا لفظ ثَقِيْلٌ (بھاری) کی جمع ہے جو خفیف (ہلکے) کی ضد ہے۔ (اقرب)

تفسیر ۔ **بجلی کی چمک میں خوف اور فوائد** برق سے لوگوں کے لئے خوف اور طمع دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ خوف اس لئے کہ بجلی گر کر ہلاک نہ کر دے اور طمع اس لئے کہ عام طور پر بجلی زیادہ تبھی چمکتی ہے جب بادل زیادہ برسنے والا ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک میں بھی مشہور ہے کہ جو ''گرجتے ہیں برستے نہیں'' مگر وہ خاص قسم کی گرج ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بجلی کی چمک سے رحم مادر میں بچوں کو اور ایسا ہی بعض پودوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کی چمک سے کئی بیماریوں کے کیڑے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ وبائیں دور ہو جاتی ہیں۔ گویا بجلی کی چمک میں خوف بھی ہے اور فوائد بھی۔ یہی حال بھاری بادلوں کا ہوتا ہے۔ کبھی وہ رحمت بن کے دنیا کی آبادی کا باعث ہو جاتے ہیں اور کبھی وہی زحمت بن جاتے ہیں اور فصلوں کو برباد اور شہروں کو غرق کر دیتے ہیں۔

اس مثال سے بتایا ہے کہ ایک ہی چیز بعض کی تباہی کا اور بعض کی ترقی کا موجب بن جاتی ہے۔ بجلی چمکتی ہے، بادل آتے ہیں۔ ان سے کئی تباہ ہو جاتے ہیں اور کئی بے شمار فوائد حاصل کرتے ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ اچھے یا برے نتائج صرف کسی چیز کے اچھے یا برے ہونے سے متعلق نہیں بلکہ اس تعلق سے متعلق ہیں۔ جو اس چیز کو کسی دوسری چیز سے جا کر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی پوچھے کہ بھاری بادل اچھے ہوتے ہیں یا کہ نہیں۔ تو اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ تاوقتیکہ موقع وحالات کو نہ دیکھ لیا جائے۔ جب بارش آتی ہے تو جس کی عمارت بن رہی ہوتی ہے وہ کہتا ہے کہ اگر بارش آ گئی تو میں تباہ ہو جاؤں گا مگر اسی وقت زمیندار جس کا کھیت خشک سالی کی وجہ سے تباہ ہو رہا ہوتا ہے کہتا ہے کہ اگر بارش نہ ہوئی تو میں برباد ہو جاؤں گا۔ پس فرمایا کہ چند دن کا فائدہ یا ضرر نسبتی امر ہے۔ پس کفار کو ظاہری سامانوں پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیے۔ مال رشتہ دار اور حکومتیں ہر اک کے لئے اچھی ہی نہیں ہوتیں۔ یہ اگر ایک کو بچا لیتی ہیں تو دوسرے کو تباہ کر دیتی ہیں۔

قوموں کی ترقی اور تنزل کی ایک لطیف مثال اس لئے وہ ان سامانوں کو نہ دیکھیں جو ان کے پاس ہیں بلکہ اپنے دل کی حالت کو دیکھیں اگر دل خراب ہو چکے ہیں تو ظاہری سامان ترقی کا نہیں تنزل کا موجب ہوں گے۔ یہ ایک اتنا لطیف اور وسیع مضمون ہے کہ اس کے ذریعہ سے قوموں کے تنزل اور ترقی کے اسباب پر ضخیم مجلدات لکھی جاسکتی ہیں۔

وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَ

اور کڑک اس کی تعریف کے ساتھ (ساتھ) اس کی پاکیزگی کا اظہار بھی کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کے خوف کے

يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَ هُمْ

سبب سے (ایسا ہی کرتے ہیں) اور وہ گرنے والی بجلیاں بھیجتا ہے۔ پھر جن پر چاہتا ہے انہیں نازل کرتا ہے اور وہ

يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ؕ﴿۱۴﴾

اللہ کے بارہ میں جھگڑ رہے ہیں حالانکہ وہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

حلّ لُغات ۔ يُسَبِّحُ سَبَّحَ ماضی سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور سَبَّحَ اللّٰهَ کے معنے ہیں نَزَّهَهٗ کہ اللہ کی پاکیزگی کا اظہار کیا اور کبھی سَبَّحَ کے ساتھ ل کا صلہ لا کر بھی اس کو متعدّی بنایا جاتا ہے۔ (اقرب) اور يُسَبِّحُ الرَّعْدُ کے معنے ہوں گے کہ کڑک اللہ کی پاکیزگی کا اظہار کرتی ہے۔

اَلرَّعْدُ رَعَدَ کا مصدر ہے اور رَعَدَ السَّحَابُ کے معنے ہیں صَاتَ وَضَجَّ لِلْاِمْطَارِ۔ بادل برسنے کے لئے گرجا اَلرَّعْدُ کے معنے ہیں صَوْتُ السَّحَابِ بادل کی آواز، کڑک۔ (اقرب)

اَلصَّوَاعِقُ صَاعِقَةٌ کی جمع ہے اور صَاعِقَه کے معنی ہیں اَلْمَوْتُ۔ موت كُلُّ عَذَابٍ مُهْلِكٍ۔ ہر مہلک عذاب۔ صَيْحَةُ الْعَذَابِ۔ عذاب کی آواز۔ نَارٌ تَسْقُطُ مِنَ السَّمَآءِ فِيْ رَعْدٍ شَدِيْدٍ لَا تَمُرُّ عَلٰى شَيْءٍ اِلَّا اَحْرَقَتْهُ۔ وہ آگ جو بادل سے کڑک کے ساتھ نازل ہوتی ہے اور جس چیز پر گرے اسے جلا دیتی ہے۔ (اقرب)

اَلْمِحَالُ مَاحَلَ کا مصدر ہے اور مَاحَلَهٗ کے معنی ہیں۔ مَاكَرَهٗ وَكَايَدَهٗ۔ کسی کی تدبیر کے خلاف تدبیر کی۔ عَادَاهُ۔ بالمقابل دشمنی کا اظہار کیا۔ قَاوَاهُ۔ کسی کے بالمقابل قوت وغلبہ کا اظہار کیا۔ اور اَلْمِحَالُ کے معنی ہیں۔ اَلْكَيْدُ۔ تدبیر۔ رَوْمُ الْاَمْرِ بِالْحِيَلِ۔ حیلوں کے ذریعوں سے کسی کام کے کرنے کا قصد کرنا۔ اَلتَّدْبِيْرُ۔

تدبیر۔ اَلْمَکْرُ۔ تجویز۔ اَلْقُدْرَۃُ۔ طاقت۔ اَلْجِدَالُ۔ جھگڑا۔ اَلْعَذَابُ۔ عذاب۔ اَلْعِقَابُ۔ سزا۔ اَلْعَدَاوَۃُ۔ دشمنی۔ اَلْقُوَّۃُ وَالشِّدَّۃُ۔ طاقت ورعب۔ اَلْھَلَاکُ۔ ہلاک ہونا۔ اَلْاِھْلَاکُ۔ کسی کو ہلاک کرنا۔ (اقرب) بعض نے مِحَالٌ کو حَوْلٌ اور حِیْلَۃٌ سے مشتق قرار دیا ہے۔ (مفردات) پس ھُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ کے معانی ہوں گے کہ اللہ کی تدبیر بڑی سخت ہے۔ اس کی پوشیدہ تدبیریں کارگر ہوکر رہتی ہیں۔ اس کی قدرت بھاری ہے۔ جب وہ بندوں کے حقوق دلواتا ہے تو اس کی سزا سخت ہوتی ہے۔ جب اس کی طرف سے ہلاکت آتی ہے تو سخت ہوتی ہے۔

تفسیر ۔ فرمایا تم مسلمانوں کو مصائب اور آفات کا شکار دیکھ کر خوش ہوتے ہو۔ کہ یہ بجلیاں انہیں تباہ کر دیں گی مگر تم اس میں دھوکا کھا رہے ہو۔ نہ بجلی ہر حالت میں اور ہر شے کے لئے ہلاکت کا موجب ہوتی ہے اور نہ بادل ہر حالت میں اور ہر شئے کے لئے فائدہ کا موجب ہوتا ہے۔ مصائب مومن کے لئے تباہی کا موجب نہیں ہوتے بلکہ ترقی کا۔ وہ اس کی چھپی ہوئی طاقتوں کو ابھارنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں وہ اس کے حوصلوں کو بلند کردیتے ہیں۔ وہ اسے اپنے رب کے اور بھی قریب کردیتے ہیں۔ آخر کڑک اور بجلی بھی تو خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے وہ اس کے مخلص بندوں کی تباہی کا موجب کس طرح ہوسکتی ہے؟ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرسکتی جس سے خدا کی ذات پر عیب لگتا ہو۔ وہ بھی خدا تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے۔ اگر وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گرکر ان کو تباہ کردے (نعوذ باللہ) تو خدا تعالیٰ کی ذات پر اعتراض آتا ہے پس جس کے ساتھ خدا ہو وہ اس کا تو بھلا ہی کرے گی۔ اگر گرے گی تو وہ تم پر ہی گرے گی۔ فرشتے بھی اس کے خوف سے تسبیح کررہے ہیں۔ یعنی رعد خود تو کوئی چیز نہیں۔ فرشتے بھی جو پہلا سبب ہیں اور سب اسباب ان کے اشارہ پر نتائج ظاہر کرتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہیں۔

جس کے ساتھ خدا تعالیٰ ہوگا سب سامان اس کے فائدہ کے نتائج پیدا کریں گے پس جس کے ساتھ خدا تعالیٰ ہوگا دنیا کے سامان بھی خواہ کسی صورت میں ظاہر ہوں آخر کار اس کے فائدے کے نتائج پیدا کریں گے۔

وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَ هُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ۔ یعنی تم کو غور کرنا چاہیے کہ یہ چمکنے والی بجلیاں کن پر گرسکتی ہیں۔ خدا جو ان کو گرانے والا ہے کیا ان پر گرائے گا جو اس کی تائید میں کھڑے ہوئے ہیں۔ یا ان پر جو اس کے متعلق جھگڑ رہے ہیں۔ اور اس کے دین کی مخالفت میں کھڑے ہیں؟ ظاہر ہے کہ وہ انہی پر گرائے گا جو اس کے مخالف ہیں۔ وَ هُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ کہہ کر اس بات کو صاف طور سے بتا دیا کہ یہ عام قانون قدرت کا ذکر نہیں ہو رہا بلکہ دشمنانِ اسلام اور خدا تعالیٰ کے بارہ میں جھگڑنے والوں کے لئے ایک سخت عذاب کی پیشگوئی ہے۔ شدید المحال کہہ کر اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اللہ سے جھگڑا کرنا آسان نہیں کیونکہ اس کی

تدابیر باریک در باریک اور مضبوط ہوا کرتی ہیں اور پھر ان کے نتائج بھی بہت سخت نکلا کرتے ہیں۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا

نہ ٹلنے والا بلاوا اسی کا ہے اور جنہیں وہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان (کی دعا) کا کوئی جواب نہیں دیتے (ہاں) مگر

یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَى الْمَآءِ

اس (شخص) کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا رہا ہو لیکن وہ (یعنی پانی) اس تک کبھی نہ پہنچے گا اور

لِیَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ۞۱۵

کافروں کی (چیخ و) پکار ضائع ہی جائے گی۔

حلّ لُغات۔ دَعْوَةٌ دَعَا کا مصدر ہے اور دَعَا فُلَانًا دَعْوَةً کے معنے ہیں طَلَبَهٗ لِیَأْكُلَ عِنْدَهٗ۔ کہ اسے کھانے پر بلایا۔ پس دَعْوَةٌ کے معنے ہوں گے ''بلاوا''۔ (اقرب)

اَلْحَقُّ اَلْحَقُّ - حقّ کا مصدر ہے۔ اور حَقَّهٗ حَقًّا کے معنے ہیں غَلَبَهٗ عَلَى الْحَقِّ۔ حق کی وجہ سے اس پر غالب آیا۔ وَالْاَمْرَ: اَثْبَتَهٗ وَاَوْجَبَهٗ۔ کسی امر کو ثابت کیا اور واجب کیا۔ كَانَ عَلٰى يَقِيْنٍ مِنْهُ۔ کسی معاملہ پر یقین سے قائم تھا۔ الْخَبَرَ۔ وَقَفَ عَلٰى حَقِيْقَتِهٖ اور حَقَّ الْخَبَرَ کے معنے ہوں گے اس کی حقیقت سے آگاہ ہوا اور اَلْحَقُّ کے معنے ہیں ضِدُّ الْبَاطِلِ سچ۔ الْاَمْرُ الْمَقْضِیُّ فیصلہ شدہ بات۔ اَلْعَدْلُ۔ عدل۔ اَلْمِلْكُ۔ ملکیت۔ اَلْمَوْجُوْدُ الثَّابِتُ۔ موجود و قائم۔ اَلْيَقِيْنُ بَعْدَ الشَّكِّ۔ یقین۔ اَلْمَوْتُ۔ موت اَلْحَزْمُ دانائی۔ (اقرب) پس لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ کے معنے ہوں گے (۱) سچائی کی تائید میں اٹھنے والی آواز صرف خدا ہی کی ہوتی ہے۔ (۲) خدا تعالیٰ ہی کی آواز ضرور غالب ہو کر رہتی ہے۔ (۳) جو پکارنا فائدہ مند ہو سکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کے حضور پکارنا ہے۔ (۴) وہی پکارے جانے کا مستحق ہے۔ (۵) تقدیر کا ٹلانا اسی کا کام ہے۔

یَسْتَجِیْبُوْنَ اِسْتَجَابَ سے ہے اور اِسْتَجَابَ کے معنے ہیں رَدَّ لَهُ الْجَوَابَ۔ اس کو جواب دیا۔ اور لَایَسْتَجِیْبُوْنَ کے معنے ہوئے وہ جواب نہیں دیتے۔ (اقرب)

ضَلَالٌ ضَلَالٌ ضَلَّ کا مصدر ہے اور ضَلَّ عَنِّیْ كَذَا کے معنے ہیں ضَاعَ۔ ضائع ہو گیا۔ فُلَانٌ الْفَرَسَ

وَالْبَعِیْرَ۔ ذَھَبَا عَنْہُ۔ اونٹ اور گھوڑا اس سے ضائع ہو گئے۔(اقرب) اور ضَلَالٌ کے معنے ہوئے ضَیَاعٌ۔ضائع ہونا۔(لسان) اور مَادُعَاءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کے معنے ہوئے کہ کافروں کی چیخ وپکار ضائع ہی جائے گی۔

تفسیر۔ لَہٗ دَعْوَۃُ الْحَقِّ کے چار معنے جیسا کہ حل لغات میں لکھا گیا ہے اس آیت کے کئی معنی ہیں۔(۱) سچائی کی تائید میں اٹھنے والی آواز صرف خدا ہی کی ہوتی ہے۔یعنی عمدہ تعلیم جو سراسر حق ہو۔ جو غلطی سے پاک ہو۔ وہ صرف خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آسکتی ہے۔انسان کی بنائی ہوئی تعلیم میں غلطیاں اور جھوٹ ہوتے ہیں۔اس لئے یہ مت سمجھو کہ تمہاری تعلیمات اس کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں گے۔اس پاک تعلیم کا مقابلہ جب تمہاری غلطیوں سے پر تعلیم کے ساتھ ہوگا تو دنیا کو خودبخود اس کی برتری کا یقین ہوجائے گا۔

اللہ ہی کی آواز پوری ہوکر رہتی ہے (۲) خدا تعالیٰ ہی کی آواز ہے جو ضرور غالب ہوکر رہتی ہے۔دنیا کے بادشاہوں کی آوازیں بھی دب جایا کرتی ہیں۔بادشاہ ایک مجرم کی سزا کا اعلان کرتا ہے مگر وہ ملک سے بھاگ جاتا ہے یا کسی کی ذلت کا سامان کرتا ہے مگر خود مر جاتا ہے۔صرف ایک اللہ کی آواز ہے جو پوری ہوکر رہتی ہے اور کوئی اس میں روک نہیں ڈال سکتا۔

(۳) پکارنے کا فاعل بندہ کو قرار دیا جائے تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ جو پکارنا حق کا موجب ہوسکتا ہے یعنی فائدہ اور کامیابی والا ہوسکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو ہی پکارنا ہے۔یعنی اسی سے عجز کے ساتھ دعائیں مانگنا ہی کامیابی کی کلید ہے۔

(۴) وہی مستحق ہے سب عبادات کا جو اس کے سوا دوسرے کو پکارتا ہے وہ کسی کا حق کسی کو دیتا ہے اور اس طرح ظالم اور ناشکر گزار بنتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَھُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا کَبَاسِطِ کَفَّیْہِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاہُ وَمَا ھُوَ بِبَالِغِہٖ وَ مَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ۔ بِشَیْءٍ سے بتلایا کہ جھوٹے معبودوں کی طرف سے انہیں ذرہ بھر بھی نفع نہیں پہنچتا۔اگر کوئی دعا پوری ہوجاتی ہے تو وہ اتفاق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ان معبودان باطلہ کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اِلَّا کَبَاسِطِ کَفَّیْہِ۔ یعنی ان کی پکار اپنے دونوں ہاتھ پھیلانے والے کی طرح ہوتی ہے۔

ادنیٰ چیز کو اعلیٰ مقام دینے والا اور اعلیٰ کو ادنیٰ دینے والا فوائد سے محروم رہ جاتا ہے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جس طرح اعلیٰ چیز کو ادنیٰ مقام دینے والا انسان فوائد سے محروم رہ جاتا ہے اسی طرح ادنیٰ کو اعلیٰ مقام دینے والا بھی اس کے فوائد سے محروم رہ جاتا ہے۔کھرے سکہ کو کھوٹا سمجھنے والا بھوکا مرے گا۔کیونکہ سکے کو استعمال نہ کرے گا۔مگر کھوٹے کو کھرا سمجھنے والا بھی وقت پر تکلیف اٹھائے گا کیونکہ وہ اس کے کام نہ آئے گا۔جو خدا تعالیٰ کی

صفات سے آگاہ نہیں وہ اس کی رحمتوں سے محروم رہے گا۔لیکن جو مخلوقات کو خدا بنائے گا وہ بھی ان مخلوقات کے فائدہ سے محروم رہے گا۔مثلاً پانی انسان کے فائدہ کی ایک چیز ہے اور انسان کے کام آنے کے لئے بنایا گیا ہے۔اگر کوئی پانی کو انسان کا ہی مقام دے دے اور جس طرح آدمی آدمی کو بلاتا ہے ہاتھ پھیلا کر اسے بلانا شروع کر دے تو پانی اس کے پاس نہ آئے گا۔اور وہ پانی کے فوائد سے محروم رہ جائے گا۔اسی طرح جو لوگ مخلوقات کو خدا بناتے ہیں وہ ان فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں جو ان مخلوقات میں مخفی ہیں۔ستاروں اور دریاؤں کو خدا بنانے والے کب ان پر حکومت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں اور انسانوں کو خدا بنانے والے کب ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ایک نبی کو خدا بنانے والا نبی والا فائدہ اٹھاتا نہیں اور خدا والا فائدہ نبی پہنچا نہیں سکتا۔پس اس کے اصل فائدہ سے یہ شخص محروم رہ جاتا ہے۔

ہندوستان کے ترقی کے میدان میں پیچھے رہ جانے کی بڑی وجہ ہندوستان کے ترقی کے میدان میں سب سے پیچھے رہ جانے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے پانی اور آگ کو خدا بنالیا اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئے۔جو ترقیات کے لئے دو بڑے رکن تھے۔مگر یوروپین لوگوں نے ان سے کام لیا اور ترقی کر کے آگے نکل گئے۔ہندوؤں کی تو یہاں تک حالت ہے کہ جب دریائے گنگا سے انگریز نہر نکالنے لگے تو انہوں نے شور مچا دیا کہ ہمارے خدا کو کاٹنے لگے۔مسلمان بھی اپنے تنزل کے وقت بزرگوں کو خدائی صفات دے کر ان سے دعائیں مانگنے لگے۔نتیجہ یہ ہوا کہ عمدہ نمونہ کے طور پر کام آنا جو ان بزرگوں کا اصل فائدہ تھا اس سے محروم ہو گئے۔اور دعائیں سننے کی ان وفات یافتہ بزرگوں میں طاقت ہی نہ تھی پس انہیں اعلیٰ مقام دے کر ان کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔آپ فوائد سے محروم رہ گئے۔اس آیت میں بتایا ہے کہ شرک انسانی ترقی میں ایک زبردست روک ہے۔اور شرک کی وجہ سے انسان مخلوقات سے وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا جو خدا تعالیٰ نے ان میں پوشیدہ رکھا ہے۔

اَلضَّلَالُ کے معنے وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ۔ان کی دعا ضائع اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اپنے موقع پر نہیں پہنچتی۔دعا تو وہ ہے جو خدا تعالیٰ کے پاس جائے۔اگر خط یا پیغامبر کسی دوسری جگہ چلا جائے تو اس کا جانا نہ جانا برابر ہوتا ہے۔اسی طرح فرمایا کہ کافروں کی دعا بے پتہ رہ جاتی ہے۔دعا کی قبولیت کا اصل مقام تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔یہ لوگ اپنی دعاؤں پر اللہ تعالیٰ کا پتہ لکھتے تو ان کی دعائیں خدا تک ضرور پہنچتیں۔اور ان کو جواب آجاتا۔مگر ان لوگوں نے تو مخلوقات کا پتہ لکھنا شروع کر دیا۔جو دعا کو قبول کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔اس لئے ان کی دعا ضائع ہو جاتی ہے اور تدبیریں ناکام رہتی ہیں۔

تقدیر کا ٹلانا خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ میں یہ بھی بتایا ہے کہ تقدیر کا ٹلانا خدا کے قبضہ میں

ہے۔ پس جو اس سے تعلق نہیں رکھتا تقدیر اس کی مؤید نہیں ہوتی۔ اور وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ میں فرمایا کہ ان کی تدبیریں بھی ناقص غلط اور بے محل ہیں۔ گویا نہ تقدیر ان کے ساتھ رہی اور نہ تدبیر۔ تو اب ان کی کامیابی کی کون سی صورت باقی رہ گئی۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّ

اور جو (ذوی الارواح) آسمانوں میں ہیں یا زمین میں ہیں اور ان کے سائے بھی خوش ہو کر (کریں) یا ناخوش ہو کر

ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۶﴾ السجدة

سجدہ ۲

(ہر) صبح اور شام سجدہ اللہ ہی کو کرتے ہیں۔

حلّ لُغات۔ يَسْجُدُ سَجَدَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور فُلَانٌ سَاجِدُ الْمَنْخِرِ کے معنے ہیں ذَلِيْلٌ خَاضِعٌ کہ وہ عاجز ذلیل ہے۔ اَلْبَعِيْرُ: خَفَضَ رَأْسَهٗ۔ اور سَجَدَ الْبَعِيْرُ کے معنے ہیں اونٹ نے اپنا سر نیچے گرایا۔ اَلسَّفِيْنَةُ لِلرِّيَاحِ۔ طَاعَتْهَا وَمَالَتْ بِمَيْلِهَا۔ کشتی کو جدھر ہوا نے چلایا وہ چل پڑی۔ (اقرب) لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے معنے ہوں گے ہر چیز اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہی ہے اور اس کے آگے عاجزی کرتی ہے۔

ظِلٰلُهُمْ ظِلَالٌ ظِلٌّ کی جمع ہے۔ اقرب الموارد میں ہے اَلظِّلُّ نَقِيْضُ الضِّحِّ وَهُوَ الْفَيْءُ۔ دھوپ کے مقابل کی چیز یعنی سایہ۔ جہاں سورج کی روشنی براہ راست نہ پہنچتی ہو۔ روشنی کا نور اثر ڈال رہا ہو۔ اَوْهُوَ بِالْغَدَاةِ۔ وَالْفَيْءُ بِالْعَشِيِّ۔ بعض کہتے ہیں کہ ظل صبح کے سایہ کو کہتے ہیں جو دوپہر تک رہتا ہے اور فَيْءٌ دوپہر کے بعد سے لے کر شام تک کے سایہ کو کہتے ہیں۔

ظلال کے محاورہ کا استعمال قرآن مجید اور لغت میں (لیکن یہ قرآن کریم کے محاورہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس جگہ آیا ہے کہ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ۔ یعنی صبح اور شام دونوں کے سایوں کو ظِلَال کہا ہے) وقال رُؤْبَةُ كُلُّ مَوْضِعٍ تَكُوْنُ فِيْهِ الشَّمْسُ فَتَزُوْلُ عَنْهُ فَهُوَ ظِلٌّ۔ اور رؤبہ کے نزدیک ظلّ کے یہ معنی ہیں کہ ہر وہ جگہ جہاں سورج ہو۔ اور پھر وہاں سے ہٹ جائے۔ يُقَالُ ظِلُّ الْجَنَّةِ وَلَا يُقَالُ فَيْؤُهَا ظِلَّ الْجَنَّةِ تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے متعلق فَيْءٌ کا لفظ نہیں استعمال کیا جا سکتا۔ اِنَّمَا هِيَ دَائِمًا ظِلٌّ۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ظل ہی رہتا ہے۔ نیز

ے الفاظ جمع ہیں مگر اردو میں مفرد ہی ترجمہ ہو سکتا ہے۔

ظِلّ کے معنے ہیں مَا يُرٰی مِنَ الْجِنِّ وَغَيْرِهٖ۔ بھوت وغیرہ۔ اَلْعِزُّ۔ عزت۔ اَلْمَنَعَةُ۔ غلبہ اَلرَّفَاهَةُ۔ خوشحالی۔ اَللَّيْلُ اَوْ جُنْحُهٗ اَوْ سَوَادُهٗ۔ رات یا رات کا حصہ یا اس کی سیاہی مِنْ كُلِّ شَيْءٍ شَخْصُهٗ اَوْ كِنُّهٗ۔ ہر حیوان کا جسم یا ہر چیز کا وہ حصہ جو اس کے مغز کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو بیرونی اثرات سے حفاظت میں رکھتا ہے۔ مِنَ الشَّبَابِ اَوَّلُهٗ جوانی کا ابتداء وَفِي الْاَسَاسِ وَكَانَ ذَالِكَ فِيْ ظِلِّ الشِّتَاءِ اَيْ فِيْ اَوَّلِ مَاجَاءَ۔ اور اساس میں ظِلّ کے لفظ کے ماتحت لکھا ہے کہ ظِلُّ الشِّتَاءِ کے معنے ہیں موسم سرما کا ابتدا۔ وَمِنَ الْقَيْظِ شِدَّتُهٗ۔ گرمی کے لئے آئے تو اس کے معنی ہیں۔ اس کی شدت۔ تَقُوْلُ سِرْتُ فِيْ ظِلِّ الْقَيْظِ۔ اَيْ فِيْ شِدَّتِهٖ۔ يَعْنِي سِرْتُ فِيْ ظِلِّ الْقَيْظِ کے معنے ہوں گے میں تیز گرمی میں چلا۔ وَمِنَ السَّحَابِ مَاوَارَى الشَّمْسَ مِنْهُ اَوْسَوَادُهٗ۔ بادل کا وہ حصہ جو سورج کو ڈھانپ لیتا ہے۔ یا اس کا سایہ۔ مِنَ النَّهَارِ لَوْنُهٗ اِذَا غَلَبَتْهُ الشَّمْسُ۔ چمکتی ہوئی دھوپ (اقرب) هُوَ فِيْ ظِلِّهٖ۔ اَيْ كَنَفِهٖ۔ اور هُوَ فِيْ ظِلِّهٖ کے معنے ہیں وہ اس کی حفاظت میں ہے۔ اس کے علاوہ ظِلَالٌ۔ ظُلَّةٌ کی بھی جمع ہے جس کے معنی ہیں اَلْغَاشِيَةُ۔ ڈھانپنے والی چیز۔ سائبان۔ وَالْبُرْطُلَّةُ اَيْ اَلْمِظَلَّةُ الضَّيِّقَةُ۔ چھوٹا سائبان چھتری۔ وَفِي التَّعْرِيْفَاتِ اَلظُّلَّةُ هِيَ الَّتِيْ اَحَدُ طَرَفَيْ جِذْعِهَا عَلٰى حَائِطِ هٰذِهِ الدَّارِ وَطَرَفُهَا الْاٰخَرُ عَلٰى حَائِطِ الْجَارِ الْمُقَابِلِ اور تعریفات میں ہے کہ ظُلَّةٌ اس چھپر کو کہتے ہیں کہ جس کو راستہ پر سایہ کے لئے ڈالا جاتا ہے اور اس کا ایک کنارہ ایک گھر کی ایک دیوار پر ہو اور دوسرا کنارہ سامنے کی دیوار پر ہو۔ اَوَّلُ سَحَابَةٍ تُظِلُّ۔ موسم کا سب سے پہلا سایہ کرنے والا بادل۔ مَا اَظَلَّكَ مِنْ شَجَرٍ۔ جو درخت سایہ دے۔ شَيْءٌ كَالصُّفَّةِ يُسْتَتَرُ بِهٖ مِنَ الْحَرِّ وَالْبَرْدِ۔ ایسا چھپر جو سردی اور گرمی سے بچاؤ کے لئے بنایا گیا ہو۔ (اقرب) اور مجمع البحار میں ہے اَلظِّلُّ۔ اَلْفَيْءُ الْحَاصِلُ مِنَ الْحَاجِزِ بَيْنَكَ وَبَيْنَ الشَّمْسِ مُطْلَقًا سورج اور انسان کے درمیان کسی روک کے آنے کی وجہ سے جو سایہ ہوتا ہے ظل کہلاتا ہے۔ وَمِنْهُ سَبْعَةٌ فِيْ ظِلِّ الْعَرْشِ اَيْ فِيْ ظِلِّ رَحْمَتِهٖ۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن سات شخص عرش کے سایہ تلے ہوں گے یعنی اس کی رحمت کے سایہ میں ہوں گے۔ وَجَاءَ سَبْعَةٌ فِيْ ظِلِّهٖ اَيْ فِيْ ظِلِّ اللهِ اور بعض حدیثوں میں سَبْعَةٌ فِيْ ظِلِّهٖ آیا ہے کہ وہ اللہ کے سایہ میں ہوں گے۔ کہتے ہیں هُوَ فِيْ عَيْشٍ ظَلِيْلٍ وَالْمُرَادُ ظِلُّ الْكَرَامَةِ وہ خوب مزے کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وَقَدْ يُكْنٰى مِنَ الْكَنَفِ۔ اور کبھی اس سے مراد حفاظت بھی لی جاتی ہے۔ وَفِي الْحَدِيْثِ اَلْكَافِرُ يَسْجُدُ لِغَيْرِ اللهِ وَظِلُّهٗ يَسْجُدُ لِلّٰهِ اَيْ جِسْمُهٗ۔ یعنی حدیث میں ہے کہ کافر غیر اللہ کے لئے سجدہ کرتا ہے اور اس کا سایہ یعنی جسم خدا تعالیٰ کے لئے۔ (مجمع البحار) اور مفردات راغب میں ہے اَلظِّلُّ ضِدُّ الضِّحِّ۔ ظِلّ

دھوپ کے مقابل کی چیز کو کہتے ہیں۔ وَھُوَ أَعَمُّ مِنَ الْفَيْءِ۔ اور یہ فے سے عام ہے۔ فَإِنَّهٗ يُقَالُ ظِلُّ اللَّيْلِ وَظِلُّ الْجَنَّةِ کیونکہ ظِلّ کا لفظ رات اور باغ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں ظِلُّ اللَّيْلِ اور ظِلُّ الْجَنَّةِ۔ باغ کا سایہ۔ وَيُقَالُ لِكُلِّ مَوْضِعٍ لَمْ تَصِلْ اِلَيْهِ الشَّمْسُ ظِلٌّ۔ اور وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچے اسے ظِلّ کے نام سے پکارتے ہیں۔ وَلَا يُقَالُ الْفَيْءُ اِلَّا لِمَا زَالَ عَنْهُ الشَّمْسُ۔ اور فَیْء صرف اسی کو کہتے ہیں جہاں سے دھوپ زائل ہو چکی ہو۔ وَيُعَبَّرُ بِالظِّلِّ عَنِ الْعِزَّةِ وَالْمَنَعَةِ وَعَنِ الرَّفَاهَةِ۔ اور ظلّ سے مراد عزت، غلبہ اور عیش و آرام لیا جاتا ہے۔ قَالَ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ اَىْ فِيْ عِزَّةٍ وَمَنَاعٍ۔ اور اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ کے معنے ہیں متقی عزت اور غلبہ وحفاظت میں رہیں گے۔ اَظَلَّنِيْ فُلَانٌ۔ حَرَسَنِيْ وَجَعَلَنِيْ فِيْ ظِلِّهٖ وَعِزِّهٖ وَمَنَاعَتِهٖ۔ اور اَظَلَّنِيْ فُلَانٌ کے معنے ہیں اس نے مجھے اپنے بچاؤ میں لے لیا۔ وَقَدْ يُقَالُ ظِلٌّ لِكُلِّ سَاتِرٍ۔ ہر ڈھانپنے والی چیز کو ظِلّ کہتے ہیں۔ مَحْمُوْدًا كَانَ اَوْ مَذْمُوْمًا۔ وہ چیز اچھی ہو یا بری جیسے آیت وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ۔ میں اچھی چیز کے لئے استعمال ہوا ہے اور آیت ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ میں مذموم کے لئے۔ (مفردات) جیسا کہ حل لغات سے ظاہر ہے ظِلَالٌ ظِلٌّ۔ اور ظُلَّةٌ کی جمع ہے اور ظِلّ کے ایک معنے سایہ کے ہیں۔ وہ یہاں مراد نہیں۔ پس اگر يَسْجُدُ ظِلٰلُهُمْ میں ظِلَالٌ ظِلٌّ کی جمع سمجھا جائے تو معنی ہوں گے تمام اشیاء کے وجود قانونِ الٰہی کے ماتحت ہیں۔ اور اگر ظُلَّةٌ کی جمع سمجھا جائے تو معنے ہوں گے کہ سردار۔ حکمران جوان کو آرام پہنچانے والے ہیں اور بطور سایہ کرنے والے کے ہیں۔ وہ بھی خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔

اَلْغَدَاةُ اَلْبُكْرَةُ صبح اَوْمَابَيْنَ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَطُلُوْعِ الشَّمْسِ صبح کی نماز سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک کا وقت اس کی جمع غُدُوّ ہے۔ (اقرب)

اَلْاٰصَالُ اَصِيْلٌ کی جمع ہے اور اصیل عصر سے لے کر مغرب تک کے وقت کو کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ **ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی کر رہی ہے** اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی کر رہی ہے۔ خوشی سے یا ناپسندیدگی سے۔ مومن، کافر، مشرک اور دہریہ تک سب قانون قدرت کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔ زبان چکھنے پر مجبور ہے اور کان سننے پر۔ یعنی جو آواز کان میں پڑے گی وہ اس کو سنے گا۔ جو چیز زبان پر رکھی جائے گی وہ اس کو چکھے گی۔ اس حد تک اطاعت کر رہا ہے۔ مگر پھر اس میں ایک حصہ طوعاً کا بھی شامل ہو جاتا ہے۔ مثلاً بھوک پر کھانا کھانا۔ بظاہر یہ اپنی مرضی سے کھاتا ہے۔ ایسا ہی عمدہ نظارے دیکھنا یا سیر کرنا۔ مگر دراصل یہ بھی خدا کے قانون کو ہی پورا کرتا ہے۔ گویا قانون قدرت میں بھی ایک حصہ کی

اطاعت طوعاً ہے اور دوسرے حصہ کی کرھاً۔ مقصد یہ کہ گو بظاہر انسان آزاد نظر آتا ہے لیکن غور سے دیکھنے پر اس کے ہر فعل میں ایک جبر بھی نظر آتا ہے جو کسی بالا ہستی کے دخل پر دلالت کرتا ہے۔

دوسرے اس آیت میں تصرفات الٰہیہ کا طریق بتلایا ہے کہ بعض تصرفات اللہ تعالیٰ رسول کریم صلعم کی مدد کے لئے ایسے کرے گا کہ کفار اس میں اپنے آپ کو مجبور سمجھیں گے اور دل میں کڑھیں گے اور بعض تصرفات ایسے کرے گا کہ کفار خیال کریں گے کہ ہم ان کاموں میں اپنا فائدہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کا جو نتیجہ پیدا ہوگا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پیدا ہوگا۔ طوعاً کی مثال صلح حدیبیہ ہے کہ اس کی شرائط کفار نے زور سے منوائیں اور یہ سمجھ کر منوائیں کہ ان میں ہمارا فائدہ ہے مگر دراصل ان میں تھا مسلمانوں کا فائدہ۔ جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ سے اخراج کہ پہلے انہوں نے سمجھا اس طرح ہم نے مسلمانوں کو اپنے مرکز سے نکال دیا۔ لیکن اس سے اسلام کی آزادی اور ترقی کی بنیاد رکھی گئی۔ کرہاً کی مثال فتح مکہ ہے کہ مجبوراً آنحضرت صلعم کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ دوسری مثال اس کی ایسے صحابہ سے حسن سلوک تھا جن کے خاندانوں اور قبائل سے وہ ڈرتے تھے۔

طوعاً و کرہاً کا مطلب پھر طوعاً و کرہاً کا فرق نیک و بد جماعت کے لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی مومن خدا کی اطاعت طوعاً کرتے ہیں اور کافر کرہاً۔

ظل کے مختلف معانی وَظِلٰلُهُمْ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ظِلَالٌ۔ ظِلٌّ کی بھی جمع ہے اور ظُلَّةٌ کی بھی۔ ظِلّ کے ایک معنے سایہ کے ہیں۔ سایہ چونکہ عدم نور کے معنی رکھتا ہے۔ اس جگہ وہ مراد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ غیر موجود چیز کے لئے سجدہ کا لفظ نہیں آسکتا۔ ظِلّ کے دوسرے معنے کسی چیز کے وجود اور شخص کے بھی ہوتے ہیں۔

(۱) تمام اشیاء کے وجود قانون الٰہی کے ماتحت ہیں ان معنوں کے رو سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ دلی اور قلبی سجدہ کے علاوہ تمام اشیاء کے وجود قانونِ الٰہی کے ماتحت ہیں۔ حتیٰ کہ کافر کا جسم بھی خدا تعالیٰ کے قانون کے ماتحت ہوتا ہے اور اس طرح گو اس کا ذہن اور ایمان خدا تعالیٰ کا منکر ہوتا ہے مگر اس کا جسم خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگا ہوا ہوتا ہے۔ مجازاً ظل توابع کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں۔ سُلْطَانٌ ظِلُّ اللّٰهِ بادشاہ اللہ کا سایہ ہے۔ یعنی اس کے ماتحت۔

(۲) تمام ذَوِی الارواح اور ان کے تابع وجود اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں

پس اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ تمام ذی روح اور ان کے تابع وجود اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔ ظُلَّةٌ جو اس لفظ کا دوسرا مفرد ہے اس کے معنی سایہ کرنے والے کے ہیں۔ جیسے سائبان وغیرہ۔ یا مجازاً سردار

اور حکمران۔ اور معنے یہ ہوں گے کہ ان کے بڑے یا ان کو آرام پہنچانے والے وجود بھی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔

(۳) تمام موجودات اور ان کے تابع اور حکمران اللہ کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں

بہترین معنے یہ ہیں کہ دونو معنے اس جگہ مراد ہیں۔ ظِلٌّ والے بھی اور ظُلَّۃٌ والے بھی اور معنے یہ ہیں کہ تمام موجودات اور ان کے تابع اور ان کے حکمران سب کے سب اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔ پس ان لوگوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے کہ اگر محمد رسول اللہ صلعم کی مخالفت انہوں نے ترک نہ کی تو جو ان سے اوپر کے وجود اور طاقتیں ہیں وہ بھی ان کی مخالف ہو جائیں گی اور جو ان کے تابع ہیں وہ بھی ان کے مخالف ہو جائیں گے۔ ان معنوں کی تصدیق اسی سورۃ کی ایک دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتا ہے اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (الرعد:۴۲) یعنے کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم ان کی حکومت کو دونوں طرف سے کم کرتے چلے آتے ہیں۔ یعنے بڑے خاندانوں میں سے بھی اور مزدور لوگوں میں سے بھی اور روز بروز کچھ لوگ مل کر محمد رسول اللہ صلعم کے ساتھ ملتے جاتے ہیں۔ آخر اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ یہ آئمۃ الکفر اکیلے رہ جائیں گے اور سب کا سب ملک محمد رسول اللہ صلعم کے ساتھ ہو جائے گا۔

بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ۔ یہ اس لئے فرمایا کہ ایک تو ان وقتوں میں سایہ لمبا ہوتا ہے اور دوسرے سایہ کا کامل ظہور سورج کے ادھر ادھر ہونے سے ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح تابع کی طاقت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب آقا پاس نہیں ہوتا اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جبکہ حکومت وسیع پھیلی ہوئی ہو۔ پس بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ کہہ کر بتایا کہ خواہ تمہاری حکومت کتنی بھی وسیع کیوں نہ ہو تب بھی خدا تعالیٰ کے ماتحت ہو۔ اور ایسا ہی یہ بتایا کہ خواہ تم خود محمد رسول اللہ کے مقابلہ پر آ ؤ یا جب تم اپنے نوکروں یا غلاموں کو بھیجو دونوں صورتوں میں ہم تمہاری تدبیروں کو توڑ ڈالیں گے۔ یعنی نہ تم کچھ کر سکتے ہو اور نہ تمہارے سامان وتدابیر۔

لطیفہ۔ اس جگہ ظل کا ذکر کیا ہے اور جیسا کہ میں نے لغت کی رو سے ذکر کیا ہے ظل کے لئے اصل کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر سورج نہ ہو تو کوئی ظل ہی نہیں۔

ظلّی نبوت خاتم النبیین کی نبوت کو توڑ نہیں دیتی پس یہ کہنا کہ ظلّی نبوت خاتم النبیین کی نبوت کو توڑ دیتی ہے بالکل غلط ہے۔ ظلی نبوت تو اصل کے وجود کو ثابت اور روشن کرتی ہے نہ کہ منسوخ۔ وہ اس کے لئے ایک زبردست شہادت ہے نہ کہ اس کے منافی۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ

تو (ان سے) کہہ (کہ بتاؤ) آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے (اس کا جواب وہ تو کیا دیں گے) تو (خود ہی) کہہ

اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ

دے (کہ) اللہ (اور پھر) تو (ان سے) کہہ (کہ) کیا پھر (بھی) تم نے اس کے سواء اور (اور اپنے) مددگار بنا

نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ۬

رکھے ہیں ۔ جو (خود) اپنے لئے (بھی) کسی نفع (کو حاصل کرنے) کی قدرت نہیں رکھتے اور نہ کسی نقصان (کو

اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ۚ۬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ

روکنے) کی (اور ان سے) کہہ (کہ) کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر (ہوسکتا) ہے یا کیا تاریکی[1] اور روشنی برابر (ہوسکتی)

خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ

ہے یا کیا انہوں نے اللہ کے ایسے شریک تجویز کئے ہیں جنہوں نے اس کی مخلوق کی طرح (کچھ) پیدا کیا ہے ۔ کہ

كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۷﴾

(جس کی وجہ سے اس کی اور دوسروں کی) مخلوق ان کے لئے مشتبہ ہوگئی ہے؟ تو (ان سے) کہہ (کہ) اللہ (ہی) ہر ایک چیز کا خالق ہے اور وہ کامل (طور پر) یکتا (اور ہر ایک چیز پر) کامل اقتدار رکھنے والا ہے ۔

حلّ لُغات ۔ رَبّ کی تشریح کے لئے دیکھو الرعد آیت نمبر ۲ جلد ھذا ۔

اَوْلِيَآءَ وَلِيٌّ کی جمع ہے اور اَلْوَلِيُّ کے معنے ہیں اَلْمُحِبُّ ۔ اَلصَّدِيْقُ ۔ دوست ۔ اَلنَّصِيْرُ ۔ مددگار ۔ (اقرب)

يَمْلِكُوْنَ مَلَكَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور مَلَكَ کے معنے ہیں اِحْتَوَاهُ قَادِرًا عَلَى الْاِسْتِبْدَادِبِهٖ کسی چیز پر قادرانہ طور پر قبضہ کیا ۔ مَلَكَ عَلَى الْقَوْمِ ۔ اِسْتَوْلٰى عَلَيْهِمْ ۔ کسی قوم پر غالب ہوا ۔ عَلٰى فُلَانٍ اَمْرَهٗ ۔ اِسْتَوْلٰى عَلَيْهِ کسی کے کام کا متولّی ہوا ۔ اَلْخِشْفُ اُمَّهٗ قَوِيَ وَقَدَرَ اَنْ يَّتْبَعَهَا ۔ ہرن کا بچہ توانا و مضبوط ہو کر اس قابل ہو گیا

[1] ظلمات کا لفظ جمع ہے لیکن اردو میں ترجمہ مفرد کیا گیا ہے ۔

کہ وہ اپنی ماں کے پیچھے چل سکے۔(اقرب) پس لَا یَمْلِکُوْنَ کے معنے ہوں گے وہ قادر نہیں ہو سکتے۔ وہ طاقت نہیں رکھ سکتے۔

اَلْوَاحِدُ بِمَعْنَی الْاَحَدِ اَیِ الْمُنْفَرِدُ الَّذِیْ لَا نَظِیْرَ لَہٗ اَوْلَیْسَ مَعَہٗ غَیْرُہٗ۔ ایسا یکتا کہ جس کا کوئی نظیر نہ ہو یا اس کا کوئی شریک نہ ہو۔ اور انہی معنوں میں یہ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوا ہے۔(اقرب)

قَھَّارٌ قَھَرَہٗ۔ قَھْرًا۔ غَلَبَہٗ۔ قَھَرَ کے معنے ہیں۔کسی پر غالب آیا۔(اقرب) اور اَلْقَھَّارُ مبالغہ کا صیغہ ہے اس کے معنے ہوں گے۔ بہت غالب۔

تفسیر۔ جتنے لوگوں کو دنیا نے خدا بنایا ان کی زندگی دکھ میں گزری یہ عجیب خدا کی قدرت ہے کہ جتنے لوگوں کو دنیا نے خدا بنایا ان کی زندگی دکھ اور تکلیف میں ہی گزری ہے۔ حضرت مسیح کو ملک چھوڑنا پڑا اور مختلف تکالیف کا سامنا ہوا۔ حضرت حسینؓ تو شہید ہی کر دیئے گئے۔ رام چندر جی بھی مصائب میں مبتلا رہے۔ لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ میں بتایا ہے کہ جب وہ اپنی جانوں کی بھی حفاظت نہ کر سکے تو تم کو کیا نفع پہنچائیں گے۔ ھَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَ الْبَصِیْرُ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں۔ یعنی تم لوگوں کو اپنی کثرت پر ناز ہے مگر یہ تو سوچو کہ کیا ہمیشہ کثرت مفید ہوا کرتی ہے۔ بہت سے اندھوں کا اجتماع قوت کا موجب ہوتا ہے یا ضعف کا۔ ایک آنکھوں والا ہزاروں اندھوں پر غالب ہوتا ہے۔ ایسا ہی اس نبی اور اس کے متبعین کو خدا سے علم ملتا ہے اور تمہارے منصوبوں اور تدبیروں سے خدائی وحی اسے آگاہ کر دیتی ہے۔ پس اس کی مثال بینا کی ہے مگر تمہیں کچھ پتہ نہیں کہ اس کی طرف سے کیا کیا تدابیر کی جا رہی ہیں۔ کیونکہ اس کی تائید میں اکثر کوششیں خدا تعالیٰ کی طرف سے قانونِ قدرت کے مخفی اثرات کے ذریعہ سے ہو رہی ہیں۔ جن سے تم بالکل ناواقف ہو۔ پھر سوچو تو سہی کہ تم اس کا اور اس کے ساتھیوں کا مقابلہ کیونکر کر سکتے ہو؟ یہ تھوڑے ہیں تو کیا ہوا ہیں تو آنکھوں والے۔

ھَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ۔ اسی طرح فرمایا ظلمات اور نور کا بھی کوئی مقابلہ نہیں۔ تھوڑی سی روشنی سارے کمرے کا اندھیرا پاش پاش کر دیتی ہے۔ ظلمات عدم نور کا نام ہے اور نور وجود کا۔ اور وجود کے سامنے عدم کی حیثیت ہی کیا ہے۔ یعنی تمہارے پاس الٰہی تعلیم نہیں۔ اس کے پاس ہے۔ پس تمہارا اور اس کا کیا مقابلہ۔ اس کی تعلیم کی بنیاد تو حقائق پر ہے اور تمہاری تعلیم کی بنیاد صرف جہالت اور انکار پر۔

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ خَلَقُوْا کَخَلْقِہٖ فَتَشَابَہَ الْخَلْقُ عَلَیْھِمْ۔ یہ بات مشرکین کے سامنے بطور اعتراض پیش کی گئی ہے یعنی تم باوجود مشرک ہونے کے بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ معبودانِ باطلہ نے کوئی خلق کی ہے اور وہ خدا کی خلق سے مشابہ ہے۔ چنانچہ مکہ کے مشرکین اس بات کی جرأت نہ کر سکے۔ گو بعض اور ممالک کے مشرک اپنے

معبودوں کے متعلق ایسے دعاوی بھی پیش کرتے ہیں۔ افسوس مسلمانوں نے بھی اس زمانہ میں ایسی بات کہنی شروع کر دی ہے اور حضرت مسیح کو پرندوں کا خالق قرار دے دیا ہے اور بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اب پتہ نہیں لگ سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے پرندے کون سے ہیں اور حضرت مسیح کے بنائے ہوئے کون سے؟

حضرت مسیح موعودؑ کا ایک مولوی سے حضرت مسیحؑ کے پرندے پیدا کرنے کے متعلق سوال

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ایک مولوی سے پوچھا کہ تم جو دعویٰ کرتے ہو کہ حضرت مسیحؑ ناصری پرندے پیدا کیا کرتے تھے آخر انہوں نے کیا چیز پیدا کی تھی۔ تو اس نے جواب دیا کہ چمگادڑ۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ مسیح کی چمگادڑیں کون سی ہیں اور خدا کی بنائی ہوئی چمگادڑیں کون سی ہیں تو ان مولوی صاحب نے فرمایا اب پتہ نہیں چلتا اور پنجابی میں کہا کہ ’’اوہن رل مل گیاں نے‘‘ یعنی اب تو وہ خدا تعالیٰ کی بنائی ہوئی چمگادڑوں سے مل جل گئی ہیں (تحفہ گولڑویہ روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۲۰۶)۔

افسوس کہ جس بات کی جرأت مکہ کے مشرکوں کو نہ ہوئی وہ کام مسلمانوں نے کس دلیری سے کیا۔ اور نہ سوچا کہ اس بے دلیل دعویٰ کو کون تسلیم کرے گا؟

واحد اور احد میں فرق اَلْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ کی وحدانیت کو ظاہر کرنے کے لئے دو نام آتے ہیں۔ ایک واحد۔ دوسرا احد۔ احد نام تنزیہی ہے اور اس کے معنے ہیں اکیلا۔ اس کے ذکر پر دو یا تین کا خیال تک بھی ذہن میں نہیں آتا۔ یہ فردیت پر دلالت کرتا ہے اور کسی دوسرے یا تیسرے وجود کا خیال ذہن میں نہیں آتا۔ لیکن واحد کا لفظ جس کے معنے پہلے کے ہیں یہ نام ابتدائی نقطہ پر دلالت کرتا ہے کیونکہ وہ دوسرے تیسرے کے وجود کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس سے یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ منبع ہے ساری مخلوق کا۔ باوجودیکہ کوئی مخلوق کمالات میں اس کی مشابہ نہیں۔ اور اس کی ذات تمام دنیا سے مستغنی ہے پھر بھی ہر چیز اس کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ جس طرح دوسرے اور تیسرے کا وجود لازمی طور پر پہلے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ کی دلیل کے طور پر صفت واحد کو پیش کیا ہے یعنی اگر تم اس کو خالق نہ مانو گے تو وہ واحد نہیں رہتا۔ پھر تو بعض اشیاء اس پر دلالت کرنے کی بجائے کسی اور منبع کی طرف اشارہ کریں گی۔ پس اگر کوئی دوسرا خالق مانو گے تو اس کی وحدانیت سے انکار کرنا پڑے گا اور اگر اسے واحد نہ مانو گے تو اس امر کا اظہار کرنا پڑے گا کہ اس کے سوا کوئی اور بھی خالق ہے۔

اَلْقَهَّارُ میں یہ بتایا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز پیدا ہو کر پھر پیدا کرنے والے کے قبضہ سے نکل جائے اور اس کے لئے قبضہ میں رکھنے کے لئے کسی اور مددگار کی ضرورت ہو مگر اس جگہ یہ بات بھی نہیں۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے

قبضہ میں ہے اور اسی کی محتاج ہے۔ پس سب معبودانِ باطلہ بھی اس کے ماتحت ہیں۔ اور کوئی بھی ان میں سے خالق نہیں اور ان کی عبادت کرنا فضول، عبث اور بے دلیل ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ

اس نے آسمان سے کچھ پانی اتارا پھر (اس سے) کئی وادیاں اپنی (اپنی) مقدار کے مطابق بہ نکلیں

السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ

اور اس سیلاب نے اوپر آجانی والی جھاگ کو اٹھالیا اور جس (دھات) کو وہ کسی زیور یا کسی (اور) سامان کی طلب

ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ

میں آگ میں تپاتے ہیں اس میں (بھی) اس جیسا ایک جھاگ (ہوتا) ہے اسی طرح اللہ

اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ؕ۬ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ

حق اور باطل (کے فرق) کو بیان کرتا ہے پھر جھاگ تو پھینکا جا کر تباہ ہو جاتا ہے اور

اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ

جو چیز لوگوں کو نفع دینے والی ہوتی ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے۔

يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ ﴿۱۸﴾

اللہ (تعالیٰ) تمام باتوں کو اسی طرح (کھول کر) بیان کرتا ہے۔

حلّ لُغات۔ اَوْدِيَةٌ وَادٍ کی جمع ہے اور وَادِی وَدَی سے مشتق ہے۔ وَدَی الشَّیْءُ وَدْيًا کے معنے ہیں سَالَ۔ بہہ پڑی۔ اور اَلْوَادِیْ اس سے اسم فاعل ہے یعنی بہنے والی۔ نیز اَلْوَادِی کے معنے ہیں مُنْفَرَجٌ بَيْنَ جِبَالٍ اَوْ تِلَالٍ اَوْ آكَامٍ يَكُوْنُ مَنْفَذًا لِلسَّيْلِ۔ کہ وادی پہاڑوں یا ٹیلوں کی درمیانی جگہ کو کہتے ہیں۔ جس میں سیلاب کا پانی بہتا ہے۔ وَفِيْ مُفْرَدَاتِ الرَّاغِبِ "اَلْوَادِیْ اَلْمَوْضِعُ الَّذِیْ يَسِيْلُ فِيْهِ الْمَآءُ وَمِنْهُ سُمِّيَ

اَلْمَفْرَجُ بَیْنَ الْجَبَلَیْنِ وَادِیًا''۔ اور مفردات راغب میں ہے کہ وادی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بہتا ہو اور اسی وجہ سے پہاڑوں کی درمیانی فراخ جگہ کو وادی کہتے ہیں۔(اقرب)

اَلسَّیْلُ اَلْمَاءُ الْکَثِیْرُ۔ بہت پانی۔ وَالْعَرَبُ تَقُوْلُ ''سَالَ بِھِمُ السَّیْلُ وَجَاشَ بِنَا الْبَحْرُ'' اَیْ وَقَعُوْا فِیْ اَمْرٍ شَدِیْدٍ وَنَحْنُ فِیْ اَشَدِّ مِنْہُ۔ اور عرب سَالَ بِھِمُ السَّیْلُ وَجَاشَ بِنَا الْبَحْرُ کا محاورہ بولتے ہیں جس کے معنے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو کثرت پانی نے بہایا۔ اور ہم پر سمندر نے جوش مارا۔ اور مطلب ان کا یہ ہوتا ہے کہ پہلے لوگ بھی مصیبت میں مبتلا ہوئے لیکن ہم اُن سے بڑھ کر مصائب میں مبتلا ہوئے۔ اس محاورہ میں السَّیْلُ کا لفظ مصیبت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔(اقرب)

اَلزَّبَدُ مَا یَعْلُو الْمَآءَ وَغَیْرَہٗ مِنَ الرَّغْوَۃِ۔ جھاگ۔ اَلْخَبَثُ۔ بری چیز۔ وَقَوْلُ الْحَرِیْرِیِّ ثُمَّ اَقْبَلْنَا عَلَی الْحَدِیْثِ نَمْخَضُ زُبَدَہٗ وَنُلْقِیْ زَبَدَہٗ کَنّٰی بِالزُّبَدِ وَھِیَ جَمْعُ زُبْدَۃٍ عَنْ خِیَارِ الْکَلَامِ وَبِالزَّبَدِ عَمَّا لَاخَیْرَ فِیْہِ۔ اور حریری نے اپنے اس قول میں زُبد اور زَبد کا استعمال کیا ہے۔ زُبد سے مراد اعلیٰ درجہ کا کلام ہے اور زَبد کے معنے ہیں وہ کلام جس میں کوئی خوبی نہ ہو۔(اقرب)

رَابِیًا رَبَا یَرْبُوْ۔ اَلْمَالُ۔ زَادَ وَنَمَا۔ مال زیادہ ہوا اور بڑھا۔ فُلَانٌ الرَّابِیَۃَ۔ عَلَاھَا۔ ٹیلے پر چڑھا۔ اَلْفَرَسُ رَبْوًا۔ اِنْتَفَخَ مِنْ عَدْوٍ اَوْ فَزَعٍ وَاَخَذَہُ الرَّبْوُ۔ گھوڑے کو دوڑ کی وجہ سے سانس چڑھ گیا۔ فُلَانٌ السَّوِیْقَ۔ صَبَّ عَلَیْہِ الْمَآءَ فَانْتَفَخَ۔ ستوؤں کو پانی میں بھگویا تو وہ پھول گئے۔ فِیْ حِجْرِہٖ۔ رَبْوًا وَرُبُوًّا۔ نَشَأَ۔ فلاں کی گود میں پلا۔ وَکَلَّمْتُہٗ فَمَا رَبَا بِرَأْسِہٖ۔ اَیْ لَمْ یَعْبَأْ بِیْ۔ میں نے اس سے بات کی لیکن اس نے توجہ نہ کی۔ اَلرَّابِیَۃُ مَا ارْتَفَعَ مِنَ الْاَرْضِ۔ ٹیلہ اَخْذَۃً رَّابِیَۃً۔ شَدِیْدَۃً۔ سختی سے پکڑنا۔(اقرب) پس زَبَدًا رَّابِیًا کے معنے ہوں گے اوپر آنے والی جھاگ۔ (۲) پھولنے والی جھاگ۔ (۳) ناقابل توجہ جھاگ یعنی حقیر۔

جُفَاءً مَانَفَاہُ السَّیْلُ اِذَا رَمٰی بِہٖ ۔ جس کو سیلاب پھینک دیتا ہے۔ قَالَ ابْنُ السِّکِّیْتِ۔ وَذَھَبَ الزَّبَدُ جُفَاءً اَیْ مَدْفُوْعًا عَنْ مَائِہٖ۔ اور ابن سکیت نے ذَھَبَ الزَّبَدُ جُفَاءً میں جُفَاءً کے معنے کئے ہیں پانی سے ہٹائی ہوئی۔ دور کی ہوئی۔ پھینکی ہوئی۔ اَلْبَاطِلُ تَشْبِیْھًا لَہٗ بِزَبَدِ الْقِدْرِ الَّذِیْ لَایُنْتَفَعُ بِہٖ۔ باطل بے حقیقت۔ بے فائدہ۔ چونکہ ہنڈیا کی جھاگ بھی بے فائدہ جاتی ہے اس لئے باطل کو اس پر قیاس کر لیا کیونکہ وہ بھی بے فائدہ ہے اس لئے جفاء کا لفظ اس کے لئے استعمال کر لیا۔(اقرب)

تفسیر۔ اس جگہ اس مضمون کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ کہ پانی جب آسمان سے اترتا

ہے اور مختلف راستوں سے بہہ پڑتا ہے تو اس وقت ان گلیوں میں جو پہلے بظاہر صاف معلوم ہوتی تھیں پانی کے گزرتے وقت اس قدر جھاگ پیدا ہوتی اور میل اٹھتی ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے اور شروع شروع میں تو جھاگ کی اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا جھاگ ہی جھاگ ہے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ سمٹ کر صرف کناروں پر تھوڑی تھوڑی رہ جاتی ہے اور پانی کا غلبہ ظاہر ہو جاتا ہے۔

دوسری مثال یہ دی کہ زیور بنانے کے لئے یا برتن وغیرہ بنانے کے لئے معدنیات کو پگھلایا جاتا ہے تو ان کے اوپر بھی ایسی ہی جھاگ آجاتی ہے مگر سنار یا ٹھٹھیرا اس کو صاف کر لیتا ہے اور نیچے سونا یا دوسری کارآمد اشیاء ہی رہ جاتی ہیں۔

حق کی مثال پانی سے اور باطل کی مثال جھاگ سے دی ہے اس جگہ پر حق کی مثال پانی سے اور باطل کی مثال جھاگ سے دی ہے جو حق پر غالب نظر آتی ہے۔ یعنی ابتداءً لوگ باطل کی کثرت اور غلبہ کو دیکھ کر خیال کرتے ہیں کہ اسی کا زور دنیا میں ہے مگر انجام کار جھاگ مٹ جاتی ہے اور اصل پانی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

حق کی مثال سونے سے یا دوسری معدنیات سے اسی طرح حق کی مثال سونے یا دوسری معدنیات سے دی ہے کہ جن کو پگھلانے پر کچھ میل نکلتی ہے لیکن اس میل کو پھینک دیا جاتا ہے اور صرف معدن کو الگ نکال کر رکھ لیا جاتا ہے۔ کفار کو بتایا کہ بے شک تم اس وقت جھاگ کی طرح اٹھ رہے ہو اور غالب نظر آتے ہو اور اسلام کا سونا تمہارے نیچے دبا ہوا نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے مگر جب ہماری نصرت کی ہوائیں چلیں گی تو جھاگ ہی کی طرح بیٹھ جاؤ گے۔ اور حق کا غلبہ نظر آئے گا اور صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی باقی رہ جائے گی۔ یا اس کا یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ فطرت انسانی کو تو اللہ تعالیٰ نے پاک بنایا ہے لیکن اس میں رسم ورواج کا گند مل کر اسے خراب کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کے ذریعہ سے پھر فطرت کے پاک تقاضوں کو جگا دیتا ہے اور طبائع میں ایک ایسا جوش پیدا کر دیتا ہے کہ جس طرح تیز بھٹی یا بڑھتے ہوئے سیلاب میں ہوتا ہے اس ہیجان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبائع کا جمود جاتا رہتا ہے۔ ایک طرف فطرت میں بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف رسوم وعادات کی محبت میں جوش آتا ہے اس حرکت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے فطرت صحیحہ اور رسوم وعادات کے ایک ملے جلے ڈلے کے یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور انسان کچھ عرصہ کے لئے دو متضاد جذبات کا حامل ہو جاتا ہے۔ آخر جس کی فطرت زیادہ پاک ہوتی ہے وہ رسوم وعادات کی میل کو باہر نکال کر پھینک دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور جو سچی کوشش نہیں کرتا اس کی طبیعت پھر ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور پھر رسوم وعادات کی جھاگ فطرت کے سونے سے مل کر پہلے کی طرح

ایک ناصاف ڈلا بن کر رہ جاتی ہے۔

تعلیم انسانی ظرف کے مطابق ہوتی ہے بِقَدَرِهَا کے الفاظ سے یہ بتایا کہ اشاعت تعلیم انسانی ظرف کے مطابق ہوتی ہے۔ جس کا قلب وسیع اور سلیم ہوگا وہ زیادہ حصہ لے گا۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ قرآن کریم بدی اور نیکی کو ممتاز کر کے دکھا دے گا اور جب دونوں کا فرق لوگوں پر روشن ہو جائے گا تو اچھے لوگ خود ہی بدی کو پرے اٹھا کر پھینک دیں گے اور نیکی کو اختیار کر لیں گے۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؕ وَ الَّذِيْنَ لَمْ

اور جنہوں نے اپنے رب کا کہا مانا ان کے لئے کامیابی (مقدر) ہے۔ اور جنہوں نے

يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ

اس کا کہا نہیں مانا (ان کی یہ حالت ہوگی کہ) اگر جو کچھ بھی زمین میں ہے (سب) ان کے لئے ہوتا اور اس کے برابر

مَعَهٗ لَا فْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ۬

اور بھی تو وہ اسے دے کر (اپنے آپ کو) چھڑا لیتے۔ ان کے لئے بہت ہی برا عذاب (مقدر) ہے

النصف ع ۲ ۸ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ۱۹ ع

اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

حلّ لُغات۔ اِسْتَجَابُوْا اِسْتَجَابَ سے مضارع ہے اور اِسْتَجَابَ لَهٗ وَمِنْهُ کے معنے ہیں قَبِلَ دُعَاءَهٗ اس کی دعا قبول کی۔ (اقرب) پس اِسْتَجَابُوْا کے معنے ہوں گے بات قبول کی۔ کہا مانا۔

اَلْحُسْنٰى ضِدُّ السُّوْأٰى۔ حُسْنٰى۔ سُوْءٰى۔ یعنی برائی کے مقابل کا لفظ ہے اور اس کے معنے ہیں اَلْعَاقِبَةُ الْحَسَنَةُ۔ اچھا انجام۔ اَلظَّفَرُ کامیابی۔ (اقرب)

اِفْتَدَوْا اِفْتَدٰى سے ہے اور اِفْتَدٰى کے معنے ہیں اِسْتَنْقَذَهٗ بِمَالٍ وَقِيْلَ اَعْطٰى شَيْئًا فَاَنْقَذَهٗ۔ مال یا کچھ اور بدلہ میں دے کر چھڑا لیا۔ اَلْمَرْأَةُ نَفْسَهَا مِنْ زَوْجِهَا اَعْطَتْهُ مَالًا حَتّٰى تَخَلَّصَتْ مِنْهُ بِالطَّلَاقِ۔ عورت نے خاوند کو مال دے کر خلاصی حاصل کی اور طلاق لی۔ (اقرب) پس اِفْتَدَوْا کے معنے ہوں گے انہوں نے

فدیۃً کچھ دے کر اپنے نفوس کو چھڑانے کی کوشش کی۔

جَهَنَّم دَارُ الْعِقَاب کا نام ہے۔ یہ ممنوع من الصرف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ عجمی ہے۔ بعض اسے اصل میں فارسی یا عبرانی قرار دیتے ہیں لیکن یہ درست نہیں کہ عربی کے الفاظ کو غیر زبانوں کی طرف منسوب کیا جائے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ لفظ ایسے قاعدہ سے بنایا گیا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس وجہ سے اس کو انہوں نے غیر زبان کا قرار دے دیا۔ عربی میں جَهَنَ جُهُوْنًا کے معنے قَرُبَ وَدَنَا کے ہوتے ہیں اور اس سے جهنم بنا ہے یا یہ لفظ جَهَمَ سے بنا ہے۔ عربی زبان میں زِيَادَةُ نُونٍ فِيْ وَسْطِ الْكَلِمَةِ کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ پس جَهَمَ سے جَهَنَّم کا بننا خلاف قواعد نہیں اور جَهَمَ کے معنے ہیں اِسْتَقْبَلَهٗ بِوَجْهٍ مُكْفَهِرٍّ۔ کہ اس کو تیوری چڑھا کر .... ملا اور تَجَهَّمَهٗ کے معنے ہیں اِسْتَقْبَلَهٗ بِوَجْهٍ كَرِيْهٍ برے چہرے سے ملا۔ (اقرب) پس جَهَنَّمَ کے معنے ہوئے ایک ناپسندیدہ جگہ جو ناراضگی سے لینے کو بڑھتی ہے۔ یہ نام اُس کے شعلے مارنے کی وجہ سے رکھا گیا۔

اَلْمِهَادُ اَلْفِرَاشُ۔ بچھونا۔ اَلْاَرْضُ۔ زمین۔ اس کی جمع اَمْهِدَةٌ ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرمایا جو لوگ اپنے رب کی باتوں کو قبول کریں گے ان کے لئے حُسنٰی ہوگی یعنی ان کا انجام نیک ہوگا۔ وہ دیدار الٰہی کریں گے۔ انہیں کامیابی حاصل ہوگی۔ اور ان کی عقلوں میں روشنی پیدا کر دی جائے گی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بات کو نہ مانیں گے قرآن مجید کی اطاعت نہ کریں گے ان کی حالتیں گرتی ہی چلی جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ ایسی مشکلات میں مبتلا ہو جائیں گے کہ اگر وہ زمین اور اس کی چیزیں اور اس کی مانند اور چیزیں فدیہ میں دے سکتے تو ضرور دے دیتے۔ ان سے جو محاسبہ کیا جائے گا وہ ان کے لئے سخت تکلیف دہ ہوگا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ بہت بری اور تکلیفوں کی جگہ ہے۔

سُوْٓءُ الْحِسَابِ کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے حساب میں خرابی کی جائے گی بلکہ یہ مطلب ہے کہ ان کے اعمال کے نتائج خراب نکلیں گے اور وہ ان طاقتوں کا حساب نہیں پیش کر سکیں گے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں ترقی کے لئے دیں۔ مگر انہوں نے غلط استعمال سے ضائع کر دیں۔

بِئْسَ الْمِهَادُ۔ میں بتایا کہ اگرچہ جہنم شفاخانہ ہے اور وہاں حصول صحت کی خاطر رکھا جائے گا مگر تاہم وہ تکلیف کا مقام ہے۔ خلاصہ یہ کہ مومن ترقی کرتے جائیں گے اور کافر گرتے جائیں گے اس لئے اے منکرو! تم کب تک نتائج کو دیکھ کر آنکھیں بند کئے رہو گے۔ کب تک اس نبی کو نہ مانو گے؟ ایک دن دو دن جنبہ داری کر لو گے

قوم پروری کرلو گے مگر آخر ایک نہ ایک دن حق قبول کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ

جو شخص جانتا ہے کہ جو (کلام) تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے وہ بالکل حق ہے۔کیا وہ اس

اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۙ﴿۲۰﴾

شخص جیسا (ہوسکتا) ہے جو اندھا ہے۔عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔

حلّ لُغات۔ يَتَذَكَّرُ تَذَكَّرَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور تَذَكَّرَ کے معنے ہیں ذَكَرَ الشَّيْءَ وَحَفِظَهٗ فِيْ ذِهْنِهٖ۔ کسی چیز کو ذہن میں محفوظ کیا یعنی یاد کیا۔ مَا كَانَ قَدْ نَسِيَ نَطَقَ بِهٖ بھولی ہوئی بات کو بیان کیا۔ اللّٰهَ: مَجَّدَهٗ وَسَبَّحَهٗ۔ اللہ کی بزرگی بیان کی اور اس کی تسبیح کی۔(اقرب)

اَلْاَلْبَابُ اَلْاَلْبَابُ لُبٌّ کی جمع ہے اس کے معنی عقل کے ہیں۔مزید تشریح کے لئے دیکھیں یوسف آیت نمبر ۱۱۲۔

پس اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ کے معنے ہوں گے کہ صرف عقل والے بات کو سمجھتے ہیں یا عقل والے بات کو یاد رکھتے ہیں یا عقل والے اگر غلطی کر جائیں تو پھر احکام الٰہی کو یاد کر کے سنبھل جاتے ہیں۔

اَلْاَلْبَابُ اَللُّبُّ خَالِصُ كُلِّ شَيْءٍ۔ لبّ ہر چیز کے خالص حصہ کو کہتے ہیں۔ وَالْعَقْلُ۔ عقل۔ اَوِ الْخَالِصُ مِنَ الشَّوَائِبِ اَوْ مَازَكٰى مِنَ الْعَقْلِ۔ایسی عقل جو تعصب ضد وغیرہ کی ملاوٹوں سے خالص ہو یا اعلیٰ پایہ کی ہو۔فَكُلُّ لُبٍّ عَقْلٌ وَلَا عَكْسَ پس جب لُبّ کا لفظ بولیں تو اس کے معنے عقل کے کر سکتے ہیں لیکن ہمیشہ عقل کے لفظ پر لُبّ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ وَمَعْنَاهَا الْقَلْبُ لُبّ کے ایک معنی دل کے بھی ہیں۔اس کی جمع اَلْبَابٌ۔ اَلُبٌّ اور اَلْبُبٌ آتی ہے۔(اقرب) اُولُو الْاَلْبَابِ کے معنے یہ ہوں گے کہ ایسی عقل والے لوگ جو اسے ضد و تعصب وغیرہ سے علیحدہ رکھتے ہیں اور بات کو جلدی سمجھ جاتے ہیں۔

تفسیر۔ اس تعلیم کے ذریعہ سے ہر قسم کی ترقیات ملیں گی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہ تعلیم اس قسم کی ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی ترقیات انسانوں کو ملیں گی۔پس جو شخص اس کو سمجھ لیتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے کیا وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو اندھا ہے۔

جب دو چیزوں میں مقابلہ کیا جائے تو ہمیشہ یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جو چیز پہلے مذکور ہو اس کو دوسری پر قیاس کیا جاتا ہے۔ اگر پہلی اچھی ہو تو مراد یہ ہے کہ کیا یہ شئے بری شئے کی طرح مضر ہوسکتی ہے اور اگر پہلے بری مذکور ہو تو یہ مراد ہوتی ہے کہ کیا یہ بری شئے اچھی چیز کی طرح فوائد پیدا کرسکتی ہے۔ مثلاً اگر یہ کہیں کہ کیا اندھا آنکھوں والے کے برابر ہوسکتا ہے تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ آرام اور فوائد جو آنکھوں والے کو حاصل ہیں وہ اندھے کو نہیں حاصل ہوسکتے اور اگر یہ کہا جائے کہ کیا آنکھوں والا اندھے کی طرح ہوسکتا ہے تو اس وقت زور اس بات پر ہوتا ہے کہ اندھے کو جو تکالیف پہنچتی ہیں کیا وہی آنکھوں والے کو پہنچ سکتی ہیں۔ پس اس آیت میں اس پر زور ہے کہ مسلمان کسی طرح بھی ان نقصانات میں مبتلا نہیں ہوسکتے جو کفار کو پہنچ سکتے ہیں۔

اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ میں ایک نیا مضمون بیان کیا ہے۔ فرماتا ہے اس تعلیم سے وہی لوگ نصیحت و نفع حاصل کرتے ہیں جو اولوا الالباب ہیں۔ یعنی جو دینی لب اور عقل رکھتے ہیں یہ مقابلہ جو پیچھے مسلمانوں اور کافروں کی حالت کا کیا گیا ہے اس سے نفع حاصل کرنا عقلمندوں کا کام ہے۔ جو دینی عقل کو مار دیتا ہے اور اسے ضائع کر دیتا ہے وہ اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ پس دین کی باتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے عقل کو محفوظ رکھنا اور اسے عادات و جذبات سے کند نہ ہونے دینا ضروری ہوتا ہے مگر افسوس کہ اکثر لوگ اس قیمتی جوہر کو عادات و جذبات کے پردوں میں چھپا دیتے ہیں اور بظاہر انسان لیکن بباطن حیوان ہوتے ہیں۔ کاش کوئی اس پر غور کرے اور فائدہ اٹھائے۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۱﴾

جو اللہ (تعالیٰ) کے (ساتھ کئے ہوئے) عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس پختہ عہد کو نہیں توڑتے۔

حلّ لُغات۔ اَلْعَهْدُ اَلْوَصِيَّةُ۔ وصیت۔ اَلْيَمِيْنُ يَحْلِفُ بِهَا الرَّجُلُ۔ قسم۔ اَلْمَوْثِقُ۔ پختہ بات۔ اَلْمِيْثَاقُ۔ پختہ اقرار۔ اَلَّذِيْ يَكْتُبُهٗ وَلِيُّ الْاَمْرِ لِلْوُلَاةِ اِيْذَانًا بِتَوْلِيَتِهِمْ۔ بادشاہ اپنے ماتحت افسران کو جو ان کی تقرری کا حکم نامہ لکھ کر دیتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ چونکہ باوجود اس کے کہ ہر شخص میں اللہ تعالیٰ نے عقل کا مادہ رکھا ہے۔ لوگ عام طور پر اس کو استعمال نہیں کرتے اور عدم استعمال کی وجہ سے اسے بالکل مار دیتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے اس امر کے مدعی ہوتے

ہیں کہ وہ عقلمند ہیں۔ اللہ تعالیٰ اولوالالباب کی علامات بیان فرماتا ہے تاکہ انسان اس مخفی جوہر کو اس کی علامتوں کے ذریعہ سے پہچان سکے۔

عقل مندوں کی پہلی علامت پہلی علامت یہ بتاتا ہے کہ وہ لوگ جو حقیقت شناس ہوتے ہیں اور چھلکے کے پیچھے پڑنے سے اپنے آپ کو روک دیتے ہیں اس عہد کو جو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے باندھا ہے کامل طور پر پورا کرتے ہیں۔ عقل کا کام یہی ہے کہ وہ موازنہ کرتی ہے اور جو اعلیٰ شیئے ہو اس کو قبول کر لیتی اور جو ادنیٰ شیئے ہو اسے رد کر دیتی ہے۔ پس یہ لوگ اس امر کو دیکھ کر کہ سب برکت اللہ تعالیٰ کے عہد کے پورا کرنے میں ہے ہمہ تن اس عہد کو پورا کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے سب امور کو اس عہد کے تابع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اس عہد کے مطابق ہوں تو انہیں اختیار کرتے ہیں اور اگر خلاف ہوں تو انہیں رد کر دیتے ہیں اور عہد کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ

اور جو (لوگ) کہ ان تعلقات کو قائم کرتے ہیں جن کے قائم کرنے کا اللہ (تعالیٰ) نے حکم دیا ہے۔ اور اپنے رب

رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ؕ﴿۲۲﴾

سے ڈرتے ہیں اور برے (انجام والے) حساب سے خوف رکھتے ہیں۔

حلّ لُغات - یَصِلُوْنَ وَصَلَ سے ہے اور وَصَلَ الشَّیْءَ بِالشَّیْءِ کے معنے ہیں۔ لَأَمَهٗ وَجَمَعَهٗ ضِدُّ فَصَلَهٗ۔ کسی چیز کو ملایا۔ جوڑا۔ (اقرب) پس یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ کے معنے ہوں گے کہ ان تعلقات کو قائم رکھتے ہیں جن کے قائم رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

اَلْخَشْیَةُ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ - یَخْشَوْنَ خَشِیَ سے ہے اور اَلْخَشْیَةُ کے معنے ہیں خوف یَشُوْبُهٗ تَعْظِیْمٌ وَاَکْثَرُ مَا یَکُوْنُ ذٰلِكَ عَنْ عِلْمٍ بِمَا یُخْشٰی مِنْهُ وَلِذٰلِكَ خُصَّ الْعُلَمَاءُ بِهَا فِیْ قَوْلِهٖ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ یعنی خشیت اس خوف کو کہتے ہی جس میں اس شخص کی جس سے خشیت کی جائے تعظیم بھی ملی ہوئی ہو اور اس کی بزرگی کا احساس بھی ہو۔

اور لفظ خشیت کا اکثر استعمال اس جگہ ہوتا ہے جہاں خوف کی وجہ کا بھی علم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ کی خشیت صرف اس کے عالم بندوں کے دل میں ہوتی ہے۔ ورنہ خوف تو عام

لوگوں کے دل میں بھی ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے (مفردات) پس یَخۡشَوۡنَ رَبَّھُمۡ کے معنے ہوں گے کہ وہ اپنے رب سے ایسی خشیت کرتے ہیں جس میں اس کی تعظیم اور بزرگی پائی جاتی ہے اور وہ علم پر مبنی ہوتی ہے۔

تفسیر۔ **عقل مندوں کی دوسری علامت** دوسری علامت عقلمندوں کی یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عہد کی پابندی کے بعد اور اس سے کامل تعلق پیدا کر لینے کے بعد اس کے ان بندوں کی طرف جھکتے ہیں جن سے تعلق رکھنے کا اس نے حکم دیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے رسول، ملائکہ، خلفاء پھر اولیاء وابرار اور اس کے بعد تمام مخلوقات حسب مراتب مثلاً قومی نظام کے چلانے والے رشتہ دار، محسن ہمسائے، غرباء ومساکین اہل وطن، مسافر باقی افراد انسانیت، حیوانات جن سے وہ کام لیتا ہے اور پھر تمام چرند پرند حتیٰ کہ درندے اور کیڑے مکوڑے پھر نباتات اور جمادات غرض تعلق باللہ کے بعد عقلمند انسان کا کام ہے کہ جن جن چیزوں سے اور جس جس حد تک اللہ تعالیٰ نے تعلق کا حکم دیا ہے اس حد تک اور اس صورت میں ان سے تعلق رکھے۔ اس علامت میں گویا شفقت علی خلق اللہ اور مادی اسباب سے استمداد اور ان کے استعمال کا ذکر کیا ہے اور یہ نکتہ بتایا ہے کہ عقلمند وہ نہیں جو دنیا کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی جستجو کرتا ہے بلکہ عقلمند وہ ہے جو خدا تعالیٰ کو پا کر اس کے ارشاد کے ماتحت دنیا کی طرف جھکتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتی ہے کہ دَنَا فَتَدَلّٰی۔ فَکَانَ قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی (النجم: ۹،۱۰) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اول تو خدا تعالیٰ کے قریب ہوئے۔ پھر اس کے حکم کے ماتحت اس مقام سے اتر کر مخلوق کی طرف جھکے۔ اور شفقت علی خلق اللہ کا اعلیٰ نمونہ دکھایا اور خدا تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان واسطہ بن گئے۔ جس طرح کمان کا چلہ ہوتا ہے کہ ایک سرا ایک طرف اور ایک سرا ایک طرف بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس آیت میں لطیف پیرایہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کوشش کا ذکر کیا ہے جو آپؐ نے بنی نوع انسان کو خدا تعالیٰ سے ملانے کے لئے کی۔ لیکن چونکہ یہ موقع اس آیت کی تفسیر کا نہیں میں نے درمیانی مطالب کو ترک کر کے صرف نتیجہ بیان کر دیا ہے۔

غرض آیت زیر تفسیر میں اللہ تعالیٰ نے عقلمندوں کی دوسری علامت یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور محبت میں کمال حاصل کر کے اس کے حکم اور اس کی ہدایت کے ماتحت مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور مخلوق سے رشتہ اتحاد واخوت اور احسان جوڑتے ہیں۔

عقل مندوں کی تیسری علامت تیسری علامت یہ بتائی ہے کہ عقلمند لوگ اپنے رب کی خشیت دل میں رکھتے ہیں۔

خشیت کے معنی جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے خشیت کسی اعلیٰ صفات والی چیز کے کمال وحسن کو پہچاننے کے بعد اس کے ہاتھ سے جاتے رہنے کے خوف کو کہتے ہیں۔

خشیت کے لفظ میں اس چیز کی معرفت کا بھی مفہوم ہے جس سے خوف کیا گیا ہو گویا خشیت کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ اس چیز کی معرفت حاصل ہو جس سے خوف کیا گیا ہو۔ نیز خوف نقصان یا ضرر کا نہ ہو بلکہ اس وجہ سے ہو کہ انسان یقین کرے کہ وہ چیز نہایت اعلیٰ اور عظمت والی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی کسی غفلت کی وجہ سے میں اس کا قرب کھو بیٹھوں۔ پس اللہ تعالیٰ کی خشیت کے یہ معنے ہوئے کہ جب تعلق باللہ کے مقام کو انسان حاصل کر لیتا ہے تو چونکہ اس پر کھل جاتا ہے کہ یہی مقام انسان کی حقیقی راحت اور کمال کا مقام ہے وہ اس کے جاتے رہنے کے خیال کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اور ہر وقت اس کی حفاظت کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور پوری طرح اس کا خیال رکھتا ہے۔ کہ جو مقام قرب اسے حاصل ہوا ہے وہ کسی غفلت کی وجہ سے کھویا نہ جائے۔

اسی علامت کا دوسرا حصہ یہ بتایا ہے کہ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ یعنی ایک طرف اگر اسے اللہ تعالیٰ کے قرب کے مقام کی حفاظت کا خیال دامنگیر ہوتا ہے تو دوسری طرف وہ اس امر سے بھی خائف رہتا ہے کہ شفقت علی خلق اللہ کا جو مقام اسے حاصل تھا اس میں کسی کوتاہی کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مستوجب نہ ہو جائے۔ پہلی دو علامتوں میں چونکہ تعلق باللہ کو اصل اور شفقت علی خلق اللہ کو اس کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ تیسری دلیل میں اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے تعلق کے نقص کے لئے خشیت کا لفظ اور مخلوق کے تعلق کے نقص کے متعلق خوف کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ اول الذکر لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جس چیز سے ڈرا جاتا ہے وہ مقصود بالذات ہے اور خوف کا لفظ ضروری نہیں کہ مقصود بالذات کے لئے بولا جائے بلکہ بسا اوقات یہ لفظ ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس سے دور بھاگنا مقصود ہو۔ گو کبھی مقصود بالذات شئے کی ناراضگی کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

اور جنہوں نے اپنے رب کی رضا کی طلب میں ثابت قدمی سے کام لیا اور نماز کو عمدگی سے ادا کیا اور جو (کچھ) ہم نے

اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ

انہیں دیا ہے اس میں سے چھپ کر (بھی) اور ظاہر (بھی ہماری راہ میں) خرچ کیا اور (جو) بدی کو نیکی کے ذریعہ دور

بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۳﴾

کرتے ہیں انہی کے لئے اس گھر کا (بہترین) انجام (مقدر) ہے۔

حلّ لُغَات - صَبَرُوْا صَبَرَ سے جمع کا صیغہ ہے اور صبر کے معنے ہیں تَرْكُ الشَّكْوٰى مِنْ اَلَمِ الْبَلْوٰى لِغَيْرِ اللّٰهِ لَا اِلَى اللّٰهِ کہ مصیبت کے دکھ کا شکویٰ خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس نہ کرنا۔ فَاِذَا دَعَا اللّٰهَ اَلْعَبْدُ فِيْ كَشْفِ الضُّرِّ عَنْهُ لَا يُقْدَحُ فِيْ صَبْرِهٖ۔ اگر بندہ اپنی رفع مصیبت کے لئے خدا تعالیٰ کے پاس فریاد کرے تو اس کے صبر پر اعتراض نہ کیا جائے گا۔ وَقَالَ فِي الْكُلِّيَّاتِ اَلصَّبْرُ فِي الْمُصِيْبَةِ۔ اور کلیات میں لکھا ہے کہ صبر مصیبت کے وقت ہوتا ہے۔ وَصَبَرَ الرَّجُلُ عَلَى الْاَمْرِ نَقِيْضُ جَزِعَ اَيْ جَرُؤَ وَشَجُعَ وَتَجَلَّدَ اور صبر جزع یعنی شکویٰ کرنے اور گھبرانے کے مقابل کا لفظ ہے اور صبر کے معنے ہوتے ہیں دلیری دکھائی۔ جرأت دکھائی۔ ہمت دکھائی۔ اور صَبَرَ عَنِ الشَّيْءِ کے معنے ہیں اَمْسَكَ عَنْهُ کسی چیز سے رکا رہا۔ اَلدَّابَّةُ حَبَسَهَا بِلَا عَلَفٍ۔ اور صبر کا مفعول دابۃ ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جانور کو بغیر چارہ دینے کے روکے رکھا۔ صَبَرْتُ نَفْسِيْ عَلٰى كَذَا کے معنے ہیں میں نے اپنے نفس کو کسی چیز پر قائم رکھا یا کسی چیز سے روکے رکھا۔ چنانچہ انہی معنوں میں صَبَرْتُ عَلٰى مَا اَكْرَهُ وَصَبَرْتُ عَمَّا اُحِبُّ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ تکلیف دہ حالت پر میں نے نفس کو استقلال سے قائم رکھا اور پسندیدہ امور سے نفس کو باز رکھا۔

صبر کے تین معنی گویا صبر کے تین معنے ہوئے گناہ سے بچنا اور اپنے نفس کو اس سے روکے رکھنا۔ (۲) نیک اعمال پر استقلال سے قائم رہنا۔ (۳) جزع فزع سے بچنا۔ (اقرب) اور وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ کے معنے ہوں گے جو اپنے رب کی رضا کے لئے جزع فزع سے بچے۔ بدیوں سے رکتے رہے اور نیکیوں پر ہمت سے قائم رہے۔

يَدْرَءُوْنَ دَرَأَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور دَرَأَ کے معنے ہیں دَفَعَهٗ وَقِيْلَ دَفَعَهٗ شَدِيْدًا۔ اس کو ہٹایا اور بعض کہتے ہیں کہ دَرَأَ میں سختی سے ہٹانے کے معنے پائے جاتے ہیں۔ (اقرب) اور يَدْرَءُوْنَ کے معنی ہوں گے سختی سے ہٹاتے ہیں۔

عُقْبٰى جَزَآءُ الْاَمْرِ۔ کام کی جزا۔ اٰخِرُ كُلِّ شَيْءٍ۔ ہر چیز کا آخر، انجام۔ اَلْاٰخِرَةُ۔ آخرت۔ (اقرب) اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ کے معنے ہوں گے۔ انہی کے لئے اس آخرت کے گھر کا بہترین انجام مقدر ہے۔

تفسیر۔ اولوالالباب کی چار اور علامتیں اس آیت میں چار اور علامات اولوالالباب کی بیان فرمائی ہیں۔ پہلی وجہ جو پچھلی آیات کو ملا کر چوتھی ہے یہ بتائی ہے کہ وہ لوگ اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لئے صبر کرتے ہیں جیسا کہ حل لغات سے ظاہر ہے صبر کے تین معنی ہیں۔

صبر کے تین معنے (۱) گناہ سے بچنا اور جذبات کو بری راہ پر پڑنے سے روکنا (۲) نیک اعمال پر استقلال سے قائم رہنا۔ (۳) جزع فزع سے بچنا۔ پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ چوتھی علامت عقلمندوں کی یہ ہے کہ وہ بدی سے مجتنب رہتے ہیں۔ نیکی پر قائم رہتے ہیں اور جزع فزع سے رکتے ہیں اور اسی پر کفایت نہیں کرتے بلکہ اپنی نیتوں کی بھی اصلاح کرتے ہیں۔ اور ان کا یہ کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے ہوتا ہے نہ کہ کسی ذاتی یا قومی غرض کے ماتحت یا کسی طبعی نقص کے سبب۔ یعنی ان کا صبر کم ہمتی یا کمزوری اور بزدلی کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ نہ اپنے ذاتی اور قومی فوائد کے حصول کے لئے ہوتا ہے بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ہوتا ہے۔ باوجود طاقت انتقام کے وہ صبر کرتے ہیں اور اس میں ان کے مدنظر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائے۔

بدی کی طاقت رکھتے ہوئے اس سے بچنا اصل عفت ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں عفت اس شخص کی نہیں جس کے اندر گناہ کی طاقت نہیں۔ عفت تو اسی کی ہے جس کے اندر بدی کی طاقت ہے اور بدی کی طاقت کے ہوتے ہوئے وہ بدی سے مجتنب رہتا ہے۔ جو شخص رات کے وقت ڈر کے مارے اپنے مکان سے باہر نہیں نکل سکتا وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ ڈکیتی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ ایک شخص جو کمزور اور نحیف الجثہ ہے وہ اگر ایک مضبوط آدمی سے مار کھا کر کہے کہ میں صبر کرتا ہوں تو وہ صابر نہیں کہلائے گا بلکہ بے بس کہلائے گا۔ ہاں اگر وہ جرأت اور طاقت کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر صبر اختیار کرتا ہے تو وہ بے شک صابر کہلانے کا مستحق ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۴۰)

پانچویں علامت اقاموا الصلوٰۃ ہے پانچویں علامت اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ کی بیان فرمائی۔ نمازوں کو باقاعدہ اور باشرائط ادا کرتے ہیں۔ یعنے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلقات میں باقاعدگی کی عادت ہوتی ہے اور بے استقلالی ان کے اعمال میں نہیں ہوتی۔

چھٹی علامت خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہے چھٹی علامت یہ بتائی وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں۔ پوشیدہ تو اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ تا دوسرے پر احسان نہ ہو اور علانیہ اس لئے کرتے ہیں کہ تا دوسروں کو صدقہ اور نیکی کی تحریک پیدا ہو اور دوسرے لوگ بھی انہیں

دیکھ کر نیکیوں میں حصہ لیں۔

ساتویں علامت۔ بدی کو دور کرنے کے چار گر ساتویں علامت یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ بیان فرمائی اور اس میں بدی کو دور کرنے کے یہ گر بتائے ہیں (۱) وہ نیک اعمال کرتے ہیں تا کہ لوگ ان کے نمونہ کو دیکھ کر بدی کو ترک کریں۔ گویا کہ صرف زبانی وعظ پر بس نہیں کرتے کہ وہ اتنا مؤثر نہیں ہوتا بلکہ عملاً نیکی کا نمونہ دکھاتے ہیں اور اس طرح بدی کی جڑ کھوکھلی کرتے ہیں۔ (۲) دوسرے معنی اس کے یہ ہیں کہ وہ نیک باتوں کا وعظ کرتے ہیں اور اس طرح آپ ہی آپ برائی کا رواج مٹتا جاتا ہے یعنی فحش کی تشریحات پر اتنا زور نہیں دیتے جتنا کہ نیک اعمال کی خوبیوں پر اور اس طرح ذہنوں کو بدی سے ہٹا کر نیکیوں کی طرف پھیرتے ہیں۔ (۳) تیسرے معنے یہ ہیں کہ وہ بہتر اور صالح اور مناسب موقعہ اعمال اس غرض کو مدنظر رکھ کر بجالاتے ہیں کہ تا ان کے ذریعہ بدی مٹ جائے۔ تورات کے مطابق ان کی یہ غرض نہیں ہوتی کہ ضرور سزا ہی دی جائے اور نہ انجیل کے مطابق ان کی یہ غرض ہوتی ہے کہ ضرور نرمی سے ہی ہر موقعہ پر کام لیا جائے اور ایک گال کے بعد دوسری گال بھی پھیر دی جائے بلکہ ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ بدی مٹ جائے۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لئے جو مناسب طریق ہو اسے اختیار کرتے ہیں۔ اگر سزا سے بدی مٹ سکتی ہے تو وہ سزا دیتے ہیں اور سختی سے کام لیتے ہیں اور اگر نرمی اور عفو کے ساتھ بدی مٹ سکتی ہے تو اس وقت نرمی اور عفو سے بدی کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر عفو کے علاوہ احسان کی ضرورت سمجھتے ہیں تو بدی کے مقابل عفو اور احسان کے ذریعہ بدی کی جڑ کاٹ دیتے ہیں۔ پس جو بدی کے مٹانے کے لئے بہتر عمل ہو اسے اختیار کرتے ہیں۔

(۴) چوتھے معنے اس کے یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ شرارت کے مقابلہ میں شرارت سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ ہمیشہ انصاف کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ شرارت کے مقابلہ میں انصاف اور راستی کو چھوڑ دیں۔

عُقْبَی الدَّار اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ عقبیٰ عام طور پر عاقبت محمودہ کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اچھا انجام جس کا برا انجام ہو وہ گویا انجام ہی نہیں سمجھا جاتا۔ الدار سے مراد جنت ہے کیونکہ اصل گھر وہی ہے۔ یہ دنیا تو عارضی سفر ہے۔ پس اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ کے معنے ہوئے کہ آخرۃ میں بہتر انجام انہیں کا ہوگا۔

جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَہَا وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَ

یعنی مستقل رہائش کے باغات جن میں وہ (خود بھی) داخل ہوں گے اور ان کے بڑوں اور

اَزۡوَاجِہِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِہِمۡ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ

ان کی بیویوں اور ان کی نسلوں میں سے بھی جنہوں نے نیکی اختیار کی ہوگی اور فرشتے

مِّنۡ کُلِّ بَابٍ ﴿۲۴﴾ۚ

ہر ایک دروازہ سے ان کے پاس آئیں گے۔

حلّ لُغات۔ جَنّٰتٌ جَنَّۃٌ کی جمع ہے اور اَلْجَنَّۃُ جَنَّ میں سے ہے۔ وَاَصْلُ الْجَنِّ سَتْرُ الشَّیْءِ۔ جَنَّ کے اصل معنے کسی چیز کو ڈھانپنے کے ہیں۔ یُقَالُ جَنَّہُ اللَّیْلُ چنانچہ جَنَّہُ اللَّیْلُ کا محاورہ انہی معنوں میں مستعمل ہے کہ رات نے اس کو ڈھانپ لیا۔ وَالْجَنَّۃُ کُلُّ بُسْتَانٍ ذِیْ شَجَرٍ یَسْتُرُ بِاَشْجَارِہِ الْاَرْضَ۔ اور جنت ہر اُس باغ کو کہتے ہیں جس میں کثرت سے درخت ہوں اور وہ درختوں کے جھنڈ سے زمین کو ڈھانپ لے۔ وَقَدْ تُسَمَّی الْاَشْجَارُ السَّاتِرَۃُ جَنَّۃً۔ اور ڈھانپنے اور چھپانے والے یعنی گھنے درختوں کو بھی جَنَّۃٌ کہتے ہیں۔ وَسُمِّیَتِ الْجَنَّۃُ اِمَّا تَشْبِیْھًا بِالْجَنَّۃِ فِی الْاَرْضِ وَاِنْ کَانَ بَیْنَھُمَا بَوْنٌ۔ وَاِمَّا لِسَتْرِہٖ نِعَمَھَا عَنَّا الْمُشَارَ اِلَیْہِ بِقَوْلِہٖ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَھُمْ مِنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ۔ اور جنت کو اس لئے جنت کے نام سے پکارا گیا ہے کہ یا تو وہ دنیاوی باغات کے مشابہ ہے اگرچہ ان میں اور اس میں بہت فرق ہے۔ یا اس وجہ سے کہ اس کی نعمتیں ہم سے پوشیدہ ہیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ میں فرمایا ہے کہ جنت کی نعماء کا کسی کو علم نہیں۔ (مفردات)

عَدْنٍ عَدَنَ بِالْمَکَانِ عَدْنًا۔ اَقَامَ بِہٖ۔ عَدَنَ کے معنے ہیں کسی جگہ میں ٹھہرا۔ تَوَطَّنَہٗ۔ اس کو وطن بنایا۔ وَقِیْلَ مِنْہُ جَنَّاتُ عَدْنٍ اَیْ جَنَّاتُ اِقَامَۃٍ لِمَکَانِ الْخُلُوْدِ اور بعض محققین لغت نے کہا ہے وَجَنّٰتُ عَدْنٍ میں عدن اقامت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے کہ رہ پڑنے کے باغات۔ کیونکہ ان میں ہمیشہ رہا جائے گا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ عُقْبَی الدَّارِ سے مراد وہ جنات ہیں کہ جو ہمیشہ رہنے والی ہیں یا یہ

مراد ہے کہ اولوالالباب ہمیشہ رہنے والی جنتوں کے وارث ہوں گے۔

جنات میں مومنوں کے رشتہ داروں کے داخل کئے جانے کی وجہ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ ۔ اوران کے ماں باپ اور ازواج اور اولادیں جو نیک ہوں گے وہ بھی ان کے ساتھ جنات میں داخل ہوں گے۔

اس آیت میں ایک عظیم الشان اصلیت اور صداقت کا اظہار اس آیت میں ایک عظیم الشان اصلیت اور صداقت کا اظہار کیا ہے۔ اس اصل اور صداقت کو صرف قرآن کریم نے ہی بیان کیا ہے۔ دنیا کی اور کسی کتاب نے اس مسئلہ کو نہیں لیا۔ دنیا میں کوئی شخص کوئی ایسی نیکی اور بدی نہیں کرتا جس میں دوسرے لوگ کسی نہ کسی رنگ میں شریک نہ ہوں۔ تاجر کی تجارت کی کامیابی، زراعت پیشہ کی زراعت کی کامیابی سینکڑوں ہزاروں دوسرے افراد کے دانستہ یا نادانستہ تعاون سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے زکوٰۃ مقرر کی ہے اور اس طرح دوسرے لوگوں کا حق دلایا ہے۔ یہی حال دوسرے کاموں کا ہے۔ مثلاً فرض کرو ایک شخص تبلیغ کے لئے جاتا ہے۔ تو اس تبلیغ میں اس کی بیوی کا حصہ بھی ہے کیونکہ وہ اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کے گھر اور اس کے بال بچہ کا انتظام کرتی ہے۔ ان کی پرورش کرتی ہے۔ اگر وہ بال بچوں کی حفاظت نہ کرے تو مبلغ کو تبلیغ کے لئے جانے میں بڑی دقت ہوگی۔ اسی طرح اگر والدین نے اچھی طرح تربیت نہ کی ہوئی ہو تو وہ کس طرح دین کے کاموں میں حصہ لے سکے گا۔ یا اگر اولاد والدین کو مطمئن نہ بیٹھنے دے تو وہ کس طرح نیکیوں میں حصہ لے سکتے ہیں۔

مومن کی نیکیوں میں اس کے رشتہ دار بھی شریک ہوتے ہیں پس چونکہ انسان نیکیوں میں ترقی اپنے رشتہ داروں کی مدد سے کرتا ہے اس کے انعام میں ان کا حصہ رکھا۔ اور یہ قانون مقرر کیا کہ سب خاندان میں جو سب سے اعلیٰ مقام کو حاصل کرے دوسرے سب اس کے پاس ہی رکھے جائیں نہ کہ اپنے چھوٹے مقاموں پر۔ بشرطیکہ وہ نجات یافتہ ہوں۔

اس آیت میں زَوج کے معنے ساتھی کے ہیں زَوج کا لفظ جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے میرے نزدیک اس کے یہاں جوڑے کے معنے ہیں۔ یعنی ساتھی کے نہ کے مرد عورت کے۔ اور میرے نزدیک اس میں تمام وہ لوگ شامل ہیں جو نیکیوں میں اس کے مدد اور معاون ہوئے ہوں نہ کہ صرف میاں اور بیوی۔ اس سے عورتوں کے متعلق بھی سوال حل ہوجاتا ہے کہ وہ نبوت کے مقام پر کیوں نہیں پہنچائی جاتیں کیونکہ اس آیت سے نکلتا ہے کہ نبی کی بیویوں کو بھی اس مقام پر رکھا جائے گا جس مقام پر نبی ہوں گے یعنی گو ان کی بناوٹ کے لحاظ سے ان کو دنیا میں نبی نہیں بنایا جاتا لیکن وہ انہی انعامات میں شریک ہوں گی جو انبیاء کو ملیں گے۔ اب دیکھو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو

ایک شخص ہیں مگر عورتیں گیارہ ان کے ساتھ ان کے انعامات میں شریک ہوں گی۔ اسی طرح نبی کا زوج صدیق ہوتا ہے اور عورتوں کو صدیق کے درجہ پانے سے روکا نہیں گیا۔ اب جو عورتیں صدیقیت کے مقام پر پہنچ جائیں وہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچائی جائیں گی۔ جس طرح تمام صدیق پہنچائے جائیں گے۔ کیونکہ وہ مرتبۂ صدیقیت کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں شامل ہوں گی۔

وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سے یہ بتانا مطلوب نہیں کہ جنت بڑا مقام ہے اور اس کے بہت سے دروازے ہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ اخلاق حسنہ اور نیکیاں کہ جن کی وجہ سے وہ جنت میں داخل ہوں گے وہ اس جہان میں جنت کے دروازوں کی شکل میں متمثل ہوں گی۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ؕ﴿۲۵﴾

(اور کہیں گے) تمہارے لئے سلامتی ہے۔ کیونکہ تم ثابت قدم رہے پس (اب دیکھو کہ تمہارے لئے) اس گھر کا کیا ہی اچھا انجام ہے۔

تفسیر۔سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کہنے کا مطلب ہر دروازہ سے ملائکہ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کہتے ہوئے داخل ہوں گے یعنی ان کو ملائکہ بتائیں گے کہ تم فلاں نیکی کی وجہ سے اس دروازہ سے داخل ہوئے ہو اور فلاں خلق فلاں دروازہ کی شکل میں متمثل ہے اور ان کو سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کہیں گے۔ یہ یاد دلانے کے لئے کہ تم نے جو نیکیاں کی تھیں ان کی وجہ سے اب تم پر ہر طرف سے سلامتی ہی سلامتی نازل ہوگی۔ جس طرح تم نے ہر رنگ میں نیکی کی تھی اسی طرح اب ہر رنگ میں تم پر سلامتیاں نازل ہوں گی۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ دوام سلامتی پر دلالت کرتا ہے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ دوام سلامتی پر دلالت کرتا ہے اور بِمَا صَبَرْتُمْ کہہ کر اس دوام کی وجہ بھی بتادی جو یہ ہے کہ جس طرح تم استقلال سے نیکی پر قائم رہے اور باوجود روکوں کے رکے نہیں۔ ہم بھی اب دائمی سلامتی تم پر نازل کریں گے۔ اس آیت میں آریوں کے اس اعتراض کا جواب بھی آجاتا ہے کہ جب عمل محدود ہیں تو ثواب غیر محدود کس طرح مل سکتا ہے (ستیارتھ پرکاش باب نہم)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم نے زندگی بھر نیکی کو نہ چھوڑا تو اپنا فرض ادا کر دیا۔ موت کا آنا تمہارے بس کی بات نہ تھی۔ جب تک تمہارا بس تھا تم نے نیکی کے مقام کو نہ چھوڑا اور عمل کرتے رہے۔ پس اب مجھ پر واجب ہے کہ میں تم کو ہمیشہ کی کامیابی اور سلامتی عطا کروں۔

جو شخص تھوڑے تھوڑے ابتلاؤں پر گھبرا جاتا ہے وہ جنت کا مستحق نہیں ہوگا اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو شخص تھوڑے تھوڑے ابتلاؤں پر گھبرا جاتا ہے اور حق پر قائم نہیں رہتا وہ جنت کا مستحق نہیں ہوگا۔ جنت کا وہی شخص مستحق ہوسکتا ہے جو کسی ابتلاء پر گھبرائے نہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو کبھی قطع نہ کرے اور نیکیوں میں برابر لگا رہے۔

السلام علیکم پر چکڑالویوں کے اعتراض کا جواب چکڑالوی لوگ کہا کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں تو سلام علیکم آتا ہے پھر مسلمان السلام علیکم کیوں کہتے ہیں۔

السلام علیکم کہنے سے یہ مراد ہے کہ اللہ تمہیں خاص سلام سننے کا موقعہ دے اس کا جواب یہ ہے کہ جب ہم السلام علیکم کہتے ہیں تو ہماری مراد اس سے یہ نہیں ہوتی کہ تم پر سلامتی نازل ہو بلکہ یہ مراد ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ تم کو وہ سلام سننے کا موقع دے جو قرآن کریم میں بیان ہوا ہے۔ جیسے وہ سلام جس کا ذکر اس آیت میں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خاص سلام کی طرف اشارہ کیا جائے گا تو عربی کے قاعدہ کے مطابق السلام علیکم ہی کہا جائے گا۔ اس آیت کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی سلام کا ذکر ہے۔ مثلاً سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ (الزمر: ۷۴)۔ سورہ زمر کے آخر میں ہے اور سورۃ یٰس میں ہے لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّ لَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ۔ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (۵۸،۵۹)۔ پس جب ہم السلام علیکم کہتے ہیں تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اے بھائی! خدا تعالیٰ تم کو جنت میں داخل کرے اور خدا تعالیٰ کے فرشتے حسب وعدہ ہر دروازے سے داخل ہوکر خدا تعالیٰ کا سلام تم کو پہنچائیں۔ جو اعلیٰ دعا اس طرح سے پہنچتی ہے وہ ہمارے منہ سے نکلے ہوئے سلام سے کہاں پہنچ سکتی ہے؟ پس سلام علیکم کی جگہ السلام علیکم ہی صحیح ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ

اور جو اللہ کے (ساتھ کئے ہوئے) عہد کو اسے پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس (تعلق) کے قائم کرنے کا

يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي

اللہ (تعالیٰ) نے حکم دیا تھا اسے توڑتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان کے لئے (اللہ کی جناب سے)

الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝۲۶

دوری (مقدر) ہے اور (اسی طرح) ان کے لئے برا گھر (مقرر) ہے۔

حلّ لغات - اَللَّعْنَةُ لَعَنَهٗ لَعْنًا۔ طَرَدَهٗ وَاَبْعَدَهٗ مِنَ الْخَيْرِ لَعَنَ کے معنے ہیں اس کو دھتکارا اور بھلائی سے دور کیا۔ محروم کیا۔ وَاَخْزَاهُ وَسَبَّهٗ۔ اس کو ذلیل کیا و راس کو گالی دی۔ اَللَّعْنَةُ اِسْمٌ مِّنَ اللَّعْنِ۔ لَعْنَةٌ لَعَنَ کا اسم ہے اور اس کے ایک معنی عذاب کے بھی ہیں۔ (اقرب)

تفسیر - نَقَضَ اور عَهْدَ اللّٰهِ دونوں کو ملا کر دو باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ یعنی نیکیوں کو بھی چھوڑ دیتے ہیں اور بدیوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور جن سے تعلق جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا ان سے قطع کرتے ہیں۔ یعنی بجائے صلہ رحمی کے قطع رحمی کرتے ہیں۔ کوئی نظام قومی کو توڑتا ہے کوئی انبیاء کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ کوئی شفقت علی الناس کو چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی اللہ تعالیٰ کو چھوڑتا ہے۔ یہ سب قطع کرنا ہے ان باتوں کو جن کے ملانے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

وصل کے مقابل پر افساد کے لفظ کے رکھنے کی وجہ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔ وَصل کے مقابلہ میں اِفْسَاد رکھا ہے یعنی صرف یہی نہیں کہ جن سے وصل اور ملاپ کرنے کا خداوند تعالیٰ نے حکم دیا ہوا ہے ان سے وصل نہیں کرتے بلکہ بجائے وصل کے وہ ظلم کرنے لگتے ہیں اور قطع تعلق سے بڑھ کر مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔

لعنت کے معنے دوری کے ہیں اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ۔ چونکہ وہ خدا سے قطع تعلق کرتے ہیں اس لئے خدا تعالیٰ سے دور کئے جائیں گے۔ لعنت کے معنی دوری کے ہیں اور لعنت کا لفظ گالی کے طور پر استعمال نہیں ہوا بلکہ اس سے حقیقت بتائی گئی ہے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ سے خود قطع تعلق کریں انہیں قرب کس طرح نصیب ہو سکتا ہے؟

اَللّٰہُ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ وَ فَرِحُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ

اللہ (تعالیٰ) جس کے لئے پسند کرتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور (جس پر چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے اور یہ (لوگ)

الدُّنۡیَا ؕ وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۷﴾ ع

اس ورلی زندگی پر (ہی) خوش ہو گئے ہیں حالانکہ یہ ورلی زندگی آخرت کے مقابلہ میں محض ایک وقتی سامان ہے۔

حلّ لُغات۔ یَقۡدِرُ ۔ قَدَرَ سے ہے اور قَدَرَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ الۡاَمۡرَ کے معنی ہیں قَضٰی وَحَکَمَ بِہٖ۔ اللہ نے کسی کام کا فیصلہ کیا۔ عَلَیۡہِ الرِّزۡقَ ۔ قَسَمَہٗ ۔ رزق کو تقسیم کیا۔ ضَیَّقَہٗ رزق کو تنگ کیا۔ عَلَی الشَّیۡءِ ۔ جَمَعَہٗ وَاَمۡسَکَہٗ ۔ کسی چیز کو جمع کیا اور اس کو روکے رکھا۔ (اقرب) پس اَللّٰہُ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ کے معنی ہوئے اللہ جس پر چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور جس پر چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔

تفسیر۔ یعنی اگر یہ لوگ کہیں کہ دنیا کی ترقی تو ہمیں ملی ہوئی ہے اور اگلے جہان کی موہوم ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم نے مان لیا تو اگلے جہان کی ترقیات تو خدا جانے ملیں یا نہ ملیں جو کچھ ملا ہوا ہے وہ تو ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ پنجابی کی مثل ہے ’’ایہہ جہان مٹھا اگلا کس ڈٹھا‘‘ یعنی یہ زندگی تو شیریں ہے دوسری زندگی کسی نے دیکھی نہیں۔ کہ اس کی خاطر اسے تلخ کیا جائے۔ اس وسوسہ کا جواب یہ دیا کہ دنیا کی دولتیں اور حکومتیں اور ترقیات بھی تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں اگر وہ تم سے چھین کر محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے متبعین کو دے دے تو تم اس کو روک نہیں سکتے۔ بلکہ ہم تم کو بتا چکے ہیں کہ عنقریب ہم یہ نعمتیں مخالفوں سے چھین کر محمد رسول اللہ صلعم کے متبعین کو دے دیں گے۔ پس ان کے ماننے سے دنیا کے نقصان کا نہیں دنیا کے فائدہ کا ہی احتمال ہے اور اس کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ لیکن بفرض محال محمد رسول اللہ صلعم کو مان کر دنیوی نقصان ہو بھی تو بھی اس کی تعلیم میں قائم رہنے والے ایسے اصول مذکور ہیں کہ ان کے مقابل پر دنیا کی نعمتیں حقیقت کیا رکھتی ہیں؟ اس میں بتایا ہے کہ ذہنی اور فکری ترقیات مادی ترقیات سے جبکہ قوتِ عملیہ کو مردہ نہ کر دیا جائے افضل ہوتی ہیں۔ کیونکہ مادی ترقیات ہمیشہ ان کے تابع ہوتی ہیں۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ

اور جن لوگوں نے (تمہارا) انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشان کیوں نہیں اتارا

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝۲۸

گیا۔ تو کہہ اللہ جسے چاہتا ہے ہلاک کر دیتا ہے اور جو (اس کی طرف) مائل ہوا سے اپنی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

حل لغات۔ يَهْدِيْ هَدٰى سے ہے اور هَدَاهُ الطَّرِيْقَ وَاِلَيْهِ وَلَهٗ کے معنے ہیں بَيَّنَهٗ لَهٗ وَعَرَّفَهٗ بِهٖ۔ راستہ دکھایا، بتایا اور واضح کیا۔ هَدٰى فُلَانًا۔ تَقَدَّمَهٗ اس کے آگے آگے چل کر منزل مقصود تک لے گیا۔ هَدَاهُ اللّٰهُ اِلَى الْاِيْمَانِ اَرْشَدَهٗ۔ ایمان کی طرف رہنمائی کی۔ (اقرب)

اَنَابَ نَابَ سے ہے اور نَابَ اِلَيْهِ کے معنے ہیں رَجَعَ مَرَّةً بَعْدَ اُخْرٰى۔ بار بار لوٹا۔ اِلَى اللّٰهِ۔ تَابَ توبہ کی۔ نَابَ فُلَانٌ۔ لَزِمَ الطَّاعَةَ۔ اطاعت کو لازم پکڑا۔ (اقرب)

يَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ کے معنے ہوں گے جو اس کی طرف مائل ہوا سے اپنی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

تفسیر۔ چونکہ پہلی آیت میں ذکر تھا کہ اللہ تعالیٰ رزق چھین بھی سکتا ہے اس پر کفار کا اعتراض بیان کیا کہ جب انہیں خدا تعالیٰ کی ان طاقتوں کی طرف توجہ دلائی جائے تو جھٹ کہتے ہیں کہ بہت اچھا اگر ایسا ہے تو یہ نشان ہمیں دکھاؤ۔ یعنی ہمارا رزق چھینا جائے تب مانیں۔

اس کا جواب یہ دیا کہ نشانات تو اللہ تعالیٰ کے بہت نازل ہوئے ہیں لیکن تم ان سے فائدہ نہیں حاصل کرنا چاہتے اور صرف یہی مطالبہ کرتے ہو کہ تم پر عذاب آئے۔ گویا رحمت کے نشان علمی نشان، روحانی نشان سب بے حقیقت ہیں۔ تمہارے نزدیک صرف یہی نشان ماننے کے قابل ہے کہ عذاب آجائے۔ حالانکہ تباہ کر دینے والا عذاب آنے کے بعد ہدایت کا تو موقعہ ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر اس نشان سے یہ کیا فائدہ اٹھائیں گے؟ پس حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے گناہوں کے سبب سے ہلاکت کے مستحق ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے تباہ کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے ورنہ ہدایت کے نشانوں سے کیوں فائدہ نہ اٹھاتے۔

خدا تعالیٰ ہلاک اسی کو کرتا ہے جو اس سے دور بھاگتا ہے۔ چونکہ اس جگہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ گویا خدا تعالیٰ زبردستی کسی کو گمراہ یا ہلاک کر دیتا ہے اس لئے فرمایا کہ خدا تعالیٰ بلاوجہ نہیں ہلاک کرتا بلکہ اس کی سنت ہے کہ جو اس کی

طرف جھکے وہ اسے ہدایت دیتا ہے۔ ہلاک اسی کو کرتا ہے جو اس سے دور بھاگتا ہے۔ اور ہدایت قبول کرنے سے خود انکار کر دیتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کا رد آ گیا جو مشیت کا لفظ دیکھ کر کہہ دیا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ زبردستی گمراہ نہیں کرتا بلکہ صرف اسے گمراہ کرتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ گمراہ قرار دیتا ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف آنا چاہتا ہی نہیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا

یعنی جو ایمان لائے ہوں اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہوں سنو

بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ ﴿۲۹﴾

اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔

حلّ لُغات۔ تَطْمَئِنُّ اِطْمَأَنَّ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اِطْمَأَنَّ اِلٰی كَذَا کے معنے ہیں سَكَنَ وَاٰمَنَ لَهٗ۔ سکون پکڑا اور تسلی پائی۔ (اقرب) تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کے معنے ہوں گے دل آرام محسوس کرتے ہیں، دل تسلی پاتے ہیں۔

تفسیر۔ اصل مقصود ملنے سے تڑپ دور ہو جاتی ہے لوگ مال کماتے ہیں، حکومتیں کرتے ہیں ان کو اچھی اولاد ملتی ہے، اچھی بیویاں ہوتی ہیں، اچھے دوست ملتے ہیں، تجارت میں فائدہ اٹھاتے ہیں، زراعت میں نفع حاصل کرتے ہیں، علم میں کمال حاصل کرتے ہیں۔ غرضیکہ ہر چیز میں ترقی کرتے ہیں مگر پھر بھی دل مطمئن نہیں ہوتا۔ ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دو اور تکلیف دہ خواہشات دل میں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر وقت دل میں یہ احساس رہتا ہے کہ گویا اصل چیز جس کی انہیں خواہش تھی انہیں ابھی نہیں ملی۔ جس طرح کہ ایک بچہ جس کی ماں جدا ہو گئی ہو کبھی کسی کی چھاتی سے لگتا ہے کبھی کسی کی چھاتی سے مگر چین کسی جگہ نہیں پاتا۔ کیونکہ اسے وہ مقصود جس کی اسے تلاش تھی حاصل نہیں ہوا۔ یعنی اس کی حقیقی ماں اس کو نہیں ملتی۔ اسی طرح دنیوی ترقی کرنے والے لوگوں کا حال ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو دیکھا اس کا بچہ گم ہو گیا تھا۔ وہ جس بچہ کو دیکھتی تھی اسے اپنی چھاتی سے لگا لیتی۔ پیار کرتی اور پھر اسے چھوڑ کر آگے چلی جاتی۔ آخر اس کو اپنا بچہ مل گیا وہ اسے لے کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو متوجہ کر کے فرمایا کہ جیسے اس عورت کو

اپنے بچے کے مل جانے سے خوشی ہوئی ہے اس سے کئی گناہ زیادہ اللہ تعالیٰ کو خوشی ہوتی ہے جب اس کا گنہگار بندہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کا ایک دوسرا سبق آموز پہلو بیان فرمایا ہے۔ مگر میرا مقصد اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ اس عورت کو کس قدر تڑپ تھی جب تک اس کا اصلی مقصد نہیں ملا تھا مگر جب مقصود ملا تو اسے اطمینان حاصل ہو گیا۔ یہی حال ہر انسان کا ہے۔ اصلی مقصد کے ملنے کے ساتھ ہی تڑپ دور ہو جاتی ہے اور اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

انسانی پیدائش کا اصل مقصد خدا تعالیٰ کی یاد اور ذکر ہے پس چونکہ اصل مقصد انسانی پیدائش کا خدا تعالیٰ کی یاد اور اس کا ذکر ہی ہے۔ جب خدا مل جاتا ہے تو کوئی جلن اور تڑپ نہیں رہتی۔ بلکہ اطمینان ہی رہتا ہے۔ جو لوگ دنیا کی جستجو میں رہتے ہیں ان کو جس قدر ترقی ملتی ہے ان کی جلن بڑھتی جاتی ہے۔ مگر جو خدا تعالیٰ کی طرف جاتا ہے اور جس قدر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کے دل کا اطمینان بڑھتا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اپنی ذات کی جستجو ہی ہماری زندگی کا اصل مقصد قرار دیا ہے۔ پس جب وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے انسان کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ ہماری ریاستوں کو ہی دیکھو۔ باوجودیکہ ان کی حفاظت گورنمنٹ کے ذریعہ ہے مگر بعض رؤسا کے ڈر کا یہ حال ہے کہ ولایت سے بند ہو کر پانی آتا ہے۔ ان کے سامنے کھولا جاتا ہے۔ پھر بھی پہلے دوسروں کو پلایا جاتا ہے پھر راجہ صاحب پیتے ہیں۔ اسی طرح ان کا کھانا ہے کہ ہزار احتیاطوں میں لگایا جاتا ہے۔ پھر اس سے پہلے خود اسی کو کھلایا جاتا ہے جو پکانے والا ہو۔ پھر اس کو ڈاکٹر کھاتا ہے۔ پھر ان کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ گویا ہر دم خطرہ ہے۔ اور احتیاط ہوتی رہتی ہے۔ ہر دم بے چینی رہتی ہے۔ مگر ہمارے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو ہر طرف دشمن ہی دشمن ہیں۔ مگر کوئی خطرہ نہیں۔ اطمینان و سرور ہے۔ دشمن بھی اگر کھانے کی دعوت دیتا ہے تو بے دھڑک چلے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک یہودن عورت نے زہر بھی دے دیا مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کے الہام سے آپؐ کو یہ امر معلوم ہو گیا۔ اور آپؐ اس سے محفوظ رہے (سیرت النبی لابن هشام زیر عنوان امر خیبر)۔ آپؐ کو اس قدر اطمینان کیوں تھا؟ اسی وجہ سے کہ آپؐ نے ایک ایسی ہستی سے تعلق قائم کیا ہوا تھا جو غیب کو جانتی ہے اور اس سے جب کسی کا تعلق ہو جاتا ہے تو وہ اپنے غیب سے بندے کو بھی حسب ضرورت حصہ دیتا رہتا ہے۔ پس اس سے تعلق رکھنے والا مطمئن رہتا ہے۔

چونکہ مومن کسی کا حق نہیں مارتا اس لئے اس کا دل مطمئن ہوتا ہے دینی ترقی میں اطمینان کی زیادتی اور دنیوی ترقی میں عدم اطمینان کی زیادتی کی ایک روحانی وجہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیوی ترقی جس قدر انسان کو

حاصل ہوتی ہے اس کا مال زیادہ سے زیادہ مشتبہ ہوتا جاتا ہے اور دوسرے لوگوں کا حصہ اس میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوتا جاتا ہے۔لیکن دینی ترقی کی یہ صورت نہیں۔دینی ترقی میں انسان کس قدر بھی ترقی کرے وہ اپنا ہی حصہ لیتا ہے دوسروں کا حصہ نہیں مارتا۔اسی کی طرف قرآن کریم میں دوسری جگہ اشارہ ہے کہ مومن کو جنت ملتی ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (ال عمران: ۱۳۴) یعنی جنت کی تمام لمبائی چوڑائی ہر مومن کو حاصل ہوگی۔فرق صرف یہ ہوگا کہ ہر مومن بقدر ذوق واستعداد اس سے فائدہ حاصل کر رہا ہوگا۔پس روحانی ترقی میں کسی کا حق مارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور چونکہ مومن کسی کا حق نہیں مارتا اس کا دل مطمئن ہوتا ہے اور اس کی روح پر گناہ اور حق تلفی کا بوجھ نہیں ہوتا۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَهُمْ وَ حُسْنُ

جو (لوگ) ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں ان کے لئے (بڑی) قابل رشک حالت اور بہترین

مَاٰبٍ ﴿۳۰﴾

واپسی کی جگہ (مقدر) ہے۔

حلّ لُغات۔طُوْبٰی مَصْدَرٌ بِمَعْنَی الطِّیْبُ طُوْبٰی مصدر ہے جو طیب کے معنے دیتا ہے۔اصلہ طُیْبٰی قُلِبَتِ الْیَاءُ وَاوًا لِسُکُوْنِهَا بَعْدَ ضَمَّةٍ۔عربی کے قاعدہ کے مطابق یا واؤ سے تبدیل ہوگئی۔نیز طِیْبَۃٌ کی جمع ہے اور اَطْیَبُ کی تانیث ہے۔اور اس کے معنے ہیں اَلْغِبْطَۃُ رشک۔اَلسَّعَادَۃُ۔نیک بختی۔اَلْحُسْنٰی۔اچھا انجام۔اَلْخَیْرُ۔بھلائی۔(اقرب) طُوْبٰی کی صفت محذوف ہے یعنی اَلْحَالَۃُ معنے یہ ہوں گے کہ قابلِ رشک حالت۔اچھی حالت۔

اَلْمَاٰبُ اَلْمَرْجِعُ۔لوٹنے کی جگہ۔اَلْمُنْقَلَبُ واپسی کی جگہ۔(اقرب)

تفسیر۔یعنی مومن کو نیکی اور سعادت حاصل ہوگی اور ایسے انعامات ملیں گے جن سے بڑھ کر ذہن میں نہیں آسکتے اور آخری ٹھکانا نہایت اعلیٰ ہوگا اور اچھا وہی ہے جس کا انجام اچھا ہو۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ

اسی لئے ہم نے تجھے ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے کئی قومیں (آنے والے کی راہ دیکھتی) گزر چکی تھیں بھیجا ہے

لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ

تاکہ جو (کلام) ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے تو وہ انہیں اس حالت میں پڑھ کر سنائے کہ وہ رحمان (کے فیضان) کا

بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ

انکار کر رہے ہیں۔تو کہہ وہ میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف

اِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۱﴾

(ہر آن) میرا رجوع ہے۔

حلّ لُغات ۔مَتَاب۔ تَابَ کا مصدر ہے اور تَابَ اِلَى اللّٰهِ مِنْ ذَنْبِهٖ کے معنے ہیں رَجَعَ عَنِ الْمَعْصِيَّةِ گناہ سے لوٹا۔اور مَتَاب کے معنے ہوئے گناہ سے لوٹ کر آنا۔(اقرب) مَتَابِ۔اصل میں مَتَابِیْ تھا یاء کو حذف کر دیا گیا اور باء کے کسرہ پر اکتفا کیا گیا۔

تفسیر ۔کیا لطیف بات بیان فرمائی کہ یہ عذاب مانگ رہے ہیں مگر باوجود اس کے ہم اپنی رحمانیت کے ماتحت عذاب میں تاخیر ڈال رہے ہیں۔پھر بھی یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رحمان نہیں ہے۔اگر ہم رحمان نہ ہوتے تو تم کب کے تباہ ہو چکے ہوتے۔تمہارا وہ کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے تم بچے ہوئے ہو۔آخر ہماری رحمانیت ہی تو تمہاری حفاظت کر رہی ہے۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ سے یہ بتایا ہے کہ جس قسم کے مطمئن دل والے اور اچھے انجام کا ذکر ہم نے کیا ہے تیری بعثت اسی غرض سے ہے کہ ایسے اعلیٰ روحانی اور اخلاقی مقام والے لوگ تیرے ذریعہ سے بھی پیدا ہوں۔

قُلْ هُوَ رَبِّيْ اَلآیہ۔ میں اس طرف اشارہ ہے کہ لوگ اعتراض کریں گے کہ تم عرب جیسی سخت دل قوم کو کہاں اس قسم کا بنا سکو گے۔مگر تم کہنا کہ یہ میرا کام تو نہیں خدا تعالیٰ کا کام ہے۔میں اس پر توکل کروں گا اور بار بار اس کی طرف جھکوں گا تو یہ مقصد پورا ہو جائے گا۔

قوموں کی اصلاح کا ذریعہ توکل اور دعا ہے۔ پس قومی اصلاح کا اصل ذریعہ توکل اور دعا ہے۔ جو لوگ ظاہری اسباب سے دلوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ظاہری اسباب سے ظاہر ہی درست ہوسکتا ہے دلوں میں ایمان اور اطمینان نہیں بھرا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ یورپ باوجود پوری سعی کے اخلاقی ترقی میں کوئی اعلیٰ معیار پیش نہیں کر سکا جیسا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود سامان نہ میسر آنے کے صحابہ کے ذریعہ سے پیش کیا۔

وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ

اور اگر کوئی ایسا قرآن ہو جس کے ذریعہ سے (نشان کے طور پر) پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے ہٹا کر) چلایا گیا ہو یا اس

الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ

کے ذریعہ سے زمین کو (ٹکڑے) ٹکڑے کیا گیا ہو یا اس کے ذریعہ سے مردوں سے باتیں کی گئی ہوں (تو کیا یہ لوگ اس

اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى

پر ایمان لے آئیں گے؟) نہیں بلکہ (ایمان لانے کا) معاملہ پورے طور پر اللہ کے اختیار میں ہے پھر کیا جو (لوگ)

النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ لَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا

ایمان لائے ہیں انہیں (اب تک) معلوم نہیں ہوا کہ اگر اللہ (تعالیٰ) چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا اور

صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ

(اے رسول) جن لوگوں نے (تمہارا) انکار کیا ہے ان کے (اس) عمل کی وجہ سے ہمیشہ کوئی (نہ کوئی) سخت آفت

وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۳۲﴾ؑ

ان پر آتی یا ان کے گھر کے قریب نازل ہوتی رہے گی یہاں تک کہ اللہ (تعالیٰ) کا (آخری) وعدہ آجائے گا۔اللہ (تعالیٰ) اس وعدہ کے خلاف ہرگز نہیں کرے گا۔

حلّ لُغات -**سُیِّرَتْ** سَیَّرَہٗ کے معنے ہیں جَعَلَہٗ سَائِرًا۔ اس کو چلایا۔ سَیَّرَ الْجُلَّ عَنْ ظَھْرِ الدَّابَّۃِ۔ اَلْقَاہُ۔ سواری کا پالان اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ اَلْمَثَلَ۔ جَعَلَہٗ یَسِیْرُ بَیْنَ النَّاسِ کسی مثال کو لوگوں میں مشہور کیا۔ مِنْ بَلَدِہٖ۔ اَخْرَجَہٗ وَاَجْلَاہُ۔ کسی کو شہر بدر کیا۔ اور جلاوطن کیا۔

اَلْجِبَالُ اَلْجَبَلُ کی جمع ہے اور اَلْجَبَلُ کے معنے ہیں کُلُّ وَتَدٍ لِلْاَرْضِ عَظُمَ وَطَالَ۔ زمین پر اونچے ٹیلے کو جبل کہتے ہیں۔ خِلَافُ السَّاحِلِ پتھریلی زمین۔ سَیِّدُ الْقَوْمِ وَعَالِمُھُمْ۔ قوم کا سردار اور عالم۔ یُقَالُ فُلَانٌ جَبَلُ قَوْمِہٖ۔ چنانچہ محاورہ ہے فلاں شخص اپنی قوم کا جبل ہے۔ یعنی سردار ہے یا قوم میں عالم کی حیثیت رکھتا ہے۔ (اقرب) پس سُیِّرَتْ بِہِ الْجِبَالُ کے معنی ہوں گے کہ اس کے ذریعے سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہلا دیئے جائیں۔ یعنی زلزلے آئیں۔ (۲) سردار یا عالم اڑا دیئے جائیں۔ (۳) بادشاہتوں کو اڑا دیا جائے۔ جَبَل کا لفظ روحانیت میں مشکلات پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اس لحاظ سے معنے ہوں گے کہ مشکلات کو دور کیا جاوے۔

قُطِّعَتْ قَطَعَ کے معنی ہیں کاٹا۔ اور قَطَّعَ۔ قَطَعَ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قَطَّعَ میں مبالغہ پایا جاتا ہے اور قَطَّعَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْعَذَابَ کے معنے ہیں لَوَّنَہٗ وَجَزَّاَہٗ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر قسم قسم کے عذاب نازل کئے۔ یہاں تک کہ اس کے بال سفید ہو گئے۔ اور جتھا ٹوٹ گیا۔ (اقرب) قَطْعُ الْاَرْضِ یعنے زمین کاٹنے سے مراد یا تو یہ ہے کہ دشمنوں کا علاقہ کاٹ کر مسلمانوں کو دیا جاوے گا یا یہ تعلیم فوراً زمین کو طے کرتی ہوئی پھیل جائے گی۔

یَایْئَسِ یَئِسَ سے فعل مضارع واحد مذکر کا صیغہ ہے اور یَئِسَ کے معنے ہیں قَنَطَ۔ ناامید ہو گیا۔ عَلِمَ جان لیا۔ (اقرب)

آیت اَفَلَمْ یَایْئَسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا میں یایئس کے معنے جاننے کے ہیں۔ یعنی کیا انہیں معلوم نہیں ہوا۔

اَلْقَارِعَۃُ اَلْقَارِعَۃُ کے معنے ہیں اَلدَّاھِیَۃُ بلائے ناگہانی، صدمہ۔ اَلْقِیَامَۃُ۔ قیامت۔ یُقَالُ قَرَعَتْھُمْ قَوَارِعُ الدَّھْرِ اَیْ اَصَابَتْھُمْ نَوَازِلُہُ الشَّدِیْدَۃُ اور جب قَرَعَتْھُمْ قَوَارِعُ الدَّھْرِ کا محاورہ بولیں

تو یہ معنی مراد ہوتے ہیں کہ ان کو سخت تکالیف پہنچیں۔ اَلنَّکْبَۃُ الْمُھْلِکَۃُ ہلاک کر دینے والی مصیبت۔ سَرِیَّۃُ النَّبِیِّ الْمُسْلِمِیْنَ آنحضرتؐ کے چھوٹے لشکر کو بھی قَارِعَہ کہتے تھے۔ قَارِعَۃُ الطَّرِیْقِ۔ وَمُعْظَمُہٗ وَاَعْلَاہٗ۔ راستے کے اونچے بڑے حصہ کو بھی قَارِعَہ کہتے ہیں۔

حَلَّ حَلَّ الْمَکَانَ اور حَلَّ بِہٖ کے معنے ہیں نَزَلَ بِہٖ کسی جگہ اترا۔ بِہٖ فِی الْمَکَانِ۔ اَحَلَّہٗ اِیَّاہُ۔ اس کو کسی جگہ اتارا۔ اَلرَّجُلُ۔ عَدَا۔ زیادتی کی۔ (اقرب)

تفسیر ۔یعنی اگر کوئی ان صفات والا قرآن ہو جو اس آیت میں بیان ہوئی ہیں تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لائیں۔ یہ مراد نہیں کہ قرآن میں یہ صفات نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآن کریم سے یہ صفات ظاہر ہوں گی مگر پھر بھی یہ لوگ فائدہ نہ اٹھائیں گے۔ جیسے حدیث میں ہے لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ مُعَلَّقًا بِالثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رَجُلٌ مِّنْ فَارِس (بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۃ الجمعۃ)۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ نہ ایمان ثریا پر چلا گیا ہے اور نہ رجل فارس اسے واپس لائے گا۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ ایمان ایک دن ثریا سے معلق ہو جائے گا اور رجل فارس اسے واپس لائے گا۔ پس اس جگہ کفار کی سنگدلی ظاہر کرنی مقصود ہے۔

جو صفات اس جگہ قرآن کریم کی بتائی ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) سُیِّرَتْ بِہِ الْجِبَالُ۔ اس کے ذریعہ سے پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہٹا دیا جائے۔ ظاہری معنے لئے جاویں تو مراد یہ ہوگی کہ اس میں شدید زلازل کی خبر دی گئی ہو جن سے پہاڑوں کی چوٹیاں اپنی جگہوں سے ہل جائیں۔ قرآن کریم میں ایسی زبردست پیشگوئیاں مادی تغیرات کی موجود ہیں جیسا کہ سورۂ زلزال میں۔ اور اگر استعارہ مراد لیا جائے تو معنے یہ ہوں کہ بڑی بڑی مشکلات دور کر دی جائیں۔ کیونکہ پہاڑ استعارۃً مصیبت اور مشکل کو بھی کہتے ہیں۔ یہ صفت بھی قرآن کریم میں موجود ہے کہ علمی، اخلاقی، روحانی، تمدنی، اقتصادی سیاسی قومی مشکلات کا حل قرآن کریم نے ایسا کیا ہے کہ کوئی دوسری کتاب اس میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور اگر جبل کے دوسرے معنے لئے جائیں جو سردار قوم یا عالم کے ہیں تو اس طرح بھی ٹھیک ہے کیونکہ قرآن کے ذریعہ سے پرانے سردار بھی اڑ گئے اور پرانے عالم بھی۔ اس نے سیادت کا بھی رنگ بدل دیا۔ بادشاہت کی جگہ خلافت کو قائم کیا۔ اور علم کا پرانا مفہوم جو وہم اور تخمین پر مبنی تھا اس کی جگہ تجربہ مشاہدہ اور خواص اشیاء پر علم کی بنیاد رکھی۔ تمام قرآن کریم اس مضمون سے پر ہے کہ وہم کی جگہ فکر اور عقل سے کام لو اور سیاروں پہاڑوں، دریاؤں، شہروں موسمی تغیرات اور خواص اشیاء کو اپنی آنکھوں سے دیکھو اور مشاہدہ سے اس کی حقیقت دریافت کرو۔ کہ یہ سب کچھ تمہارے فائدہ اور خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ پس قرآن کریم نے پرانی سیاست اور پرانے علم

کو بالکل بدل دیا اور دونوں امور کے متعلق نیا نقطۂ نگاہ دنیا کے سامنے پیش کر کے گویا ایک نئی دنیا بسادی۔

قطع ارض کے معنے (۲) دوسری صفت قطع ارض بتائی۔ قطع ارض کے معنے مسافت کے چھوٹا ہو جانے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی وہ کتاب سب زمین میں آسانی سے پھیل جائے اور یہ بھی کہ زمین اس کے ذریعہ سے کاٹ لی جائے۔ یعنی اس کی پیشگوئیوں کے مطابق دشمنوں کا علاقہ کاٹ کر مسلمانوں کو دے دیا جائے۔ یہ دونوں باتیں بھی قرآن کریم کو حاصل ہوئیں۔ یعنی آناً فاناً وہ دنیا میں پھیل بھی گیا اور اس نے اپنے ماننے والوں کے دلوں میں ایسا جوش پیدا کر دیا کہ وہ قرآن ہاتھ میں لے کر سب دنیا میں پھیل گئے اور ایک نسل کے اندر ساری دنیا پر اس کے ماننے والے چھا گئے اور یہ بھی ہوا کہ اس کی برکت سے اور اس کی پیشگوئیوں کے مطابق اس کے مخالفوں کے ملک کاٹ کاٹ کر مسلمانوں کی املاک میں شامل کر دیئے گئے۔

مردوں کے بلوائے جانے سے مراد روحانی مردوں کا زندہ ہو کر بولنا ہے (۳) تیسری صفت یہ بتائی کہ اس کے ذریعہ سے مردوں کو بلوایا جائے۔ اس کے بھی کئی معنے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کی شہادت میں مردے بولنے لگ جائیں۔ چونکہ مردوں کا اس دنیا میں زندہ ہونا قرآن تعلیم کے خلاف ہے اس لئے ان معنوں کو مدنظر رکھ کر اس کے یہ معنے ہوں گے کہ مردے خواب میں آ کر بولیں یا کشف میں بولیں۔

سپر چولزم کی طرف میلان تجربہ شاہد ہے کہ لوگ اپنے آباء کی شہادت کو بہت مانتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی دیکھا گیا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق کئی لوگ دلائل سے مان لیتے ہیں لیکن پھر بھی یہ خواہش کرتے ہیں کہ اگر رسول کریم صلعم کی زیارت ہو اور وہ کہہ دیں تو ہم مان لیں گے۔

یورپ میں اس وقت سپر چولزم کی طرف شدید میلان بھی اسی خواہش کی وجہ سے ہے۔ پس اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ بھی اپنے آباء سے شدید تعلق رکھتے ہیں اور بظاہر دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے وفات یافتہ آباء کہہ دیں تو ہم مان لیں گے لیکن جب آباء کی شہادتیں تورات انجیل سے پیش کی جائیں تو پھر انکار کر دیتے ہیں۔ یا حضرت ابراہیم کی شہادت مکہ والوں کو پیش کی جائے تو بھی منکر ہی رہتے ہیں۔ یا پھر لوگوں کو خوابوں اور کشوف میں ان کے آباء آ کر قرآن کریم کی صداقت پر گواہی دیں تب بھی ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی میں نے دیکھا ہے کہ کئی لوگ تو رؤیا پر ایمان لاتے ہیں کئی لوگوں کو رسول کریم صلعم یا دوسرے بزرگ بھی رؤیا میں نظر آ کر مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کی شہادت دے جاتے ہیں۔ مگر لوگ نہیں مانتے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہزارہا آدمیوں کو رؤیا اور کشوف میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سچائی وفات یافتہ بزرگوں کی زبانی بتائی گئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے یہی سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی تھا مگر آج کل کی طرح اس زمانہ میں بھی کئی لوگ ان رؤیا اور کشوف سے فائدہ نہ اٹھاتے تھے۔

مُردوں کے بلوائے جانے سے دوسرے معنے یہ ہوسکتے ہیں کہ جو لوگ روحانی مُردے تھے قرآن کریم کے ذریعہ سے انہیں بلوا دیا جائے گا۔ یعنی وہ صرف زندہ ہی نہ ہو جائیں گے بلکہ بولنے بھی لگیں گے۔ یعنی اعلیٰ علوم ان کی زبان پر جاری ہو جائیں گے۔ اور وہ دنیا کے لئے ہادی ہو جائیں گے۔ قرآن کریم میں متواتر روحانیت سے محروم لوگوں کو مردہ کہا گیا ہے اور ان کے روحانیت حاصل کرنے کو زندگی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً فرماتا ہے يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال:۲۵) اے مومنو! جب خدا اور اس کا رسول تم کو زندہ کرنے کے لئے بلایا کریں تو ان کی آواز کو قبول کیا کرو۔ پس معلوم ہوا قرآنی اصطلاح کی رو سے روحانیت سے بُعد موت اور اس کا حصول زندگی کہلاتا ہے۔ ان معنوں کی رو سے مردوں کے بلوا دینے کے معنے روحانیت سے دور لوگوں کا اسلام لانا اور روحانیت میں ترقی کر کے دنیا کے لئے ہادی ہو جانا لئے جائیں گے۔ چنانچہ اس کی مثالیں بکثرت شروع اسلام میں پائی جاتی ہیں۔

اسلام کے اشد ترین دشمنوں کا اسلام لانا حضرت عمرؓ جیسے اشد مخالف جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لئے گھر سے نکلے تھے اسلام لا کر انہوں نے کس قدر اسلام کے لئے قربانی کی اور اسلام کی اشاعت میں کس قدر حصہ لیا۔ ایسا ہی خالدؓ بن ولید جو بڑے مخالف اور دشمن تھے بعد میں مسلمان ہو کر اسلام کے لئے ایک نہایت مفید وجود ثابت ہوئے۔ ایسا ہی عکرمہ جو ابوجہل کے لڑکے تھے اور اسلام کے خطرناک مخالف تھے آخر اسلام لائے اور اشاعت اسلام میں جان تک کی پرواہ نہ کی۔

بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا۔ سب امور خدا تعالیٰ کے ہی قبضہ میں ہیں۔ یعنی مذکورہ بالا امور بظاہر ناممکن معلوم ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ لو گے کہ کس طرح یہ نشان قرآن کریم کی تائید میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اس آیت میں يَاْيْئَسِ کے معنی يَعْلَمُ کے ہیں اَفَلَمْ يَاْيْئَسِ۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے يَاْيْئَسُ کے معنے اس جگہ يَعْلَمُ کے ہیں۔ یعنی کیا کفار کو یہ معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ سب کو ہدایت دے۔ اور آگے اس ہدایت کا وقت بتایا کہ اس قوم پر عذاب پر عذاب آئیں گے اور لشکر کے بعد لشکر چڑھائی کرے گا۔ (قارعہ سے مراد لشکر ہے) اور آخری لشکر ان کے گھروں کے پاس جا کر اترے گا۔ یعنی مکہ پر حملہ ہوگا تب وہ اوپر کا وعدہ پورا ہوگا۔ یعنی یہ وعدہ کہ خدا چاہے تو سب کو ہدایت دے دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ متواتر اسلام

اور اس کے دشمنوں میں جنگیں جاری رہیں۔ اور وہ لوگ جن کے متعلق پیشگوئی تھی کہ سب نشان دیکھ کر بھی نہ مانیں گے ہلاک ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اسلامی لشکر مکہ کے قریب جا اترا۔ یعنی فتح مکہ کا دن آ گیا۔ تب خدا کا وعدہ پورا ہوا اور سب ہی کو اس نے ہدایت دے دی۔ تمام عرب ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسلام لے آیا۔ اللہ! اللہ! کیسی زبردست پیشگوئی ہے اور کس طرح تفصیلاً اسلام کی ترقی کا ذکر قبل از وقت کیا گیا ہے۔ جو لفظاً لفظاً پورا ہو کر قرآن کریم کی صداقت کا شاہد ہے۔ مگر افسوس کہ دل کے اندھے اب بھی ایمان نہیں لاتے۔ بلکہ خود مسلمان کہلانے والے ان علوم سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ سے مراد اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ خدا تعالیٰ یقیناً اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی وعدہ ہے جس کے متعلق فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے اس وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔ وہ وعدہ وہی ہے جو دوسری جگہ فرمایا کہ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ (القصص:۸۶)۔ یعنی ہم ضرور تجھ کو معاد میں یعنی مکہ میں واپس لائیں گے۔ جو دنیا کے لئے رجوع کا مقام ہے۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ اس میں اس آیت کا آنا کئی پیشگوئیوں کو اپنے اندر رکھتا ہے۔ (۱) یہ کہ آپؐ مکہ سے ہجرت کر کے جائیں گے۔ (۲) پھر وہاں سے مکہ واپس آئیں گے۔ (۳) پھر یہ بھی کہ اس جانے کے بعد لڑائیاں ہوں گی۔ ٹھکرانے والے لشکر حملہ آور ہوتے رہیں گے۔ (۴) حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے پاس آ اتریں گے۔ (۵) تب اللہ تعالیٰ کا وعدہ کامل طور پر پورا ہو گا۔ یعنی مکہ فتح ہو گا۔

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ

اور یقیناً تجھ سے پہلے رسولوں سے استہزاء کیا گیا تھا جس پر میں نے ان لوگوں کو جنہوں نے انکار کیا (تھا ایک مدت

كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۳﴾

تک) مہلت دی پھر میں نے انہیں ہلاک کر دیا اور (دیکھو) میری سزا کیسی (سخت) تھی۔

حلّ لُغَات۔ اُسْتُهْزِئَ اِسْتَهْزَأَ سے مجہول کا صیغہ ہے اور اِسْتَهْزَأَ هَزَأَ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنے ہیں سَخِرَ مِنْهُ اس سے ٹھٹھا کیا۔ (اقرب)

اَمْلَيْتُ اَمْلَيْتُ اَمْلٰى سے واحد متکلّم کا صیغہ ہے اور اَمْلٰى لَهٗ فِيْ غَيِّهٖ کے معنے ہیں اَطَالَ لَهٗ۔ اس کو

گمراہی میں مہلت دی۔ اَلْبَعِيْرَ وَسَّعَ لَهٗ فِي قَيْدِهٖ اونٹ کی رسی کو لمبا کیا۔ وَعِبَارَةُ الْأَسَاسِ'' اَمْلَيْتُ الْقَيْدَ لِلْبَعِيْرِ! اَرْخَيْتُهٗ وَاَوْسَعْتُهٗ'' اور اساس میں اَمْلَيْتُ الْقَيْدَ لِلْبَعِيْرِ کے معنے یوں کئے گئے ہیں کہ میں نے اونٹ کے باندھنے کی رسی کو لمبا اور ڈھیلا کر دیا۔ اللّٰهُ الظَّالِمَ۔ اَمْهَلَهُ اللہ نے ظالم کو مہلت دی۔ (اقرب) پس اَمْلَيْتُ کے معنے ہوں گے میں نے مہلت دی۔ ڈھیل دی۔

اَخَذَهُ اللّٰهُ اَهْلَكَهٗ۔ اللہ نے اسے ہلاک کیا۔ فُلَانًا بِذَنْبِهٖ۔ عَاقَبَهٗ عَلَيْهِ۔ کسی کے گناہ پر اسے سزا دی۔ (اقرب) اور اَخَذْتُهُمْ کے معنے ہوں گے (۱) میں نے ان کو ہلاک کر دیا۔ (۲) میں نے ان کو گناہوں پر سزا دی۔

تفسیر۔ **منکرین کو ڈھیل دی جانی ضروری ہوتی ہے** چونکہ کفار بار بار اعتراض کرتے تھے کہ عذاب فوراً کیوں نہیں آتا؟ اور ان کو جواب دیا گیا تھا کہ ہماری غرض ہدایت ہے۔ اس لئے ڈھیل کا دیا جانا ضروری ہے۔

پہلے انبیاء کے منکرین کو ڈھیل دی گئی اب فرمایا کہ یہ ڈھیل کا دینا تیرے زمانہ کے منکروں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں کہ اعتراض ہو بلکہ سب رسولوں کے زمانہ میں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ منکرین کو ڈھیل ملتی رہی۔ اور فوراً نہیں پکڑے گئے۔ پس اگر کسی مدعی کے منکروں کو ڈھیل کا ملنا اسکے جھوٹ کی علامت ہے تو پھر پہلے نبیوں کو بھی نعوذ باللہ جھوٹا ماننا پڑے گا۔ مکہ والے کم از کم حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو تو ضرور سچا مانتے تھے اور ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو بے انتہا تکالیف دی گئیں حتیٰ کہ آگ میں ڈالا گیا۔ مگر خداوند تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو فوراً نہ پکڑا بلکہ لمبی ڈھیل کے بعد پکڑا۔ آیت کے آخر میں اس امر کو بھی پیش کیا ہے کہ اصل میں دیکھنے والی بات یہ نہیں کہ ڈھیل کیوں مل رہی ہے۔ بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ منکرین جب پکڑے گئے تو ان کے ساتھ کیسا معاملہ ہوا کیا ان کا انجام نہایت عبرتناک نہیں ہوا؟ پھر ڈھیل پر کیا اعتراض ہے؟ ڈھیل پر اعتراض تو تب ہو جب اس کا نتیجہ انبیاء کے حق میں مضر ہو۔ درمیانی ڈھیل تو بعثت انبیاء کی غرض یعنی خلق اللہ کی ہدایت کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ

تو کیا وہ (خدائے برتر) جو ہر ایک شخص کا جو کچھ اس نے کمایا ہو اس کے مطابق نگران ہے (ان سے نہ پوچھے گا) اور

شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي

انہوں نے (تو) اللہ کے کئی ایک شریک (بھی) بنائے (ہوئے) ہیں (ان سے) کہو تم ان (نئے خداؤں) کے

الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ

نام (تو) بتاؤ یا (کیا) تم (لوگ) اس (یعنی خدا تعالیٰ) کو کوئی ایسی بات بتاؤ گے جو زمین پر (موجود) تو ہے لیکن وہ

كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَ صُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ

(اسے) نہیں جانتا یا کوئی اور کھلی بات (کہو گے؟ مگر) نہیں (تم کوئی ایسی بات نہیں بتا سکتے) بلکہ جن لوگوں نے انکار

اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۴﴾

کیا ہے ان کو ان کی (اپنی ہی) فریب کاری خوبصورت (شکل میں) دکھائی گئی ہے۔ اور انہیں (درست) راستہ سے ہٹا دیا گیا ہے اور جسے اللہ ہلاک کرے پھر اسے راہ دکھانے والا کوئی نہیں (مل سکتا)۔

حلّ لُغات۔ قَائِمٌ قَامَ سے اسم فاعل ہے۔ اور قَامَ عَلَيْهِ کے معنے ہیں رَاقَبَهٗ اس پر نگہبان رہا۔ عَلٰی غَرِيْمِهٖ۔ طَالَبَهٗ۔ (اقرب) اپنے قرضدار سے قرض کا مطالبہ کیا۔ اَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلٰی كُلِّ نَفْسٍ اَیْ حَافِظٌ لَّهَا۔ (مفردات) یعنی اَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ میں قَائِمٌ کے معنے محافظ و نگران کے ہیں۔ اَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ کے آگے یہ جملہ محذوف ہے۔ كَمَنْ هُوَ لَيْسَ بِقَائِمٍ۔ اور معنے یہ ہوں گے کہ کیا وہ ذات جو نگہبان ہے اس جیسی ہوسکتی ہے جو نگہبان نہیں۔

تُنَبِّئُوْنَ نَبَأَ سے ہے اور نَبَّأَهُ الْخَبَرَ وَبِالْخَبَرِ کے معنے ہیں خَبَّرَهٗ۔ اس کو خبر دی۔ يُقَالُ نَبَّأْتُ زَيْدًا عَمْرًوا مُنْطَلِقًا۔ أَیْ اَعْلَمْتُهٗ میں نے زید کو بتایا کہ عمرو جا رہا ہے (اقرب) پس اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ کے معنے ہوئے کیا تم اسے بتاؤ گے۔

تفسیر۔ **اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ کا جواب محذوف ہے** اس آیت میں اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ کے جواب کا جملہ یعنی كَمَنْ هُوَ لَيْسَ بِقَائِمٍ محذوف ہے اور یہ عربی زبان کا عام قاعدہ ہے کہ مقابل کا فقرہ لفظاً چھوڑ دیا جاتا ہے اور معناً اسے مدنظر رکھ لیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جو انسانی اعمال میں سے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو ضائع نہیں جانے دیتی اور سب کے نتائج پیدا کرتی ہے اور جس کے ہاتھ سے کوئی بچ نہیں سکتا اس جیسی ہوسکتی ہے جس میں یہ طاقت نہیں؟ قَائِمٌ علٰی كُلِّ نَفْسٍ کے معنے ہیں کہ نگران کے طور پر سر پر کھڑا ہے۔ کوئی اس سے دور نہیں اور

اس کی گرفت سے بھاگ نہیں سکتا۔ پس اسے سزا میں جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سزا میں جلدی تو وہ کرتا ہے جس میں طاقت نہیں ہوتی اور جو اپنے مخالف کو پکڑ لینے پر ڈرتا ہے کہ میں نے فوراً سزا نہ دی تو شاید ہاتھ سے نکل جائے اور پھر میں اس پر قدرت نہ پاؤں۔ جب اللہ تعالیٰ ہر وقت قادر ہے اور پوری طرح قادر ہے تو وہ کمزوروں کی طرح جلدی کیوں کرے؟ پس ان کو سزا کی تاخیر پر ہنسنے یا تعجب کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں تو اس امر کا محاسبہ کرنا چاہیے کہ آیا یہ خدا تعالیٰ کے مجرم ہیں یا نہیں؟ اگر خدا تعالیٰ کے مجرم ہیں تو پھر بے فکری اور خوشی کی کوئی وجہ نہیں۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ سے بتایا کہ اگر یہ اپنے عقائد اور اعمال پر غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ اس ذات کے مجرم ہیں جو سب کام خود کر رہی ہے اور کسی کی امداد کی محتاج نہیں۔ لیکن یہ اس کے شریک مقرر کر رہے ہیں۔ پس جب یہ اپنی ذات میں سزا کے مستحق ہو چکے ہیں تو یہ خیال ہی کس طرح کر سکتے ہیں کہ انہیں سزا نہیں ملے گی؟

قُلْ سَمُّوْهُمْ۔ قرآن مجید کا قاعدہ ہے کہ جب کسی اہم مسئلہ کا ذکر ضمنی طور پر بھی ہو تو وہ اس کی تفاصیل پر روشنی ڈال دیتا ہے۔ اس جگہ پر جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ دراصل اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ کے مضمون کی تشریح کے طور پر لایا گیا تھا لیکن چونکہ شرک کا ذکر آ گیا اس لئے اس عقیدہ کی بے ہودگی ثابت کرنی ضروری سمجھی۔ چنانچہ شرک کے رد میں فرمایا قُلْ سَمُّوْهُمْ اگر شرکاء ہیں تو ذرا ان کے کام تو بتاؤ۔ سَمُّوْهُمْ سے یہ مراد نہیں کہ نام بتاؤ کیونکہ نام تو بتوں کے انہوں نے رکھے ہی ہوئے تھے۔ خود قرآن کریم نے بھی کئی نام گنائے ہیں۔ پس مراد اسماء ذات نہیں بلکہ صفاتی نام ہیں۔ ایک اور جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ (النجم: ۲۴) یہ بت جن کو تم معبود قرار دیتے ہو نام ہی نام ہیں اور ہے کیا؟ یعنی ان میں کوئی صفات تو ہیں نہیں۔ آیت زیر تفسیر میں بھی یہی مراد ہے کہ ان شرکاء کے ذرا کام تو بتاؤ۔

شرک کے خلاف ایک زبردست دلیل یہ ایسی زبردست دلیل ہے جس کا کوئی مشرک جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اگر وہ یہ کہے کہ مثلاً اس بت کا کام بیٹا دینا ہے تو اس میں سب صفات الٰہی ماننی پڑیں گی۔ کیونکہ بیٹا دینے کے لئے ایک طرف تو رحم کی اصلاح کی ضرورت ہوگی اور دوسری طرف اگر مادہ تولید میں نقص ہے تو مرد کی اس مرض کو دور کرنا ہوگا۔ اور اس کے لئے غذاؤں اور دواؤں اور ان کے اثرات پر تصرف ضروری ہے۔ اور جب ایک بت کو یہ بات حاصل ہوگی تو پھر ماننا پڑے گا کہ غذاؤں پر بھی اسے تصرف حاصل ہے اور انسانی مشین کا چلانے والا دواؤں کے اثرات کو قبضہ میں رکھنے والا بھی وہی بت ہے نہ کہ خدا۔ اور دواؤں کا اثر اجرام فلکیہ کے اثر کے تابع ہے۔ اس لئے اس کا تصرف اجرام فلکیہ پر بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ ایسا ہی پھر اس کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ اسے علم غیب ہو۔

ورنہ وہ کیسے جانے گا کہ مریض کے موجودہ حالات میں اس کے لئے فلاں دوا ہی مفید ہے اور پھر اسے صرف عالم الغیب ہی نہیں بلکہ معلم بھی ہونا چاہیے تا وہ حکیم کے ذہن میں یا اس کی بیوی یا خود اس مریض کے ذہن میں یہ بات پیدا کرے کہ اس کو یہ چیز کھلاؤ یا تم کو یہ چیز کھانی چاہیے۔ جس سے مادہ تولید درست ہوگا۔ وغیرہ۔

غرض جب تک تمام صفات نہ ہوں گی صرف کوئی ایک صفت کام نہ کر سکے گی۔ اور اگر باقی تمام صفات بھی اس میں مان لی جائیں تو پھر خدا جیسا ایک دوسرا خدا ماننا پڑے گا۔ اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ دنیا کا کارخانہ ہزاروں خدا جن میں سے ہر اک آزادطور پر اس کارخانہ کو چلا سکتا ہے مل کر چلا رہے ہیں اور یہ ایسا فضول کام ہے کہ معبود تو الگ رہا عام انسان کے بارہ میں بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

ایک پادری سے الوہیت مسیح کے متعلق سوال میں نے ایک مرتبہ ایک عیسائی سے پوچھا کہ دنیا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مسیحؑ نے میں نے کہا کیا خدا میں بھی طاقت ہے کہ دنیا کو پیدا کر سکے؟ اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا پھر کیا وہ معطل اور بے کار بیٹھا ہے؟ اس نے کہا نہیں وہ بھی پیدا کر رہا ہے اور پھر یہی بات روح القدس کے متعلق کہی۔ تب میں نے ان سے کہا کہ آپ کے سامنے آپ کی میز پر ایک پنسل پڑی ہے اگر آپ اپنے نوکر سے کہیں کہ یہ پنسل مجھے اٹھا دو اور وہ جا کر دو اور آدمیوں کو بھی بلا لائے اور پھر تینوں مل کر اس پنسل کو اٹھا کر آپ کے سامنے لانے کی کوشش کریں تو آپ ان کو کیا سمجھیں گے؟ اس نے کہا پاگل۔ میں نے کہا جب ہر ایک خدا الگ الگ دنیا کو پیدا کر سکتا تھا تو پھر یہ تین مل کر اس کام کو کیوں کر رہے ہیں۔ جسے ایک ہی کر سکتا تھا گھبرا کر بولا اصل میں تثلیث کا مسئلہ ایسا باریک ہے کہ انسان کی عقل میں نہیں آ سکتا۔ یہ سَمُّوْهُمْ والی دلیل ہی تھی کہ جسے میں نے استعمال کیا اور پادری بالکل حیران رہ گیا۔

عربی محاورہ کے رو سے سَمُّوْهُمْ کے دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی حقیقت ہی کیا ہے۔ عربی میں حقارت کے لئے کہتے ہیں۔ سَمِّهٖ۔ اس کا نام تو لو۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی ذلیل چیز ہے کہ اس کا نام لیتے ہی تم شرمندہ ہو جاؤ گے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں بھی ان معنوں میں سَمُّوْهُمْ کہا گیا ہو۔ مطلب یہ کہ ذرا نام تو لو۔ نام لیتے ہی خود ہی شرمندہ ہو جاؤ گے۔ اردو میں نام لینے کی بجائے کہتے ہیں ''منہ تو دکھا۔''

اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ میں شرک کے خلاف دوسری دلیل اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ۔ شرک کے خلاف دوسری دلیل یہ دی ہے کہ اگر کوئی خدا کا شریک ہوتا تو اس کی خبر خدا کی طرف سے آنی چاہیے تھی۔ جیسا کہ ڈپٹی کمشنر گورنمنٹ مقرر کرتی ہے تو وہی اعلان کرتی ہے نہ یہ کہ ضلع کے لوگ۔ یعنی اگر خدا نے ان

کو اپنا شریک بنایا تھا تو ان کے لئے کوئی نبی آتا اور اعلان کرتا کہ یہ خدا کے شریک ہیں یا فرشتے اترتے اور وہ اعلان کرتے۔ مطلب یہ کہ بالواسطہ اعلان ہوتا یا بلا واسطہ اور یا پھر کم از کم وہ شریک خود ہی یہ اعلان کرتے کہ ہمیں خدا نے اپنا شریک مقرر کیا ہے۔ مگر یہاں تو ان تینوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ کیا تم اللہ کو اطلاع دیتے ہو جس بات کا اسے زمین میں علم نہیں؟

اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ کے دو معنی اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ اس کے دو معنے ہیں۔ (۱) اَمْ تَقُوْلُوْنَ بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ۔ یعنی یہ بات تم صرف زبان سے کہتے ہو۔ دل میں اس کے منکر ہو۔ دل میں اس کی عظمت نہیں۔ کیونکہ دل میں کسی چیز کی عظمت دلیل سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ معنے یہ ہوئے کہ جو کچھ کہہ رہے ہو کیا خود تمہارے دل اس کو مانتے ہیں؟ اس طرح فطرت سلیمہ سے اپیل کی جو بسا اوقات نہایت کامیاب طریقہ صداقت کی طرف لانے کا ہوتا ہے۔

دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس کی کوئی نقلی دلیل بتاؤ۔ کیا کوئی خدا کا کلام یا اس کی وحی ہے جس کی بناء پر تم ایسا کہتے ہو؟ لیکن جب کوئی بھی صورت نہیں تو انہیں شریک قرار دینا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

سَمُّوْهُمْ کہہ کر یہ بتایا تھا کہ ان بتوں میں کوئی ذاتی کمال نہیں۔ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ میں عقلی دلیل اور الٰہی شہادت کی عدم موجودگی بیان فرمائی ہے اور بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ میں نقلی دلیل کا بھی انکار کیا ہے اور فطرت کی شہادت کا بھی۔

بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَ صُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ۔ جب انسان کوئی فریب کرتا ہے اور لوگوں کو دھوکا دے کر ٹھگنا چاہتا ہے تو آہستہ آہستہ وہ خود اور اس کی اولاد بھی اس فریب کا شکار ہو جاتی ہے۔ زین کا محذوف فاعل خدا تعالیٰ نہیں بلکہ ان کے اپنے نفس ہیں۔ یعنی پہلے تو بعض لوگ دوسروں کو لوٹنے کے لئے شرک کا ڈھکوسلا بناتے ہیں مگر آخر کار خود بھی انہیں وہ بات اچھی لگنے لگ جاتی ہے اور اولاد تو اس وہم کا بالکل ہی شکار ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید اور کمپریٹیو ریلجن کے ماہرین کا اختلاف صُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ یعنی جب وہ خدا کے تعلق کو چھوڑتے ہیں تو شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انسان بغیر ساتھی کے نہیں رہ سکتا۔ خدا کو چھوڑنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر چھوٹی چھوٹی چیزوں کا سہارا ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اور اسی طرح شرک پیدا ہو جاتا ہے۔ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا اس مسئلہ میں قرآن مجید اور کمپریٹیو ریلجن کے ماہرین کا اختلاف ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ پہلے توحید تھی بعد میں شرک پیدا ہوا مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے شرک تھا آہستہ آہستہ خدا کا خیال پیدا ہوا۔ اور توحید دنیا میں آئی (Encyclopedia of Religion and Ethics under the word Polytheism)۔

پہلے توحید تھی اور بعد میں شرک پیدا ہوا مشاہدہ اور تاریخ ہماری تائید میں ہیں۔ مسلمان اور یہودی پہلے مؤحد تھے۔ یورپ کے لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل توحید کی تعلیم دی تھی۔ مگر آج مسلمان اور یہودی دونوں کامل توحید کے بعد مشرک بن گئے۔ اسی بات کو اس جگہ بیان کیا ہے کہ جب انہوں نے خدا سے تعلق توڑ لیا تو مخلوق کا سہارا ڈھونڈنے لگے۔ اس طرح سے شرک شروع ہو گیا۔ میں کہتا ہوں جس طرح یہود اور مسلمانوں میں توحید کے بعد شرک پیدا ہوا کیوں نہ تسلیم کیا جائے کہ اسی طرح ابتداء عالم میں توحید تھی پھر بگڑ کر لوگ مشرک ہو گئے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ کے معنی وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ۔ (۱) جس کے متعلق اللہ تعالیٰ گمراہ ہونے کا فیصلہ کر دے اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔ (۲) جس کو خدا تعالیٰ ہلاک کرے اس کو کامیابی کا راستہ دکھانے والا کوئی نہیں۔

اَضَلَّ کے تین معنی اضل کے تین معنے ہوتے ہیں۔ ہلاک کیا یا گمراہ کیا یا گمراہ قرار دیا۔ چونکہ قرآن مجید کی رو سے گمراہ کرنا خدا کا کام نہیں بلکہ ہدایت کرنا خدا کا کام ہے جیسے اس سورۃ کے چوتھے رکوع میں آچکا ہے کہ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا (الرعد:۳۲)۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب کو ہدایت ہی دیتا۔ پس گمراہ کرنے کے معنے تو کئے نہیں جا سکتے۔ دوسرے دونوں معنے باقی رہ جاتے ہیں۔ ہلاک کرنا یا گمراہ قرار دینا۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ چونکہ خدا تعالیٰ عالم الغیب ہے وہ اسی کو گمراہ قرار دے گا جس نے اپنے لئے سب راہیں ہدایت کی بند کر لی ہوں گی۔

اسی مضمون پر مزید روشنی آیت وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (البقرۃ:۲۷) سے بھی پڑتی ہے یعنے خدا تعالیٰ کا کلام بدوں کو گمراہ قرار دیتا ہے۔ نہ کہ نیکوں کو۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ

ان کے لئے ایک عذاب (تو) اس ورلی زندگی میں (ہی مقدر) ہے اور آخرت کا عذاب یقیناً اور

اَشَقُّ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۵﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ

(بھی) سخت ہوگا۔ اور انہیں اللہ (تعالیٰ کے عذاب) سے کوئی بھی بچانے والا نہیں ہوگا اس جنت کا (مثالی) بیان

الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا

جس کا پرہیز گاروں کو وعدہ دیا گیا ہے۔(یہ ہے کہ) اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اس کا پھل

دَآىِٕمٌ وَّ ظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِیْنَ اتَّقَوْا ۖۗ وَّ عُقْبَى

(بھی) ہمیشہ رہنے والا ہوگا اور اس کا سایہ (بھی)۔یہ ان (لوگوں) کا انجام ہوگا جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا (ہوگا)

الْكٰفِرِیْنَ النَّارُ ﴿۳۶﴾

اور انکار کرنے والوں کا انجام (دوزخ کی) آگ ہے۔

حلّ لُغات۔اَشَقُّ شَقَّ سے ہے اور شَقَّ کے معنے ہیں صَدَعَہٗ۔اس کو پھاڑا۔فَرَّقَہٗ ٹکڑے ٹکڑے کیا۔عَلَیْہِ الْاَمْرُ شَقًّا۔ صَعُبَ۔معاملہ مشکل ہوگیا۔عَلٰی فُلَانٍ اَوْقَعَہٗ فِی الْمَشَقَّۃِ کسی کو مشقت میں ڈال دیا۔ (اقرب) اَشَقُّ کے معنے ہوئے بہت سخت۔

اَلْمَثَلُ اَلشِّبْہُ۔مشابہ۔اَلنَّظِیْرُ۔نظیر۔اَلصِّفَۃُ۔ بیان۔اَلْحُجَّۃُ۔ دلیل۔یُقَالُ اَقَامَ لَہٗ مَثَلًا اَیْ حُجَّۃً اور اَقَامَ لَہٗ مَثَلًا میں مثلاً دلیل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اَلْحَدِیْثُ۔عام بات۔اَلْقَوْلُ السَّائِرُ۔ضرب المثل۔اَلْاٰیَۃُ۔نشان۔ جَنَّۃٌ کے معنوں کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہٰذا آیت نمبر ۲۴ جلد ھٰذا۔

تفسیر۔جیسا کہ حل لغات میں بیان ہو چکا ہے جنت اس زمین کو نہیں کہتے جس میں درخت ہوں بلکہ اصل میں سایہ کرنے والی چیز کو کہتے ہیں۔پس تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ سے مراد یہ ہوئی کہ باغوں کے اندر درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔گویا اس سے ایک تو پانی کے قرب کی طرف اشارہ کیا دوسرے اس طرف اشارہ کیا کہ وہ خود نہروں کے مالک ہوں گے۔

نہر سے وسعت عمل پر دلالت ہوتی ہے نہر۔ سہولت سے چلنے والے پانی کو کہتے ہیں۔پس نہر سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہاں انہیں بے روک ٹوک ترقیات حاصل ہوں گی۔نیز نہر سے وسعتِ عمل پر بھی دلالت ہوتی ہے۔کیونکہ دس بیس گھماؤں زمین کے لئے نہر نہیں جاری کی جاتی بلکہ وسیع رقبوں کے لئے جاری کی جاتی ہے۔

پس اس سے اشارہ کیا گیا ہے کہ مومن کے اعمال بہت وسیع ہوتے ہیں۔ وہ کنوئیں کے مینڈک کی طرح محدود نگاہ نہیں رکھتا۔ پھر جمع کا لفظ انہار بول کر یہ بھی بتا دیا کہ نہر کے لفظ سے جن فوائد کی طرف اشارہ ہے وہ کئی اقسام کے ہوں گے۔

نہر کا لفظ روحانی عالم میں عمل کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے نہر کا لفظ روحانی عالم میں عمل کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے۔ پس بتایا ہے کہ جس طرح مومن کے عمل مختلف اور کئی اقسام کے ہوتے ہیں ویسے ہی روحانی عالم میں ان کا تمثل بھی کئی نہروں کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور ہر قسم کے عمل کے مقابل پر ایک نہر جاری ہوگی اور ہر وقت مومن کو توجہ دلاتی رہے گی کہ یہ تمہارا فلاں عمل کام دے رہا ہے۔

اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا۔ ظِلُّهَا میں یہ بتایا ہے کہ وہاں خزاں کبھی نہ آئے گی پتے ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی جنت کی راحتوں اور نعمتوں میں وقفہ نہ ہوگا بلکہ ہمیشہ ہی رہیں گی۔

اکل سے باطن کو راحت ہوتی ہے اور ظِلّ سے ظاہر کو پھر اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا میں یہ بھی اشارہ ہے کہ ظاہری اور باطنی نعمتیں قائم رہیں گی۔ اکل سے باطن کو راحت ہوتی ہے اور ظل سے ظاہر کو۔

وَ عُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ۔ انہوں نے اپنی روحانی ترقیات کو مدنظر نہ رکھا بلکہ دوسروں کے پیچھے چل پڑے اور کہہ دیا کہ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا پر ہم قائم رہیں گے گویا ان کی زندگی اپنے لئے نہ رہی دوسروں کے لئے ہوگئی اس لئے فرمایا ہم بھی تمہیں آگ میں ڈالیں گے جو دوسروں کو فائدہ دیتی ہے اور خود جلتی ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ

اور جن (لوگوں) کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس (کلام الٰہی) سے جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے خوش ہوتے ہیں اور ان

مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ

(مختلف) گروہوں میں سے (بعض) ایسے (بھی) ہیں جو اس کے بعض (حصہ) کا انکار کرتے ہیں تم کہو مجھے (تو)

اَعۡبُدَ اللّٰہَ وَ لَاۤ اُشۡرِکَ بِہٖ ؕ اِلَیۡہِ اَدۡعُوۡا وَ اِلَیۡہِ مَاٰبِ ﴿۳۷﴾

یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور (کسی کو) اس کا شریک نہ ٹھہراؤں میں اسی کی طرف (تم کو) بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میں (بھی) رجوع کرتا ہوں۔

حلّ لُغات۔ اَلۡاَحۡزَابُ اَلۡحِزۡبُ کی جمع ہے۔ اور اَلۡحِزۡبُ کے معنے ہیں۔ اَلطَّائِفَۃُ۔ گروہ۔ جَمَاعَۃُ النَّاسِ۔ لوگوں کی جماعت۔ جُنۡدُ الرَّجُلِ وَاَصۡحَابُہُ الَّذِیۡنَ عَلٰی رَأۡیِہٖ۔ ایسے دوست اور ساتھی جو ہم خیال اور ہم رائے ہوں۔ اَلنَّصِیۡبُ۔ حصہ۔ کُلُّ قَوۡمٍ تَشَاکَلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَاَعۡمَالُہُمۡ فَھُمۡ اَحۡزَابٌ وَاِنۡ لَّمۡ یَلۡقَ بَعۡضُھُمۡ بَعۡضًا۔ تمام وہ لوگ جن کے اعمال اور دل آپس میں مشابہ ہوں۔ اگرچہ وہ آپس میں ملے نہ ہوں۔ احزاب کہلاتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ **مکی زندگی میں بعض اہل کتاب ایمان لے آئے تھے** اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مکی زندگی کے دوران میں بھی بعض اہل کتاب ایمان لے آئے تھے۔ وَالَّذِیۡنَ یَفۡرَحُوۡنَ میں جن لوگوں کی خوشی کا ذکر کیا ہے میرے نزدیک وہ نجاشی اور اس کے ساتھی تھے۔ جو ہجرت حبشہ کے وقت سے ہی ایمان لا چکے تھے۔ حضرت جعفرؓ نے جب ان کو قرآن مجید سنایا تو نجاشی نے کہا کہ میرا بھی یہی ایمان ہے۔ مگر چونکہ ابھی ان کا ایمان ظاہر نہ ہوا تھا وہ صرف مومنوں کی ترقیات کو دیکھ کر ہی خوش ہوتے تھے۔ اس لئے یُؤۡمِنُوۡنَ نہیں فرمایا بلکہ یفرحون فرمایا ہے۔

اٰتَیۡنٰھُمُ الۡکِتٰبَ سے مراد مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اٰتَیۡنٰھُمُ الۡکِتٰبَ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ وہ اسلام کی ترقی کی بشارتوں اور اپنے نیک انجام کی خوشخبریوں کو پا کر خوش ہوتے ہیں۔ مِنَ الۡاَحۡزَابِ مَنۡ یُّنۡکِرُ بَعۡضَہٗ۔ احزاب سے مراد وہ تمام قومیں ہیں جو نبی کی مخاطب ہوتی ہیں۔ مگر ایمان نہیں لاتیں۔ اس میں یہودی، عیسائی، مشرک اور دوسری تمام اقوام مراد ہیں۔

یُنۡکِرُ کے دو معنی یُنۡکِرُ کے دو معنے ہیں۔ ایک انکار کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یا عجیب سمجھتے ہیں۔ بَعۡضَہٗ اس لئے فرمایا کہ جو حصے ان کے مطابق تھے ان سے وہ خوش ہوتے تھے۔ صرف اپنے مذہب یا خیالات کے مخالف حصوں پر ہی ان کو اعتراض تھا۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ سے یہ بتایا کہ ہر نبی کی تعلیم کا مرکزی نقطہ توحید ہوتا ہے۔ اسی نقطہ کے گرد میری تعلیم چکر لگا رہی ہے۔ پھر میں اس کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ دوسرے یُّنۡکِرُ بَعۡضَہٗ سے جو اس طرف اشارہ تھا کہ کفار قرآن کریم کے بعض حصہ کو بدلوانا چاہتے تھے اس کا بھی جواب دیا کہ میں تو تابع ہوں۔ جو حکم ہوتا ہے کہتا ہوں۔ خدا کے کلام کے بدلنے کا مجھے کہاں حق ہوسکتا ہے۔ اگر میں اس کو بدلوں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ میں خدائی کا دعویدار ہوں۔ پس یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا کیونکہ مجھے تو حکم ہی یہی ہے کہ میں ایک خدا کی عبادت کروں۔

اِلَیۡہِ اَدۡعُوۡا کا مطلب اِلَیۡہِ اَدۡعُوۡا سے بتایا کہ میرا تو شروع سے دعویٰ ہے کہ میں اپنی ذات میں کچھ نہیں۔ صرف خدا تعالیٰ کی طرف بلانے والا ہوں۔ پھر میں تمہاری ناپسندیدگی پر اس قرآن کریم میں کیونکر تبدیلی کر سکتا ہوں۔

اِلَیۡہِ مَاٰبِ میں بتایا کہ میرا سارا معاملہ خدا کے ساتھ پیش آنا ہے تو میں اس کی نافرمانی کیسے کر سکتا ہوں۔ تم مانو نہ مانو۔ مجھے اس سے کیا غرض۔ مانو گے تو خود فائدہ اٹھاؤ گے نہ مانو گے تو میرا کیا نقصان ہے؟ پس میں تمہاری خوشی کے لئے خدا تعالیٰ کے کلام میں تبدیلی کس طرح کر سکتا ہوں۔

وَ كَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ حُكۡمًا عَرَبِيًّا ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ

اور اسی طرح ہم نے اسے مفصل حکم کی صورت میں اتارا ہے اور اگر (اے مخاطب) تو نے اس علم کے بعد جو تجھے

بَعۡدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِيٍّ وَّ لَا وَاقٍ ﴿۳۸﴾ ع

حاصل ہو چکا ہے ان (کفار) کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلہ میں نہ (تو) تیرا کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا (ہوگا)۔

حلّ لُغات۔ عَرَبِیًّا اَعۡرَبَ الشَّیۡءَ کے معنے ہیں اَبَانَہٗ وَاَفۡصَحَہٗ کسی چیز کو خوب بین اور واضح کر دیا۔ عَنۡ حَاجَتِہٖ اَبَانَ عَنۡھَا۔ حاجت کو کھول کر بیان کیا۔ کَلَامَہٗ۔ حَسَّنَہٗ وَاَفۡصَحَ وَلَمۡ یَلۡحَنۡ فِی الۡاِعۡرَابِ بات میں حسن پیدا کیا اور اسے خوب واضح کیا۔ اور تلفظ میں بھی کوئی غلطی نہ کی۔ بِحُجَّتِہٖ۔ اَفۡصَحَ بِھَا۔ اپنی بات کھول کر مدلل طور پر بیان کی۔ اور مفردات راغب میں ہے الۡاِعۡرَابُ: اَلۡبَیَانُ کہ اعراب کے معنے بات کو کھولنے اور خوب واضح کرنے کے ہیں۔ پس حُکۡمًا عَرَبِیًّا کے معنے ہوئے مفصل حکم۔ عَرَبِیًّا کی مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۃ یوسف آیت نمبر ۳۔

عَرَبِیٌّ کا لفظ عرب کی طرف منسوب ہے۔ اور عَرَبٌ عَرِبَ یَعْرَبُ کی مصدر بھی ہے اور صفت مشبہ بھی۔ اور نیز یہ عرب کی مصدر ہے اور یہ ملک عرب کا نام بھی ہے اور اس ملک کی اصلی اور پرانی باشندہ قوم کا نام بھی۔

عَرِبَ کے معانی حسب ذیل ہیں۔ جن میں سے ہر ایک میں پری اور بھرا ہوا ہونے کا مفہوم پایا جاتا۔ عَرِبَتِ الْمِعْدَۃُ عَرَبًا تَغَیَّرَتْ وَفَسَدَتْ۔ زیادہ کھانے سے فساد معدہ ہو گیا۔ عَرِبَ الْجُرْحُ نُکِسَ وَغُفِرَ وَبَقِیَ اَثَرُہٗ بَعْدَ الْبُرْءِ۔ زخم اوپر سے اچھا ہو کر اندر سے از سر نو بھر گیا۔ اور اس کا منہ بند رہا۔ تَوَرَّمَ وَتَقَیَّحَ۔ زخم پھول گیا۔ اور اس میں پیپ پڑ گئی۔ فُلَانٌ فَسَدَتْ مِعْدَتُہٗ۔ اسے بدہضمی ہو گئی۔ نَشِطَ۔ اس کے جسم میں چستی پیدا ہو گئی۔ اور امنگ سے بھر گیا۔ فَصُحَ بَعْدَ لُکْنَۃٍ۔ بغیر کسی رکاوٹ کے خوب بولنے لگ گیا اور اس کی صفت مشبہ بھی عَرِبٌ ہی آتی ہے۔ اَلنَّھْرُ غَمَرَ۔ اور جب یہ لفظ نہر یا دریا کے لئے بولا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں بھر گیا۔ اور اس کا پانی بہت اونچا ہو گیا۔ (اقرب)

پس عَرَبٌ مصدر کے ان تمام معانی کا قدر مشترک بھرا ہوا ہونا۔ یا بھر جانا ہوا۔ جس کے ساتھ یاءِ نسبت کے لگنے سے اس کے معنے ہوئے خوب بھری ہوئی چیز۔ کیونکہ یاءِ نسبت کے لگانے سے وصفی معنے کے علاوہ مبالغہ کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے اور عَرِبٌ صفت مشبہ کے معنے بھری ہوئی چیز کے ہوئے۔ اور جب اس کے ساتھ یاءِ نسبت لگائی جائے تو جس طرح اَحْمَرُ کے مقابلہ میں اَحْمَرِیٌّ کے معنے بہت سرخ کے اور عَبْقَرٌ کے مقابلہ میں عَبْقَرِیٌّ کے معنی نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی چیز کے ہوتے ہیں اسی طرح اس کے معنے ہوں گے۔ خوب بھری ہوئی چیز اور جب یہ لفظ کسی کتاب کی صفت واقع ہو تو ان معنوں کی رو سے کِتَابٌ عَرَبِیٌّ کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ نہایت پر معانی کتاب ہے۔ کیونکہ جس چیز سے کسی کتاب کو بھری ہوئی کہا جا سکتا ہے وہ اس کے معانی اور مطالب ہی ہو سکتے ہیں۔ اور جب ایک زبان کو اس صفت سے موصوف کریں گے تو اس کا یہ مدعا ہو گا کہ اس کے مفردات نہایت ہی کثیر المعانی اور وسیع مفہوم رکھنے والے ہیں۔

اور عَرُبَ عَرَبًا کے معنے ہیں کَانَ عَرَبِیًّا خَالِصًا وَلَمْ یَلْحَنْ: تَکَلَّمَ بِالْعَرَبِیَّۃِ وَکَانَ عَرَبِیًّا فَصِیْحًا۔ زبان کا ہر ایک نقص سے پاک اور خالص عربی اور خوب واضح ہونا۔ فصیح عربی بولنا اور اپنے مدعا کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کرنا۔ (اقرب)

اور یائے نسبت کے لگانے سے اس کے معنے نہایت فصیح اور خوب واضح ہر ایک نقص سے بالکل پاک کے ہو جائیں گے۔ اور ان معنوں کی مزید وضاحت اس لفظ کی مختلف تصریفات سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ اقرب الموارد

میں ہے اَعْرَبَ الشَّیْءَ اَبَانَہٗ وَاَفْصَحَہٗ خوب بین اور واضح کر دیا۔ عَنْ حَاجَتِہٖ اَبَانَ عَنْھَا کھول کر بیان کیا۔ کَلَامَہٗ: حَسَّنَہٗ وَاَفْصَحَ وَلَمْ یَلْحَنْ فِی الْاِعْرَابِ۔ بات میں حسن پیدا کیا۔ اور اسے خوب واضح کیا۔ اور تلفظ میں بھی کوئی غلطی نہ کی۔ بِحُجَّتِہٖ: اَفْصَحَ بِھَا۔ اپنی بات خوب کھول کر مدلل طور پر بیان کی۔ اور مفردات راغب میں ہے اَلْعَرَبِیُّ :اَلْمُفْصِحُ۔ عربی کے معنی ہیں اپنے مدعا کو خوب صفائی اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والا۔ وَالْاِعْرَابُ اَلْبَیَانُ۔ اور اعراب کے معنے کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں۔ پس ان معنوں کی رو سے قُرْاٰنٌ عَرَبِیٌّ کے معنی ہوئے ایسی کتاب جو ہمیشہ پڑھی جانے والی اور اپنے مطالب کو نہایت وضاحت کے ساتھ اور مدلل طور پر بیان کرنے والی ہے۔

اَھْوَاءُ ھَوٰی کی جمع ہے اور اَلْھَوٰی کے معنے ہیں اِرَادَۃُ النَّفْسِ۔ ارادہ۔ خواہش۔ فُلَانٌ اتَّبَعَ ھَوَاہُ اِذَا اُرِیْدَ ذَمُّہٗ۔ اور جب فُلَانٌ اتَّبَعَ ھَوَاہُ کا محاورہ بولتے ہیں تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی خواہشات کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اور یہ بول کر مذمت مقصود ہوتی ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ عَرَبِیًّا کے لفظ سے عربی ہونا مراد نہیں عَرَبِیًّا کے لفظ میں صرف عربی ہونا مراد نہیں کیونکہ عربی تو ہر عرب بولتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے الفاظ میں معانی کی ایسی وسعت ہے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے اس وسعت کو کوئی پیدا نہیں کر سکتا۔ پس اگر اسے بدلا جائے تو فوراً اس کی شان میں کمی آ جائے گی۔ کہتے ہیں کسی امیر نے ایک ادیب سے کہا کہ قرآن کی مثل تو بناؤ۔ اس نے کہا اس کے لئے فارغ دماغ چاہیے۔ عمدہ باغ عمدہ مکان اور فراغت کی ضرورت ہے۔ امیر نے سب کچھ مہیا کر دیا۔ نوکر چاکر دے دیئے۔ وہ عمدہ لباس پہنتا۔ عیش کرتا اور خوب سیر کرتا رہتا۔ چھ ماہ کی مقررہ میعاد کے بعد جب اس امیر نے سوال کیا کہ کیا کچھ تیار کیا تو ادیب نے کاغذوں کا ایک انبار دکھا کر کہا کہ میں اس عرصہ میں فارغ نہیں بیٹھا رہا۔ میں نے دیانتداری سے کام کیا ہے اور یہ ڈھیر اس کی شہادت ہے۔ مگر قرآن کی مثل مجھ سے نہیں بن سکی۔ کیونکہ جو آیت نکالتا ہوں اس میں لکھا ہوتا ہے ہم یوں کر دیں گے، تیرے دشمنوں کو یوں تباہ کیا جائے گا اور تیرے دوستوں کو یوں ترقی دی جائے گی۔ مگر میں ان باتوں میں سے کوئی بھی نہیں لکھ سکتا۔ میں تو روٹی بھی تیری کھاتا ہوں۔ پس مجھ سے قرآن کی مثل نہیں بن سکی۔

عَرَبِیًّا کا یہی مطلب ہے کہ اس میں غیر معمولی وسعتِ مضامین رکھی گئی ہے۔ جو انسانی طاقت سے بالاتر ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ میں ہر مخاطب بھی مراد ہے اور آنحضرتؐ بھی مراد ہو سکتے ہیں وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَھُمْ۔ اس میں ہر مخاطب بھی مراد ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اور اس صورت میں

شان ایزدی کا اظہار ہوگا۔ کہ تیری اپنی کوئی ہستی نہیں۔ یہ نَے تو اسی وقت تک دل لبھانے والی آواز سے بجتی ہے جب تک کہ آسمانی بادشاہ کے منہ میں ہے اس کے منہ سے ہٹا لو تو خالی لکڑی ہی لکڑی ہے اور کچھ بھی نہیں۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ

اور ہم نے تجھ سے پہلے (بھی) یقیناً کئی رسول بھیجے تھے اور انہیں بیویاں اور بچے (بھی) دیئے تھے اور کسی رسول

ذُرِّيَّةً ؕ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ

کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اللہ (تعالیٰ) کے اذن کے سواء (اپنی قوم کے پاس) کوئی نشان لاتا ہر زمانہ کی انتہاء کے لئے

اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۹﴾

(خدا تعالیٰ کی طرف سے) ایک (خاص) حکم ہوتا ہے۔

حلّ لغات۔ اَلْاِذْنُ کے معنے ہیں اَلْاِجَازَةُ۔ اجازت۔ اَلْاِرَادَةُ۔ ارادہ۔ اَلْعِلْمُ۔ علم۔ (اقرب)

اَلْاَجَلُ اَلْاَجَلُ کے معنے ہیں مُدَّةُ الشَّيْءِ۔ کسی چیز کی مدت۔ وَوَقْتُهُ الَّذِيْ يَحِلُّ فِيْهِ۔ کسی امر کی وہ مدت جب جا کر وہ واقعہ ہوتا ہے۔ (اقرب)

اَلْكِتَابُ اَلْكِتَابُ کے معنے ہیں اَلْحُكْمُ۔ حکم۔ اَلْفَرْضُ۔ فرض۔ اَلْقَدْرُ۔ قدر۔ اندازہ۔ (اقرب)

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ کے معنے لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ کے معنے ہوئے ہر مدت کے لئے فیصلہ الٰہی میں حکم موجود ہے۔ کتاب کی اجل نہیں کہا بلکہ اجل کی کتاب کہا ہے۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ نکلنے کے لئے ایک خاص حکم ہے۔ ایک خاص وقت ہے۔

تفسیر۔ اس آیت میں پہلے مضمون کو دہرایا ہے۔ یعنی جو مضمون پہلے رکوع میں آیا تھا اسی کو آخر میں دوبارہ بیان کیا ہے۔ جو یہ ہے کہ جس قسم کے حالات میں پہلے رسول آتے رہے انہی حالات کے ماتحت تو آیا ہے۔

کفار کا یہی سوال تھا کہ تو بے سامان آیا ہے۔ سو اس کا یہ جواب فرمایا کہ تجھ سے پہلے بھی جو رسول ہم نے بھیجے تھے وہ بھی تو اسی طرح بے سامان ہی آئے تھے۔ ان کے ساتھ بھی تیری طرح انسانی حاجتیں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے بھی بیوی بچے تھے۔ جن کی پرورش کا انہیں انتظام کرنا پڑتا تھا۔ جسمانی ذمہ داریاں تھیں جنہیں ادا کرنا پڑتا تھا۔ مگر

باوجود حاجات کی موجودگی کے اور سامانوں کے فقدان کے وہ کامیاب ہوئے۔

بیوی بچوں کا ذکر یہ بتانے کے لئے کیا کہ آزاد انسان زیادہ دلیری سے قربانی کرسکتا ہے۔لیکن بیوی بچے کام میں قدم قدم پر روک ہوتے ہیں۔ پس گویا دوہری روکیں ان کے راستہ میں بھی تھیں۔اول سامان نہ تھے۔پھر جو سامان میسر تھے ان کے استعمال میں بھی بیوی بچوں کی وجہ سے روکیں تھیں۔مگر پھر بھی وہ کامیاب ہوئے۔اسی طرح اب محمد رسول اللہ صلعم کامیاب ہوں گے۔مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ گو ہم نے انہیں کامیاب کیا۔اور یہ عظیم الشان صداقت کا نشان ان کو ملا لیکن ہم نے یہ نہیں کیا کہ ان کے لئے لوگوں کی مرضی کے مطابق نشان دکھایا ہو۔جو نشان ہم نے مناسب سمجھا وہ دکھایا۔قرآن کریم میں جہاں کفار کی طرف سے نشان کے مطالبہ کا ذکر ہو اور ساتھ تشریح نہ ہو وہاں نشان سے مراد عذاب ہوتا ہے۔پس اس جگہ بھی عذاب ہی مراد ہے۔اور چونکہ اس جگہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر خدا تعالیٰ نے نبیوں کو دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا تو کیا روک تھی کہ ان کے ہاتھوں میں سزا بھی رکھ دیتا۔تا کہ لوگوں کو حق کی مخالفت کی جرأت نہ رہتی۔آخر دنیوی حکومتیں بھی تو اپنے ماتحتوں کو ایک حد تک سزا کا اختیار دیتی ہیں۔ اس کا جواب لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ کے الفاظ میں دیا جس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی حالت کا اندازہ لگا کر نہ صرف یہ فیصلہ کیا ہے کہ کس کس عمل کی کیا کیا پاداش چاہیے بلکہ یہ بھی کہ کس عمل کا نتیجہ کس وقت نکلنا اس شخص اور دوسرے شخصوں کے لئے زیادہ مفید ہوگا؟ اور ہر سزا کے لئے اس نے ایک وقت مقرر کر چھوڑا ہے۔اگر وہ سزا نبیوں کے ہاتھ میں رکھتا تو وہ چونکہ عالم الغیب نہ ہوتے وہ سزا لوگوں کے مطالبہ پر دے کر اس حکمت کو باطل کر دیتے۔دنیوی حکومتوں اور آسمانی حکومت میں یہ بھی ایک فرق ہے کہ دنیوی حکومتیں جرم کے مطابق سزا تجویز کر کے ہر جرم پر سزا دے دیتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ صرف یہی نہیں دیکھتا کہ کس نے جرم کیا ہے بلکہ یہ بھی کہ اس جرم کی سزا کو کس وقت جاری کیا جائے؟ تو زیادہ مؤثر یا زیادہ مفید ہوگی۔یہ ایک اہم سوال ہے کہ سزا کا وقت سزا کے اثر کو بہت کچھ بڑھا گھٹا دیتا ہے۔اور اس لئے کامل اور بے عیب فیصلہ وہی ہوسکتا ہے جس میں سزا کی تعیین ہی نہ ہو بلکہ سزا کے وقت کو بھی حکمت کے ماتحت معین کیا جائے۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ میں تقدیم وتاخیر نہیں اس آیت کو مفسرین نے بڑا غلط سمجھا ہے۔انہوں نے اس میں تقدیم تاخیر مانی ہے اور اس کے یہ معنی سمجھے ہیں کہ ہر کتاب کے لئے ایک وقت ہے۔حالانکہ خدا تعالیٰ کو تقدیم وتاخیر کی ضرورت نہیں۔جو لفظ اس آیت میں ہے جس ترتیب سے ہے وہی صحیح ہے۔کتاب کی اجل نہیں بتائی۔بلکہ اجل کی کتاب کا ہی ذکر ہے اور کوئی تقدیم وتاخیر نہیں بلکہ یہ فرما کر کہ ہر مدت کے لئے فیصلہ الٰہی میں حکم موجود ہے ایک

نہایت لطیف اور جدید مضمون پر روشنی ڈالی ہے جس کا ذکر اجمالاً اوپر آ چکا ہے۔

خلاصہ یہ کہ نبیوں کو سزا جزاء کا اس لئے اختیار نہیں دیا کہ وہ عالم الغیب نہیں۔ اور نہیں جان سکتے تھے کہ کس وقت کون سا حکم جاری ہونا چاہیے۔ آیا سزا کا یا عفو کا یا تاخیر سزا کا؟ اگلی آیت اسی مضمون کی تصدیق کرتی ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚۖ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۴۰﴾

جس چیز کو اللہ (تعالیٰ) چاہتا ہے مٹاتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) قائم کرتا ہے اور اسی کے پاس (تمام) احکام کی اصل (اور جڑ) ہے۔

حلّ لُغَات۔ **يَمْحُوْ** مَحَا سے مضارع کا صیغہ ہے اور مَحَا الشَّیْءَ کے معنے ہیں زَالَ وَذَهَبَ اَثَرُهٗ۔ کوئی چیز مٹ گئی اور اس کا نشان جاتا رہا۔ فُلَانٌ الشَّیْءَ۔ اَزَالَهٗ وَاَذْهَبَ اَثَرَهٗ۔ کسی چیز کو مٹایا اور اس کا اثر دور کیا۔ یعنی مَحَا کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ (اقرب)

يُثْبِتُ اَثْبَتَ ماضی سے مضارع کا صیغہ ہے اور اَثْبَتَ کے معنے ہیں عَرَفَهٗ حَقَّ الْمَعْرِفَةِ کسی بات کو خوب واضح کیا۔ حَبَسَهٗ وَجَعَلَهٗ ثَابِتًا فِي مَكَانِهٖ لَا يُفَارِقُهٗ۔ کسی چیز کو اس کی جگہ پر ایسا مضبوط کیا کہ وہ اپنی جگہ سے علیحدہ نہ ہو سکے۔ الحقَّ أَكَّدَهٗ۔ حق و پختہ کیا۔ اِسْمَهٗ فِي الدِّيْوَانِ۔ كَتَبَهٗ۔ نام رجسٹر میں لکھا۔ (اقرب) پس يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ کے معنے ہوئے کہ جسے چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔ یعنی اگر چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اگر چاہتا ہے عذاب ٹال دیتا ہے۔

أَلْاُمُّ کے معنے ہیں اَلْوَالِدَةُ۔ ماں۔ أُمُّ الشَّيْءِ: اَصْلُهٗ۔ کسی چیز کا اصل۔ أُمُّ الطَّرِيْقِ۔ مُعْظَمُهٗ۔ راستے کا فراخ حصہ۔ (اقرب) أُمُّ الْكِتَابِ کے معنے ہوئے کتاب کی اصل۔ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ سے یہ مراد ہے (۱) کہ احکام کی حکمت خدا کو معلوم ہے۔ (۲) تمام احکام شریعت صفات الٰہیہ پر مبنی ہیں۔ پس شریعت کی جڑ گویا خدا تعالیٰ کے پاس ہے کیونکہ شریعت کے احکام اسی کی صفات کی شاخیں ہیں۔

تفسیر۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ عذاب کا وقت نہ آیا ہو مگر اللہ تعالیٰ پھر بھی عذاب دے دے۔ ہاں یہ ہو جاتا ہے کہ عذاب کا وقت تو آ جائے مگر اس کی کسی حکمت کے ماتحت وہ عذاب ٹل جائے۔

عذاب کے متعلق دو قانون عذاب کے متعلق دو قانون بیان فرمائے ہیں۔ ایک يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ

دوسرے وَ یُثْبِتُ یعنے یا عذاب کو مٹا ڈالتا ہے۔ عذاب دیتا ہی نہیں یا عذاب کو قائم رکھتا ہے۔ مگر بغیر استحقاق کے عذاب کبھی نہیں آتا۔ نہ استحقاق سے زیادہ آتا ہے۔ استحقاق کی حد تک عذاب دینا یا اس سے کم دینا یہ اصول ہمیشہ آسمانی عذابوں میں مدنظر رہتا ہے اور یہی اصل ہر شخص کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ جو با اخلاق بننا چاہے۔ جو لوگ غصہ کی حالت میں دشمن کو پیس کر رکھ دینا چاہتے ہیں یا عفو کرنا نہیں چاہتے وہ صفات الٰہیہ کے خلاف چلتے ہیں اور کبھی سچے مسلمان نہیں کہلا سکتے۔

اُمُّ الْکِتٰبِ کے دو معنی ام کے معنے جڑ کے ہیں۔ پس عِنْدَہٗٓ اُمُّ الْکِتٰبِ کے دو معنے ہوں گے۔ (۱) احکام کی حکمت خدا تعالیٰ کو ہی معلوم ہے اس لئے اس کی ہدایت سے تم صحیح راستہ معلوم کر سکتے ہو۔ انسان اپنی ذاتی اغراض اور نفسانی خواہشات کے اثر کے نیچے کبھی بھی اس قدر بلند نہیں ہوتا کہ تمام عالم کی ضرورت کو مدنظر رکھ سکے۔ وہ جو احکام تجویز کرتا ہے نفسانیت سے ملوث ہوتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی نظر سب عالم کی ضرورت اور آئندہ نتائج پر بھی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا حکم کامل اور صحیح ہدایت کے مطابق ہوتا ہے۔ دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ تمام احکام شریعت صفات الٰہیہ پر مبنی ہیں پس شریعت کی جڑ گویا خدا تعالیٰ کے پاس ہوئی۔ کیونکہ شریعت کے احکام اسی کی صفات کی شاخیں ہیں۔ اس میں یہ لطیف نکتہ بیان کیا ہے کہ اخلاق کامل اللہ تعالیٰ کی صفات کی کامل اتباع اور پوری نقل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ جو شخص اچھے یا برے اخلاق کی تشریح انسانی اعمال کو سامنے رکھ کر کرنا چاہے کامیاب نہ ہوگا۔

نیکی کی تعریف نیکی کی تعریف یہی ہے کہ صفات الٰہیہ کی نقل ہو۔ اور بدی کی تعریف یہی ہے کہ صفات الٰہیہ کے مخالف ہو۔ اس تعریف سے وہ سب مشکلات حل ہو جاتی ہیں جو فلسفیوں کو نیکی اور بدی کی تعریف کرنے میں پیدا ہوتی ہیں۔ تیسرے معنے یہ ہیں کہ چونکہ احکام کا مقصد اسی کو معلوم ہے اس لئے سزا اسی کے اختیار میں ہونی چاہیے۔ کئی شدید دشمن بعد میں ایمان لے آتے ہیں۔ جیسے اسلام میں عکرمہؓ۔ خالدؓ اور عمروؓ بن عاص کے وجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی جانتا تھا کہ باوجود اسلام کی مخالفت کے وہ لوگ عذاب سے بچانے کے قابل ہیں کیونکہ کسی دن اسلام کی عظیم الشان خدمات کا موقع پائیں گے۔

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ

اورجس (عذاب کے بھیجنے) کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں اگر ہم اس کا کوئی حصہ (تیرے سامنے بھیج کر) تجھے دکھا

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾

دیں (تو تو بھی انکا انجام دیکھ لے گا) اور (اگر) ہم (اس گھڑی سے پہلے) تجھے وفات دے دیں (تو تجھے بعد الموت اس کی حقیقت معلوم ہوجائے گی کیونکہ) تیرے ذمہ (ہمارے حکم اور پیغام کا) صرف پہنچا دینا ہے۔اور (ان کا) حساب لینا ہمارے ذمہ ہے۔

حلّ لُغات۔نَتَوَفَّيَنَّكَ ہم تجھے وفات دے دیں۔مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ یونس آیت نمبر ۴۷۔

نَتَوَفَّيَنَّ باب تفعل سے فعل مضارع ہے جس کا ماخذ وَفَاۃٌ ہے۔چنانچہ کلیات ابی البقاء میں لفظ تَوَفّٰی کے ذیل میں ہے وَالْفِعْلُ مِنَ الْوَفَاۃِ اور وفات کے معنی موت کے ہیں۔(اقرب) تَوَفَّى اللّٰهُ زَيْدًا قَبَضَ رُوْحَهٗ۔ اس کی جان نکال لی۔اسے وفات دے دی۔اس کی روح کو قبض کرلیا۔تُوُفِّيَ فُلَانٌ مَجْهُوْلًا قُبِضَتْ رُوْحُهٗ وَمَاتَ۔اس کی جان نکال لی گئی اور وہ مرگیا۔فَاللّٰهُ الْمُتَوَفِّيْ وَالْعَبْدُ الْمُتَوَفّٰى۔غرض ان معنوں میں اس کے استعمال کے وقت اس کا فاعل اللہ اور مفعول بندہ ہوتا ہے۔(اقرب)

بَعْضُ كُلِّ شَيْءٍ کے معنے ہیں اَیْ طَائِفَةٌ مِّنْهُ ساری چیز کا ایک بڑا حصہ۔وَقِيْلَ جُزْءٌ مِّنْهُ۔اور بعض محققین کے نزدیک کسی چیز کے ایک تھوڑے سے حصے پر بھی بَعْضٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔وَيَجُوْزُ كَوْنُهٗ اَعْظَمُ مِنْ بَقِيَّتِهٖ كَالثَّمَانِيَةِ مِنَ الْعَشَرَةِ۔اور بعض کا لفظ کسی چیز کے بڑے حصہ کے لئے بھی استعمال ہوسکتا ہے جیسے دس میں سے آٹھ کو بعض کہیں۔حالانکہ آٹھ بقیہ دو سے بہت زیادہ ہیں۔(اقرب) تو اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ کے معنے یہ ہوئے کہ اگر وعدے کا کوئی حصہ ہم تجھے دکھا دیں زیادہ ہو یا کم۔

تفسیر۔یعنی جب ہماری سزا کا اصول ہی اصلاح اور انصاف ہے نہ کہ غصہ نکالنا تو پھر اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ عذاب کی بعض پیشگوئیاں ٹل جائیں ہوسکتا ہے کہ بعض پیشگوئیاں جو عذاب کے متعلق ہیں پوری ہو جائیں اور تو انہیں دیکھ لے اور بعض ٹل جائیں۔مگر اس سے گھبرانا نہیں چاہیے کیونکہ آخری حساب تو اللہ تعالیٰ نے ہی کرنا

ہے۔ جو لوگ ان ٹل جانے والی پیشگوئیوں پر اعتراض کرنے والے ہیں وہ آخر خدا تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں گے اور سب حقیقت ان پر کھل جائے گی۔ جب اصل غرض بلاغ یعنی تبلیغ ہے تو پھر امر تبلیغ کے مقصد کے تابع ہی رکھا جائے گا۔ نہ کہ تبلیغ و اصلاح کو نظر انداز کیا جائے اور سزا کو مقدم۔

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُہَا مِنۡ اَطۡرَافِہَا ؕ وَ

اور کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم ملک کو اس کی (تمام) اطراف سے کم کرتے چلے آ رہے ہیں اور فیصلہ (تو)

اللّٰہُ یَحۡکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکۡمِہٖ ؕ وَ ہُوَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۴۲﴾

اللہ (تعالیٰ) کرتا ہے کوئی اس کے فیصلہ کو تبدیل کرنے والا نہیں اور وہ جلد حساب لینے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ نَأْتِیۡ اَتٰی سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے اور اَتَاہُ کے معنے ہیں جَاءَہٗ۔ اس کے پاس آیا۔ وَالۡاَمۡرَ۔ فَعَلَہٗ۔ اور جب اَتٰی کا مفعول اَلۡاَمۡرَ ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں کام کو کیا۔ اَتَی الۡمَکَانَ۔ حَضَرَہٗ۔ کسی جگہ گیا۔ اَتٰی عَلَی الشَّیۡءِ۔ اَنۡفَدَہٗ۔ اس کو ختم کیا۔ وَبَلَغَ اٰخِرَہٗ اور اس کے انتہاء تک پہنچا۔ اَتٰی عَلَیۡہِ الدَّھۡرُ۔ اَھۡلَکَہٗ۔ زمانہ نے اسے ہلاک کیا۔ (اقرب)

أَطۡرَافِھَا اَطۡرَافُھَا طَرَفٌ۔ اور طَرَفٌ کی جمع ہے اور اَلطَّرَفُ کے معنے ہیں حَرۡفُ الشَّیۡءِ وَ نِھَایَتُہٗ۔ کسی چیز کا کنارہ اور اس کی انتہاء۔ اَلنَّاحِیَۃُ۔ جانب۔ طَائِفَۃٌ مِّنَ الشَّیۡءِ کسی چیز کا بڑا حصہ۔ اَلرَّجُلُ الۡکَرِیۡمُ۔ شریف آدمی اور الطَّرَفُ کے معنے ہیں مُنۡتَھٰی کُلُّ شَیۡءٍ ہر چیز کا انتہاء اَلۡکَرِیۡمُ مِنَ الۡفِتۡیَانِ وَالرِّجَالِ۔ معزز نوجوان ہو یا بڑا آدمی۔ اَلۡاَطۡرَافُ مِنَ النَّاسِ۔ خِلَافُ الرُّؤُوۡسِ۔ عام لوگ۔ مِنَ الۡاَرۡضِ۔ اَشۡرَافُھَا وَعُلَمَآؤُھَا۔ اَطۡرَافٌ مِّنَ الۡاَرۡضِ کے معنے ہیں معزز یا عالم لوگ۔ ھُوَ مِنۡ اَطۡرَافِ الۡعَرَبِ۔ اَیۡ مِنۡ اَشۡرَافِھَا وَاَھۡلِ بُیُوۡتَاتِھَا جب کسی کے متعلق ھُوَ مِنۡ أَطۡرَافِ الۡعَرَبِ کا محاورہ استعمال کریں تو یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ عرب معزز ترین خاندان میں سے ہے۔ گویا یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ (اقرب)

لَا مُعَقِّبَ لِحُکۡمِہٖ کے معنے ہیں اَیۡ لَا رَادَّ لَہٗ وَلَا نَاقِضَ لَہٗ۔ اس کے فیصلہ کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں یا اس کے حکم کو کوئی توڑنے والا نہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ عیسائی مصنفین اعتراض کیا کرتے ہیں کہ قرآن کریم سے ثابت نہیں ہوتا کہ محمد (رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم) نے کبھی کوئی آیت (یعنی نشان) دکھائی ہو۔ ہاں یہ دعویٰ بے شک ہے کہ دکھائیں گے (A Comprehensive Commentary on the Quran by Wherry, ch.2,verse 118)۔اس آیت میں اس کا کیسا کھلا جواب موجود ہے۔فرماتا ہے ہم نے ان کو نشان تو دکھایا ہے مگر یہ دیکھتے نہیں۔کیا ان کو معلوم نہیں کہ ہم زمین کو اس کے اطراف سے کم کرتے چلے آرہے ہیں۔یعنی سابق پیشگوئیوں کے مطابق اسلام کی فتح کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ ہر گھر میں سیندھ لگ رہی ہے۔ان کی اولادیں مسلمان ہو رہی ہیں۔اور غلام مسلمان ہو رہے ہیں۔ بڑے لوگوں میں سے بھی ایک حصہ ایمان لا رہا ہے۔اور عوام میں سے بھی۔غرض سوسائٹی کے ہر طبقہ میں سے کچھ لوگ ایمان لا رہے ہیں۔

الارض سے مراد عرب بھی ہوسکتا ہے۔یعنی عرب کے اطراف میں اسلام کی اشاعت ہو رہی ہے۔مثلاً یمن میں لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔غفار میں سے ابوذر غفاریؓ ایمان لے آئے۔ مدینہ منورہ میں لوگ اسلام لائے۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں سے بعض یہودی اور عیسائی بھی اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

نَأۡتِي الۡاَرۡضَ سے یہ مراد بھی ہوسکتا ہے کہ ہر قسم کے کفار فنا ہو رہے ہیں۔ کیونکہ اتی اللہ کے معنی قرآن کریم میں سزا اور عذاب کے بھی آتے ہیں۔ جیسے کہ فرماتا ہے فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنۡ حَيۡثُ لَمۡ يَحۡتَسِبُوۡا۔ (الحشر:۳) اللہ تعالیٰ کفار کے پاس وہاں سے آیا جہاں سے آنے کا ان کو خیال بھی نہ تھا۔یعنی ان کو ایسی سزا دی جس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔اس صورت میں یہ معنے ہوں گے کہ ان کے بڑے لوگ بھی سزا پا رہے ہیں اور عوام بھی۔ یا یہ کہ عرب کے چاروں گوشوں میں عذاب آرہے ہیں۔

مطلب یہ کہ کفار ان امور سے نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے نشان ان میں ظاہر ہو رہے ہیں اور اسلام کی ترقی کے سامان پیدا ہو رہے ہیں۔

وَاللّٰهُ يَحۡكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكۡمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ۔ یعنی اصل چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے۔جب خدا تعالیٰ اس رسول کے ساتھ ہے تو اس کے راستہ میں کون روک بن سکتا ہے۔خدا تعالیٰ کے حکم کو ٹالنے کی طاقت ہی کسے ہے؟

اس آیت سے سبق ملتا ہے کہ مومن کو چاہیے کہ دشمن کی باتوں سے نہ گھبرائے۔اللہ تعالیٰ کے حکم کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔وَهُوَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جلدی حساب لینا شروع کر دیتا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ جب وہ حساب لینے لگے گا تو جلدی سے لے لے گا۔یوں تو وہ عذاب میں تاخیر ہی کرتا ہے مگر جب

حساب لینے پر آتا ہے تو فوراً لے لیتا ہے اور اس کے حکم میں کوئی روک نہیں بن سکتا۔

وَ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ يَعْلَمُ

اور جو (لوگ) ان سے پہلے تھے انہوں نے (بھی انبیاء کے خلاف اسی طرح مخالفانہ) تدبیریں کی تھیں (مگر ان کی

مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَ سَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى

کوئی پیش نہ گئی) پس تدبیر کرنا تو کلی طور پر اللہ (تعالیٰ) ہی کے اختیار میں ہے ہر شخص جو کچھ (بھی) کرتا ہے وہ (یعنے

الدَّارِ ﴿۴۳﴾

اللہ) اسے جانتا ہے اور ان کافروں کو ضرور (اور جلد) معلوم ہو جائے گا کہ اس (آنے والے) گھر کا (اچھا) انجام کس کے لئے (مقدر) ہے۔

حلّ لُغات۔ مَكَرَهٗ کے معنے ہیں خَدَعَهٗ۔ اس کو دھوکا دیا۔ اَللّٰهُ فُلَانًا۔ جَازَاهُ عَلَى الْمَكْرِ۔ جب اللہ تعالیٰ کے لئے مَكَرَ کا لفظ آئے تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مکر کا بدلہ دیا۔ قِيْلَ الْمَكْرُ صَرْفُ الْاِنْسَانِ عَنْ مَقْصَدِهٖ بِحِيْلَةٍ۔ بعض نے کہا کہ کسی کو اس کے قصد سے کسی حیلہ کے ذریعہ سے پھیرنے کا نام مکر ہے۔ وَهُوَ نَوْعَانِ مَحْمُوْدٌ يُّقْصَدُ فِيْهِ الْخَيْرُ وَمَذْمُوْمٌ يُقْصَدُ فِيْهِ الشَّرُّ۔ اور مکر اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ (اقرب)

تَكْسِبُ كَسَبَ میں سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور كَسَبَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں جَمَعَهٗ اس کو جمع کیا۔ اور جب كَسَبَ مَالًا وَعِلْمًا کہا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ طَلَبَهٗ وَرَبِحَهٗ۔ یعنی اس نے مال وعلم حاصل کرنے کی کوشش کی اور کامیاب ہو گیا۔ وَالْاِثْمَ تَحَمَّلَهٗ اور جب كَسَبَ کا مفعول اَلْاِثْم ہو تو اس کے معنے ہوں گے تَحَمَّلَهٗ۔ گناہ کا مرتکب ہوا۔ اور كَسَبَ لِاَهْلِهٖ کے معنے ہیں طَلَبَ الْمَعِيْشَةَ اپنے اہل وعیال کے لئے روزی کو حاصل کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ۔ تمہاری تدبیر کس طرح کارگر ہو سکتی ہے جبکہ وہ تمہاری تمام تدابیر کو جانتا ہے اس لئے وہ ان کو توڑ ڈالے گا۔ جیسے ایک آنکھوں والا کئی اندھوں کی سرکوبی کے لئے کافی ہوتا ہے۔

وَ سَیَعۡلَمُ الۡکُفّٰرُ لِمَنۡ عُقۡبَی الدَّارِ یعنی کفار جو تدابیر کرتے ہیں ان کو تو ہم جانتے ہیں مگر ان کے برخلاف جو تدابیر ہم اختیار کر رہے ہیں ان کا ان کفار کو کوئی علم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے جب کفار کو نقصان پہنچ جائے گا تبھی انہیں معلوم ہوگا کہ انجام کس کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں س زور دینے کے لئے آیا ہے یعنی کفار ضرور جان لیں گے کہ انجام کس کا اچھا ہے؟ اور اس کے معنوں میں قریب کے زمانہ پر بھی دلالت ہوتی ہے اور جاننے کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ بالضرور انجام مسلمانوں کا ہی اچھا ہوگا۔ دوسرے اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ بڑے بڑے کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی کو دیکھ کر مریں گے۔

وَ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَسۡتَ مُرۡسَلًا ؕ قُلۡ کَفٰی بِاللّٰہِ

اور جن لوگوں نے (تیرا) انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ تو (خدا کا) بھیجا ہوا نہیں ہے تو (انہیں) کہہ (کہ) اللہ (تعالیٰ)

شَہِیۡدًۢا بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ ۙ وَ مَنۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ الۡکِتٰبِ ﴿۴۴﴾ ع ۶

میرے درمیان اور تمہارے درمیان کافی گواہ ہے اور (اسی طرح پر) وہ (شخص بھی گواہ ہے) جس کے پاس اس (مقدس) کتاب کا علم (آچکا) ہے۔

تفسیر۔ نبی کے مخالفین کی دماغی خرابی کی یہ علامت ہے کہ وہ ہر دلیل کو سن کر انکار کرتے ہیں اور واضح سے واضح برہان پر شک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ دلیل بجائے خود نبی کے سچا ہونے کی علامت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب کسی قوم کے علماء کی یہ حالت ہو کہ وہ واضح اور ظاہر بات کو نہ سمجھ سکیں تو عوام کی حالت لازماً قابلِ رحم ہوگی اور اگر وہ وقت نبی کی آمد کا نہ ہو تو اور کون سا وقت اس کی بعثت کے مناسب ہوسکتا ہے؟ اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ ان سب دلائل کو سن کر بھی دشمن یہی کہے گا کہ خواہ کچھ کہو میں تو نہ مانوں گا۔ اور یہی کہوں گا کہ تو رسول نہیں ہے مگر تو اس سے چڑیو نہیں۔ تو یہی جواب دیجئو کہ میری شہادت خدا تعالیٰ دے رہا ہے۔ تو مجھے انکار کی کیا پرواہ ہے؟

اسی طرح جو لوگ کتب سماویہ کا صحیح علم رکھتے ہیں وہ میرے شاہد ہیں۔ پس ان شہادتوں کی موجودگی میں تمہارے انکار کی کیا قدر ہے؟

یہی دو شہادتیں نبیوں کو فتح دیتی ہیں۔ یعنی تازہ آسمانی شہادت اور پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں۔ ان دو گواہوں

سے بڑھ کر کبھی کوئی اور شہادت کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔اس وقت بھی انہی دو شہادتوں پر زور دے کر اسلام کی ترقی کی مہم سر کی جا سکتی ہے۔

۞ ۞ ۞ ۞ ۞

سُوْرَۃُ اِبْرَاھِیْمَ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ ابراہیم۔ یہ سورت مکی ہے

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ ثَلَاثٌ وَّ خَمْسُوْنَ اٰيَةً وَ سَبْعَةُ رُكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی ترپن آیتیں ہیں اور سات رکوع ہیں

سورۃ ابراہیم مکی ہے جمہور کے نزدیک یہ سورۃ سب مکی ہے۔ لیکن ابن عباس اور قتادہ کے نزدیک اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا سے اِلَى النَّارِ تک مکی نہیں باقی مکی ہے (بحر محیط زیر آیت ابراہیم ۱ تا ۳)۔ نحاس نے حبر سے روایت کی ہے کہ یہ آیتیں بدر کے مشرک مقتولین کے متعلق ہیں۔ ابوالشیخ نے بھی اسی قسم کی روایت قتادہ سے کی ہے (روح المعانی ابتدائی تعارف سورۃ ابراہیم)۔

سورۃ ابراہیم کا سورۃ ھود سے تعلق اس سورۃ میں بھی وہی پہلا مضمون جاری رکھا گیا ہے۔ مگر رؤیت پر بنیاد ہے۔ یعنی واقعات سے مسائل کا زیادہ استخراج کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ایسے ہی حالات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اور پھر بھی وہ رسول بغیر اس کے کہ ظاہری سامان ان کی تائید میں ہوں کامیاب ہوتے رہے ہیں۔

سورۃ ابراہیم کا خلاصہ مضمون خلاصہ مضمون اس سورۃ کا یہ ہے کہ قرآن کریم کے نزول کی اصل غرض ہدایت ہے۔ لوگ تاریکی میں تھے۔ اب تو انہیں تاریکی سے نور کی طرف نکالے گا۔ اس غرض کے لئے ہم پہلے بھی رسول بھیج چکے ہیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام بھی اسی غرض سے آئے تھے اور پھر موسیٰ کی زبانی بتایا ہے کہ پہلے رسول بھی اسی غرض سے آئے تھے۔ پھر ان سب کی کامیابی کا گر بتایا کہ چونکہ ان کے ساتھ حق تھا اس لئے آخر ان کی بات غالب آئی۔ پھر سچے کلام کی علامتیں بتائی ہیں اور فرمایا ہے کہ تمہیں دیکھنا چاہیے کہ آیا یہ علامتیں قرآن کریم میں موجود ہیں یا نہیں۔ پھر جو اندھیرے سے باہر نکالے گئے ہیں یعنی مسلمانوں کو بتایا ہے کہ اس اعلیٰ کلام سے تم کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ پھر بتایا ہے کہ یہ تغیر جو عرب میں پیدا ہونے والا ہے اس کا آج ہی ہم نے ارادہ نہیں کیا کہ ہم اس کو بدل ڈالیں بلکہ یہ قدیم سے ہمارے مدنظر ہے۔ جن تغیرات کو ہم آج پیدا کرنا چاہتے ہیں انہیں کے لئے ہزاروں سال پہلے ابراہیم نے دعا کی تھی۔ بلکہ مکہ کو قائم ہی انہیں تغیرات کے لئے کیا گیا ہے۔ اور ہم جو غیر معمولی طور پر مکہ کے لوگوں کو رزق پہنچاتے رہے ہیں وہ بھی ان آئندہ آنے والے تغیرات کی وجہ سے تھا۔ پھر ہم آج انہیں کس طرح

بھلا سکتے ہیں۔ پھر مومنوں کو توجہ دلائی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ہم تمہارے فرائض بیان کر چکے ہیں۔ تمہیں وہ ذمہ داریاں کبھی نہیں بھلانی چاہئیں اور کفار کو ڈرایا ہے کہ ابراہیم نے اس نیت سے مکہ کی بنیا د رکھی تھی کہ یہ توحید کا مرکز ہو۔ اب اگر تم شرک نہ چھوڑو گے تو تم کو یہاں سے دور کر دیا جائے گا۔ اور تمہاری ہلاکت توحید کی تصدیق کے لئے ایک دلیل بن جائے گی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۱

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر (شروع کرتا ہوں) جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ

الٓرٰ۔ (یہ) ایک کتاب ہے جسے ہم نے تجھ پر اس لئے اتارا ہے کہ تو تمام لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے ظلمات

اِلَى النُّوْرِ ۙ۬ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۲

سے نکال کر نور کی طرف یعنی (اس) کامل (طور پر) غالب (اور) کامل محمود (ہستی تک پہنچنے) کے راستہ کی طرف لائے۔

حل لغات۔ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ أَخْرَجَهٗ اور أَخْرَجَهٗ مِنْ كَذَا اِلٰى كَذَا کے معنوں میں فرق ہوتا ہے۔ اَخْرَجَهٗ کے یہ معنے ہیں کہ اس کو نکالا اور اَخْرَجَهٗ مِنْ كَذَا اِلٰى كَذَا کے معنے یہ ہیں کہ اس کو وہاں سے نکال کر دوسری جگہ لے گیا۔ پس لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ کے یہ معنے ہوں گے کہ تو لوگوں کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لائے۔

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ ان کے ربّ کے حکم کے ساتھ اس راستہ کی طرف جو عزیز وحمید کا ہے عزیز کے معنے ہیں اَلْمَنِيْعُ الَّذِيْ لَا يُنَالُ وَلَا يُغَالِبُ وَلَا يُعْجِزُهٗ شَيْءٌ وَلَا مِثْلَ لَهٗ۔ غالب، قادر جسے کوئی چیز عاجز نہ کر سکے اور اس کا کوئی شریک نہ ہو۔ (اقرب) حَمِيْدٌ جو کامل حمد والا ہو۔

تفسیر۔ کتاب خبر ہے۔ مبتداء محذوف کی جو مثلاً هٰذَا الْقُرْاٰنُ ہے۔ یعنی یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر اتاری ہے۔

قرآن کریم ایک روشنی ہے اس آیت میں بتایا ہے کہ قرآن کریم ایک روشنی ہے جس کے ذریعہ سے محمد رسول اللہ

لوگوں کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال لے جائیں گے۔

روشنی کی تشریح پھر روشنی کی تشریح اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ سے کی۔ یعنی عزیز و حمید خدا کا راستہ ہی اصل روشنی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں روشنی کو تو ہر ایک پسند کرتا ہے لیکن روشنی کی تشریح میں لوگوں کو اختلاف ہوتا ہے۔ آج کل لوگ کہتے ہیں یہ نئی روشنی کے آدمی ہیں اور مراد جدید فلسفہ اور تہذیب اور اباحت اور لامذہبی کی اتباع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے مسیحیت خدا کا نور ہے۔ کوئی ہندو مذہب کو کوئی اسلام کو خدا کا نور قرار دیتا ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسم و رواج اور قشر اور چھلکا خدا کا نور نہیں کہلا سکتا۔ نور تو خدا تعالیٰ کی طرف جانے کا نام ہے۔ جس کا قدم خدا تعالیٰ کی طرف نہیں اٹھا اسے نور کو حاصل کرنے والا کسی صورت میں نہیں کہہ سکتے۔ نور کو وہی پاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

صفت عزیز اور حمید علمی و عملی روشنی پر دلالت کرتی ہیں وجود باری پر دلالت کرنے کے لئے اس جگہ دو صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ عزیز اور حمید۔ عزیز کے معنے غالب اور حمید کے معنے قابل تعریف کے ہیں۔ ان دو صفات کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ ایک عملی روشنی پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا علمی پر۔ عزیز سے مل کر انسان اپنے دشمنوں پر غالب آجاتا ہے اور ظاہری اندھیرے یعنی تکالیف اور مصائب دور ہو جاتے ہیں۔ اور حمید سے مل کر انسان اپنے اندرونی دشمن شیطان پر غالب آجاتا ہے اور باطنی اندھیرے یعنی وساوس اور شبہات اور جہالت دور ہو جاتے ہیں۔

آنحضرتؐ کے ذریعہ سے عربوں میں پہلی تبدیلی۔ صفت عزیز کے ماتحت صحابہ دنیا پر حکمران ہو گئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے یہ دونوں کام ہوئے۔ عربوں کی ذلت اور نکبت و ادبار بھی دور ہوا۔ اور ان کی جہالت اور شرک اور اخلاقی کمزوری بھی دور ہوئی۔ ایک طرف وہ سب دنیا کے بادشاہ ہو گئے۔ دوسری طرف وہ سب دنیا کے معلم ہو گئے۔ عربوں کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی حالت اور آپ کے بعد کی تبدیلی کا اس تاریخی واقعہ سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب ایران پر چڑھائی ہوئی تو ایران کے بادشاہ نے اپنے کمانڈر انچیف کو یہ کہلا بھیجا کہ ان لوگوں کو کچھ انعام کا وعدہ دے کر جنگ کو ختم کرو۔ اور انعام بھی نہایت حقیر تھا۔ یعنی فی سپاہی ایک ایک دو دو دینار (السیرۃ الحلبیۃ، الفاروق از شبلی نعمانی واقعہ محل)۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب اپنی ہمسایہ قوموں کی نظر میں نہایت غریب اور محتاج اور کم ہمت تھے۔ لیکن اسلام نے ان کو کیا بنا دیا۔ وہ اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے نہ صرف ایران کو فتح کیا بلکہ شام، فلسطین، مصر، اناطولیہ، آرمینیا، عراق، شمالی افریقہ، ہسپانیہ، افغانستان، ہند اور چین تک بھی پہلی صدی کے اندر فتح کر لئے۔

صحابہ جو غریب اور متوسط الحال لوگ تھے۔ایسے ایسے دولت مند ہو گئے کہ ایک صحابی عبدالرحمٰن بن عوف جب فوت ہوئے تو اڑھائی کروڑ روپیہ ان کا ترکہ نکلا جو آج کل کے لحاظ سے بہت بڑی دولت ہے کیونکہ اس وقت روپیہ کی قیمت بہت زیادہ ہوتی تھی۔

آنحضرتؐ کے ذریعہ سے عربوں میں دوسری تبدیلی دوسری تبدیلی بھی ظاہر ہے۔عرب کے لوگ یا تو لکھنے کو عیب سمجھتے تھے اور کسی قسم کا علم بھی ان میں نہ پایا جاتا تھا۔ساری دنیا کے علوم کے حامل ہو گئے۔تاریخ کی بنیاد انہوں نے ڈالی۔صرف ونحو،معانی،بیان،لغت کو انہوں نے کمال تک پہنچا دیا۔

علوم کی ایجاد فقہ اور فلسفہ فقہ اور منطق اور حکمت اور طب اور سیاست اور انجینئر نگ اور ہندسہ اور الجبرا اور علم کیمیا اور ہیئت وغیرہ۔بیسیوں علوم یا ایجاد کئے یا انہیں ادنیٰ حالت سے بڑھا کر کمال تک پہنچایا۔اور آج یورپ کے محققین تسلیم کرتے ہیں کہ اگر مسلمان عرب نہ ہوتے تو آج دنیا علم کی اس منزل پر نہ ہوتی جہاں اب ہے۔اور روحانیت میں جو عربوں نے ترقی کی اس کی مثال تو ابتداء عالم سے اس وقت تک اور کسی قوم میں پائی ہی نہیں جاتی۔

اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ وَیْلٌ

یعنی اللہ (تعالیٰ کے راستہ کی طرف) کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور (اس کا) انکار

لِّلْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِ ۙ﴿۳﴾

کرنے والوں کے لئے ایک (بہت) بڑی آفت یعنی ایک سخت عذاب (مقدر) ہے۔

حلّ لُغَات۔اَلْوَیْلُ حلُوْلُ الشَّرِّ۔وَیْلٌ کے معنے ہی مصیبت کا نازل ہونا۔وَقِیْلَ هُوَ تَفْجِیْعٌ اور بعض محققین لغت کہتے ہیں کہ یہ لفظ کسی کے مبتلائے مصیبت ہونے یا اس پر اظہار افسوس کے لئے بولا جاتا ہے۔وَوَیْلٌ کَلِمَةُ عَذَابٍ۔نیز یہ لفظ عذاب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔وَالرَّفْعُ عَلَی الْاِبْتِدَاءِ اور چونکہ وہ اس مقام پر مبتداء ہوتا ہے اس پر رفع آتا ہے۔وَالْوَیْلَةُ۔اَلْفَضِیْحَةُ وَالْبَلِیَّةُ اور وَیْلَةٌ کے معنی رسوائی کے اور مصیبت کے ہیں۔(اقرب)

تفسیر۔اللہ عزیز وحمید کے بعد آیا ہے اس لئے کہ یہاں وہ عطف بیان کے طور پر استعمال ہوا ہے۔اور معنے یہ ہوئے کہ عزیز وحمید کے راستہ کی طرف جس سے مراد ہماری اللہ ہے۔اسی کا آسمان اور زمین ہے یعنی تمام مخلوق

اس کے غالب ہونے پر شاہد ہیں۔ زمین وآسمان میں ایک ہی قانون نظر آتا ہے اور اسی طرح زمین وآسمان اس کے حمید ہونے پر بھی شاہد ہیں کیونکہ کہیں کوئی نقص یا عیب نظر نہیں آتا۔ پس جو لوگ ایسے خدا کی طرف جائیں گے وہ یقیناً اپنے اندر ایک خاص اور نیک تبدیلی محسوس کریں گے اور زمین وآسمان پر انہیں بھی حکومت ملے گی۔

یہ وعدہ کس شان سے پورا ہوا۔ ایک خلیفہ مدینہ میں بیٹھا ہوا حکم دیتا ہے اور فوراً ساری دنیا اس پر عمل کرنے لگ جاتی ہے۔ اس قسم کی حکومت کی مثال اور کہاں ملتی ہے؟

مسلمانوں کے ایثار اور ایفائے عہد کی ایک مثال ایسا ہی لفظ حمید کے ماتحت مسلمانوں کی وہ حمد ہوئی کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ مسلمان کا لفظ ایک ضمانت ہوتی تھی۔ جس میں کوئی شک نہ کرتا تھا۔ اس کا وعدہ ایک سماوی تقدیر سمجھی جاتی تھی۔ جسے کوئی رد نہ کر سکتا تھا۔ ان کی تعریفوں کی گونج آج بھی دنیا میں سنائی دے رہی ہے۔ مثلاً ایک یہی واقعہ لے لو کہ ایک دفعہ ایک شخص سے کوئی ایسا جرم ہوا جو اسے سزائے قتل کا حقدار بناتا تھا۔ جب وہ خلیفۂ وقت کے سامنے پیش ہوا تو اس نے سزا کے سننے کے بعد عرض کی کہ میرے پاس کچھ امانتیں اور ذمہ واریاں اپنے یتیم بھتیجوں کی ہیں۔ ان کو میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ مجھے کل اس وقت تک آپ مہلت دیں۔ وہ کام کر کے پھر حاضر ہو جاؤں گا۔ خلیفہ نے کہا کوئی ضامن پیش کرو۔ اس نے خلیفہ کی مجلس میں ایک صحابی (ابوذر) کی طرف اشارہ کیا کہ یہ میرے ضامن ہیں۔ حالانکہ وہ صحابی اس کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ مگر صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے اور اس لئے کہ اس نے آپ سے ایک بڑی ذمہ داری کی امید کی تھی اپنی شرافت اور وقار کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی ضمانت دے دی۔ لیکن مقررہ وقت قریب آ گیا اور وہ نہ پہنچا۔ لوگوں نے حضرت ابوذرؓ سے پوچھا کہ وہ کون تھا تو انہوں نے کہا میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھا۔ ایک مسلمان جان کر میں نے اس کی ضمانت دے دی۔ جب اس نے مجھ پر اعتبار کیا تو میں اس پر کیوں اعتبار نہ کرتا۔ آخر وقت ختم ہونے کو ہوا۔ تو لوگوں کو حضرت ابوذرؓ کی جان کا خطرہ پیدا ہوا۔ لیکن عین وقت پر ایک شخص دور سے بے تحاشا گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور بے جان ہو کر آ گرا۔ اور حضرت ابوذرؓ سے معذرت کی کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ بمشکل عین وقت پر پہنچ سکا ہے اور ان کی تشویش کا موجب ہوا ہے...... ایک طرف ابوذرؓ کے ایثار کی اور دوسری طرف اس شخص کے ایفاء عہد کی مثال دوسری قوموں میں کہاں ملتی ہے؟ اس واقعہ کو انگریزوں نے اپنی کہانیوں اور نظموں میں بھی درج کیا ہے۔ ایسی ہی ایک اور مثال ہے۔ شام کے فتح ہو جانے کے بعد ایک دفعہ عیسائی لشکر عارضی طور پر غالب ہو گیا اور اسلامی لشکر کو کچھ علاقہ چھوڑنا پڑا۔ اس وقت حضرت عمرؓ کے حکم کے ماتحت مسلمانوں نے اس علاقہ کے سب وصول شدہ ٹیکس واپس کر دیئے کہ جب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے تو

ہم تمہارا ٹیکس اپنے پاس نہیں رکھ سکتے ۔ یہ علاقہ بھی عیسائیوں سے آباد تھا۔لیکن باوجود اس کے کہ ان کے ہم مذہب فتح پا کر آرہے تھے وہ مسلمانوں کی اس نیک نفسی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ زن و مرد روتے ہوئے شہر کے باہر تک انہیں چھوڑ نے آئے اور کہتے جاتے تھے کہ اگر عیسائی لشکر آپ کی جگہ ہوتا تو ٹیکس کی واپسی کی جگہ جاتے ہوئے جو کچھ ہمارا تھا وہ بھی لوٹ کر لے جاتا۔اور دعائیں کرتے جاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو پھر واپس لائے۔(الفاروق حصہ اول)

پہلے زمانہ کے مسلمانوں اور آج کے مسلمانوں میں فرق افسوس کجا وہ زمانہ تھا اور کجا اب مسلمان سب سے زیادہ بے اعتبار سمجھا جاتا ہے۔علماء نے غیر مذاہب کو لوٹ لینے کا فتویٰ دیا ہوا ہے۔غیر مذہب کی حکومت سے غداری کو دین کا جزو قرار دیا ہوا ہے۔غیر مسلموں کے قتل کو ثواب کا موجب بتلاتے ہیں۔غرض ہر وہ نیکی جس پر مسلمان کو فخر تھا آج ان میں سے مفقود ہے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

جماعت احمدیہ کی ذمہ داری کاش جماعت احمدیہ اپنی ذمہ داری کو سمجھے اور اسلام کے کھوئے ہوئے متاع کو پھر واپس لائے۔اور پھر وہی اخلاق محمد رسول اللہ صلعم کے غلاموں میں دنیا دیکھے۔جنہیں دیکھ کر انسان کو خدا تعالیٰ نظر آجاتا ہے۔وہ امین ہوں اور ایسے امین کہ خود بھوکے مر جائیں، بیوی بچے بھوکے مر جائیں، لیکن دوسرے کی امانت میں خیانت نہ ہو۔وہ سچے ہوں اور ایسے سچے کہ جان جائے مال و دولت جائے، عہدہ جائے لیکن جھوٹ کا ایک لفظ زبان پر نہ آئے۔اور نہ آئے وعدہ کریں تو جان کے ساتھ نباہیں اور ارادہ کریں تو سر ہتھیلی پر رکھ کر اسے پورا کریں۔

الَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَ

جو آخرت کے مقابلہ میں (اس) ورلی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں

یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ

اور (دوسرے لوگوں کو بھی) اللہ (تعالیٰ) کے راستہ سے روکتے ہیں۔اور اسے کجی اختیار کر کے (حاصل کرنا) چاہتے

فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ ۝۴

ہیں یہ لوگ دور کی گمراہی میں (پڑے ہوئے) ہیں۔

حلّ لُغات۔یَسْتَحِبُّوْنَ اِسْتَحَبَّ سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے۔اور اِسْتَحَبَّهٗ کے معنی ہیں

اَحَبَّہٗ یعنی اس سے محبت کی۔اسے چاہا۔اِسْتَحْسَنَہٗ۔اسے پسند کیا۔اَلْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ۔اٰثَرَہٗ۔کفر کو ایمان پر ترجیح دی یعنی مقدم کیا۔(اقرب)

یَبْغُوْنَ بَغٰی سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے اور بَغَاہُ یَبْغِیْہِ کے معنے ہیں طَلَبَہٗ۔ اسے طلب کیا۔ چاہا۔ یُقَالُ اِبْغِنِیْ ضَالَّتِیْ۔ اَیْ اُطْلُبْھَا لِیْ چنانچہ اِبْغِنِیْ ضَالَّتِیْ کا فقرہ بول کر یہ مراد لیتے ہیں کہ میری گمشدہ چیز میرے لئے تلاش کر۔(اقرب) پس یَبْغُوْنَھَا عِوَجًا کے معنے ہوں گے اسے کجی اختیار کر کے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

تفسیر۔جو لوگ ایسی تعلیم کو چھوڑیں گے ان کا انجام واضح ہے۔عزیز وحمید کو چھوڑ کر عزت اور حمد کہاں باقی رہ سکتی ہے۔مگر فرمایا کفار کو دیکھو خود ہی اللہ تعالیٰ کے انعامات سے محروم نہیں ہوتے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور لوگوں کو ہی روکتے نہیں بلکہ تعلیم الٰہی میں خرابیاں پیدا کر کے ہمیشہ کے لئے اور لوگوں کو اس کے فوائد سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔

یہ انسان کی سخت بدقسمتی ہوتی ہے کہ ضد میں آ کر صداقت کو مٹانے لگ جاتا ہے۔اور نہیں سمجھتا کہ اس طرح ہزاروں آدمیوں کی روحانی موت کا گناہ اس کی گردن پر رکھا جاتا ہے۔

یَبْغُوْنَھَا عِوَجًا کے معنے کجی اختیار کر کے اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں کا یہ مطلب ہے کہ ایک طرف ان کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ خدا کا راستہ مل جائے اور دوسری طرف اپنے غلط رویہ اور گندی عادات کو بھی بدلنا نہیں چاہتے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے نفس کو دھوکا دینے اور اپنی ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے وہ اپنی خودساختہ باتوں کا نام دین رکھ لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اور ان کی اولادیں بھی جھوٹی تسلی پا کر نورِ ہدایت سے محروم رہ جاتے ہیں۔

سبیل اللہ سے مراد صداقت مطلقہ ان معنوں کے رو سے سبیل اللہ سے مراد صداقت مطلقہ لی جائے گی۔ان معنوں سے ان لوگوں کے خیالات کا رد بھی ہو جاتا ہے۔جو کہتے ہیں کہ ہر مذہب میں نیک اور پارسا لوگ پائے جاتے ہیں۔پھر انہیں کیوں خدا رسیدہ نہ قرار دیا جائے۔اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے والی راہ کو تو وہی پا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصول کی اتباع کرے۔اگر وہ اس پر مصر ہو کہ اپنے باپ دادا کے راستہ کو نہیں چھوڑوں گا تو وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کا متلاشی نہیں۔باپ دادا کے راستہ کا متلاشی ہے۔پھر جس کا رخ مخالف طرف ہو وہ اس راستہ کی طرف کس طرح پہنچ سکتا ہے جو عوجاً چل پڑے یعنی غلط زاویہ کی طرف بڑھنا شروع کرے۔یقیناً اس کی

منزل کسی غیر جگہ ہی جا کر ختم ہوگی۔

سبیل اللہ سے مراد اسلام بھی ہوسکتا ہے اس آیت کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ بظاہر کفار اسلام کے بارہ میں بحث مباحثہ میں لگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اسلام کا نقطۂ نگاہ سمجھنے کی خواہش ہے لیکن درحقیقت وہ ضد اور تعصب سے کام لے کر اسلام کے بارہ میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں۔ اور چونکہ اللہ کے راستہ کو صداقت کی راہوں سے ہی پایا جاسکتا ہے اس لئے وہ ہدایت پانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان معنوں کے رو سے سبیل اللہ کے معنے مخصوص طور پر اسلام کے ہوں گے۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۵

اور ہر ایک رسول کو ہم نے اس کی قوم کی زبان میں ہی (وحی دے کر) بھیجا ہے۔ تا کہ وہ انہیں (ہماری باتیں) کھول کر بتائے پھر (اس کے بعد) اللہ (تعالیٰ) جسے (ہلاک کرنا) چاہتا ہے ہلاک کرتا ہے اور جسے (کامیاب کرنا) چاہتا ہے (اسے) منزل مقصود پر پہنچا دیتا ہے اور وہ کامل (طور پر) غالب (اور) صاحب حکمت ہے۔

حلّ لغات۔ يُضِلُّ اَضَلَّ سے مضارع ہے اور اَضَلَّهٗ کے معنے ہیں اَهْلَكَهٗ اس کو ہلاک کر دیا۔ (اقرب) فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ جسے ہلاک کرنا چاہتا ہے ہلاک کرتا ہے۔

بَيَّنَهٗ۔ اَوْضَحَهٗ کھول کر بیان کیا۔ (اقرب) اور لِيُبَيِّنَ کے معنے ہوں گے کہ وہ کھول کر بیان کرے۔

تفسیر۔ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ کے معنے اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ کے معنے بعضوں نے تو یہ کئے ہیں کہ رسول کی وحی صرف اس کی قوم کی زبان میں ہونی چاہیے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ ہاں! یہ صحیح ہے کہ اس کی قوم کی زبان میں ضرور وحی ہونی چاہیے کیونکہ وہ پیغام جو اس نے اپنی قوم کو پہنچانا ہے اگر دوسری زبان میں ہوا تو اس کی تبلیغ اس کے لئے مشکل ہو جائے گی۔ لیکن بطور نشان اور معجزات کسی اور زبان میں الہام ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہاموں پر اعتراض اور اس کا جواب بعض لوگ حضرت مسیح موعود

علیہ السلام کے الہاموں پر یہ آیت پیش کر کے اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ عربی اور اردو کے سوا آپ کو جن زبانوں میں الہام ہوئے وہ بطور نشان اور معجزات کے ہیں۔ عربی میں آپ کو اس لئے الہام ہوئے کہ وہ اسلام کی مذہبی زبان ہے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی قومی زبان ہے اور اردو میں اس لئے کہ آپ کے پہلے مخاطب اردو دان تھے۔ اور اگر دیکھا جائے تو آپ کے الہامات کا اصولی حصہ سب کا سب یا عربی میں ہے یا اردو میں۔ دوسری زبانوں میں جو الہام ہوئے ہیں وہ ایسے نہیں کہ ان کے بغیر تبلیغ میں روک پیدا ہو۔ وہ صرف ایک مزید تائید اور نشان کے طور پر ہیں۔

اس آیت سے ویری کا آنحضرتؐ کی ذات پر اعتراض عیسائیوں نے اور بالخصوص ویری نے اس آیت سے رسول کریم صلعم کی ذات پر اعتراض کیا ہے۔ ویری صاحب کہتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے محمد رسول اللہ صلعم صرف عرب کے لئے تھے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ کرنا جائز ہے۔ ان کی یہ دونوں باتیں آپس میں متضاد ہیں۔

ویری کے اعتراض کا جواب اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف عرب کے لئے تھے تو ترجمہ کا سوال ہی کہاں رہا؟ جب دوسری قوموں کا اس سے تعلق ہی نہیں تو ترجمہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور اگر اس آیت سے ترجمہ کرنا جائز ثابت ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ آپ کی رسالت دوسری قوموں کے لئے بھی تھی۔ حقیقی جواب اس سوال کا یہ ہے کہ یہ مفہوم اس آیت کا ہو ہی نہیں سکتا کہ آنحضرت صلعم عرب کے لئے ہیں۔

آنحضرتؐ کے سب دنیا کی طرف مبعوث ہونے کے قرآن مجید سے پانچ دلائل کیونکہ قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے صاف ثابت ہے کہ آپ سب دنیا کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ چنانچہ سورۃ اعراف ع ۱۹، ۲۰ میں فرماتا ہے وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ۔ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ٘ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ا۟لَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (آیت ۱۵۷ تا ۱۵۹) یعنی میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے اور اب میں خاص طور پر اس کو ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے۔ اور زکوٰۃ دیں گے اور جو لوگ پورے طور پر ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ نیز جو کامل طور پر ہمارے اس

موعود رسول کی اطاعت کریں گے جس کی بعثت کی بشارات کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ رسول وقت پر مبعوث ہو کر انہیں نیک کاموں کی تلقین کر رہا ہے اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام قرار دیتا ہے۔ اور وہ ان سے سخت حکموں کے بوجھوں کو اور رسومات کے پھندوں کو جو ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے تھے دور کرتا ہے۔ پس جو لوگ اس پر کامل طور پر ایمان لائے اور پھر انہوں نے اس کی حمایت اور مدد کے لئے ہر ممکن کوشش سے کام لیا اور اس نور کی انہوں نے اتباع کی جو اس رسول کے ساتھ اتارا گیا۔ صرف ایسے لوگ ہی کامیاب ہوں گے۔ اے ہمارے رسول! تو یہ اعلان کر کہ اے بنی نوع انسان میں تم سب کی طرف اس خدا کی طرف سے رسول ہو کر آیا ہوں کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اسی کی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور معبود قابل پرستش نہیں۔ وہ زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے۔ پس اے لوگو! اللہ پر اور اس کے موعود بھیجے ہوئے نبی پر ایمان لاؤ۔ جو خود اللہ کی ذات پر اور اس کے کلمات پر پورا ایمان رکھتا ہے اور اس کی کامل پیروی کی راہوں پر چلو تا کہ تم ہدایت پاؤ۔

اس میں پانچ دلیلیں اس امر کی دی گئی ہیں کہ نبی کریم صلعم ساری دنیا کے لئے ہیں۔

پہلی دلیل اہل کتاب کو آپ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا اول: اہل کتاب کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کو تسلیم کریں۔ فرمایا اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ یعنی اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو خدا تعالیٰ کی رحمت کا انعام دیا جائے گا جو آنحضرت صلعم کو مانیں گے۔ اگر آپ صرف عرب کے لئے تھے تو اہل کتاب کو رحمت کا انعام حاصل کرنے کے لئے آپ کی اتباع کا کیوں حکم دیا گیا۔

دوسری دلیل تورات وانجیل میں آنحضرتؐ کی پیشگوئی تھی دوم: اس آیت میں ذکر ہے کہ تورات وانجیل میں آنحضرت صلعم کی پیشگوئی ہے۔ اگر آپ ان کی طرف مبعوث ہی نہ تھے تو ان کے لئے پیشگوئی کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ جن کو فائدہ ہو سکتا ہے وہ مکہ والے تھے اور وہ تورات وانجیل کو نہیں مانتے تھے۔ اور پیشگوئی اس لئے کی جاتی ہے کہ لوگوں کو اس کے ذریعہ سے ہدایت ہو۔ پس تورات اور انجیل میں اسی لئے پیشگوئیاں کی گئی تھیں کہ یہود اور مسیحیوں کے لئے آنحضرت صلعم کا ماننا ضروری تھا۔ اور قرآن کریم ان پیشگوئیوں کی طرف اسی لئے اشارہ کرتا ہے کہ اس کے نزدیک ان کتب کے ماننے والوں کے لئے بھی آپ کا ماننا ضروری تھا۔

تیسری دلیل آنحضرتؐ کا انہیں امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کرنا ہے سوم: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ اگر وہ مخاطب نہ تھے تو پھر ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کیا ضرورت تھی۔

چوتھی دلیل آپؐ پر یہود و نصاریٰ ایمان لانے والے انعام کے وارث ہوں گے چہارم: اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو یہود و نصاریٰ میں سے آپ پر ایمان لائیں گے وہ کامیاب و مظفر ہوں گے۔ اگر آپ صرف عرب کی طرف تھے تو پھر تو یہود و نصاریٰ کو ایمان لانے پر سزا ملنی چاہیے تھی نہ کہ انعام ملنا چاہیے تھا۔

پس ان چاروں دلیلوں سے ثابت ہے کہ اور کسی قوم کی طرف آپ مبعوث تھے یا نہ تھے یہود و نصاریٰ کی طرف تو ضرور تھے۔ لیکن پانچویں دلیل نے تو بات کو بالکل ہی کھول دیا ہے۔

دلیل پنجم آنحضرتؐ ساری دنیا کے لئے رسول ہو کر آئے ہیں پنجم: دلیل پنجم یہ ہے کہ قرآن کریم نے اوپر کے دلائل کا نتیجہ نکال کر خود ہی فرما دیا ہے۔ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ کہہ دے کہ اے بنی نوع انسان میں تم سب کی طرف رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس دعویٰ نے تو بات کو بالکل صاف کر دیا اور یہود و نصاریٰ کے علاوہ دوسری اقوام کو بھی آپؐ کا مخاطب بنا دیا۔

آنحضرتؐ کا ساری دنیا کے لئے مبعوث ہونے کا حدیث سے ثبوت ایک اور آیت میں فرماتا ہے وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (السبا:۲۹) کہ ہم نے تجھے تمام جہان کی طرف بشیر و نذیر کر کے بھیجا ہے۔ پھر حدیث میں بھی آتا ہے بُعِثْتُ اِلَى الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ (مسند احمد بن حنبل بروایت جابر بن عبداللہ)۔ میں ہر کالے گورے کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ عرب کبھی بھی اپنے آپ کو اسود نہیں کہتے۔ بلکہ ہمیشہ احمر کہتے ہیں۔ اب اسود قوم کوئی اور نکالنی پڑے گی۔ عربی زبان کے محاورہ کے مطابق وہ عجم ہی ہیں۔ لغت میں بھی اَلْاَسْوَدُ وَالْاَحْمَرُ کے معنے اَلْعَجَمُ وَ الْعَرَبُ لکھے ہیں۔ (مجمع البحار) پھر ایک اور حدیث میں آتا ہے بُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً میں سب انسانوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ (مسند احمد بروایت حضرت جابرؓ) ایک اور روایت میں ان کی جگہ یہ الفاظ ہیں اُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَآفَّةً۔ میں سب لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ (مسلم کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ باب المساجد و مواضع الصلاۃ، مشکوٰۃ المصابیح کتاب المصابیح باب فضائل سید المرسلین الباب الاول) ان تمام آیات و احادیث سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلعم کی بعثت تمام دنیا کے لئے تھی۔ اور مسیحی مصنفین کا اعتراض باطل ہے۔

جس قوم کو نبی پہلے مخاطب کرتا ہے اسی زبان میں اس کو الہام ہوتا ہے اسی طرح ان آیات و احادیث سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ جس قوم کو نبی پہلے مخاطب کرتا ہے اس کی زبان میں اس کو الہام ہوتا ہے۔ اور پھر وہ لوگ بات کو سمجھ کر دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

عربی زبان اُمّ الْاَلْسِنَة ہے اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عربی اُمّ الْاَلْسِنَة ہے۔ کیونکہ جو

رسولِ عرب میں آیا اسی کے سپرد سب دنیا کی اصلاح کی گئی۔ پس عربی میں نازل ہونے والی وحی کو سب دنیا کے لئے ہدایت قرار دینے سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ عربی کسی نہ کسی رنگ میں ساری زبانوں کی ماں ہے اور دوسری زبانیں اس کی بیٹیوں کی طرح ہیں۔

آریوں کے ایک اعتراض کا رد۔ آریوں کے عقیدہ اور قرآن کے بیان میں فرق اس آیت میں آریوں کے اس اعتراض کا بھی رد ہو جاتا ہے جو وہ یوں کرتے ہیں کہ کلام الٰہی ایسی زبان میں آنا چاہیے جسے کوئی بولتا نہ ہو۔ تا کہ سب میں برابری رہے (ستیارتھ پرکاش چودھواں باب)۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے کہ ایسی زبان میں وحی ہونی چاہیے جس کو لوگ بولتے ہوں۔ تا کہ نبی ان کو سمجھا سکے اور وہ سمجھ سکیں۔ جس زبان کو دنیا نہ بول سکتی ہے نہ سمجھ سکتی ہے اس میں کلام الٰہی آنے کا فائدہ کیا ہوا۔ آریوں کا یہ عقیدہ اس طرح بھی غلط ہے کہ جب وید نازل ہوئے اگر اسی وقت رشیوں نے اسے نہیں سمجھا تو ان کا نزول بے فائدہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر ان کو وید سمجھا دیا گیا تھا تو پھر برابری نہ رہی۔ اور اگر اس وقت لوگ موجود تھے اور انہیں بھی سمجھا دیا گیا تھا تو گو اس وقت کے لوگوں کے لئے برابری ہو گئی مگر جو لوگ بعد میں پیدا ہوئے ان کے لئے برابری کہاں رہی۔ اب تو پنڈت تک ویدوں کی زبان سے ناواقف ہو رہے ہیں۔

ہندوستان کی آئندہ زبان اردو ہو گی چونکہ اس زمانہ کے مامور حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر عربی کے بعد اردو میں الہام زیادہ کثرت سے ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ زبان ہندوستان کی اردو ہو گی اور دوسری کوئی زبان اس کے مقابل پر نہیں ٹھہر سکے گی۔

تبیین کے بعد ہی گمراہی کا فتویٰ لگایا جا سکتا ہے لِيُبَيِّنَ لَهُمْ کے بعد يُضِلُّ اللّٰهُ لانے میں اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ اگر سمجھنے کے سارے سامان نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ گمراہ قرار نہیں دیتا۔ الزام ہمیشہ اسی وقت قائم کیا جاتا ہے جبکہ پہلے سمجھایا جا چکا ہو۔ گویا تَبْيِيْن کے بعد ہی گمراہی کا فتویٰ لگایا جا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس قوم کو کسی بات کا یقینی علم نہ پہنچے اس وقت تک ان کو نہ ماننے کی وجہ سے سزا نہیں دی جا سکتی۔

غیر مبایعین کے الزام کی تردید اس ضمن میں ہی میں وہ الزام بھی دور کرنا چاہتا ہوں جو غیر مبایعین کی طرف سے ہم پر لگایا جاتا ہے کہ گویا ہم ہر شخص کو قابل سزا سمجھتے ہیں۔ خواہ اس کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دعویٰ پہنچا ہو یا نہ۔ یہ الزام غلط ہے۔ ہم یہ اعتقاد کیسے رکھ سکتے ہیں جب کہ قرآن شریف میں صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ تباہی کا فتویٰ اسی وقت لگتا ہے جبکہ تَبْيِيْن ہو چکی ہو۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ کے معنی وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ وہ غالب ہے۔ سزا دے سکتا ہے لیکن حکیم ہے۔

اس لئے جب تک سزا کے وجوہ نہ ہوں اس وقت تک سزا دیتا نہیں۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ

اور (تجھ سے پہلے) ہم نے موسیٰ کو (بھی) اپنے نشانات کے ساتھ یہ (حکم دے کر) بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو ظلمات سے

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

نکال کر نور کی طرف لا۔ اور انہیں اللہ (تعالیٰ) کے انعام اور اس کے عذاب یاد دلا۔ (کیونکہ) بلا شبہ اس میں ہر ایک

لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۶

پورے صابر (اور) پورے شکر گذار کے لئے کئی نشان (پائے جاتے) ہیں۔

حلّ لُغات ۔وَذَکِّرْھُمْ۔ ذَکَّرَ النَّاسَ وَعَظَھُمْ ذَکَّرَ النَّاسَ کے معنے ہیں کہ اس نے لوگوں کو نصیحت کی۔ ذَکَّرَہٗ جَعَلَہٗ یَذْکُرُ۔ اس کو یاد دلایا۔ (اقرب) اَیَّامُ اللّٰہِ نِعَمُہٗ وَنِقَمُہٗ۔ اَیَّامُ اللّٰہِ سے مراد اللہ تعالیٰ کے انعامات اور عذاب ہیں۔ (اقرب) پس ذَکِّرْھُمْ بِاَیَّامِ اللّٰہِ کے یہ معنے ہوں گے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور انعامات یاد دلا۔ صَبَّارٌ صَبَرَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنے بہت صبر کرنے والا۔ صَبَرَ کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۲۳۔

شَکُوْرٌ شَکَرَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور شکر کبھی بغیر صلہ اور کبھی ل کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی شَکَرَہٗ وَشَکَرَلَہٗ اور اگر شَکَرَ کا ''ل'' صلہ آئے تو یہ زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے اور شَکَرَہٗ وَشَکَرَلَہٗ کے معنے یہ ہوتے ہیں اَثْنٰی عَلَیْہِ بِمَا اَوْلَاہُ مِنَ الْمَعْرُوْفِ۔ کہ کسی کے احسان کے باعث اس کی تعریف کی۔ گویا اقرارِ احسان اظہارِ قدر کے ساتھ شکر کہلاتا ہے اور کثرت کے ساتھ اقرارِ احسان کرنے والے کو شکور کہتے ہیں۔

تفسیر ۔ **مسلمانوں کو صبر اور شکر کرنے اور استقلال سے کام کرنے کی نصیحت** فرمایا کہ جو کام تیرے سپرد ہوا ہے ویسا ہی کام موسیٰ علیہ السلام کے سپرد ہوا تھا۔ پس تیرے متعلق بحث کرتے ہوئے مخالف اور موافق کو موسیٰ کے حالات مدنظر رکھنے چاہئیں۔ یہ بھی فرمایا کہ موسیٰ کے معاملے میں ہر صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لئے نشانات ہیں۔ یعنی جیسے موسیٰ کی قوم نے صبر کیا تھا اور نتیجہ اچھا نکلا تھا بعینہٖ اسی طرح مصائب آئیں گے۔ جب تک مسلمان استقلال سے کام نہیں کریں گے کامیابی مشکل ہے۔ اسی طرح یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ

موسیٰ کی قوم نے انعام کے بعد شکر نہ کیا اور سزا پا گئی۔ تمہیں چاہیے کہ انعامات الٰہیہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا کرو اور ان کی بے وقعتی نہ کیا کرو۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو تمہارے لئے بھی اچھا نتیجہ نہ نکلے گا۔

ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ کے دو معنی ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ سے یہ بتایا ہے کہ ظلمات سے نور کی طرف نکالنے کے طریق یہ ہیں کہ (۱) نعمائے الٰہی کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اور (۲) سزاؤں سے خوف دلایا جائے۔ کیونکہ ایام اللہ سے مراد خاص انعامات یا خاص سزاؤں کے ایام ہوتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی گرفت اور سزا پر زور دیئے جانے کی وجہ آج کل کے تعلیم یافتہ اس پر بہت زور دیتے ہیں کہ خوف سے جو ایمان پیدا ہو وہ ایمان نہیں۔ حالانکہ یہ تعلیم فطرت کے خلاف ہے۔ دنیا کا بہت سا حصہ ایسا ہے جو نیکی کی طرف پہلا قدم خوف سے اٹھاتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کی گرفت اور سزا پر زور نہ دیا جائے تو یہ طبقہ بالکل نیکی سے محروم رہ جائے گا۔ کامل ہدایت وہ نہیں جو صرف کاملوں کے لئے ہو کامل ہدایت وہ ہے جس میں ادنیٰ حالت کے انسانوں کے لئے بھی علاج موجود ہو۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ

اور (اے مخاطب تو اس وقت کو بھی یاد کر) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا (کہ اے میری قوم) تم اپنے پر

اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ

اللہ (تعالیٰ) کا (اس وقت کا) انعام یاد کرو جب اس نے تمہیں فرعون کے ساتھیوں سے اس حالت میں بچایا تھا کہ وہ

يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ

تمہیں سخت عذاب دیتے تھے اور تمہارے بیٹوں کو مار دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔ اور اس میں

ع ۱۲ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۷ؑ

تمہارے رب کی طرف سے (تمہارے لئے) بڑا (بھاری) امتحان تھا۔

حل لغات۔ يَسُوْمُوْنَكُمْ سَامَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور سَامَهٗ فُلَانًا اَلْاَمْرَ

کے معنے ہیں کَلَّفَهٗ اِیَّاہُ یعنی کسی کو بامشقت کام کرنے کا حکم دیا وَاَکْثَرُ مَا یُسْتَعْمَلُ فِی الْعَذَابِ وَالشَّرِّ۔ اس کا اکثر استعمال عذاب اور دکھ کے معنوں میں ہوتا ہے (اقرب) اَلسَّوْمُ اَصْلُهٗ اَلذَّهَابُ فِی ابْتِغَاءِ الشَّیْءِ سَوم کے اصل معنے کسی چیز کی تلاش میں جانے کے ہیں۔ فَهُوَ لَفْظٌ لِمَعْنًی مُرَکَّبٍ مِنَ الذِّهَابِ وَالْاِبْتِغَاءِ پس سوم کا لفظ دراصل مرکب معنے رکھتا ہے۔ یعنی کسی جگہ جانا اور کسی چیز کو تلاش کرنا اور بعض دفعہ صرف جانے کے معنوں میں بھی مستعمل ہو جاتا ہے۔ جیسے سَامَتِ الْاِبِلُ کہ اونٹ چرنے کے لئے گئے اور کبھی صرف ابتغاء کے جیسے یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کہ وہ تمہیں سخت عذاب دینا چاہتے تھے۔ (مفردات)

یُذَبِّحُوْنَ ذَبَّحَ سے ہے اور اَلذَّبْحُ کے معنے ہیں اَلْهَلَاکُ مار دینا۔ ہلاک کرنا۔ (تاج) اور یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ کے معنے ہوں گے کہ وہ تمہارے بیٹوں کو مار دیتے تھے۔

اَلْبَلَاءُ۔ بَلَاءٌ کے معنے اصل میں امتحان کے ہوتے ہیں لیکن امتحان چونکہ کبھی انعام کے ذریعہ سے اور کبھی سزا کے ذریعہ سے لیا جاتا ہے اس لئے بلا کے اندر دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ بلاء انعام بھی اور بلاء تکلیف بھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ۔ (الاعراف:۱۶۹)

تفسیر۔ ذَبَّحَ کے معنی لغت میں ہلاک کرنے کے آئے ہیں ذَبَّحَ کے معنے ہلاک کرنے کے بھی لغت میں ہیں اور چونکہ بائبل میں لکھا ہے کہ فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو دریا میں ڈلوا دیا کرتا تھا اس لئے ذبح کرنے کی بجائے ہلاک کرنے کے معنے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو دریا میں ڈلواتا تھا تورات کی کتاب خروج میں لکھا ہے ’’اور فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کر کے کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دو۔ اور جو بیٹی ہو جیتی رہنے دو۔‘‘ (باب ۱ آیت ۲۲)

یَسُوْمُوْنَکُمْ سے مراد ذلّت آمیز سلوک ہے یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ سے مراد وہ ذلت آمیز سلوک ہے جو فرعون بنی اسرائیل سے کرتا۔ مثلاً بھاری ٹیکس، بیگار وغیرہ۔ لکھا ہے ’’انہوں نے ان پر خراج کے لئے محصل بٹھلائے تا کہ انہیں اپنے سخت کاموں کے بوجھوں سے ستائیں اور انہوں نے فرعون کے لئے خزانے کے شہر پتوم اور رعمسیس بنائے۔‘‘ (خروج باب ۱ آیت ۱۱)

نیز لکھا ہے ’’انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔‘‘ (خروج باب ۱ آیت ۱۴)

بلاء کے معنی امتحان کے ہیں خواہ بذریعہ عذاب لیا جائے یا بذریعہ انعام۔ چونکہ بنی اسرائیل کی آزمائش لڑکوں کے قتل سے اور لڑکیوں کو بچا کر کی گئی تھی اس لئے بلاء کا لفظ استعمال کیا گیا جو دونوں قسم کے امتحانوں پر دلالت کرتا ہے۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَ لَىِٕنْ

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب تمہارے رب نے (انبیاء کے ذریعہ سے) اعلان کیا تھا کہ (اے لوگو) اگر تم

كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ﴿۸﴾

شکر گذار بنے تو میں تمہیں (اور بھی) زیادہ دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو (یاد رکھو کہ) میرا عذاب یقیناً سخت (ہوا کرتا) ہے۔

حل لغات۔ تَأَذَّنَ تَأَذَّنَ الرَّجُلُ۔ اَقْسَمَ۔ تَاَذَّنَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں قسم کھائی۔ تَأَذَّنَ الْاَمْرَ۔ (متعدّی) اَعْلَمَهٗ کسی معاملہ کی اطلاع دی اور بتلایا۔ اَلْاَمِیْرُ فِی النَّاسِ نَادٰی فِیْهِمْ یُهَدِّدُ وَ یَنْهٰی۔ تَأَذَّنَ الْاَمِیْرُ کے معنے ہیں کہ امیر نے لوگوں میں حاکمانہ اعلان کیا۔ (اقرب) وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ کے معنے ہوں گے کہ اس وقت کو یاد کرو کہ جب تمہارے رب نے اعلان کیا اور اس بات کی اطلاع دی۔

کَفَرَ کَفَرَ نِعْمَةَ اللهِ وَبِنِعْمَةِ اللهِ كُفْرًا نًا۔ کے معنے ہیں جَحَدَ هَا وَسَتَرَهَا یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار اور ان کی ناشکری کی اور ان کو ظاہر نہ کیا۔ وَهُوَ ضِدُّ الشُّكْرِ۔ کفر کا لفظ شکر کے مقابل بولا جاتا ہے۔ وَفِی الْكُلِّيَّاتِ اَلْكُفْرُ تَغْطِيَةُ نِعَمِ الْمُنْعِمِ بِالْجُحُوْدِ اور کلیات میں کفر کے یہ معنے لکھے ہیں کہ محسن کی نعمتوں کا انکار کرتے ہوئے ان پر پردہ ڈالنا اور ان کا اقرار نہ کرنا۔ (اقرب) پس اِنْ كَفَرْتُمْ کے معنے ہوں گے کہ اگر تم میری نعمتوں کی ناشکری کرو۔ شَكَرْتُمْ ۔شکر کی تشریح کے لئے دیکھو ابراہیم آیت نمبر ۶۔

تفسیر۔ تمام ترقیات شکر کے ساتھ وابستہ ہیں اس آیت میں ایک عظیم الشان قانون بتایا ہے کہ تمام ترقیات شکر کے ساتھ وابستہ ہیں۔ شکر کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بیان کیا گیا ہے احسان ماننا اور محسن کی ثناء کرنا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر اسی طرح سے ہوتا ہے کہ انسان اس کی دی ہوئی چیز کو عمدگی کے ساتھ اور برمحل استعمال کرے۔ جب کوئی شخص کسی کی دی ہوئی چیز کو استعمال نہ کرے تو اس کی تعریف کرنا صرف لفظی ثناء ہوگی۔ شکر نہ ہوگا۔

شکر میں صحیح استعمال اور صحیح مصرف کا ہونا ضروری ہے شکر کے لئے ضروری ہے کہ صحیح استعمال اور صحیح مصرف بھی ہو۔ یہ قانون تمام ترقیات کا گر ہے۔ اگر علم کا صحیح استعمال کیا جائے گا تو علم ضرور بڑھے گا۔ آنکھ، ہاتھ، ناک، کان غرض ہر عضو جس کا صحیح استعمال کیا جائے وہ ضرور ترقی پذیر ہوتا ہے۔ یہ ایک عام قانون ہے اس میں ہندو، مسلم یا عیسائی کی کوئی تمیز نہیں۔ مسلمان مال کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔ وہ گر رہے ہیں۔ مگر ہندو اس کا صحیح استعمال کرنے کی وجہ سے ترقی کر رہے ہیں۔

مسلمانوں پر ادبار کی وجہ روحانیات کا بھی یہی حال ہے۔ قرآن کریم ہی کو دیکھو مسلمان اس کا صحیح استعمال کرتے تھے تو نہ فلسفہ اور عقلیات اور نہ عیسائیت اور یہودیت وغیرہ مذاہب اسلام کے مقابلہ کی تاب لا سکے۔ مگر آج وید، تورات اور انجیل ہر ایک اپنے آپ کو آگے آگے پیش کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف علوم عقلیہ اس پر حملہ آور ہیں۔ کبھی اسلام کفر کو کھاتا تھا آج کفر اسلام کو کھا رہا ہے۔ جب مسلمان ہی اسلام کے متعلق کہہ رہے ہیں کہ اس کا یہ حکم بھی ناقابلِ عمل ہے اور وہ بھی تو اس کا باقی کیا رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھ دے کہ اپنے عیب کو اسلام کی طرف منسوب نہ کریں۔ عمل تو وہ خود صحیح طور پر نہیں کرتے لیکن نتیجہ کی خرابی کو قرآن کریم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

وَ قَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ

اور موسیٰ نے (اپنی قوم سے یہ بھی) کہا تھا (کہ) اگر تم اور جو (دوسرے لوگ) زمین میں (بستے) ہیں سب (کے

فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝۹

سب) بھی کفر اختیار کر لو تو (اس میں خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں ہو سکتا کیونکہ) اللہ (تعالیٰ) یقیناً بے نیاز (اور) بہت ہی تعریفوں والا ہے۔

حلّ لُغات ۔غَنِیٌّ غَنِیَ میں سے صفت مشبہ ہے۔ اور غَنِیَ فُلَانٌ غِنًی وَغَنَاءً کے معنے ہیں ضِدُّ فَقَرَ۔ اَیْ کَثُرَ مَالُهٗ وَ کَانَ ذَا وَفْرٍ۔ کہ مالدار ہو گیا۔ اور ہر چیز کثرت سے میسر آ گئی۔ غَنِیَ بِهٖ عَنْ غَیْرِهٖ: اِکْتَفٰی بِهٖ یعنی اس چیز کے میسر آ جانے سے دوسروں کی مدد کا محتاج نہ رہا۔ اَلْغَنِیُّ: اَلْمُکْتَفِیْ مِنَ الرِّزْقِ ضرورت کے مطابق رزق والا۔ وَهُوَ غَنِیٌّ عَنْهُ اَیْ مُسْتَغْنٍ هُوَ غَنِیٌّ عَنْهُ کے معنے ہیں اس سے بے نیاز۔ (اقرب) علاوہ ازیں غِنًی کے معنے ہیں عَدَمُ الْحَاجَاتِ حاجات کا نہ ہونا۔ (مفردات) پس غَنِیٌّ کے معنے ہوں گے ایسی ذات جسے

کسی قسم کی حاجت نہ ہو۔یعنی بے نیاز۔

تفسیر ۔حضرت موسیٰؑ فرماتے ہیں کہ یہ جوخدا تعالیٰ بار بارنبیوں کے ذریعہ ہدایت بھیجتا ہےاس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا کوکوئی ضرورت ہے۔اس کوکوئی ضرورت نہیں۔وہ تمہارے فائدہ کے لئے بھیجتا ہے۔ورنہ وہ تو بے احتیاج ہستی ہے۔

خدا تعالیٰ کا کلام بھیجنا اس کے محتاج ہونے کی دلیل نہیں اس آیت میں اس سوال کا جواب آ جاتا ہے جوآج کل کے تعلیم یافتہ کیا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا کلام بھیجنا اس کے محتاج ہونے پر دلالت کرتا ہے۔فرماتا ہے کہ غنی کودوسرے کی کیا احتیاج ہوسکتی ہے۔ہاں چونکہ وہ حمید ہےاس لئے ڈوبتوں کو بچاتا ہے۔اس میں یہ نکتہ بتایا کہ ہر کام اپنی احتیاج سے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ کبھی کام دوسرے کی احتیاج کو دور کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ جولوگ خودغرض ہیں وہ اپنے پر قیاس کر کے خیال کر لیتے ہیں کہ جوبھی کام کیا جائے احتیاج ہی کے سبب ہوتا ہے۔حالانکہ احتیاج اوراحسان میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ

کیا جولوگ تم سے پہلے تھے یعنی نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور جو ان کے بعد ہوئے ان کی (نسبت) دلوں کو ہلا دینی

ثَمُوْدَ۬ ؕ وَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ

والی خبر تمہیں نہیں پہنچی وہ ایسے نابود ہوئے اور مٹائے گئے (کہ) اللہ (تعالیٰ) کے سواء (اب) انہیں کوئی (بھی)

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ فِیْۤ

نہیں جانتا۔(جب) ان کے پاس ان کے رسول (ہمارے) روشن نشان لے کر آئے تو انہوں نے ان کی بات نہ مانی

اَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِیْ

اور کہا (کہ) جس (تعلیم) کے ساتھ تمہیں بھیجا گیا ہےاس کا (تو) ہم انکار کر چکے ہیں اور جس بات کی طرف تم ہمیں

شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝۱۰

بلاتے ہو اس کے متعلق ہم ایک بے چین کر دینے والے شک میں (پڑے ہوئے) ہیں۔

حلّ لُغات۔ اَلنَّبَأُ اَلْخَبَرُ۔ نَبَأٌ کے معنے ہیں خبر۔ یُقَالُ اَتَانِیْ نَبَأٌ مِّنَ الْاَنْبَاءِ چنانچہ اَتَانِیْ نَبَأٌ مِّنَ الْاَنْبَاءِ کا محاورہ انہی معنوں کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ میرے پاس ایک خبر آئی۔ وَقَالَ فِی الْكُلِّيَّاتِ اَلنَّبَأُ وَالْاَنْبَاءُ لَمْ يَرِدَا فِي الْقُرْاٰنِ اِلَّا لِمَا لَهٗ وَقْعٌ وَشَأْنٌ عَظِيْمٌ۔ اور کلیات میں اَلنَّبَأُ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ قرآن مجید میں اس کا استعمال ایسے واقعہ اور خبر پر ہوتا ہے جو عظیم الشان اور دل ہلا دینے والی ہوتی ہے۔ (اقرب) پس اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَأٌ کے معنے ہوں گے کیا تمہارے پاس دل ہلا دینے والی خبر نہیں پہنچی۔

اَلْيَدُ اَلْيَدُ۔ اَلْكَفُّ۔ یَدٌ کے معنے ہیں ہتھیلی۔ أَوْمِنْ اَطْرَافِ الْاَصَابِعِ اِلَى الْكَتِفِ نیز ید کا استعمال انگلیوں کے پوروں سے لے کر کندھے تک کے لئے بھی ہوتا ہے۔ اس کی جمع اَيْدٍ اور يُدِيٌّ اور جمع الجمع اَيَادٍ ہے اور اَيَادِیْ کا اکثر استعمال نعمت اور احسان پر ہوتا ہے۔ اور ید کے کئی اور معنے بھی ہیں۔ مثلاً اَلْجَاهُ۔ عزت۔ أَلْوَقَارُ۔ وقار۔ یُقَالُ ’’لَهٗ يَدٌ عِنْدَ النَّاسِ۔‘‘ چنانچہ جب لَهٗ يَدٌ عِنْدَ النَّاسِ کا فقرہ بولتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ فلاں شخص کو لوگوں کے ہاں عزت و رتبہ حاصل ہے۔ اَلطَّرِيْقُ۔ طریق۔ أَلْقُوَّةُ وَالْقُدْرَةُ۔ طاقت۔ وَالسُّلْطٰنُ۔ وَالْوَلَايَةُ۔ غلبہ۔ يُقَالُ مَالَكَ عَلَيْهِ يَدٌ اَیْ وَلَايَةٌ۔ چنانچہ مَالَكَ عَلَيْهِ يَدٌ میں یَد کے لفظ سے مراد ولایت ہی ہے۔ اَلْمِلْكُ۔ ملکیت۔ اَلْجَمَاعَةُ۔ جماعت۔ اَلْغِيَاثُ۔ فریادرسی۔ اَلنِّعْمَةُ وَالْاِحْسَانُ تَصْطَنِعُهٗ نعمت و احسان جو کسی پر کی جائے۔ وَهٰذَا فِيْ يَدِیْ اَیْ مِلْكِیْ هٰذَا فِيْ يَدِیْ کے معنے ہیں کہ یہ چیز میری ملکیت ہے اور اَلْاَمْرُ بِيَدِ فُلَانٍ کہہ کر یہ مراد لیتے ہیں اَیْ فِيْ تَصَرُّفِهٖ کہ معاملہ فلاں کے تصرّف میں ہے۔ وَيَدُ الرِّيْحِ سُلْطَانُهَا اور جب ید کا لفظ ریح کی طرف مضاف ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں ہوا کی تیزی و تُندی۔ (اقرب) پس ید کے مختلف معنوں کے لحاظ سے رَدُّوْا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ کے مختلف معانی ہوں گے۔ اوّل منکرینِ انبیاء نے اپنے ہاتھ اپنے منہ کی طرف لوٹا دیئے۔ یعنی حیرت زدہ ہو گئے۔ (۲) انہوں نے اپنے ہاتھوں کو اپنے مونہوں پر رکھا اور نبیوں کو کہا کہ بولو مت۔ خاموش ہو جاؤ۔ (۳) منکرین نے نبیوں کے احسانوں کو ان کے مونہوں پر دے مارا۔

مُرِيْبٌ مُرِيْبٌ اَرَابَ سے اسم فاعل ہے اور اَرَابَ زَيْدًا کے معنے ہیں اَقْلَقَهٗ وَاَزْعَجَهٗ کہ زید کو کسی معاملہ نے بے چینی اور گھبراہٹ میں ڈال دیا۔ (اقرب) اور مریب کے معنی ہوں گے بے چین کر دینے والا۔

گھبراہٹ میں ڈالنے والا۔

تفسیر۔ سب قوموں میں نبی آتے رہے لَا یَعْلَمُھُمْ اِلَّا اللّٰہُ سے نکلتا ہے کہ غیر قوموں میں بھی نبی آتے رہے۔ عاد اور ثمود کے بعد تو ابراہیمی نسل شروع ہو گئی تھی اور ابراہیمی نسل کے انبیاء کا ذکر قرآن مجید اور تورات میں موجود ہے۔ پس مِنْ بَعْدِھِمْ سے مراد ابراہیمی نسل کے سوا دوسری نسلیں ہیں جن کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ یعنی کتب سماویہ جو ایک حد تک محفوظ ہیں ان میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ابراہیمی زمانہ میں بھی غیر قوموں میں نبی آرہے تھے۔ بعض تاریخوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کا زمانہ اور ثمود کا زمانہ برابر چل رہے تھے۔ اگر یہ درست ہے تو ظاہر ہے کہ اسی وقت سے ہی غیر قوموں میں نبی آرہے تھے۔

رَدُّوْٓا اَیْدِیَھُمْ کے معنوں میں مفسرین کا اختلاف رَدُّوْٓا اَیْدِیَھُمْ کے متعلق مفسرین میں بہت کچھ اختلاف ہوا ہے۔ اور زیادہ مشکل لفظ فی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اگر علی آتا تو معنے صاف تھے۔ رَدَّفِیْہِ چونکہ نئی قسم کا محاورہ ہے اس لئے مختلف معانی کئے گئے ہیں۔ بعض نے اس کے معنے یوں کئے ہیں (۱) کہ ’’منکرین انبیاء نے اپنے ہاتھ اپنے منہ کی طرف لوٹا دیئے۔‘‘ یعنی وہ انبیاء کی باتیں سن کر حیرت سے انگشت بدندان ہو گئے۔ اور انہوں نے اس کو عجیب بات سمجھا۔ کسی کی بات سن کر اس طرح منہ پر ہاتھ رکھنا استہزاء اور تمسخر کا ایک طریق ہے۔ ہمارے ملک میں عورتوں میں اس کا بہت رواج ہے۔ غالباً منہ پیٹ لینے کا اشارہ اس میں پایا جاتا ہے۔

فِیْ بمعنے عَلٰی (۲) بعض نے فِیْ کے معنے عَلٰی کے کئے ہیں جو لغۃً درست ہیں (تفسیر ابن کثیر زیر آیت ھذا)۔ اس صورت میں یہ معنے ہوں گے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو اپنے مونہوں پر رکھا۔ اور کہا کہ بولو مت خاموش ہو جاؤ۔ یہ عام دستور بھی ہے۔ خاموش کرانے کے لئے منہ پر ہاتھ رکھا جاتا ہے۔

یَدٌ کے معنی احسان کے بھی ہوتے ہیں میرے نزدیک اس مشکل کو حل کرنے کے لئے لفظ یَدٌ کے اور معنوں کو بھی دیکھنا چاہیے۔ لغت میں لکھا ہے کہ یَدٌ کے معنے نعمت اور احسان کے بھی ہوتے ہیں۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے نبیوں کے احسان کو ان کے منہ پر دے مارا۔ اور کہا کہ اپنی تعلیم تم اپنے گھر لے جاؤ ہم نہیں سنتے۔ گویا نبیوں کی تعلیم کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اور کہا کہ ہم اسے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اردو میں بھی اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایک فارسی جملہ ’’عطاء تو بلقاء تو‘‘ بولا جاتا ہے۔

آیت کا اگلا حصہ بھی احسان کے معنوں کی تائید کرتا ہے آیت کا اگلا حصہ بھی انہی معنوں کی تائید کرتا

ہے۔فرماتا ہے وَ قَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس تعلیم کا انکار کرتے ہیں جس کے ساتھ تمہیں بھیجا گیا ہے۔ اور ہمیں اس تعلیم سے جس کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو اضطراب میں ڈالنے والے شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ

ان کے پیغمبروں نے (انہیں) کہا (کہ) کیا (تمہیں) اللہ (تعالیٰ) کے متعلق کوئی شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو

يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى

پیدا کرنے والا ہے وہ (تو) تمہیں بلا رہا ہے تا کہ وہ تمہارے (فائدہ کے) لئے تمہارے گناہوں میں سے بعض بخش

اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ

دے۔ اور ایک مقرر میعاد تک تمہیں تاخیر دے۔ انہوں نے کہا (کہ) تم (تو) ہماری ہی طرح کے انسان ہو۔ تم

تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا

چاہتے ہو کہ جس چیز کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے چلے آئے ہیں اس سے ہمیں ہٹا دو۔ پس (اگر اس معاملہ میں

بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۱﴾

تم حق پر ہو تو) ہمارے پاس کوئی روشن نشان لاؤ۔

حلّ لُغات۔ فَاطِرِ فَطَرَ سے اسم فاعل ہے اور فَطَرَ الشَّیْءَ یَفْطُرُ فَطْرًا کے معنی ہیں شَقَّهٗ۔ اس چیز کو پھاڑ دیا۔ اَلْعَجِیْنَ۔ اِخْتَبَزَهٗ مِنْ سَاعَتِهٖ وَلَمْ یُخَمِّرْهُ جب آٹے کے متعلق یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ گوندھتے ہی روٹی پکا لی۔ اور خمیر نہ ہونے دیا۔ فَطَرَ الْاَمْرَ۔ اِخْتَرَعَهٗ۔ کوئی چیز بنائی۔ وَابْتَدَاَهٗ۔ بغیر نمونہ کے بنائی۔ وَاَنْشَاَهٗ۔ اور اسے پیدا کر کے نشوونما دی۔ پس فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کے معنے ہوں گے آسمان اور زمین کو بغیر نمونہ کے بنانے والا۔ (اقرب) گویا فاطر کا لفظ پیدائش کی ابتداء کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اَلْمُسَمّٰی اَلْمَعْلُوْمُ الْمُعَیَّنُ۔ مقررہ معین۔ (اقرب) اور اَجَلٌ مُّسَمًّى کے معنے ہوں گے مقررہ معیاد۔ اَلسُّلْطَانُ اَلْحُجَّةُ۔

سلطان کے معنے ہیں دلیل۔ اَلتَّسَلُّطُ۔ قبضہ وَقُدْرَۃُ الْمَلِكِ۔ بادشاہ کی طاقت۔ (اقرب) تو فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ کے معنے ہوں گے ہمارے پاس کوئی روشن نشان اور دلیل لاؤ۔ یا اپنی طاقت کا اظہار کرو۔

تفسیر۔ فاطر کا لفظ پیدائش کی ابتدا کے متعلق اشارہ کرتا ہے قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ کُنْتُ لَاأَدْرِیْ مَاھُوَ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ۔ حَتّٰی اَتَانِیْ اَعْرَابِیَّانِ یَخْتَصِمَانِ فِیْ بِئْرٍ فَقَالَ اَحَدُھُمَا اَنَا فَطَرْتُھَا اَیْ اَنَا ابْتَدَأْتُھَا (اقرب) ابن عباس کہتے ہیں کہ فاطر کے معنے پوری طرح مجھ پر نہ کھلے تھے۔ لیکن ایک دفعہ میرے پاس دو اعرابی ایک کنوئیں کے بارہ میں جھگڑتے ہوئے آئے اور ان میں سے ایک نے کہا کہ اَنَا فَطَرْتُھَا میں نے اس کنوئیں کو پہلے بنانا شروع کیا تھا۔ تب اس لفظ کے معنی مجھے معلوم ہوئے۔

پیدائش کے چار مراتب ابن عباس کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ فاطر کا لفظ پیدائش کی ابتداء کی طرف اشارہ کرتا ہے اور قرآن شریف نے پیدائش کے چار مراتب بیان فرمائے ہیں۔

پہلا مرتبہ ۔ ۱۔ خلق کا وہ مرتبہ جس سے پہلے کسی قسم کا کوئی وجود موجود نہ تھا۔

دوسرا مرتبہ ۲۔ خلق کا وہ مرتبہ جب مادہ تو تھا مگر اس سے آگے کوئی چیز متکیّف ہونی شروع نہ ہوئی تھی۔

تیسرا مرتبہ ۳۔ خلق کا وہ مرتبہ جب اجتماع کے ذریعہ سے مادہ کے اندر مختلف قسم کی طاقتیں پیدا ہونی شروع ہوئیں اور قوانین تیار ہونے لگے جس کی تکمیل کا نام قانونِ قدرت ہے۔

چوتھا مرتبہ ۴۔ خلق کا وہ مرتبہ جبکہ ان قوانین کے مطابق خلق میں تکرار شروع ہوا۔ یعنی نسل اور ولادت وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ جیسے انسان سے انسان کا پیدا ہونا۔ غلہ کا غلہ سے نکلنا۔

فاطر کے لفظ سے دوسرے مرتبہ کو بیان کیا گیا ہے فُطُوْر کا لفظ چونکہ ایک چیز کے دوسری چیز سے نکلنے پر دلالت کرتا ہے اس لئے فَاطِر کے لفظ سے پیدائش کے دوسرے مرحلہ کو بیان کرنا مقصود ہے۔

انبیاء کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے کہنے پر وعظ کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ تو کیا تم کو اللہ کے متعلق شک ہے کہ وہ الہام بھیج سکتا ہے یا نہیں؟ اگر یہ شک ہے تو بالکل غلط ہے۔ کیونکہ وہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس کی نسبت یہ امید رکھنا کہ وہ مخلوق کو پیدا کر کے روحانی ہدایت کے بغیر چھوڑ دے گا عقل کے خلاف ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ خیال کرنا بھی کہ وہ جسمانی زمین و آسمان تو پیدا کرے گا مگر روحانی زمین و آسمان کی پیدائش کو نظر انداز کر دے گا عقل کے بالکل خلاف ہے۔

یَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ ابھی ایک سوال باقی تھا اور وہ یہ کہ کفار کہہ سکتے تھے کہ ہمیں یہ تو شک نہیں کہ خدا تعالیٰ ہمیں ہدایت کی طرف بلا سکتا ہے یا نہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ وہ بڑی شان والا ہے اس کی شان کے خلاف ہے کہ ہم جیسے حقیر وجودوں کو بلائے۔ (یہ خیال اب بھی تعلیم یافتہ طبقہ میں پھیلا ہوا ہے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ بڑی شان والے کی شان کے خلاف تو یہ امر ہوتا ہے کہ وہ چھوٹوں کو اپنی مدد کے لئے بلائے نہ یہ کہ وہ چھوٹوں کی مدد کے لئے خود آئے۔ یہ فعل تو اس کی شان کے عین مطابق ہے۔ ہمارا یہ تو دعویٰ نہیں کہ خدا تعالیٰ تم کو اس لئے بلاتا ہے کہ تم سے کوئی فائدہ اٹھائے۔ بلکہ ہمارا تو یہ دعویٰ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں اس لئے تمہاری طرف بھیجا ہے کہ تا تمہاری احتیاج کو دور کرے۔ اور تمہارے گناہوں کو معاف کرے۔ اور تمہیں ایک نئی زندگی عطا کرے۔ اس پر ان کا یہ اعتراض نقل کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو خدا تعالیٰ کوئی اپنی شان کے مطابق پیغامبر بھیجتا نہ کہ ہمارے جیسے ایک انسان کو بھیج دیتا۔ تم تو ہماری ہی طرح کے ایک بشر ہو تم کو خدا نہیں بھیج سکتا تھا۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ تم یہ سب باتیں محض ہم پر حکومت کرنے کے لئے بنا رہے ہو۔ تا کہ ہمیں اپنے آباء کی اطاعت سے ہٹا کر اپنی فرمانبرداری میں لگاؤ۔ اگر ہمارا یہ شبہ غلط ہے تو نشانات کے ذریعہ سے اس امر کو ثابت کرو کہ تم ہم سے بالا ہستی ہو۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ

ان کے پیغمبروں نے انہیں کہا (کہ یہ سچ ہے کہ) ہم تمہاری (ہی) طرح کے بشر ہیں لیکن (ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ)

اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ

اللہ (تعالیٰ) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے (خاص) احسان کرتا ہے۔ اور یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں

نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ

ہے کہ اللہ (تعالیٰ) کے حکم کے سوا تمہارے پاس کوئی نشان لائیں۔ اور مومنوں

فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

کو اللہ (تعالیٰ) پر ہی توکل رکھنا چاہیے۔

تفسیر۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے جواب دیا کہ بے شک ہم تمہاری ہی طرح کے آدم ہیں لیکن یہ تو

سوچو کہ جسے بھی خدا تعالیٰ چنتا آخر وہ اس کی مخلوق میں سے ہی ہوتا اور اس کی دی ہوئی طاقتوں کے ساتھ ہی آتا۔ آنے والا خدا تعالیٰ کا شریک یا غیر مخلوق تو ہو نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ایسی کوئی ہستی ہے ہی نہیں۔ اور جب بہرحال اس نے مخلوق ہی میں سے ہونا تھا تو اس پر کیا اعتراض کہ اس نے انسانوں کو اس کام کے لئے کیوں چنا۔ اپنے بندوں میں سے جسے اس نے چاہا چن لیا۔ تم اس کے اختیارات کو محدود کرنے والے کون ہو؟

انبیاء بشریت سے بالا نہیں ہوتے باقی جو تم ہم سے ایسی دلیل کا مطالبہ کرتے ہو کہ ہم اپنی فضیلت تم پر ثابت کریں تو یہ مطالبہ ہمارے دعاوی کے خلاف ہے۔ ہم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم بشر سے بالا ہیں۔ بلکہ بشر رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور صرف یہ دعویٰ کیا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمارے ہاتھ پر نشان دکھاتا ہے اور ہمارا اس کی مدد پر انحصار ہے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ ہم خود کوئی معجزہ دکھاتے ہیں۔ اور جو اصولِ دین ہم پیش کرتے ہیں ان کے رو سے تو وہ شخص مومن ہی نہیں کہلا سکتا جو اپنی ذاتی فضیلت کو پیش کرے۔ وہ تو کافر ہے مومن نہیں۔

وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَ

اور ہمیں (ہوا) کیا ہے کہ ہم اللہ (تعالیٰ) پر توکل نہ کریں حالانکہ اس نے ہمارے (مناسب حال) راستے ہمیں

لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَیْتُمُوْنَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ

دکھائے ہیں اور جو دکھ تم نے ہمیں دے رکھا ہے اس پر ہم یقیناً صبر کرتے چلے جائیں گے اور بھروسہ کرنے والوں کو تو

ع ۲ ۱۴
الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۳﴾

اللہ (تعالیٰ) پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔

حل لغات۔ هَدٰىنَا هَدٰی کی تشریح کے لئے دیکھو سورۃ رعد آیت ۲۸۔

تفسیر۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طاقتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہم تو وہم بھی نہیں کر سکتے کہ خدا تعالیٰ ہماری تائید اور مدد کا محتاج ہے۔ بلکہ اس کی قدرت کو دیکھ کر ہم نے تو ان طاقتوں کو بھی جو اس نے ہمیں دوسرے انسانوں کی طرح دے رکھی ہیں اسی کے سپرد کر دیا ہے۔

هَدٰىنَا سُبُلَنَا میں عظیم الشان نکتہ هَدٰىنَا سُبُلَنَا سے یہ بتایا کہ نبی کی فضیلت ذاتی فضیلتوں کے سبب سے نہیں

ہوتی بلکہ اس امر میں ہوتی ہے کہ وہ انسان کی احتیاج کو ثابت کر کے آسمانی مدد کی ضرورت کو ثابت کرتا ہے۔ ان الفاظ میں یہ عظیم الشان نکتہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ شریعت ان امور کو بیان کرتی ہے جو انسان کے اپنے فائدہ کے لئے ہوتے ہیں۔ یہ مضمون سُبُلَنَا (ہمارے راستے) کے الفاظ سے نکلتا ہے۔ یعنی وہ راستے جن کی ہمیں اپنی ترقی کے لئے ضرورت ہے نہ کہ خدا کو ان کی ضرورت ہے۔

دوسرے سبل کا لفظ جمع رکھ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس تعلیم میں انسان کی مختلف ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے اور اپنے وقت کے لحاظ سے یہ مکمل شرائع ہیں۔ وَ لَنَصْبِرَنَّ کے لفظ سے اپنی کمزوری کا مزید اقرار کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ بجائے اپنی فضیلت اور طاقت کا دعویٰ کرنے کے ہم تو اقرار کرتے ہیں کہ ظاہری سامانوں کے لحاظ سے تم ہم پر غالب ہو۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم ہم کو ہر قسم کے دکھ دو گے۔ مگر ہم چونکہ خدا تعالیٰ کے حکم سے کھڑے ہوئے ہیں۔ ہم ان دکھوں کو پوری طرح برداشت کریں گے۔ اور ثابت کریں گے کہ اپنی برتری اور فائدہ ہمارے مدنظر نہیں ہے۔

توکّل علی اللہ سب سہاروں سے آزاد کر دیتا ہے پھر وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ کہہ کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ ہر شخص کو دوسرے کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ کوئی شخص اکیلا اپنی ضروریات پوری نہیں کرسکتا۔ تو جب سہارا لینا ہی ضروری ہے اور ہر شخص کو سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے تو پھر معمولی سہارا کیوں تلاش کریں۔ کیوں نہ خدا تعالیٰ پر ہی توکل کریں تا باقی سب سہاروں سے آزاد رہیں؟

اس آیت سے علاوہ اور سبقوں کے مومن کو یہ سبق بھی حاصل کرنے چاہئیں۔

مومن اپنی ذات کے متعلق صبر اور دینی کاموں کے لئے غیرت سے کام لیتا ہے ۱۔ مومن کی شان یہی ہے کہ وہ صبر سے زیادہ کام لے۔ غصہ کم کرے مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ صبر اور غیرت میں فرق ہے۔ اپنی ذات کے متعلق صبر سے کام لینا چاہیے اور دین کے کاموں کے متعلق غیرت سے مگر نا جائز غیرت نہ ہو جائز غیرت ہو۔

خدا تعالیٰ پر توکّل نہ کرنے کی وجہ کامل یقین سے محرومیت ہے ۲۔ توکل کے متعلق تصوف کا یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں انسان سہارے تو ہمیشہ ڈھونڈتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ خدا پر توکل نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ پر کامل یقین لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن نبی چونکہ اس کی شفقتوں کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اس لئے وہ اور ان کے پیرو نہایت خوشی سے خدا پر توکل کرتے ہیں۔

انبیاء کا اصل کام یقین اور توکّل پیدا کرنا ہے اور اصل کام نبیوں کا یہی ہوا کرتا ہے کہ وہ خدا کے متعلق

یقین پیدا کر کے لوگوں کو متوکل بنا دیں۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ

اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہوں نے اپنے (اپنے زمانہ کے) پیغمبروں سے کہا (کہ) ہم تمہیں ضرور اپنے ملک

اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ

سے نکال دیں گے یا تم (مجبور ہو کر) ہمارے مذہب میں واپس آ جاؤ گے (تو ان تکلیفوں سے بچ سکو گے) جس پر

الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۴﴾

ان کے رب نے ان پر وحی نازل کی (کہ) ہم ان ظالموں کو یقیناً ہلاک کر دیں گے۔

حل لغات۔ لَتَعُوْدُنَّ عَادَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور عَادَ اِلٰی کَذَا وَلَہٗ کے معنے ہیں صَارَ اِلَیْہِ۔ اس کی طرف ہو گیا۔ وَرَجَعَ اس کی طرف لوٹا۔ وَقِیْلَ اِرْتَدَّ اِلَیْہِ بَعْدَ مَا کَانَ اَعْرَضَ عَنْہُ۔ اور بعض عَادَ کے معنے یہ کرتے ہیں کہ کسی چیز سے منہ پھیرنے کے بعد اور اسے ترک کرنے کے بعد پھر اس کی طرف رجوع کیا۔ وَالْعَرَبُ تَقُوْلُ عَادَ عَلَیَّ مِنْ فُلَانٍ مَکْرُوْہٌ۔ اَیْ صَارَ مِنْہُ اِلَیَّ۔ اور جب عرب لوگ عَادَ عَلَیَّ مِنْ فُلَانٍ مَکْرُوْہٌ کا محاورہ بولتے ہیں تو اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ مجھے فلاں سے تکلیف پہنچی۔ (اقرب)

اَلْمِلَّۃُ اَلْمِلَّۃُ۔ اَلشَّرِیْعَۃُ اَوِ الدِّیْنُ۔ شریعت اور دین کو ملّت کہتے ہیں۔ وَقِیْلَ اَلْمِلَّۃُ وَالطَّرِیْقَۃُ سَوَآءٌ۔ بعض کہتے ہیں کہ ملّت اور طریقہ ہم معنے لفظ ہیں۔ وَھِیَ اِسْمٌ مِنْ اَمْلَیْتُ الْکِتٰبَ ثُمَّ نُقِلَتْ اِلٰی اُصُوْلِ الشَّرَائِعِ بِاِعْتِبَارِ اَنَّھَا یُمْلِیْھَا النَّبِیُّ اور ملّت اسم ہے جو اَمْلَیْتُ الْکِتَابَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے پھر وہ شریعت کے اصول کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ کیونکہ شریعت کے اصول نبی لکھا تا ہے۔ وَقَدْ تُطْلَقُ عَلَی الْبَاطِلِ کَالْکُفْرِ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ اور کبھی یہ لفظ جھوٹے مذہبوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کے محاورہ سے ظاہر ہے۔ وَلَا تُضَافُ اِلَی اللّٰہِ وَلَا اِلٰی آحَادِ الْاُمَّۃِ۔ اور یہ اللہ کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔ اور نہ امت کے کسی فرد کی طرف۔ یعنی دِیْنُ اللّٰہِ تو کہہ سکتے ہیں مگر مِلَّۃُ اللّٰہِ نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح قوم کی ملّت کہیں گے زید یا بکر کی ملت کا لفظ نہیں بولیں گے۔ (اقرب) پس لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا کے معنے ہوں گے (۱) ہماری ملّت میں آ جاؤ

(۲) ہمارے مذہب کو اختیار کرو۔ (۳) ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔

تفسیر۔اپنی عزت قائم رکھنے کے لئے کفار کی ایک دلی خواہش جبکہ کفار نبیوں اور ان کی جماعتوں سے لڑ رہے ہوتے ہیں اور کامیابی کے دعویٰ پر ناراض ہو رہے ہوتے ہیں۔ان کے دلوں میں ایک باریک خواہش پائی جاتی ہے کہ یہ ہماری طرف جھکیں اور ہماری تھوڑی سی دلجوئی کریں۔تا کہ ان کا دعویٰ برتری کا ٹوٹ جائے۔اور ہماری بھی کچھ عزت بنی رہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی کفار آپ کے چچا کے پاس آئے اور کہا کہ اگر یہ ذرہ بھی نرمی کر دے تو ہم سب مخالفت چھوڑ کر اس سے صلح کر لیں گے۔لیکن آپ نے صاف فرما دیا کہ یہ لوگ سورج کو دائیں اور چاند کو بائیں بھی لا کھڑا کریں تو میں یہ بات نہیں مان سکتا (سیرت النبی لابن ھشام زیر عنوان مبادة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قومه وما کان منھم)۔

صلح کی خواہش پوری نہ ہونے پر کفار کا آخری حربہ اس پر مخالفوں نے آنحضرتؐ کی ذات بابرکات پر اور آپ کے صحابہؓ پر ایسا حملہ شروع کیا کہ جسے آخری حملہ کہنا چاہیے جس کا اختتام ہجرت پر ہوا۔اس قسم کے واقعات ہر نبی کو پیش آتے ہیں اور اس آیت سے پہلے کی آیات میں کفار کی اس خواہش کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا تبھی بار بار توکل کا لفظ استعمال کیا گیا تھا اور کہہ دیا گیا تھا کہ ہم تمہاری تمام ایذاؤں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔اس پر کفار نے سمجھ لیا کہ اب یہ لوگ کسی ایسی صلح پر تیار نہیں جس میں ہماری بھی کچھ عزت رہ جائے۔اور انہوں نے وہی دھمکی ان کو دی جو رسول کریم صلعم کو بعد میں کفار مکہ نے دی۔یعنی اب ہم بھی صلح پر تیار نہیں۔یا تو پوری طرح ہمارے مذہب میں شامل ہو گے یا ہم تم کو اپنی زمین سے نکال دیں گے۔

زمین سے نکال دینے کے معنے مار دینے کے بھی ہیں زمین سے نکال دینے کے معنے صرف جلاوطن کر دینے کے نہیں ہیں بلکہ مار دینے کے بھی ہیں۔درحقیقت یہ ایک کامل بے تعلقی کا اعلان ہے۔یعنی جب تم اپنے دعویٰ کے متعلق کسی معقول سمجھوتہ پر آنے کے لئے تیار نہیں تو ہمارا تمہارا یکجا رہنا ناممکن ہے۔آخر یہ ہمارا ملک ہے ہم اکثریت میں ہیں اگر تم ہماری مرضی کے تابع نہیں رہ سکتے تو پھر ہمارے ملک میں رہنے کا بھی تمہیں کوئی حق نہیں۔

باطل پرست اقوام مذہب کو سیاسی اختلاف کا باعث بنا لیتی ہیں عجیب امر ہے کہ ہمیشہ باطل پرست اقوام اپنی طاقت پر ناز کرتی ہیں اور یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ یا تو عقائد بھی ان کی مرضی کے مطابق رکھے جائیں یا ان کے ملک سے لوگ نکل جائیں۔آج کل احمدیوں کے متعلق دوسرے مسلمانوں کا ایک حصہ یہی رویہ اختیار کر رہا ہے۔ہر جگہ احمدیوں کو دکھ دیا جا رہا ہے۔اور صاف کہا جا رہا ہے کہ یا احمدی توبہ کریں ورنہ ہندوستان سے نکل

جائیں۔ان کو ہمارے ملک میں رہنے کا کوئی حق نہیں اور لطیفہ یہ ہے کہ بعض ہندو مصنف یہی امر مسلمانوں کے متعلق لکھ رہے ہیں۔گویا بلا وجہ اختلاف کی خلیج کو وسیع کیا جا رہا ہے اور مذہب کو سیاسیات کے میدان میں گھسیٹا جا رہا ہے۔

لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ میں دو اشارے لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ اس جگہ لَنُهْلِكَنَّكُمْ نہیں فرمایا بلکہ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ فرمایا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان میں سے ایمان لانے والے تھے۔اس لئے فرمایا کہ جو لوگ ظلم پر قائم رہیں گے ان کو ہی ہم ہلاک کریں گے۔

لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ سے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ تم جو کہتے ہو کہ چونکہ ہمارا ملک ہے اگر ہماری بات نہ مانو گے تو ہم تم کو نکال دیں گے۔تو اس طرح خود اپنے خلاف فتویٰ لگاتے ہو کیونکہ زمین تو خدا کی ہے پھر وہ کیوں تمہارے فتویٰ کے مطابق تم کو ہی ہلاک نہ کرے؟

لَتَعُوْدُنَّ کے تین معنی یہاں جو فرمایا ہے اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا۔تو یا تو (۱) عَادَ بمعنی صَارَ ہے یعنی ہو گیا کیونکہ نبی تو بچپن سے ہی شرک سے محفوظ ہوتا ہے۔پس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہماری ملّت میں آ جاؤ۔ہمارے مذہب کو اختیار کر لو۔یا (۲) چونکہ مومن بھی اس کے ساتھ ہی مخاطب تھے اور مومن فی الواقع پہلے ان لوگوں کے ہم مذہب تھے اس لئے کثرت مخاطبین کے لحاظ سے لوٹ آؤ کے الفاظ استعمال کئے گئے۔یا (۳) لَتَعُوْدُنَّ کے الفاظ کفار نے اس لئے استعمال کئے کہ گو نبی خدا تعالیٰ کے فضل سے بچپن سے ہی شرک سے محفوظ ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ مشرکوں میں پیدا ہوا ہوتا ہے اس لئے عرفاً وہ ان کی قوم کا ایک فرد سمجھا جاتا ہے اس کو مدنظر رکھ کر کفار نے ''لوٹ آؤ'' کے الفاظ استعمال کئے۔

وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ

اور ان (کی ہلاکت) کے بعد اس ملک میں ضرور تمہیں آباد کر دیں گے یہ (وعدہ) اس کے حق میں ہے جو میرے

مَقَامِيْ وَ خَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۵﴾

مقام سے ڈرے اور (نیز) میرے وعید سے ڈرے۔

حل لغات۔اَلْمَقَامُ مَقَامٌ مصدر ہے اور اسم زمان اور اسم مکان بھی ہے۔یعنی قیام کی جگہ یا قیام کا زمانہ۔نیز مقام کے معنے ہیں۔اَلْمَنْزِلَةُ۔رتبہ۔درجہ۔شان۔(اقرب) پس ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ کے یہ معنے

ہوں گے کہ یہ اس کے لئے ہے جو میرے رتبہ اور میرے مقام اور میری شان سے ڈرے۔

وَعِیْدٌ وَعِیْدٌ وَعَدَ کا مصدر ہے اور وَعَدَ عِدَۃً وَوَعْدًا اچھے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور وَعَدَ وَعِیْدًا برے معنوں میں اور وعدہ کے وقت وعدہ نہ پورا کرنا تو کذب کہلاتا ہے لیکن وعید میں تخلّف کرم کہلاتا ہے اور اچھا سمجھا جاتا ہے اور وعید کے معنے ہیں اَلتَّھْدِیْدُ۔ دھمکی۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں جمع کا صیغہ قبضہ اور تصرف کے ظاہر کرنے کے لئے ہے پہلی آیت میں بھی اور اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے متکلم مع الغیر کے صیغہ کو استعمال کیا ہے جو کہ جمع کے معنے دیتا ہے۔ حالانکہ ہلاک کرنے والی اور جگہ دینے والی تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو واحد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جگہ قبضہ اور تصرف کا اظہار کرنا مقصود ہے۔ چونکہ جماعت میں قوت اور طاقت زیادہ ہوتی ہے جہاں قرآن کریم میں قبضہ اور تصرف بتانا مقصود ہوتا ہے اور اسے نمایاں کرکے دکھانا ہوتا ہے۔ وہاں جمع کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اور جہاں استغناء کا اظہار مقصود ہوتا ہے یا قبضہ اور تصرف پر زور دینا مقصود نہیں ہوتا۔ وہاں واحد کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔

جمع کے صیغہ کے استعمال کے متعلق صوفیوں کا خیال بعض صوفیوں نے یہ بھی لکھا ہے جس کام کو اللہ تعالیٰ ملائکہ کے توسط سے کرتا ہے اس کے لئے جمع کا صیغہ استعمال فرماتا ہے اور جس کام کو خالص امر سے کیا جاتا ہے وہاں مفرد کا صیغہ استعمال فرماتا ہے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ سے اس طرف اشارہ کیا کہ یہ غلبہ اور کامیابی کا وعدہ اس کے لئے ہے جو میرے درجہ کو سمجھتا ہو اور میرے مالک ہونے پر یقین رکھتا ہو۔

ان کی طرف سے وعید یہی تھا کہ اے مومنو! ہم تم کو اپنی زمین سے نکال دیں گے گویا وعید اپنی ملکیت سے نکالنے کا تھا۔ ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کو تباہ کرکے اپنے رسول کو ان کی جگہ قائم کردیں گے۔

الٰہی وعدہ کے پورا ہونے کے لئے اللہ کی عظمت اور اس کا خوف دل میں ہونا ضروری ہے اور پھر فرمایا کہ یہ وعدہ ہمارا اس کو ہی ملے گا جو میرے مقام اور مرتبہ سے اور میرے انذار سے خوف رکھتا ہوگا گویا وعدہ کے پورا ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت نبی کی جماعت کے دل میں ہو اور اس کے عذاب سے وہ خائف ہوں۔ پس وہ لوگ غلطی پر ہیں جو صرف امت میں سے کہلا کر الٰہی وعدوں کے امیدوار رہتے ہیں۔

وَ اسْتَفْتَحُوْا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۟ۙ﴿۱۶﴾

اورانہوں نے (اپنی) فتح کے لئے دعا کی اور (نتیجہ یہ ہوا کہ) ہر ایک سرکش (اور) حق کا دشمن نا کام رہا۔

حلّ لُغات۔ اِسْتَفْتَحَ اِسْتَفْتَحُوْا اِسْتَفْتَحَ سے جمع کا صیغہ ہے اور اِسْتَفْتَحَ الْبَابَ کے معنے ہیں فَتَحَهٗ دروازہ کو کھولا۔ اِسْتَفْتَحَ الشَّيْءَ بِكَذَا اِبْتَدَأَهٗ اس کو شروع کیا۔ اور اِسْتَفْتَحَ فُلَانٌ کے معنے ہیں طَلَبَ الْفَتْحَ وَاسْتَنْصَرَ اس نے فتح طلب کی اور مدد چاہی۔ وَمِنْهُ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا اَيْ اِنْ طَلَبْتُمُ الظَّفَرَ۔ یعنی اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا کے معنے ہیں۔ اگر تم مدد چاہو۔ نیز هُوَ يَسْتَفْتِحُ عَلَيَّ بِفُلَانٍ کا فقرہ بھی ان معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ یعنی وہ میرے خلاف مدد چاہتا ہے۔ (اقرب)

خاب خَابَ يَخِيْبُ خَيْبَةً لَمْ يَظْفَرْ بِمَا طَلَبَ۔ خَابَ کے معنے ہیں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ كَفَرَ۔ کفر کیا۔ اِنْقَطَعَ اَمَلُهٗ۔ اس کی امید ٹوٹ گئی۔ خَابَ سَعْيُهٗ اَيْ لَمْ يَنْجَحْ اور خَابَ سَعْيُهٗ کے معنے ہیں اس کی کوشش نا کام گئی۔ (اقرب)

جبّار جَبَّارٌ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے اور اس کے معنے ہوتے ہیں بڑا مصلح اور لوگوں کی حاجات پوری کرنے والا۔ جب جَبَّار غیر اللہ کی صفت ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں كُلُّ عَاتٍ مُتَمَرِّدٍ۔ سرکش۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے والا۔ وَالَّذِيْ يَقْتُلُ عَلَى الْغَضَبِ جسے غصہ کی حالت میں قتل سے بھی دریغ نہ ہوتا ہو۔ (اقرب)

عَنَدَ عَنَدَ عَنِ الطَّرِيْقِ وَالْقَصْدِ کے معنے ہیں مَالَ وَعَدَلَ۔ راستہ یا ارادہ کو ترک کر دیا۔ اُس سے اِدھر اُدھر ہو گیا۔ اور عَنِيْدٌ کے معنے ہیں اَلْمُخَالِفُ لِلْحَقِّ الَّذِيْ يَرُدُّهٗ وَهُوَ يَعْرِفُهٗ حق کا ایسا مخالف جو اس کو باوجود سمجھنے کے رد کرتا ہو۔ (اقرب) پس خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ کے معنے ہوں گے۔ ہر حق کا مخالف۔ سرکش۔ اپنی کوششوں میں نا کام رہا اس کی امیدیں ٹوٹ گئیں۔ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔

تفسیر۔ اِسْتَفْتَحُوْا کی ضمیر انبیاء اور کفار دونوں کی طرف راجع ہو سکتی ہے وَاسْتَفْتَحُوْا الخ کی ضمیر دونوں طرف پھر سکتی ہے۔ نبیوں کی طرف بھی اور کفار کی طرف بھی اور سیاق و سباق کے لحاظ سے بھی دونوں ہی معنے ہو سکتے ہیں۔ جب کفار نے کہا کہ ہم تم کو اپنی زمین سے نکال دیں گے تو لازماً نبیوں اور ان کے اتباع نے دعا مانگنی ہی تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں کفار کے شر سے محفوظ رکھے۔

وعدہ کے بعد دعا کی ضرورت اگر کوئی یہ کہے کہ خدا تو پہلے وعدہ کر چکا ہے کہ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ کہ ہم مومنوں کو ہی جگہ دیں گے تو پھر دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن باتوں کا خدا تعالیٰ وعدہ کرتا ہے ان کے لئے زیادہ دعا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر وعدہ کے بعد انسان محروم رہ جائے تو یہ امر اس کی سخت بدقسمتی پر دلالت کرے گا۔ وعدہ کے بعد دعا کی ضرورت قرآن کریم کی ایک اور آیت سے ثابت ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ (ال عمران: ۱۹۵) پس مومن کو اس پر اتکال نہیں کرنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ بلکہ اگر وعدہ ہو تو تدبیر اور دعا سے اور بھی زیادہ کوشش کرنی چاہیے تا اس کی غلطی سے خدا تعالیٰ کے کلام پر کوئی حرف نہ آئے۔ انبیاء ہمیشہ موعود امور کے لئے دعا اور تدبیر سے کام لیتے چلے آئے ہیں اور یہ ان کی کمزوری نہیں بلکہ طاقت کی دلیل ہے۔

فتح مکہ کے وعدہ کے باوجود آنحضرتؐ کا دعا اور تدبیر سے کام لینا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ میں ہی فتح مکہ کا وعدہ کیا گیا تھا۔ جیسا کہ فرمایا لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ (القصص: ۸۶) لیکن باوجود اس کے آپ اس کے لئے دعا بھی کرتے رہے اور تدابیر کرتے رہے۔ بیس کے قریب جنگیں آپ نے اس مقصد کے لئے کیں اگر وعدہ کے بعد تدبیر ناجائز ہے تو پھر چاہیے تھا کہ آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ پس یہ اصل کہ وعدہ کے بعد تدبیر یا دعا ناجائز ہے جاہلوں کا بنایا ہوا ہے اور دین سے جہالت کے سبب سے گھڑا گیا ہے۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے وَاسْتَفْتَحُوْا کی ضمیر کفار کی طرف بھی پھر سکتی ہے۔ اس صورت میں آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ کفار فتح کے لئے کوششیں کرتے ہیں اور فتح کی خواہش کرتے ہیں مگر اگلے جملہ میں فرمایا کہ یہ عجب بے وقوف ہیں ان کے سامنے پہلے مثالیں موجود ہیں کہ نبیوں کے مخالف ہمیشہ ناکام اور نامراد ہوتے رہے ہیں مگر باوجود اس کے پھر یہ امید رکھتے ہیں کہ ہم نبی کے مقابل کامیاب ہو جائیں گے۔

مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۟ۙ﴿۱۷﴾

اس (دنیوی عذاب) کے بعد (اس کے لئے) جہنم (کا عذاب مقدر) ہے اور (وہاں) اسے تیز گرم پانی پلایا جائے گا

حلّ لُغَات۔ وَرَآئِهٖ وراء کے لفظ کے معنے آگے اور پیچھے دونوں کے ہیں۔ اور اکثر زمانہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور آگے اور پیچھے دونوں معنوں میں اس لئے استعمال ہوتا ہے کہ کبھی فرض کر لیا جاتا ہے کہ گویا

زمانہ انسان کے پیچھے چلا آرہا ہے۔اور کبھی یہ فرض کیا جاتا ہے کہ انسان اس کی تلاش میں چلا جارہا ہے پس دونوں معنوں میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔یعنی اس چیز کے متعلق بھی کہ جو پیچھے سے اس کو آ ملے گی۔اور اس چیز کے متعلق بھی کہ جس کو یہ جا کر آگے مل جائے گا۔اور کبھی اس کے معنے سواء کے بھی ہوتے ہیں۔جیسے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ یعنی سَوَآءُ ذٰلِكَ نیز کبھی یہ ظرف مکان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔(اقرب)

اَلصَّدِيْدُ مَاءُ الْجُرْحِ الرَّقِيْقُ -اَلْمُخْتَلِطُ بِالدَّمِ قَبْلَ اَنْ تَغْلُظَ الْمِدَّةُ۔ پتلی خون آلود پیپ جو پیپ کے گاڑھا ہونے سے پہلے زخم سے نکلتی ہے۔وَ قِيْلَ هُوَ الْقَيْحُ الْمُخْتَلِطُ بِالدَّمِ اور بعض اس کے معنے صرف خون آلود پیپ کے کرتے ہیں۔خواہ گاڑھی ہو خواہ پتلی۔وَ قِيْلَ الْحَمِيْمُ اُغْلِيَ حَتّٰى خَثُرَ۔اور بعض اس کے معنی گرم پانی کے بھی کرتے ہیں کہ جو ابل ابل کر گاڑھا ہو جائے۔(اقرب)

تفسیر۔اس کے آگے جہنم ہوگی یعنی ایک لمبے عرصہ تک اس کا واسطہ جہنم سے پڑے گا۔اور صدید یعنی گرم پانی پینے سے مراد گرم پانی بھی ہو سکتا ہے۔کہ اس دنیا میں بھی گرم پانی سے علاج کیا جاتا ہے۔

گرم پانی پینے سے مراد ممکن ہے کہ جہنم میں بھی گرم پانی کی شکل میں کوئی روحانی علاج مقرر ہو۔اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ حصول مدعا کے ذرائع سامنے ہوں گے۔لیکن انہیں استعمال نہیں کر سکیں گے۔جس طرح تیز گرم پانی پانی تو ہے لیکن پیا نہیں جا سکتا۔اس لئے پیاسے کو اسے دیکھ کر اور تکلیف پہنچتی ہے۔

زخموں کے دھوون سے مراد اگر زخموں کا دھوون سمجھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ دنیا میں بھی ان کے کاموں کا موجب ان کے ناپاک شہوات ہوتے تھے جو گویا اندرونی زخموں کا دھوون ہیں۔کیونکہ شہوت قلب کی خرابی کا نتیجہ ہے۔اگلے جہاں میں وہ ہی متمثل ہو کر زخموں کے دھوون کی شکل میں سامنے آئیں گے۔دھوون کے معنی بھی علاج کو مدنظر رکھتے ہوئے چسپاں ہو سکتے ہیں۔کیونکہ آج کل سب سے بہتر علاج ویکسین اور سیرم اور بیکٹر وفیج ہیں۔اور ان علاجوں میں بیماری کے ہی مختلف اجزاء اور کیڑوں کے لعابوں سے علاج کیا جاتا ہے۔پس ہو سکتا ہے کہ علاج بالمثل کی طرف اشارہ ہو کہ ان کے گناہوں اور گندوں کے فاسد مادوں سے ہی ان کا علاج کیا جائے گا۔یا یہ کہ ان کے گند ان کے سامنے رکھ دیئے جائیں گے جن سے ان کو گھن آئے گی اور اس طرح انہیں گند سے نفرت ہو جائے گی جیسا کہ سائیکو انیلسس والے کرتے ہیں جو ایک نیا طریق علاج نکلا ہے۔

يَّتَجَرَّعُهٗ وَ لَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ

وہ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے پیئے گا اور اسے آسانی سے نہیں نگل سکے گا اور ہر جگہ (اور ہر طرف) سے اس پر موت آئے

مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَ مِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۸﴾

گی اور وہ مرے گا نہیں اور اس کے علاوہ بھی (اس کے لئے) ایک سخت عذاب (مقرر) ہے۔

حلّ لُغات۔ يَتَجَرَّعُهٗ تَجَرَّعَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور تَجَرَّعَ الْمَاءَ کے معنے ہیں اِبْتَلَعَهٗ شَيْئًا بَعْدَ شَيْءٍ۔ اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے حلق سے اتارا۔ وَمِنْهُ فِي الْقُرْاٰنِ۔ وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ۔ يَتَجَرَّعُهٗ اور آیت مذکورہ میں يَتَجَرَّعُهٗ کے معنے یہی ہیں کہ اس کو گلے سے بڑی مشکل سے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارے گا۔ تَجَرَّعَ الْغَيْظَ كَظَمَهٗ غصہ کو دبایا۔ (اقرب)

يُسِيْغُ اَسَاغَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور سَاغَ (جو اَسَاغَ کا مجرد ہے) کے معنے ہیں سَاغَ الشَّرَابُ فِي الْحَلْقِ۔ هَنَا وَسَلِسَ وَسَهُلَ مَدْخَلُهٗ فِيْهِ کہ پانی راس آیا اور حلق سے بآسانی نیچے اتر گیا۔ (پس اَسَاغَ کے معنے ہوئے آسانی سے اتارا۔ لیکن کبھی اَسَاغَ متعدی بھی استعمال ہوتا ہے جیسے) اَسَاغَ الطَّعَامُ اسَاغَةً کے معنے ہیں سَهُلَ مَدْخَلُهٗ فِي الْحَلْقِ وَسَاغَ لَهٗ دُخُوْلُهٗ فِيْهِ کھانا گلے میں آسانی سے اتر گیا۔ (اقرب) پس وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُه کے معنے ہوں گے کہ اسے حلق سے آسانی سے نہیں اتار سکے گا۔ وہ اس کے لئے فائدہ مند ثابت نہ ہوگا۔

غَلِيْظٌ غَلِيْظٌ ذُوالْغِلَاظَةِ۔ سختی والا۔ خِلَافُ اللَّيِّنِ وَالسَّلِسِ۔ نرمی اور سہولت کے مخالف معنے دیتا ہے۔ اَمْرٌ غَلِيْظٌ شَدِيْدٌ صَعْبٌ۔ سخت مشکل امر۔ عَذَابٌ غَلِيْظٌ اَيْ شَدِيْدُ الْاَلَمِ۔ سخت دردناک عذاب۔ (اقرب)

تفسیر۔ وَيَأْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ اس سے بتایا ہے کہ جس طرح مومنوں کو جنت میں ہر دروازہ سے سلام آئے گا اسی طرح کفار کو ہر طرف موت کا سامنا ہوگا۔ یعنی قسم قسم کے گنہ جو وہ کرتے تھے موت کی شکل میں ان کے سامنے آئیں گے۔ مگر فرمایا کہ وہ اس موت سے مریں گے نہیں کیونکہ اصل غرض ان کی اصلاح ہے۔ آخر سلامتی پہنچ جائے گی۔ کیونکہ انسان سلامتی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ موت نہ پہنچے گی کیونکہ انسان موت کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔ (سوائے پہلی موت کے)

جنت اور دوزخ کے لئے باب اور دوزخ کے لئے مکان کا لفظ استعمال کرنے میں حکمت جنت اور دوزخ کے ذکر میں (جنت کا ذکر سورۂ رعد میں آیا تھا دیکھو آیت ۲۴، ۲۵) ایک یہ فرق بھی رکھا ہے کہ جنت کے متعلق تو باب کا لفظ استعمال کیا تھا اور دوزخ کے لئے مکان کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سلامتی باہر سے آتی ہے یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے اور موت یعنی ہلاکت انسان اپنے لئے خود پیدا کرتا ہے۔ پس سلامتی کے لئے تو فرمایا کہ دروازوں سے آئے گی اور ہلاکت کے لئے فرمایا کہ اندر سے ہی ہر کونہ سے نکل پڑے گی۔

وَ مِنۡ وَّرَآئِہٖ عَذَابٌ غَلِیۡظٌ سے مراد وَ مِنۡ وَّرَآئِہٖ عَذَابٌ غَلِیۡظٌ سے یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ اس عذاب کے بعد اور عذاب آئیں گے۔ مثلاً خدا تعالیٰ سے دوری، ندامت، حسرت وغیرہ اور یہ بھی کہ یہ عذاب ایک دفعہ مل کر ہٹ نہ جائے گا بلکہ لمبا چلتا جائے گا۔

مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ اَعۡمَالُہُمۡ کَرَمَادِ

جن لوگوں نے اپنے رب (کے احکام) کا انکار کیا ہے ان کے اعمال اس راکھ کی طرح ہیں جسے ایک تیز آندھی والے

اشۡتَدَّتۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ یَوۡمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقۡدِرُوۡنَ

دن ہوا تیزی سے (اڑا) لے گئی ہو۔ جو کچھ انہوں نے (اپنے مستقبل کے لئے) کمایا ہے اس میں سے کوئی حصہ

مِمَّا کَسَبُوۡا عَلٰی شَیۡءٍ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الضَّلٰلُ الۡبَعِیۡدُ ﴿۱۹﴾

(بھی) ان کے ہاتھ نہیں آئے گا یہی پرلے درجہ کی تباہی ہے۔

حلّ لُغات۔ عَاصِفٌ عَصَفَ سے اسم فاعل ہے اور عَصَفَ الزَّرْعَ یَعْصُفُ عَصْفًا کے معنے ہیں جَزَّہٗ قَبْلَ اَنْ یُّدْرِکَ کھیتی کو پکنے سے پہلے ہی کاٹ لیا۔ اَلرِّیْحُ تَعْصِفُ عَصْفًا وَعُصُوْفًا۔ اِشْتَدَّتْ۔ ہوا کے لئے جب عَصَفَ کا لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں ہوا تیزی سے چلی۔ عَصَفَ فُلَانٌ عِیَالَہٗ کَسَبَ لَھُمْ اپنے اہل وعیال کے لئے کمایا۔ عَصَفَ الْحَرْبُ بِالْقَوْمِ ذَھَبَتْ بِھِمْ وَاَھْلَکَتْھُمْ۔ لڑائی نے قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ اور عَصَفَ الدَّھْرُ بِھِمْ بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ زمانے نے ان کو ہلاک کر دیا۔ اَلنَّاقَۃُ بِرَاکِبِھَا کے معنے ہیں اَسْرَعَتِ السَّیْرَ کَاَنَّھَا الرِّیْحُ۔ اونٹنی اپنے سوار کو تیزی سے لے کر چلی۔ گویا کہ وہ ہوا

ہے۔ الشَّیْءُ مَالَ چیز کے متعلق آئے تو اس کے معنے جھکنے کے ہوتے ہیں۔ الرَّجُلُ اَسْرَعَ آدمی کے لئے یہ لفظ آئے تو اس کے معنے جلدی کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور عَاصِفٌ کے معنے اَلْمَائِلُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ کے بھی ہوتے ہیں یعنی ہر چیز کا مائل حصہ۔ یَوْمٌ عَاصِفٌ کے معنے تَعْصِفُ فِیْہِ الرِّیْحُ کے ہیں یعنی وہ دن جس میں ہوا بہت تیزی سے چلے اور یہاں اسم فاعل کا صیغہ بمعنی اسم مفعول استعال ہوا ہے اور اس کی جمع عَوَاصِفُ آتی ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور طاقتوں کا انکار ہے کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ سے مراد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار کیا۔ کیونکہ وہ لوگ تو اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتے تھے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار یا اس کی طاقتوں کا انکار ہے۔

اللہ کی طاقتوں کے منکروں کو اعمال فائدہ نہیں دیتے بہت سے لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو مانتے ہیں لیکن اس کا دخل دنیا میں نہیں مانتے۔ جیسے کہ اس زمانہ کے مغربی تعلیم پائے ہوئے لوگ ہیں۔ انہی سے ننانوے فی صدی بلکہ زیادہ اگر خدا تعالیٰ کو مانتے بھی ہوں تو بھی اس امر کو نہیں مانتے کہ وہ اس دنیا کے معاملات میں کوئی دخل دیتا ہے۔ اس لئے ان کے سب کام دنیا یا نفس کے لئے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے یا اس کے خوف کے سبب سے نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کی نسبت فرماتا ہے کہ ان کے اعمال کوئی روحانی فائدہ نہیں دیتے۔ روحانیت یا آخرۃ کے لحاظ سے وہ ایسے ہی بیکار ہیں جیسے کہ وہ راکھ جس پر آندھیوں کے موسم میں تیز آندھی چلی ہو۔ جیسے متواتر اور شدید آندھی کے سبب سے اس راکھ کا نام ونشان تک بھی باقی نہیں رہتا اسی طرح ان لوگوں کے اعمال آخرت کے لحاظ سے باطل ہوتے ہیں۔

دنیا کے لئے کئے ہوئے عمل کا فائدہ دنیا تک ہی محدود رہ سکتا ہے کیونکہ جو کام دنیا کے لئے کیا گیا ہو اس کا فائدہ دنیا تک ہی محدود رہ سکتا ہے اور یہ بالکل انصاف کے مطابق ہے۔ کیونکہ عمل کا طبعی نتیجہ تو وہ ہے جو اس کے بعد قاعدہ کے طور پر مترتب ہوتا ہے۔ اور وہ نتیجہ کافر ومومن ہر شخص کو مل جاتا ہے۔ جو شخص غریبوں کی خبر گیری کرتا ہے غربا اس کی خدمت کرتے اور بوقت ضرورت اس کے لئے جان تک دے دیتے ہیں۔ جو سچ بولتا ہے لوگ اس کا اعتبار کرتے ہیں اور ہزاروں مواقع پر اس اعتبار کی وجہ سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ پس جب طبعی نتیجہ انسان کو مل گیا پھر اس کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔

خدا تعالیٰ کے لئے نیکی کرنے والے کو دگنا فائدہ لیکن جو شخص نیکی خدا تعالیٰ کے لئے کرتا ہے اس کے ظاہری عمل کے ساتھ ایک اور عمل اخلاص باللہ کا بھی شامل ہو جاتا ہے اور ظاہری نتیجہ کے نکلنے کے باوجود اس عمل کے

صلہ کا وہ مستحق رہ جاتا ہے۔اور اسی کو اخروی ثواب کہتے ہیں۔ یہ ثواب چونکہ عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ عمل کے ساتھ کے اخلاص باللہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مستحق وہی شخص ہوسکتا ہے جس کے اعمال اپنے ساتھ اِبْتِغَاءَ لِوَجْهِ اللّٰهِ کا عمل بھی رکھتے ہوں۔ یعنی نیک کام کے ساتھ خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول کی خواہش بھی شامل ہو۔ اور جس کے عمل کے ساتھ یہ امر نہ ہو اس کا بس اتنا ہی بدلہ تھا جو اسے دنیا میں مل گیا۔

دوسرے معنے آیت کے یہ ہیں کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں کوششیں کرتے ہیں ان کی کوششیں ضائع ہو جائیں گی۔ بیکار ہوں گی۔ کیونکہ مسبب الاسباب تو اللہ تعالیٰ ہے۔ تمام اسباب اسی نے پیدا کئے۔ پھر وہ ان اسباب کو کس طرح کامیاب کرسکتا ہے جو خود اس کے دین کے خلاف ہوں؟

عارضی خوشی منکران حق کو پہنچ سکتی ہے مگر اس امر کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عارضی خوشیاں اللہ تعالیٰ اپنے دین کے دشمنوں کو بھی پہنچا دیتا ہے اور عارضی اور وقتی فتوحات انہیں بھی ملتی رہتی ہیں جن کا مقصد ایک تو نصرت الٰہی کو چمکا کر دکھانا ہوتا ہے دوسرے اس وقفہ سے نیک لوگوں کے لئے توبہ کا موقع بھی مہیا کیا جاتا ہے۔

ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ۔ یعنی اس سے زیادہ ہلاکت کیا ہوگی کہ انسان محنت کرے لیکن اس کا پورا فائدہ نہ اٹھائے۔ یا وہ محنت الٹی اس کے خلاف پڑے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ

(اے مخاطب) کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ (تعالیٰ) نے آسمانوں اور زمین کو حق (وحکمت) کے ساتھ پیدا کیا ہے

يُذْهِبْكُمْ وَ يَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۙ۝۲۰

اگر وہ چاہے تو تمہیں ہلاک کردے اور (تمہاری جگہ پر) کوئی (اور) نئی مخلوق لے آئے۔

حلّ لغات۔ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَلذِّهَابُ۔ اَلْمُضِيُّ۔ ذِهَابٌ کے معنے ہیں چلے جانا۔ وَقَالَ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ كِنَايَةً عَنِ الْمَوْتِ۔ آیت اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ میں ہلاک کرنے کے معنے مراد ہیں یعنی اگر وہ چاہے تو تمہیں ہلاک کردے۔ (مفردات)

تفسیر۔ **اپنے عمل سے دنیا کی پیدائش کو بیکار کرنے والوں کی سزا** یعنی دنیا کی پیدائش بیکار نہیں۔ پس ایسے لوگ جو اپنے عمل سے اسے بے کار بنا رہے ہیں انہیں خدا تعالیٰ اس دنیا پر کب حکومت دے سکتا

ہے۔ کیونکہ ان کا وجود تو پیدائش عالم کی غرض کو باطل کر رہا ہے۔ پس انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ خطرہ کے مقام میں ہیں۔ اور یہ بھی انہیں نہ سمجھنا چاہیے کہ انہیں کوئی شخص اپنے مقام سے ہٹا نہیں سکتا کیونکہ ان کا کوئی قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ ایسا کر سکتا ہے کہ انہیں ہلاک کر کے دوسرے لوگوں کو ان کی جگہ لے آئے۔

دوسرے لوگوں کو ان کی جگہ لانے سے مراد نبیوں کی جماعتیں ہیں دوسرے لوگوں سے اس جگہ نبیوں کی جماعت مراد ہے۔ اور صرف یہ بتانا مقصود نہیں کہ وہ ایسا کر سکتا ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایسا نہ سمجھیں کہ ان کا قائم مقام نہیں مل سکتا۔ ان کا بہتر قائم مقام تیار ہو رہا ہے۔

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۱﴾

اور یہ بات اللہ (تعالیٰ) کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔

حل لغات۔ عَزِيْز يُقَالُ عَزَّ عَلَيَّ كَذَا ۔ اَيْ صَعُبَ۔ عَزَّ عَلَيَّ كَذَا کے معنے ہیں کہ یہ کام مجھ پر مشکل ہو گیا۔ (مفردات) وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ کے معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں۔

تفسیر۔ **دنیا میں کمزور اقوام کا ترقی کرنا اور زبردست کا زیردست ہونا ناممکن امر نہیں** دنیا کا عجب حال ہے۔ جب کوئی قوم کمزور ہوتی ہے تو کہتی ہے کہ اب ہمارا بڑھنا ناممکن ہے اور جب کوئی قوم ترقی کر جاتی ہے تو کہتی ہے کہ اب ہمارا ہلاک ہونا ناممکن ہے۔ حالانکہ لوگ ہر زمانہ میں دیکھتے ہیں کہ کمزور اقوام ترقی کر گئیں اور زبردست، زیردست ہو گئیں۔ اس آیت میں اسی غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے۔ ہزاروں دفعہ اللہ تعالیٰ نے گری ہوئی قوموں کو ترقی دی ہے اور ہزاروں دفعہ ترقی یافتہ قوموں کو قعرِ مذلّت میں گرایا ہے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا

اور وہ سب اللہ (تعالیٰ) کے حضور آ کھڑے ہوں گے تب (ان میں سے) کمزور (سمجھے جانے والے) ان سے جو

كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ

تکبر کیا کرتے تھے کہیں گے (کہ) ہم تو تمہارے پیچھے چلنے والے تھے پس کیا تم اللہ (تعالیٰ) کے عذاب میں سے

اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ

(اس وقت) کچھ بھی ہم پر سے دور کر سکتے ہو۔ وہ (جواب میں) کہیں گے کہ اللہ (تعالیٰ) ہمیں ہدایت دیتا تو ہم

عَلَیْنَاۤ اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ ﴿۲۲﴾ ع ۳ ۹ ۱۵

(بھی) تمہیں ہدایت دیتے (لیکن اب کیا ہو سکتا ہے) ہمارا بے صبری دکھانا یا ہمارا صبر کرنا (اس وقت) ہمارے لئے یکساں ہے (اور) ہمارے لئے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔

حلّ لُغات۔ اَغْنٰی مُغْنُوْنَ اَغْنٰی سے ہے اور اَغْنٰی عَنْهُ کے معنے ہیں اَجْزَأَهٗ۔ اس سے کفایت کی۔ اس کی تکلیف خود اٹھا کر اس کو بچا لیا۔ اور جب مَایُغْنِیْ عَنْكَ هٰذَا بولا جائے تو اس سے یہ معنے مراد ہوتے ہیں مَایُجْدِیْكَ کہ یہ بات تجھے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ (اقرب) پس فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا کے معنے ہوں گے کہ کیا تم ہمارے عذاب اٹھا کر ہم کو عذاب سے بچا سکتے ہو۔ یا ہمیں کچھ فائدہ دے سکتے ہو۔

مَحِیْصٌ حَاصَ یَحِیْصُ کا مصدر ہے اور حَاصَ مَحِیْصًا کے معنے ہیں عَدَلَ وَحَادَ۔ بچاؤ کر کے ایک طرف ہو گیا۔ اَلْمَحِیْصُ اَلْمَحِیْدُ۔ ایک طرف بچاؤ کی جگہ۔ بچاؤ اَلْمَهْرَبُ۔ بھاگنے کی جگہ۔ (اقرب) مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ کے معنے ہوں گے ہمارے لئے بھاگنے کی کوئی صورت نہیں۔ کوئی بچاؤ کی صورت نہیں۔

تفسیر۔ آیت کے لفظ ماضی کے ہیں اور معنے مستقبل کے اس آیت میں ماضی کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں لیکن ترجمہ مستقبل کا کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گو لفظاً ماضی کے صیغے استعمال ہوئے ہیں لیکن مراد آئندہ زمانہ سے ہے کیونکہ یہاں ذکر عذاب کا ہے اور عذاب آئندہ آنے والا تھا۔ ابھی تک آیا نہ تھا۔

کسی امر کے یقینی وقوع پذیر ہونے کے لئے ماضی کے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں ماضی کے صیغے اس امر پر زور دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے استعمال کئے ہیں کہ وہ دن ضرور آئے گا اور یہ نظارہ ضرور دنیا کو دیکھنا پڑے گا۔ عربی کا محاورہ ہے کہ جب کسی مستقبل کے امر کے یقینی ہونے پر زور دینا ہو تو ماضی کے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ اردو میں بھی اس قاعدہ کا وجود ملتا ہے۔ اگر کسی شخص کی آمد کی انتظار ہو اور کوئی شخص گھبراہٹ کا اظہار کرے تو منتظر شخص کے رشتہ دار یا دوست کہہ دیتے ہیں بس جی وہ آ ہی گیا ہے۔ یعنی اب اس کے آنے میں کوئی دیر نہیں اور اس کا آنا یقینی ہے۔

مطلب آیت **قومیں کمزوریوں کی وجہ سے اتنی ہلاک نہیں ہوتیں جتنی کمزوریاں ظاہر ہونے سے**

کا یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کا منشاء تباہ کرنے کا ہوگا سب اس کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔یعنی ان کی اندرونی کمزوریاں اور باطنی نقائص ظاہر ہونے لگیں گے۔قوموں کی تباہی کے متعلق یہ نکتہ یادرکھنے کے قابل ہے کہ قومیں اس قدر اپنی کمزوریوں کی وجہ سے تباہ نہیں ہوتیں جس قدر کہ ان کمزوریوں کے ظاہر ہونے کے سبب سے۔جب تک ان کی کمزوریوں پر پردہ پڑا رہتا ہے باوجود کمزوریوں کی موجودگی کے وہ بڑھتی جاتی ہیں۔کیونکہ لوگ ان سے مرعوب ہوتے ہیں۔جب ان کی کمزوریاں ظاہر ہو جاتی ہیں تو پھر باوجود پورا زور لگانے کے وہ گرنا شروع ہو جاتی ہیں۔گویا کام اتنا کام نہیں آتا جس قدر کہ نام۔اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے عیب کو ظاہر کر دے گا۔ورنہ خدا تعالیٰ تو ہر بات کو ہر وقت ہی جانتا ہے۔

قومی تباہی کا ایک سبب فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا یعنی جب قوم گرنے لگے گی تب کمزور طاقتوروں سے کہیں گے کہ اب ہماری حفاظت کرو۔کہ ہم تو تمہارے پیچھے اور تمہارے کہنے پر چلتے تھے۔مگر طاقتور کہیں گے کہ ہمیں خود کوئی راستہ نہیں ملتا۔ساری تدبیریں بے کار جا رہی ہیں۔ہم تمہاری مدد کیا کریں۔اس لئے صبر ہی کرو۔اس میں پھر قومی تباہی کا ایک سبب بتایا ہے۔جس قوم نے زندہ رہنا ہوتا ہے وہ گرتے گرتے بھی کوشش کو جاری رکھتی ہے۔مگر جس قوم نے ہلاک ہونا ہوتا ہے وہ صبر کر کے خاموش ہو جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔اور اپنی حالت پر راضی ہو جاتی ہے۔حالانکہ صحیح صبر کا یہ مقام نہیں۔صبر تو بری حالت سے بچنے کا نام ہے نہ کہ اس پر راضی ہو جانے کا۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ عذاب سے پہلے لوگ ایک دوسرے کو جرم کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ ڈرو نہیں ہم ذمہ دار ہیں۔ہم تمہارے ساتھ ہیں۔تو پھر تم کو کسی کا کیا ڈر۔لیکن جب خدا کا عذاب آتا ہے تو پھر کوئی بھی ساتھ نہیں دیتا۔یہی حال دنیوی جرائم کا ہے۔بعض لوگ کسی کو قتل کا مرتکب بنا دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں ہم تمہیں بچائیں گے۔لیکن جب وہ مجرم پکڑا جاتا ہے تو پھر بھلا کون ہے جو یہ کہے کہ مجھے پکڑ لو۔اس وقت کوئی اپنے آپ کو اس کی جگہ پیش نہیں کرتا۔

وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ

اور جب تمام معاملہ کا فیصلہ کیا جا چکے گا تو شیطان (لوگوں سے) کہے گا (کہ) اللہ (تعالیٰ) نے یقیناً تم سے اٹل وعدہ

الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ

کیا تھا۔ اور میں نے (بھی) تم سے (ایک) وعدہ کیا تھا پھر میں نے وہ تم سے (کیا ہوا وعدہ) پورا نہ کیا اور میرا تم پر

مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا

کوئی تسلط نہ تھا ہاں میں نے تمہیں (اپنے خیالات کی طرف) بلایا اور تم نے میرا کہا مان لیا اس لئے (اب)

تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَ مَاۤ

مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو (اس وقت) نہ میں تمہاری فریاد سن سکتا ہوں اور

اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ

نہ تم میری فریاد سن سکتے ہو۔ تم نے جو مجھے (اللہ تعالیٰ کا ایک) شریک بنا رکھا تھا۔ میں (تمہاری) اس (بات) کا

اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾

پہلے سے انکار کر چکا ہوں (اس قسم کا شرک کرنے والے) ظالموں کے لئے یقیناً دردناک عذاب (مقدر) ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلْحَقّ کے لئے دیکھیں حل لغات سورۃ رعد آیت نمبر ۱۵۔

اَخْلَفْتُكُمْ اَخْلَفَهٗ مَا وَعَدَهٗ کے معنے ہیں قَالَ شَيْئًا وَلَمْ يَفْعَلْهُ۔ کسی بات کے کرنے کا وعدہ کیا۔ اور پھر اسے پورا نہ کیا۔ فُلَانًا وَجَدَ مَوْعِدَهٗ خِلْفًا۔ اَخْلَفَ فُلَانًا کے معنے ہیں کہ اس کے وعدوں میں اختلاف پایا۔ (یعنی جھوٹے وعدے ہوتے ہیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ) اَخْلَفَ الْغَيْثُ۔ اَطْمَعَ فِي النُّزُوْلِ ثُمَّ نَقَصَ بارش پہلے اترتی ہوئی معلوم ہوئی پھر نہ اتری۔ اَخْلَفَ الدَّوَاءُ فُلَانًا اَضْعَفَهٗ۔ دوا نے کمزور کر دیا۔ (اقرب)

پس اَخْلَفْتُكُمْ کے معنے ہوں گے کہ میں نے تم سے وعدہ کر کے اسے پورا نہ کیا (۲) میں نے تمہیں جھوٹے وعدے دے دے کر غافل رکھا اور کمزور کر دیا۔

اَلْمُصْرِخُ اَصْرَخَ سے اسم فاعل ہے اور اَصْرَخَ فُلَانٌ کے معنے ہیں اَغَاثَہٗ وَاَعَانَہٗ۔ اس کی فریادرسی اور اس کی مدد کی۔ اور جب یہ محاورہ بولیں اِسْتَصْرَخَنِیْ فَاَصْرَخْتُہٗ تو اس کے معنے ہوں گے اِسْتَغَاثَ بِیْ فَاَغِثْتُہٗ۔ کہ اس نے میری مدد چاہی۔ اس پر میں نے اس کی مدد کی۔

اصرخ میں ھمزہ سبب کا بھی ہوسکتا ہے وَقِیْلَ الْھَمْزَۃُ لِلسَّلْبِ۔ بعض کہتے ہیں کہ اَصْرَخَ کا ہمزہ سلب کے لئے ہے اور اَصْرَخَ کے معنی ہیں ازلت صراخہ یعنی اس کی چیخ وپکار اور فریاد کو دور کر دیا۔ (اقرب) اور چونکہ یہ مصیبت دور کرنے سے ہوتا ہے اس لئے اصرخ کے معنے مدد کرنے کے ہو گئے۔ پس آیت مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ کے معنے ہوں گے نہ میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں اور نہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔ (۲) نہ میں تمہاری چیخ و پکار کو دور کرسکتا ہوں نہ تم میری چیخ و پکار کو دور کر سکتے ہو۔

تفسیر۔ شیطان یا شیطانی لوگوں کا عذاب کے وقت اپنی براءت ظاہر کرنا شیطان یا شیطانی لوگ عذاب کے وقت اپنے آلۂ کار سے براءت ظاہر کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارا تجھ پر کیا زور تھا۔ تمہارے اپنے اندر گند تھا۔ اس لئے تم نے ہماری بات مانی اگر تمہارے اندر نیکی ہوتی اور تم نہ مانتے تو ہم کیا تم کو مجبور کر سکتے تھے۔

اور یہ بات درست بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیطان یا اس کے اظلال جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں انہیں انسان پر کوئی اختیار نہیں۔ وہ تو ایک ذریعہ ہیں انسانی کمزوری کے اظہار کا۔ جس طرح فرشتے ذریعہ ہیں اس کی اچھی طاقتوں کے اظہار کا۔ گمراہ کرنے والا خود انسان کا نفس ہے۔

فرشتے انسان کی نیکی کے معیار کو اور شیطان بدی کے معیار کو ظاہر کرتا ہے شیطان کا کام صرف اشارہ کرنا ہے۔ جیسے فرشتے نیکی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شیطان بدی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کی مثال تو استاد کی سی ہے۔ کہ وہ شاگرد کے سامنے امتحان کے وقت مشکل سوال پیش کرتا ہے لیکن کوئی نہیں کہتا کہ استاد نے شاگرد کو فیل کیا۔ فیل تو طالب علم اپنی کمزوری کے سبب سے ہوتا ہے۔ استاد تو صرف اس کی لیاقت کے معیار کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح فرشتے انسان کی نیکی کے معیار کو اور شیطان بدی کے معیار کو ظاہر کرتے ہیں۔ نہ کہ نیک و بد بناتے ہیں۔

فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ یعنی تم نے ہمیشہ خدا تعالیٰ کے وعدے پورے ہوتے دیکھے۔ مگر انہیں قبول نہ کیا۔ میری طرف سے تمام جھوٹے ہی وعدے ہوئے اور تم نے ان کو مان لیا۔ تو بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے؟

شیطان کا دعویٰ توحید اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ۔ یہ لطیفہ ہے کہ شیطان توحید کا دعویدار ہے اور کہتا ہے کہ تم مجھے خدا تعالیٰ کا شریک بناتے تھے اور میں منکر تھا اور یہ ہے بھی درست۔ وہ شیطان جو انسانی کمزوریوں کو ظاہر کرنے پر مؤکل ہے وہ تو اپنا فرض ادا کر رہا ہے اور خدا تعالیٰ کا جلال اس کے سامنے ہے۔ وہ شرک کس طرح کر سکتا ہے۔ شرک تو تب پیدا ہوتا ہے جب انسان شیطانی تحریک کو اپنے اندر لے کر اسے نافرمانی کی شکل میں ڈھال دیتا ہے۔ سنکھیا جب تک انسان کے پیٹ میں نہیں جاتا۔ ایک قیمتی دوا ہے جب انسان اس کا غلط استعمال کرتا ہے تو وہ زہر قاتل بن جاتا ہے۔ یہی مثال شیطان کی ہے۔ انسان کے اندر داخل ہونے سے پہلے وہ ایک امتحان کا سوال ہے اور کچھ بھی نہیں۔

شیطان کا دوزخ میں جانا بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ پھر شیطان دوزخ میں کیوں جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان کی نسبت آتا ہے خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ۔ مجھے تو نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) آگ سے پیدا کیا ہے۔ پس جو چیز آگ سے پیدا ہے آگ میں جانا اس کے لئے عذاب تو نہیں۔ ایک انگارہ کو اگر چولہے میں ڈال دو تو اسے کیا عذاب ہے۔ صوفیاء کا عام طور پر اسی طرف رجحان ہے کہ شیطان کے اظلال تو عذاب پائیں گے لیکن خود شیطان نہیں۔ کیونکہ وہ تو ایک امتحان لینے والی طاقت ہے اور فرض ادا کر رہی ہے۔

وَ اُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ

اور جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور انہوں نے (نیک اور) مناسب حال عمل کئے ہوں گے انہیں ان کے رب کی

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِیَّتُهُمْ

اجازت سے ایسے باغوں میں جن کے (سایوں کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی داخل کیا جائے گا (اور) وہ اپنے رب

فِیْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۴﴾

کی اجازت سے اس میں (ہمیشہ) بستے رہیں گے۔ اور ان (جنتوں) میں ان کی (ایک دوسرے کے لئے یہ) دعا ہوگی (تم پر) سلامتی (ہو)۔

حل لغات۔ اَلْاِذْنُ کے معنے ہیں اَلْاِجَازَۃُ۔ اجازت۔ اَلْاِرَادَۃُ۔ ارادہ۔ اَلْعِلْمُ۔ علم۔ (اقرب)

اَلتَّحِیَّۃُ التَّحِیَّۃُ کے معنے ہیں۔ اَلسَّلَامُ۔ سلامتی۔ اَلْبَقَاءُ۔ بقاء۔ اَلسَّلَامَۃُ مِنَ الْاٰفَاتِ۔ آفات سے سلامتی۔ اَلتَّحِیَّۃُ مِنَ اللّٰہِ۔ اَلْاِکْرَامُ وَالْاِحْسَانُ۔ جب اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ بولا جائے تو اس کے معنے اکرام اور احسان کے ہوتے ہیں۔(اقرب)

تفسیر۔ مفسرین کے نزدیک بِاِذْنِ رَبِّهِمْ کے معنے بِاِذْنِ رَبِّهِمْ کے مفسرین نے یہ معنے کئے ہیں کہ جنّت کا ملنا اس کی رحمت اور فضل سے ہے نہ کہ استحقاق سے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ کوئی بات بیان فرمائی تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ تو اپنے اعمال کے زور سے جنت میں جائیں گے۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں عائشہ! میں بھی خدا کے فضل سے ہی جنت میں جاؤں گا۔ (بخاری کتاب الرقاق باب القصد و المداومۃ علی العمل) اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اعضاء اور قویٰ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں۔ پس ہمارے اعمال بھی اسی کے فضل سے پیدا ہوئے۔ کیونکہ انہیں اسی کی دی ہوئی طاقتوں سے ہم بجالاتے ہیں۔ پس اعمال کے بدلہ میں جو کچھ ملتا ہے وہ محض فضل ہے۔ اس پر کسی کا حق نہیں۔

مومن جنت نہیں چاہتا خدا تعالیٰ کا قرب چاہتا ہے ۲۔ میرے نزدیک اس آیت کے ایک اور معنے بھی ہیں اور وہ یہ کہ مومن جنت نہیں چاہتا۔ وہ تو صرف خدا تعالیٰ کا قرب چاہتا ہے۔ وہ اگر جنت میں رہے گا تو صرف خدا تعالیٰ کے حکم سے رہے گا۔ ان معنوں کی ایک حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نیک اعمال کرنے والے تین قسم کے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو جنت کی خاطر نیک عمل کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو جہنم سے بچنے کے لئے نیک اعمال کرتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو محض خدا تعالیٰ کی خاطر نیک اعمال کرتے ہیں۔ پس ایسے لوگوں کے لئے جنت ایک زائد چیز ہے نہ کہ مقصود۔

تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ کے تین معنے تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ (۱) ان کی دعا آپس میں سلام ہوگی۔ یعنی وہ آپس میں ایک دوسرے کو سلام کہیں گے۔ (۲) یا یہ کہ ہر ایک دوسرے کے شر سے کلی طور پر محفوظ ہوگا۔ (۳) ان کو وہاں بہترین تحفہ سلام کا ملے گا۔ یعنی ملائکہ کی طرف سے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو سلامتی کے تحفے ملیں گے۔ یعنی ملائکہ تقویٰ کی باریک طاقتوں کو ابھاریں گے اور اللہ تعالیٰ ان پر خاص فضل نازل کرے گا۔

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ

اے (مخاطب) کیا تو نے دیکھا نہیں (کہ) اللہ (تعالیٰ) نے کس طرح ایک پاک کلام کی حالت کو جو ایک پاک

طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۵﴾ تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا

درخت کی طرح ہے (اور) جس کی جڑھ (مضبوطی کے ساتھ) قائم ہے اور اس کی (ہر ایک) شاخ آسمان (کی بلندی)

كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ

میں (پہنچی ہوئی) ہے کھول کر بیان کیا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے رب کے اذن سے اپنا (تازہ) پھل دیتا ہے اور

لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اللہ (تعالیٰ) لوگوں کے لئے (ان کی ضرورت کی) تمام باتیں بیان کرتا ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

حلّ لُغات ۔ضَرَبَہٗ بِیَدِہٖ کے معنے ہیں اَصَابَہٗ وَصَدَمَہٗ بِھَا ۔ اس کو ہاتھ سے مارا۔ ضَرَبَ بِالسَّوْطِ کے معنے ہیں جَلَدَہٗ۔ اس کو کوڑے سے مارا۔ (اقرب)

اَلْمَثَلُ کے معنے ہیں اَلشِّبْهُ وَالنَّظِیْرُ۔ مشابہ۔ اَلصِّفَةُ بیان۔ اَلْحُجَّةُ۔ دلیل۔ یُقَالُ اَقَامَ لَہٗ مَثَلًا اَیْ حُجَّةً اَقَامَ لَہٗ مَثَلًا کہہ کر مثل سے مراد دلیل لیتے ہیں۔ اَلْحَدِیْثُ عام بات۔ اَلْقَوْلُ السَّائِرُ ضرب المثل۔ اَلْعِبْرَةُ عبرت۔ اَلْاٰیَةُ۔ نشان۔ (اقرب)

اور ضَرَبَ لَہٗ مَثَلًا کے معنے ہیں وَصَفَہٗ وَقَالَہٗ وَبَیَّنَہٗ مثل کو بیان کیا۔ اور اچھی طرح سے واضح کیا۔ پس ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کے معنے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی مثال کو خوب کھول کر بیان کر دیا ہے تا کہ کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آ جائے۔

طَیِّبَةً طَابَ میں سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور طَیِّبٌ کا مؤنث ہے۔ اور طَابَ الشَّیْءُ یَطِیْبُ طَابًا وَ طِیْبًا وَطِیْبَةً وَطِیْبَانًا کے معنے ہیں لَذَّ وَزَکٰی وَ حَسُنَ وَحَلَا وَجَلَّ وَجَادَ۔ کوئی چیز۔ لذیذ۔ پاکیزہ۔ خوبصورت۔ شیریں۔ شاندار۔ خوبیوں میں بڑھی ہوئی ہوگئی۔ اور طَابَتِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں اَکْلَأَتْ زمین گھاس سے ہری بھری ہوگئی۔ طَابَتْ بِہٖ نَفْسِیْ اِنْبَسَطَتْ وَانْشَرَحَتْ جی خوش ہوگیا۔ اور طَابَ الْعَیْشُ

لِفُلَانٍ کے معنے ہیں فَارَقَتْهُ الْمَكَارِهُ۔ تکالیف دور ہوگئیں۔ طَابَتْ نَفْسِیْ عَلَیْهِ کے معنے ہیں وَافَقَهَا کہ میرے دل نے اس سے موافقت کی اور طَیِّبٌ کے معنے ہیں ذُوالطَّیِّبَةِ پاکیزگی والا۔ (اقرب) پس كَلِمَةٌ طَيِّبَةٌ کے معنے ہوں گے ایسا کلام جو اعلیٰ ہو۔ بڑھنے والا ہو۔ عمدہ ہو۔ خوشی پیدا کرنے والا ہو۔ فطرت انسانی کے موافق ہو۔

تفسیر ۔ یہ آیت ان آیات میں سے ہے جن کی تفسیر کرکے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے نہ صرف ان آیات کو حل کر دیا ہے بلکہ دوسری آیات کے لئے حل کرنے کا گر بھی ہمارے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ مگر پیشتر اس کے کہ میں اس کی تفسیر کروں كَلِمَةً طَيِّبَةً کا اعراب بتا دینا چاہتا ہوں۔

كَلِمَةً طَيِّبَةً کی ترکیب کے متعلق نحویوں کا اختلاف نحویوں نے کلمۃ کا اعراب دو طرح بیان کیا ہے۔ بعضوں نے كَلِمَةً کو مَثَلًا کا بدل قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے ترجمہ یوں ہوگا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے ایک مثال یعنی کلمہ طیبہ کی۔ یہ معنے ابوالبقا نے کئے ہیں۔

ضَرَبَ مَثَلًا کے ساتھ استعمال ہو کر دو مفعول چاہتا ہے ابن عطیہ اور زمخشری کہتے ہیں کہ ضَرَبَ جب مَثَلًا کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو یہ بھی جَعَلَ کی طرح دو مفعول چاہتا ہے۔ اس بناء پر انہوں نے كَلِمَةً کو مفعول اوّل قرار دیا ہے اور مَثَلًا کو مفعول ثانی اور كَشَجَرَةٍ کو مبتدا محذوف کی خبر بنایا ہے۔ یعنی ھی كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ تو ان کے نزدیک ترجمہ یہ ہوا کہ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح کلمہ طیبہ کو مثالی طور پر واضح کر کے بیان کیا ہے کہ وہ ایک شجرہ طیبہ ہے جس کی جڑھ قائم ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں یا بلندی میں پھیلی ہوئی ہیں۔

کلمہ طیبہ سے مراد تازہ اور انسانی دستبرد سے پاک کلام ہے اب میں اس آیت کی تفسیر بیان کرتا ہوں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی حقیقت بیان کی ہے۔ یعنی اس کلام الٰہی کی جو تازہ اور پاکیزہ ہو اور انسانی دست برد سے پاک ہو اور اس کا موقع یہ تھا کہ پہلی آیات میں شیطانی راہوں پر چلنے والوں کے لئے تباہی کا ذکر فرمایا تھا اور ایمان لانے والوں کے لئے جنات اور انعامات کا۔ اس ذکر سے قدرتی طور پر انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں وہ راہ اختیار کروں جو عذاب سے بچانے والی اور نعمتوں کا وارث بنانے والی ہو۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا ہے کہ اس سورۃ میں یہ ذکر موجود ہے کہ مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی آئے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض نبی بعض کے کلام کو منسوخ کرنے والے تھے۔

تازہ اور مصفّٰی کلام الٰہی کے امتیاز کا معیار پس جب خدا تعالیٰ کا بعض کلام بعض دوسرے کلام کو منسوخ کر دیتا ہے تو انسان کس طرح معلوم کرے کہ فلاں خدائی کلام تو تازہ اور مصفّٰی ہے اور فلاں تازہ اور مصفّٰی نہیں؟ یا کس

طرح معلوم کرے کہ فلاں تعلیم تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور دوسری نہیں۔ کوئی ایسا معیار چاہیے جس سے تازہ اور قابل عمل کلام دوسرے منسوخ شدہ کلام سے اور انسانوں کے بنائے ہوئے اصولوں سے ممتاز ثابت ہو۔ سو وہ معیار اس آیت میں بیان کیا گیا ہے جس کے ذریعہ سے انسان بہ سہولت اس کلام الٰہی کی صداقت کو معلوم کر لیتا ہے۔ جو تازہ بتازہ اور اپنے زمانہ کے لئے قابل عمل ہوتا ہے۔

شجرۃ طیبہ اور کلمہ طیبہ کی پانچ علامات میں مشابہت فرماتا ہے کلمۃ طیّبۃ یعنی تازہ محفوظ اور نہ بگڑے ہوئے کلام الٰہی کی مثال شجرہ طیبہ کو سمجھ لو کہ (۱) وہ طیب ہو۔ یعنی ظاہری صورت اچھی ہو۔ (۲) اس کی جڑھ مضبوط گڑی ہوئی ہو۔ (۳) اس کی شاخیں آسمان میں پھیل رہی ہوں۔ (۴) اور وہ اپنا پھل ہر وقت دے رہا ہو۔ (۵) اور یہ پھل دینا اللہ تعالیٰ کے اذن کے ماتحت ہو۔

یہ پانچ علامات ہیں جو ایک تازہ اور ملاوٹ سے پاک کلام میں ہونی چاہئیں۔ اگر یہ علامات کسی کلام میں پائی جائیں تو وہ اس زمانہ کے لئے قابل عمل ہے اور اس زمانہ کے لوگوں کے لئے ہدایت نامہ ہے۔ لیکن اگر یہ اور کسی کتاب یا کلام الٰہی کہلانے والے صحیفہ میں نہ پائے جائیں تو وہ یا تو منسوخ شدہ کلام الٰہی ہے یا انسانی بناوٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے منزل نہیں ہے۔

اب میں الگ الگ سب علامتوں کو لیتا ہوں۔

کلام کے طیب ہونے کا مطلب پہلی علامت یہ بتائی ہے کہ وہ طیب ہو۔ طیب کے معنے ہیں (ا) برائی عیب اور نقصان سے محفوظ شے۔ (ب) خوبصورت (ج) جو طیب والا ہو۔ اور طیب کے معنے ہیں (۱) لذیذ (۲) پاکیزہ (۳) خوبصورت (۴) شیریں (۵) شاندار (۶) خوبیوں میں بڑھا ہوا۔ پس خدا تعالیٰ کی طرف سے قابل عمل کلام وہ ہے جو اچھے درخت کی طرح ضرر اور نقصان سے محفوظ ہو۔ یعنی اس میں ایسی باتیں نہ ہوں جو انسانی روح یا انسانی شرافت یا انسانی احساسات وجذبات کے خلاف ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ خوبصورت ہو اور اس میں دلکشی اور جذب کے سامان ہوں۔ تیسرے اس پر عمل کرنے والا لذت اور سرور حاصل کرے۔ چوتھے اس میں حلاوت ہو۔ پانچویں وہ شاندار ہو۔ چھٹے وہ دوسروں سے خوبیوں میں بڑھا ہوا ہو۔

سچے کلام میں مضامین کی وسعت ہوتی ہے اور انسانی فطرت کی سب ضرورتوں کو پورا کرتا ہے

دوسری علامت یہ بتائی ہے کہ اس کی جڑھ مضبوط ہو۔ درخت کی جڑھ کے مضبوط ہونے سے ایک تو یہ مراد ہوتی ہے کہ درخت زندہ ہے اور زمین سے غذا لے رہا ہے۔ اسی طرح تازہ کلام الٰہی ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اپنی غذا لے رہا

ہوتا ہے۔ جو کلام منسوخ ہو جاتا ہے اس کے مضامین کی وسعت ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اس لئے منسوخ ہوتا ہے کہ اب وہ بنی نوع انسان کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا لیکن جو کلام قائم ہوتا ہے وہ انسانی فطرت کی سب ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور جو ضرورت بھی انسان کو پیش آئے جھٹ اس کلام سے اسے مل جاتی ہے۔ گویا وہ ایک ایسے درخت کی طرح ہے جو زمین سے غذا لے رہا ہے اور اس سے تازہ مطالب جو زمانہ کی ضرورت کے مطابق ہوتے ہیں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ مطالب اس میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں لیکن وقت پر ان کو ظاہر کرنا اور ضرورتوں کا اس سے پورا کرنا یہ خدا تعالیٰ کے تازہ فضل سے ہی ہوتا ہے۔ پس ایک رنگ میں یہ ہر وقت غذا لیتے رہنے کے مترادف ہے۔

سچا کلام اعتراضات سے متأثر نہیں ہوتا ۲۔ جڑھ کی مضبوطی سے ایک مراد اس کے تنے کی مضبوطی کے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ صدمہ سے جھکتا نہیں۔ یہ بھی سچے کلام کی ایک علامت ہے کہ وہ اعتراضوں اور نکتہ چینیوں سے متأثر نہیں ہوتا بلکہ جس قدر بھی اس پر بوجھ ڈالو وہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور ہر قسم کے اعتراضوں کو اور جرح کو برداشت کر لیتا ہے۔

سچے کلام کے اصول پختہ اور غیر متبدل ہوتے ہیں ۳۔ تیسرے معنی جڑھ کی مضبوطی کے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی جگہ سے ہلتا نہیں۔ ان معنوں کی رو سے کلمہ طیبہ کی یہ علامت ہوگی کہ اس کے اصول ایسے پختہ ہوتے ہیں کہ زمانہ کے اختلاف سے بدلتے نہیں۔ زمانہ بدلتا جائے مگر اس کی تعلیم نہیں بدلتی۔ اور اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہتی ہے۔ جب بھی کسی کلام کو بدلنے کی ضرورت محسوس ہو سمجھ لو کہ اب وہ کلام خدا تعالیٰ کا تازہ کلام نہیں رہا۔ ایک سوکھا ہوا درخت ہے جس کی جڑھیں اکھڑ گئی ہیں۔

سچا کلام لمبی عمر پاتا ہے ۴۔ وہ لمبی عمر والا ہو۔ کیونکہ جن درختوں کی جڑھیں لمبی زمین میں جاتی ہیں وہ لمبی عمر پاتے ہیں۔ کلام الٰہی کی بھی یہ علامت ہے کہ وہ لمبی عمر والا ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ آج نازل ہوا اور کل منسوخ ہو گیا۔ کلام الٰہی سے مراد کلام الٰہی کا اصولی حصہ ہے ورنہ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض جزوی امور ابتلاء اور آزمائش کی غرض سے بدلائے جائیں مگر یہ امور کبھی بھی اصولی تعلیم میں سے نہیں ہوتے۔ اصولی تعلیم کبھی جلد نہیں بدلتی۔ جیسے تورات کہ گو قرآن کریم نے اسے منسوخ کیا مگر یہ دو ہزار سال بعد ہوا۔ درمیان میں نبی آتے رہے مگر ان کی بعثت کی غرض تورات کو منسوخ کرنا نہ تھی۔

سچے کلام پر عمل کرنے والے مومنوں کی ایک جماعت موجود رہتی ہے ۵۔ اس کے ماننے والی اور اس

پر عمل کرنے والی ایک جماعت ہو۔ جن کے اندر وہ پرورش پا کر بڑھے اور ترقی کرے کیونکہ جس طرح درخت زمین میں اپنی جڑھیں پکڑتا ہے کلام الٰہی مومنوں کے دلوں اور اعمال میں جڑھیں پکڑتا ہے۔ اگر اس پر عمل کرنیوالی کوئی جماعت نہ ہو تو اس کے آثار اور نتائج ظاہر نہیں ہو سکتے۔ پس مومنوں کی جماعت کلامِ الٰہی کے لئے بمنزلہ زمین ہوتی ہے اور اَصْلُهَا ثَابِتٌ کے یہ معنے ہیں کہ وہ ایمان لانے والوں کے قلوب پر ایک گہرا اثر ڈالتا ہے اور ان کے اندر مضبوطی سے جڑھیں پکڑ لیتا ہے۔ یعنی وہ اس پر عمل کرتے ہیں اور اس کے کمالات کو ظاہر کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔

۶۔ اس کا منبع ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی حیوان کی طرح اپنی غذا مختلف جگہوں سے نہیں لیتا بلکہ درخت کی طرح ایک ہی جگہ سے یعنی اللہ تعالیٰ سے غذا لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ انسانی کلام اور تعلیمات مختلف جگہوں سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔ کچھ رسم ورواج سے لیا کچھ فلسفہ سے کچھ طبعیات سے کچھ رائج الوقت اصول سے اور اس وجہ سے ان تعلیمات میں باہمی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف الٰہی کلام ایک ہی منبع سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ جڑھیں اس کی گہری ہوتی ہیں۔ یعنی ہر معاملہ پر سیر کن بحث کرتا ہے لیکن سب تعلیمات ایک ہی اصل کے ماتحت ہوتی ہیں۔ اور ان میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اور نیز یہ کہ تازہ الٰہی کلام انسانی امداد کا محتاج نہیں ہوتا۔ سب غذا یعنی اس کی زندگی کا سامان جس سے مراد دلائل و براہین ہیں اپنی جڑھ سے ہی لیتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے جہاں سے وہ آیا ہے۔

آسمان میں شاخیں ہونے سے مراد تیسری علامت یہ بتائی تھی کہ اس کی شاخیں آسمان میں ہوتی ہیں۔ اس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ

(۱) اس پر عمل کر کے انسان خدا تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے کیونکہ جس درخت کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہوں جو شخص اس پر چڑھے گا لازماً آسمان تک پہنچ جائے گا۔ جو استعارۃً الہامی کتب میں اللہ تعالیٰ کے قرب کا مقام قرار دیا گیا ہے۔

(۲) وہ تفصیلات شریعت کو مکمل طور پر بیان کرے۔ کیونکہ آسمان میں شاخوں کے پھیلنے سے شاخوں کی بہتات اور کثرت بھی مراد ہو سکتی ہے۔ پس کلام الٰہی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ معنے ہوں گے کہ اس کلام میں ہر انسانی ضرورت کے متعلق تعلیم موجود ہو اور اخلاقی اور مذہبی کوئی ایسا مسئلہ نہ ہو جس پر اس میں بحث نہ ہو۔ گو اس نے روحانی آسمان کو اپنے پھیلاؤ سے ڈھانپ لیا ہو۔

سچے کلام کی تعلیم اعلیٰ اخلاق پر مبنی ہوتی ہے (۳) تیسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی تعلیم اعلیٰ اخلاق پر مبنی ہو۔ کیونکہ اونچی شاخوں سے مراد ایک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی تعلیم ادنیٰ اخلاق اور ادنیٰ امور پر

مشتمل نہ ہو بلکہ اعلیٰ مقاصد اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم پر مشتمل ہو۔

سچے کلام سے ہر فطرت کے آدمی فائدہ اٹھاتے ہیں (۴) چوتھی بات فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر فطرت کے آدمی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ کیونکہ جس درخت کی شاخیں خوب پھیلی ہوئی ہوں اس کے سایہ کے نیچے بہت سے آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ پس اس میں کلام الٰہی کی اس صفت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس کے سلسلہ میں بہت سے لوگ آسکتے ہیں۔ یعنی مختلف فطرتوں اور مزاجوں کے لوگوں کو وہ آرام دینے کا موجب ہوتا ہے۔

چوتھی علامت یہ بتائی ہے کہ وہ ہر وقت اپنے پھل دے رہا ہو۔ اس سے یہ مراد ہے کہ زندہ کلام الٰہی کی۔ ا۔ یہ علامت ہوتی ہے کہ وہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا کرتا رہتا ہے جو اس کے پھل کہلا سکتے ہیں یعنی وہ اس کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں۔ اور انہیں کلام کے اعلیٰ ہونے کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

سچے کلام سے دائمی نجات حاصل ہوتی ہے ۲۔ دائمی نجات اس سے حاصل ہو۔ کیونکہ جس طرح تُؤْتِيٓ أُكُلَهَا سے یہ مراد ہے کہ ہر وقت کامل انسان پیدا کرتا رہے اسی طرح یہ بھی کہ انسان ہمیشہ اس سے پھل کھاتا ہے اور ہمیشہ پھل تبھی کھا سکتا ہے جبکہ ہمیشہ کی پاکیزہ حیات انسان کو حاصل ہو۔

پانچویں علامت شجرہ طیبہ کی یہ بتائی کہ وہ اپنے پھل بِإِذْنِ رَبِّهَا دیتا ہے۔ یعنی اس کے اعلیٰ پھل طبعی نہیں ہوتے بلکہ اذن الٰہی سے ہوتے ہیں۔ کلام الٰہی کے درخت کو اس طرح عام درخت سے ممیز کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ عام درخت قوانین طبعیہ کے ماتحت پھل دیتا ہے لیکن شجرہ طیبہ ایک ایسا درخت فرض کیا گیا ہے کہ جو پھل تو دے لیکن وہ پھل خاص حکم کے ماتحت ظاہر ہوں۔ ان کا ظہور الٰہی منشاء کے ماتحت ہو۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کلام الٰہی کے نتائج صرف طبیعی نہیں ہوتے بلکہ شرعی بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً سچ بولنا ہے اس کا ایک طبعی پھل ہوگا کہ لوگوں میں سچے آدمی کا وقار بڑھے گا لیکن اس کا ایک پھل شرعی ہوگا کہ ایسا انسان خدا تعالیٰ کے خاص فضلوں کا وارث ہوگا۔ نماز ہے۔ اس کا ایک ظاہری پھل تو یہ ہوگا کہ اطاعت اور نظام قومی کی تعلیم ہوگی لیکن ایک اس کا شرعی پھل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت ایسے شخص کو حاصل ہوگی اور وہ اس کا قرب پائے گا۔

قرآن مجید میں سچے کلام کی سب علامات پائی جاتی ہیں یہ علامات شجرہ طیبہ کی جو قرآن کریم نے بیان کی ہیں تازہ کلام الٰہی کی جو مصفّٰی اور زندہ ہو ایسی بین تشریح کر دیتی ہیں کہ سچے اور جھوٹے کلام میں فرق کرنے میں کوئی مشکل ہی باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ جب ہم ان علامات کی روشنی میں قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو ہر علامت اس میں ایسے حیرت انگیز طور پر پائی جاتی ہے کہ بلید سے بلید آدمی بھی اس امر کو تسلیم کرنے سے رک نہیں سکتا کہ یہ کلام اپنے

اندر بے نظیر خوبیاں رکھتا ہے اور فوق العادت طاقتیں اس میں پائی جاتی ہیں۔اس حد تک کہ نہ کوئی انسانی کلام اور نہ سابقہ آسمانی کتب اس سے ان امور میں برابری کر سکتی ہیں۔

ایک مختصر تفسیر میں ان امور کی تفصیلات بیان کرنے کا تو موقعہ نہیں مل سکتا لیکن اختصاراً میں ان امور کو قرآن کریم پر چسپاں کر کے بتاتا ہوں کہ یہ سب علامات قرآن کریم میں ایسے اعلیٰ اور اکمل طور پر پائی جاتی ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

طیبہ کے لفظ میں خوبیوں کی طرف اشارہ سب سے پہلے میں ''طیبۃ'' کے لفظ میں جن خوبیوں کی طرف اشارہ ہے انہیں لیتا ہوں۔طیبۃ کا لفظ جس چیز کے لئے بولا جائے اس کے لئے شرط ہے کہ اس میں ظاہری یا باطنی کوئی نقص نہ ہو۔کوئی ضرر نہ ہو۔

نازک ترین مضامین پر مشتمل ہونے کے باوجود قرآن مجید کی زبان نہایت اعلیٰ اور شستہ ہے

اب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو اس کے اندر ہمیں یہ بات غیر معمولی طور پر نظر آتی ہے کہ باوجود اس کے کہ اس میں ایسے مضامین بیان کے گئے ہیں جو نہایت نازک ہیں لیکن پھر بھی اس کی زبان نہایت اعلیٰ اور تہذیب کے انتہائی نقطہ پر قائم رہتی ہے۔میاں بیوی کے تعلقات حیض و نفاس کا ذکر،عورت و مرد کی جذباتی زندگی، یہ سب ہی کچھ اس میں بیان ہے۔لیکن ایسے عمدہ طریق سے کہ نازک سے نازک طبیعت اس سے صدمہ محسوس نہیں کرتی۔اس کی زبان ایسی صاف ہے کہ نہ ثقیل لفظ ہیں نہ پیچیدہ بندشیں، نہ شاعرانہ تخیلات بلکہ ہر مضمون کو خواہ کس قدر مشکل ہو وہ اس عمدگی سے اور ایسے سادہ لفظوں میں ادا کرتا ہے کہ نہ کانوں پر اس کی عبارت گران گزرتی ہے اور نہ دماغ اس سے پریشان ہوتا ہے۔تعلیم ایسی سادہ اور لطیف ہے کہ اس پر عمل کر کے کسی نقصان کا خطرہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔

قرآن مجید کا ظاہری حسن بے مثل ہے دوسرے معنے طیبۃ کے یہ ہیں کہ اس کا موصوف خوبصورت ہو۔ ان معنوں کی رو سے بھی قرآن کریم سب کتب سے ممتاز نظر آتا ہے۔اس کا ظاہری حسن ایسا نمایاں ہے کہ کوئی کتاب اس کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتی۔الفاظ کی خوبی، بندش کی چستی، محاورہ کا برمحل استعمال، عبارت کا تسلسل، مضمون کی رفعت، معانی کی وسعت، ایک سے ایک بڑھ کر خوبیاں ہیں۔کہ انسان نہیں کہہ سکتا کہ اسے سراہے یا اس کی تعریف کرے۔انہی عربی الفاظ سے وہ بنا ہے جو ہزاروں لاکھوں اور کتب میں استعمال ہوئے ہیں مگر کیا مجال کہ کوئی اور کتاب اس کے قریب تک پہنچ سکتی ہو۔عرب اپنے خیالات کی نزاکت اور اپنے ادب کی بلندی اور اپنے ذخیرہ الفاظ کی کثرت کی وجہ سے سب دنیا کے لوگوں پر فوقیت رکھتے ہیں اور عرب قوم ادب کی اس قدر دلدادہ ہے کہ زور اور زر

اورعلوشان جیسی آنکھوں کوخیرہ کر دینے والی اشیاء بھی ان کے نزدیک ادب کے مقابلہ پر ہیچ ہیں۔وہ اپنے شاعروں کو پیغمبراوراپنے ادیبوں کو دیوتا سمجھنے والے لوگ جن میں ادب اور ادیب کو ترقی کرنے کا بہترین موقعہ مل چکا تھا جب قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو زبانوں پر مہر لگ جاتی ہے۔اور آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ نزول قرآن کریم کا زمانہ ان کا بہترین ادبی زمانہ تھا یا توعرب کے چوٹی کے ادیب قریب میں ہی گزر چکے تھے یا ابھی زندہ موجود تھے۔وہ جب قرآن کریم کو سنتے ہیں تو بے اختیار اس کے سحر ہونے کا شور مچا دیتے ہیں۔مگر وہی لفظ جو اس کے جھوٹا ہونے کے ثبوت کے طور پر استعمال کیا گیا تھا اسی نے ظاہر کر دیا کہ عرب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ قرآن کریم کا حسن انسانی قوتِ تخلیق سے بالا تھا۔انسانی دماغ نے بہتر سے بہتر ادبی مقالات بنائے تھے مگر اس جگہ اسے اپنے عجز کا اعتراف کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔فَسُبْحَانَ اللّٰہِ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔

قرآنی مضامین کی وسعت بلندی اورتاثیر حیرت انگیز ہے اس کے مضامین کا بھی یہی حال ہے۔ان کی بلندی ان کی وسعت، ان کی ہمہ گیری، ان کا نسانی دماغ کے گوشوں کومنور کر دینا، انسانی قلوب کی گہرائیوں میں داخل ہوجانا، نرمی پیدا کرنا تو اس قدر کہ فرعونیت کے ستونوں پر لرزہ طاری ہوجائے، جرأت پیدا کرنا تو اس حد تک کہ بنی اسرائیل کے قلوب بھی ابراہیمی ایمان محسوس کرنے لگیں۔عفو کو بیان کرے تو اس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی انگشت بدنداں ہوجائیں۔سزا کی ضرورت کو ظاہر کرے تو اس طرح کہ موسیٰؑ کی روح بھی صلِ علیٰ کہہ اٹھے۔غرض بغیر اس کے مضامین کی تفاصیل میں پڑنے کے ہر انسان سمجھ سکتا ہے کہ وہ ایک سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں۔ایک باغ ہے جس کے پھلوں کا خاتمہ نہیں۔آج تک اس کے حسن کو دیکھ کر لوگ یہ کہتے چلے جاتے ہیں کہ یہ کلام بہت سے لوگوں نے مل کر بنایا ہے مگر کیا یہ خود اقرارِ حسن نہیں۔

قرآن مجید کی غیر معمولی لذت طیّب کے تیسرے معنے لذت کے ہیں۔قرآن کریم کی لذت کو دیکھو تو غیر معمولی ہے۔ ہر مذہب وملت کے لوگوں کو دیکھو وہ اپنے مذہب پر عمل کر کے بیزار نظر آتے ہیں لیکن قرآن کریم پر عمل کرنے والا کبھی اس سے بیزار نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ مزہ اس سے اٹھاتا ہے۔غرض اس میں کچھ ایسی لذت ہے کہ جو اس کا مزہ حقیقی طور پر چکھ لیتا ہے پھر اسے چھوڑنے کا نام نہیں لیتا۔

قرآن مجید میں پاکیزگی پر سب کتابوں سے زیادہ زور دیا گیا ہے طیّب کے چوتھے معنے پاکیزگی اور نمو کے ہیں۔قرآن کریم اس میں بھی بے مثل ہے۔جس قدر پاکیزگی کی تعلیم پر قرآن کریم میں زور ہے اور کسی کتاب میں نہیں۔ظاہری پاکیزگی کو دیکھو تو یہ قرآن کریم ہی ہے جو اسے مذہب کا جزو قرار دیتا ہے۔قرآن کریم سے

پہلے ظاہری صفائی اور روحانیت آپس میں مخالف چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ مسیحی راہب اپنی غلاظت پر فخر کرتے تھے۔ ہندو سادھو اپنی بھبوت اور چپکی ہوئی جٹاؤں پر نازاں تھے مگر قرآن کریم نے پاکیزگی کے اصول کو کیسا واضح کیا؟ اس نے کس طرح دنیا کی توجہ اس طرف پھیری کہ صاف جسم سے صاف روح پیدا ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ طیبات کا استعمال روح کو گندہ نہیں بلکہ پاک کرتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کا ولی ہی اس کی اچھی چیزوں کو پھینک دیتا ہے تو دوسرے ان کی صحیح قدر کو کب پہچان سکتے ہیں؟ ہاں! طیب چیزوں کو طیب صورت میں استعمال کرنا ضروری ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا (المؤمنون:۵۲) اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اس کے نتیجہ میں نیک اور مناسب حال عمل کرو کہہ کر قرآن کریم نے جسم اور روح کے درمیان ایک ایسا رشتہ ظاہر کیا ہے کہ کتابوں کی جلدیں کی جلدیں اس کے بیان کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔

قرآن کریم لذیذ ہونے کے علاوہ شیریں بھی ہے طیب کے پانچویں معنے شیرین کے ہیں۔ قرآن کریم نہ صرف لذیذ ہے بلکہ شیرین ہے۔ لذت صرف انسانی رغبت پر دلالت کرتی ہے مگر شیرینی اس کی مناسبت پر بھی دلالت کرتی ہے۔ قرآنی تعلیم میں کوئی تیزی نہیں، کوئی حدت نہیں۔ نازک سے نازک دماغ اس کو بلا تکلیف کے قبول کرتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

قرآنی مضامین ایسے شاندار ہیں کہ کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی چھٹے معنے طیب کے شاندار کے ہیں۔ قرآنی مضمون ایسے شاندار ہیں کہ کوئی کتاب اس میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اس طرح تفصیل سے بیان کرتا ہے وہ اس کی دنیا پر حکومت کو اس خوبی سے ظاہر کرتا ہے، وہ اس کے تصرف کو اس عمدگی سے ثابت کرتا ہے کہ قرآنی مضامین کو پڑھ کر انسانی روح وجد میں آجاتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان سب دنیوی علائق کو توڑ کر آسمان کی طرف پرواز کرنے لگ گیا ہے۔ کون سی کتاب ہے جو اس امر میں اس کے سامنے آسکتی ہے۔ کون سا کلام ہے جو اس حسن میں اس کا مقابلہ کرسکتا ہے؟

قرآن کریم خوبیوں میں سب کتابوں سے آگے بڑھا ہوا ہے ساتویں معنے طیب کے خوبیوں میں بڑھے ہوئے ہونے کے ہیں۔ اوپر کے مطالب سے ہر شخص معلوم کرسکتا ہے کہ قرآن کریم ہر کتاب پر خواہ وہ الہامی ہو خواہ انسانی اس قدر فوقیت رکھتا ہے کہ وہ کتب کسی اور عالم کی معلوم ہوتی ہیں اور قرآن کریم کسی اور عالم کا۔

دوسری علامت كَلِمَةٌ طَیِّبَةٌ کی یہ بتائی گئی تھی کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ اس کی جڑھ مضبوط ہے اور اس علامت کی تشریح میں میں نے چھ باتیں بتائی تھیں۔ جن کو اگر قرآن کریم کے متعلق دیکھا جائے تو وہ سب کی سب اس میں

بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کے زندہ کتاب ہونے سے اس کے نئے نئے مطالب نکلتے رہتے ہیں

اول قرآن کریم ایک زندہ کتاب ہے یعنی جس طرح زندہ درخت جس کی جڑھیں زمین میں پھیل کر ہر وقت غذا لے رہی ہوتی ہیں تازہ رہتا ہے۔اسی طرح قرآن کریم کی تازگی قائم ہے۔اور ہر وقت تازہ معانی اس سے ملتے ہیں۔تیرہ سو سال سے لوگ اس کی تفاسیر لکھتے چلے آئے ہیں اور بعض نے تو سو سو جلدوں کی تفسیریں لکھی ہیں مگر باوجود اس کے اس کے مطالب ختم نہیں ہوئے۔اب بھی اس میں سے نئے مطالب نکل رہے ہیں۔اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نلکی ہے جس کے ایک طرف بیٹھا ہوا کوئی شخص دوسری طرف خزانہ لڑھکا رہا ہے۔کتنا ہی غور کرو کوئی سا سوال کرو۔نئے مطالب کھلتے جاتے ہیں اور ہر سوال کا جواب ملتا جاتا ہے۔قرآن کریم خود فرماتا ہے وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس وجہ سے ہم جانتے ہیں کہ اس کے دل میں سے کیا کیا شبہات پیدا ہوتے ہیں۔اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ (ق:۱۷) الٰہی کلام جب تک دنیا کے لئے قابل عمل ہے ایک تازہ درخت کی طرح ہونا چاہیے۔یعنی وہ ہر وقت اپنے منبع سے غذا حاصل کر رہا ہو۔جس طرح درخت بظاہر وہی نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر تازہ رس حیات کا زمین سے آتا رہتا ہے۔اسی طرح کلام وہی رہتا ہے لیکن اس کے تازہ مطالب حسب ضرورت کھلتے رہتے ہیں۔اور ان کی طرف ذہن کا پھرانا اللہ تعالیٰ اپنے اختیار میں رکھتا ہے۔اسی کی طرف اشارہ ہے لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ یعنی اس کلام کو سوائے ان کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے پاک کیا ہو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔(الواقعة:۸۰)

قرآن کریم میں ہر زمانہ کے اعتراضوں کا جواب موجود ہے

مضبوط جڑھوں والے درخت کی دوسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ صدمات سے جھکتا نہیں حوادث کا مقابلہ مضبوطی سے کرتا ہے۔کلام وہی مضبوط جڑھ والا کہلا سکتا ہے جو ہر زمانہ کے اعتراضوں کی برداشت کر سکے۔اور ان کا جواب اس کے اندر موجود ہو۔قرآن کریم میں یہ خوبی بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔اس کے اصول ایسے واضح ہیں کہ اس کے جھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔نہ اسے بدلانے کی کسی کو اجازت ہے۔اور نہ خود اس کے اپنے الفاظ اس کے معانی کو بدلنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس کے اندر تبدیلی کی کوشش کرنے والا قرآن کریم کو توڑ دے گا۔مروڑ نہیں سکے گا۔جس طرح عمارت میں سے چند اینٹیں نکال لی جائیں تو وہ گر جاتی ہے اسی طرح اس کی تعلیم کو کوئی بدلنا چاہے تو وہ سب کی سب ناقص ہو جائے گی۔ اسی طرح روحانی طور پر بھی ممکن نہیں کہ قرآن کریم کے بعض ٹکڑوں کو کوئی اختیار کرے اور بعض کو چھوڑ دے۔

یا سب کو چھوڑے گا یا سب کو اختیار کرے گا۔ ورنہ کوئی فائدہ نہ اٹھائے گا۔ چنانچہ اس وقت مسلمان بعض قرآن پر عمل کر رہے ہیں اور بعض کو چھوڑ رہے ہیں۔ لیکن اس سے انہیں فائدہ کوئی نہیں پہنچ رہا۔ بلکہ غیر مسلم ان سے زیادہ ترقی کر رہے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن کریم دب کر نہیں رہنا چاہتا۔ جو اسے دبانے کی کوشش کرے وہ نقصان اٹھائے گا۔ ہاں! اسے بالکل چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اختیار کر لے۔ گویا قرآن کریم کی جڑھ کو اپنے دل سے اکھاڑ پھینکے تو پھر بے شک وہ دنیوی طور پر ترقی کر سکے گا۔

اسی طرح یہ امر بھی ثابت ہے کہ قرآن کریم تبدیلی زمانہ سے متاثر نہیں ہوتا۔ کوئی علم نکلے کوئی ایجاد ہو اس کی تعلیم پر کوئی حملہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم کے اصول پختہ اور غیر متبدل ہیں تیسری خصوصیت مضبوط جڑھ والے درخت کی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی جگہ کو چھوڑتا نہیں۔ یہ معنے بھی قرآن کریم میں بدرجہ اعلیٰ پائے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کے اصول ایسے پختہ ہیں کہ وہ کبھی بدلتے نہیں۔ یہ نہیں کہ تعلیم کا ایک حصہ اور اصول پر مبنی ہو اور دوسرا حصہ دوسرے اصول پر۔ جیسے انجیل میں توحید اور تثلیث یا کفارہ اور رحم متضاد اصول پر مذہب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ آریہ مذہب میں ایک طرف خدا تعالیٰ کو دیالو کرپالو کہا گیا ہے تو دوسری طرف روح اور مادہ کو انادی۔ حالانکہ یہ دونوں تعلیمیں متضاد اصول پر قائم ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی سب تعلیم مقررہ اصول پر قائم ہے۔ توحید ہے تو اس کے باریک سے باریک احکام اسی کے گرد چکر کھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو رحمٰن اور رحیم قرار دیا گیا ہے تو تمام تفصیلی تعلیمات ان صفات کے تابع ہیں۔ یہ نہیں کہ توحید کی تعلیم دی ہو اور تفصیلات شرک پر مبنی ہوں۔ رحیم قرار دیا ہو اور جزئیات عدم رحم پر دلالت کرتی ہوں۔

قرآنی تعلیم تا قیامت قابل عمل رہے گی چوتھی خصوصیت مضبوط جڑھ کے درخت کی یہ ہوتی ہے کہ اس کی عمر لمبی ہو۔ جس قدر جڑھیں مضبوط ہوں درخت لمبی عمر پاتا ہے۔ قرآن کریم پر تیرہ سو سال گزر چکے ہیں۔ اب تک اس کی تعلیم قابل عمل ہے اور قابل عمل رہے گی۔ جو کتب خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتیں وہ آج لکھی جاتی ہیں۔ اور کل ان کے خلاف انہی کے ماننے والے کہنے لگتے ہیں اور اس پر سے عمل اٹھ جاتا ہے لیکن قرآن کریم پر برابر عمل ہو رہا ہے۔ بلکہ جو لوگ اسے چھوڑ رہے تھے اب پھر اس کی تعلیم کی طرف واپس آ رہے ہیں۔

یورپین تہذیب کے دلدادہ قرآن کریم کی تعلیم کی خوبی کے قائل ہو رہے ہیں یورپین تہذیب کے دل دادہ اب پھر اس کی ظاہری خوبصورتی کا تلخ تجربہ کر لینے کے بعد دوبارہ قرآن کریم کی ٹھوس تعلیم کی خوبی کے قائل ہو رہے ہیں۔ سؤر کی حرمت، شراب کی ممانعت، کثرت ازدواج کی اجازت، طلاق، عورت اور مرد کے اختلاط میں

حزم واحتیاط، ورثہ وغیرہ بیسیوں امور ہیں کہ جن میں قرآنی اصول کی برتری کو دنیا پھر تسلیم کرنے پر مجبور ہورہی ہے۔

اوراس طرح قرآن کی عمر جو ہمارے نزدیک تو تا قیامت ہے دشمنوں کے نزدیک بھی لمبی ہوتی نظر آتی ہے۔

پانچویں خصوصیت مضبوط جڑھوں والے درخت کی یہ ہوتی ہے کہ وہ اچھی مٹی میں اگتا ہے۔یعنی ایسا درخت کبھی معمولی زمین میں نہیں اگ سکتا۔ کیونکہ جب تک جڑھوں کے پھیلنے کے لئے عمدہ مٹی دور تک نہ ملتی ہو جڑھیں دور تک پھیل نہیں سکتیں۔اسی طرح کلام الٰہی بھی اپنے حسن کو تبھی ظاہر کرسکتا ہے جب ایسی قوم اس کی حامل ہو۔ جو اس سے مناسبت رکھتی ہو۔اوراسے اپنے دلوں میں جگہ دینے کو تیار ہو۔اسی کی طرف قرآن کریم میں یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے کہ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (الفاطر:۱۱)عمل صالح ایمان کو ترقی دیتا ہے۔یعنی درخت تو ایمان ہے لیکن وہ عمل صالح کے بغیر بڑھتا نہیں۔ پس گو کلام الٰہی کیسا اعلیٰ ہو جب تک اس کے ساتھ عمل شامل نہ ہو اس کی خوبی ظاہر نہیں ہوتی۔پس ضروری ہے کہ کلام الٰہی ایسے دلوں میں جگہ پکڑ لے جو اس کی تعلیم کے نشوونما کے لئے موزوں ہوں اور جن میں دور دور تک اس کی جڑھیں پھیل سکیں۔ جب تک یہ بات کسی کلام کو میسر نہ ہو وہ قائم نہیں رہ سکتا۔ قرآن کریم کو یہ بات بدرجہ اتم حاصل ہے۔جب یہ ظاہر ہوا تب بھی ایک ایسی جماعت اسے میسر ہوئی جنہوں نے اس کا درخت اپنے دلوں میں لگایا۔اوراپنے خون سے اس کی آبیاری کی اوراس کے بعد سے لے کر آج تک یہ بات اسے میسر ہے۔وید،تورات،انجیل،سب کتب پر ایک وقت میں لوگ عمل کرتے تھے مگر آج ان پر عمل کرنے والے تلاش کرنے سے بھی شاید ہی ملیں۔

قرآن کریم پر عمل کرنے والے لوگ ہر زمانہ میں ملتے رہے ہیں لیکن قرآن کریم پر عمل کرنے والے لوگ ہر زمانہ میں ملتے رہے ہیں۔اور جب بھی ان لوگوں میں کمی آتی رہی ہے اللہ تعالیٰ اور لوگ پیدا کردیتا رہا ہے جو اس پر عمل کرنے والے تھے اوراس طرح اس کی جڑھیں مضبوطی سے گڑی رہی ہیں اوراس کا حسن ہمیشہ لوگوں کی نظروں کے سامنے رہا ہے۔باقی کتب میں اگر حسن بھی ہے تو ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی درخت کے حسن کو اس کا بیج ہتھیلی پر رکھ کر بیان کیا جائے اور قرآن کریم کا حسن اس کے خوبصورت درخت سے جو ہر وقت اگا ہوا ہے دکھایا جاسکتا ہے اور قیاس سے حسن معلوم کرنا اورآنکھوں سے دیکھ کر معلوم کرنا برابر نہیں ہوسکتا۔

انسانی کتب کے بالمقابل قرآن کریم کی تعلیم سب کی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے چھٹی خصوصیت مضبوط جڑھوں والے درخت کی یہ ہوتی ہے کہ اس کا منبع ایک ہوتا ہے۔یعنی وہ حیوان کی طرح مختلف جگہ سے غذا نہیں لیتا۔اس خصوصیت میں بے شک کمزور درخت بھی شامل ہے لیکن یہ مقابلہ حیوانات سے ہے۔نہ کہ

دوسرے درختوں سے۔ گویا دوسری الہامی کتب خواہ وہ قرآن کریم کی طرح شاندار نہ ہوں اس امر میں ایک حد تک اس سے مشابہ ہوں گی لیکن انسانی کلام نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کی تعلیم سب کی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ انسانی ہاتھ کا اس میں دخل نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ نشوونما حاصل نہیں کیا۔ بلکہ یکدم ایک ہی شخص کے دل پر اسے نازل کیا گیا ہے۔ وہ زمانہ کی رو کی ترجمانی نہیں کرتی کہ اسے صدیوں کے فلسفہ کا خلاصہ کہا جائے۔ جیسا کہ اچھی انسانی کتب کا حال ہے بلکہ وہ اکثر امور میں زمانہ کی رو کا مقابلہ کرتی اور ان کے خلاف چلتی ہے۔ اور اپنے لئے ایک بالکل نیا راستہ بناتی ہے۔ جس سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ اپنی غذا ایک ہی جگہ سے لیتی ہے اور درخت سے مشابہ ہے۔ برخلاف انسانی کتب کے کہ وہ حیوان کے مشابہ ہوتی ہیں۔ اور انتخاب اور استفادہ اور تجسس پر ان کی بنیاد ہوتی ہے۔ اور گو مصنف ایک نظر آتا ہے لیکن اس کا علم ماخوذ ہوتا ہے۔ ہزاروں انسانوں کے تجربہ سے۔ سوائے ان لوگوں کے کہ جو قرآن کریم پر اپنی تصنیفات کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی تصنیفات قرآن کریم کا عکس ہیں۔ اس سے جدا نہیں۔

تیسری علامت شَجَرَۃٌ طَیِّبَۃٌ کی یہ بیان فرمائی تھی کہ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ اس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ آسمان میں شاخیں پھیلنے کے سات معنے میں نے اوپر بیان کئے ہیں اور ان معانی کے رو سے بھی قرآن کریم ایک ممتاز کتاب نظر آتی ہے۔ اس کے اس امتیاز میں کوئی اس کا شریک نظر نہیں آتا۔

قرآنی تعلیم پر عمل کرنے سے قرب الٰہی حاصل ہو جاتا ہے

پہلی خصوصیت فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ کی میں نے یہ بتائی تھی کہ اس پر چڑھ کر انسان آسمان تک پہنچ سکے گا۔ یہ خصوصیت قرآن کریم میں واضح طور پر پائی جاتی ہے۔ بلکہ اس میں اس کے ساتھ کوئی اور کتاب شریک ہی نہیں۔ کیونکہ کوئی کتاب اس کی دعویدار نہیں کہ اس پر عمل کر کے انسان خدا تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس کا مدعی ہے کہ اس کی تعلیم پر عمل کر کے انسان آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ یعنی قرب الٰہی اسے حاصل ہو جاتا ہے۔ اور وہ آسمانی امور کو بچشم خود دیکھ لیتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے عاملین میں سے ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جو اس امر کے مدعی تھے کہ قرآن کریم کے ذریعہ سے انہیں روحانی صعود حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ وہ خدا تعالیٰ تک جا پہنچے۔ اور اس کے خاص فضلوں کو انہوں نے حاصل کیا۔

قرآن کریم کی اخلاقی تعلیم ہر طبقہ کے لوگوں کے لئے ہے

دوسری خصوصیت فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ کلام الٰہی کی تعلیم اعلیٰ اخلاق پر مشتمل ہوتی ہے۔ کیونکہ اونچا درخت بلند خیالی اور وسعت اخلاق پر

بھی دلالت کرتا ہے۔ یہ امر بھی قرآن کریم میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔قرآن کریم کی اخلاقی تعلیم ایسی اعلیٰ ہے اور درخت کی شاخ کی طرح اس طرح ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف گئی ہے کہ کسی اور کتاب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔بعض کی اخلاقی تعلیم نہایت ادنیٰ ہے جس طرح زمین پر گری ہوئی شاخ۔ اور بعض کی اعلیٰ تو ہے لیکن اس کا جڑھ سے تعلق نہیں۔ وہ ایسی ہے جیسے کسی تاگا سے کسی شاخ کو بلندی میں لٹکا دیں۔ وہ بلند تو ہو جائے گی لیکن اس پر کوئی چڑھ نہیں سکے گا۔لیکن قرآن کریم کی اخلاقی تعلیم ایسی ہے جس پر ہر طبقہ کا آدمی عمل کر سکتا ہے۔ادنیٰ آدمی جڑھ سے چڑھ کر اوپر جا سکتا ہے اور اوپر پہنچا ہوا آدمی اس کے اوپر اور ترقی کر سکتا ہے۔اس کی اس خوبی پر بعض لوگ معترض ہوتے ہیں۔مثلاً سزا کی تعلیم پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس طرح ادنیٰ اخلاق سکھائے گئے ہیں۔حالانکہ نہیں دیکھتے کہ ادنیٰ اخلاق والے انسانوں کی اصلاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی۔کچھ لوگ سزا سے مانتے ہیں، کچھ عفو سے، پھر کچھ عدل کے مقام پر ہوتے ہیں، کچھ احسان کے اور کچھ ایتاء ذی القربیٰ کے۔ جو مذہب ان امور کو اپنی تعلیم میں شامل نہیں کرتا وہ لوگوں کو یا اعلیٰ اخلاق سے محروم کر دیتا ہے یا انسانوں میں سے ایک حصہ کو نجات سے محروم کر دیتا ہے۔غرض اس خصوصیت میں بھی قرآن کریم ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن کریم کی تعلیم اس قدر مطالب پر حاوی ہے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے

تیسری خصوصیت فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ کے ماتحت یہ ہے کہ اس کی شاخیں بہت ہوں۔ کیونکہ جس درخت کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہوں گی وہ نہ صرف اونچی ہوں گی بلکہ بہت کثرت سے بھی ہوں گی۔(یاد رہے کہ اِلَى السَّمَآءِ نہیں فرمایا فِي السَّمَآءِ فرمایا ہے جس سے بلندی کے علاوہ پھیلاؤ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے) اس خصوصیت میں بھی قرآن کریم کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔اس کی تعلیم اس قدر مطالب پر حاوی ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ایک مختصر سی کتاب ہے۔اناجیل سے بھی چھوٹی۔لیکن اس کے اندر اس قدر مطالب پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس سے ہزاروں گنے زیادہ حجم کی کتب میں وہ مضامین نہیں ملتے۔عبادات ہیں تو ان کی ہر شاخ اس میں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ معاملات ہیں تو ان کی ہر شاخ اس میں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔علم الاخلاق، تمدن، سیاست، اقتصادیات، پیشگوئیاں، الٰہیات، قضاء، تصوف، علم المعاد، علم کلام اور ان سب علوم کے فلسفے اور تفصیلات قرآن کریم میں موجود ہیں۔اور ایسے کامل طور پر موجود ہیں کہ اس کے بعد کسی اور کتاب کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔(اس کے لئے دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتاب اسلامی اصول کی فلاسفی اور آئینہ کمالات اسلام اور میری کتاب احمدیت یعنی حقیقی اسلام وغیرہ)

چوتھی خصوصیت فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ ہر فطرت کے انسان کے لئے قرآن کریم میں تسلی کا سامان ہے

کے ماتحت یہ ہے کہ اس کا سایہ وسیع ہو۔ کیونکہ جس درخت کی شاخیں بلند اور پھیلی ہوئی ہوں اس کا سایہ بھی بہت وسیع ہوتا ہے۔ پس کلمہ طیبہ وہ ہے جس کے سایہ میں بہت سے آدمی بیٹھ سکیں۔ یعنی وہ ہر فطرت کے انسانوں کے لئے تسلی دینے کا موجب ہو۔ یعنی جس طرح اخلاق کے ہر درجہ کے لوگوں کو بلندی کی طرف پہنچائے۔ اسی طرح ہر فطرت کے انسان کے لئے بھی اس میں تسلی کا سامان موجود ہو۔ قرآن کریم میں یہ صفت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ انسانی مزاج مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ کوئی انسان کسی طاقت اور میلان کو لے کر آتا ہے کوئی کسی طاقت اور میلان کو۔ کامل کتاب میں سب کے لئے آرام کا سامان موجود ہونا چاہیے اور قرآن کریم میں ایسا ہی ہے۔ کسی طبعی تقاضے کو ضائع نہیں کیا گیا۔ کچلا نہیں گیا۔ باقی تمام مذاہب میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بشریت کے تقاضوں کو گناہ قرار دے کر ان کے کچلنے پر سارا زور لگایا گیا ہے۔

قرآن کریم بشری تقاضوں کو انسانی تکمیل کے ذرائع قرار دے کر ان کی اصلاح پر زور دیتا ہے

لیکن قرآن کریم نے بشریت کے تقاضوں کو انسانی تکمیل کے ذرائع قرادے کر ان کی اصلاح پر زور دیا ہے۔ جس طرح گاڑی چلانے کے لئے نہ جانور کو ذبح کرنے والا کامیاب ہوسکتا ہے نہ اسے آزاد چھوڑ دینے والا۔ بلکہ وہی کامیاب ہوسکتا ہے جو بیلوں اور گھوڑوں کو سدھا کر اس کے آگے جوتے۔ قرآن کریم بھی بشری تقاضوں کو سدھا کر ہر فطرت کے انسان کے لئے آرام کا سامان پیدا کرتا ہے۔ وہ نرم مزاج انسان کو نرمی سے روکتا نہیں نہ سخت مزاج کو سختی سے۔ بلکہ انہیں اپنے طبعی تقاضے کے صحیح موقع پر استعمال کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ نہ تو کھانے کو گناہ قرار دیتا ہے نہ پہننے کو نہ شادی کو نہ مال و دولت کمانے کو نہ مکان بنانے کو بلکہ ہر امر میں اقتصاد اور مناسب حدود کو قائم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس وجہ سے ہر فطرۃ کی اصلاح اس کے ذریعہ سے ہو جاتی ہے۔ اور کوئی شخص نہیں جو اس کے سایہ میں بیٹھ نہ سکے۔

چوتھی علامت شَجَرَۃٌ طَیِّبَۃٌ کی یہ بتائی گئی تھی کہ وہ ہر آن اپنے پھل دیتا ہے۔ اس علامت کے ماتحت کلام الٰہی کی ایک تو یہ خصوصیت معلوم ہوتی ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ پھل دیتا رہے یعنی اس میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں جو اس کی اعلیٰ تعلیم کے مظہر ہوں۔ اس لئے تُؤْتِیْ الْاُکُلَ نہیں فرمایا بلکہ اُکُلَھَا فرمایا۔ یعنی درخت کی طرف ضمیر پھیر کر اس کی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا۔ کہ وہ پھل اپنے اندر درخت والی خوبیاں رکھتے ہوں۔ جو خواص اس درخت میں ہوں وہی ان پھلوں میں ہوں۔ وہ طیب بھی ہوں وہ مضبوط جڑھ پیدا کرنے کی طاقت بھی رکھتے ہوں۔ اور

آسمان میں پھیل جانے کی طاقت بھی۔ یہ خاصیت بھی قرآن کریم میں پائی جاتی ہے بلکہ اس وقت صرف اس میں پائی جاتی ہے۔یعنی اس پر عمل کرنے والے لوگ اس کے ذریعہ سے ایسے اعلیٰ مقامات تک پہنچتے ہیں کہ گویا وہ مجسم قرآن ہوجاتے ہیں۔اسی کی طرف اشارہ ہے۔ کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ میں (مجمع البحار) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اگر دیکھنا چاہو تو قرآن کریم دیکھ لو۔ جو تعلیمات قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں اور جو اعلیٰ صفات اس میں بیان کی گئی ہیں وہ سب کی سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہیں اور اسی کی طرف اشارہ ہے۔مَا اَنَا اِلَّا کَالْقُرْاٰنِ سَیَظْهَرُ عَلٰی یَدِیْ مَاظَهَرَ مِنَ الْفُرْقَانِ کے الہام میں جو اس زمانہ کے قرآنی پھل حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود علیہ السلام پر ہوا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ میں قرآن کی طرح ہوں اور جو کچھ اس سے ظاہر ہوا مجھ سے بھی ظاہر ہوگا (الحکم ۲۴ ستمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۱)۔ یعنی تعلیم قرآنی میرے وجود میں دنیا کو نظر آئے گی۔ اس الہام میں گویا تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا کا مصداق ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

قرآن کریم دائمی نجات دیتا ہے

دوسری خصوصیت تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ کے ماتحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ دائمی نجات دے اور یہ مفہوم اس سے پیدا ہوتا ہے کہ جس کے دل میں کلام الٰہی داخل ہو کر ایک درخت بنے گا اگر وہ شخص دائمی زندگی نہ پائے گا تو درخت ہمیشہ پھل کس طرح دے گا۔ گو یہ مفہوم آئندہ کے متعلق ہے اور اس کا اس دنیا میں ثبوت دینا ناممکن ہے۔لیکن کم سے کم یہ بات تو ظاہر ہے کہ صرف الہامی کتب ہی دائمی نجات کا وعدہ دیتی ہیں۔ انسانی کتب دائمی نجات کا وعدہ نہیں دیتیں۔ اور نہیں دے سکتیں کیونکہ دائمی زندگی ابدی زندگی والی ہستی ہی دے سکتی ہے اور وہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ پس وہی کلام دائمی زندگی کا دعویٰ پیش کرسکتا ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے کا مدعی ہو۔ اور اس دعویٰ میں بھی قرآن کریم سب دوسری کتب سے بڑھا ہوا ہے۔ ہمیشہ کی زندگی کا مضمون جس وضاحت سے اور جس طرح با دلائل قرآن کریم میں بیان ہوا ہے اس سے دسواں حصہ بھی دوسری کتب میں نہیں۔ اگر ہے تو کوئی شخص پیش کرکے دیکھ لے۔

بِاِذْنِ رَبِّهَا کے الفاظ سے قرآن کریم کے فوق الطبعی نتائج کی طرف اشارہ

پانچویں خصوصیت اس آیت میں کلمہ طیبہ کی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ بِاِذْنِ رَبِّهَا پھل دے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس کے نتائج طبعی نہ ہوں بلکہ طبعی نتائج سے بالا ہوں۔ طبعی نتائج صرف اس قدر ثابت کرسکتے ہیں کہ اس کتاب نے قوانین قدرت کا اچھا نقشہ پیش کیا ہے۔ لیکن یہ ثابت نہیں کرتے کہ وہ کتاب کسی ایسی ہستی کی طرف سے ہے جو طبعیات پر حاکم ہے۔ یہ امر اس کتاب سے ثابت ہوسکتا ہے جو علاوہ طبعی نتائج کے فوق الطبعی نتائج بھی پیدا کرے۔ مثلاً ایک

کتاب میں حکم ہے کہ فلاں شے کھاؤ فلاں نہ کھاؤ۔اس کا طبعی نتیجہ تو یہ ہوگا کہ اگر کھانے والی شے مفید ہے تو کھانے والے کو طاقت حاصل ہوگی۔اور اگر مضر ہے تو اس سے بچنے سے اس کی صحت اچھی رہے گی۔انسانی کتاب کا اثر یہاں تک ختم ہو جائے گا۔لیکن الٰہی کتاب اس سے اوپر تک ہمیں لے جائے گی کیونکہ اس کے احکام پر عمل کرنے سے ہم ایک زائد فعل بھی کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اس عمل کو کرتے ہیں اور اس طرح ہمارا طبعی فعل مذہبی بھی ہو جاتا ہے۔پس ضروری ہے کہ اگر کتاب آسمانی ہے تو اس کے طبعی نتائج کے علاوہ فوق الطبعی نتائج بھی نکلیں۔اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی ایسی علامات ظاہر ہوں کہ جو طبعی نتائج سے ممتاز اور علیحدہ ہوں۔اس امر میں بھی قرآن کریم دوسری کتب سے بدرجہ غایت اعلیٰ اور اکمل ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جس طرح فوق الطبعی نشانات آپ کے لئے اور آپ کے اتباع کے لئے ظاہر ہوئے وہ دوسری مثال نہیں رکھتے۔اور آپؐ کے بعد بھی قرآن کریم پر سچے طور پر عمل کرنے والے لوگوں کے ساتھ نشانات الٰہیہ کا سلسلہ اس طرح وابستہ چلا آیا ہے کہ ہر عقل منداس سے بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ کسی ایسی ہستی کا تعلق ہے جو طبعی قوانین پر حاکم ہے۔اور جس پر خوش ہوتی ہے اس کے لئے غیر معمولی سامانوں سے نصرت کے سامان پیدا کر دیتی ہے۔

حضرت مسیح موعودؑ قرآن مجید کے بِاِذْنِ رَبِّهَا والے نتائج کی تازہ مثال اس وقت بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانی سلسلہ احمدیہ جن کی برکت سے اس آیت کے اس قدر وسیع مطالب کھلے ہیں اس بِاِذْنِ رَبِّهَا والے نتائج کی تازہ مثال ہیں اور آپ کے بعد آپ کی جماعت سے بھی اللہ تعالیٰ کا یہی سلوک ہے اور اسی سلوک کے ماتحت باوجود شدید مخالفت کے وہ روز بروز ترقی کر رہی ہے۔فَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس آیت میں جو مطالب بیان کئے گئے ہیں وہ وہمی نہیں بلکہ تم خود تجربہ کر کے دیکھ لو اپنی ذات میں ان امور کا مشاہدہ کر لو گے جو اس میں بیان ہوئے ہیں۔

وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ مِنْ

اور بری بات کا حال برے درخت کی طرح ہے جس کو زمین پر سے اکھاڑ (کر پھینک) دیا گیا ہو (اور) جسے

فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۷﴾

(کہیں بھی) قرار (حاصل) نہ ہو۔

حلّ لُغات۔ خَبِيْثَةٌ خَبِيْثٌ کا مؤنث ہے۔ اور اَلْخَبِيْثُ کے معنے ہیں اَلنَّجِسُ پلید۔ گندی چیز۔ اَلرَّدِئُ الْمُسْتَكْرَهُ۔ ایسی ردی چیز جس سے نفرت پیدا ہو۔ اور انسان اسے قبول نہ کر سکے۔ كُلُّ حَرَامٍ ہر حرام شے کو خبیث کہتے ہیں اور تاج العروس میں ہے کہ خَبِيْث ہر بری چیز کے لئے بطور صفت کے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً كَلَامٌ خَبِيْثٌ۔ یعنی برا کلام وغیرہ۔ وَالْحَرَامُ السُّحْتُ يُسَمّٰى خَبِيْثًا۔ ہر قسم کے حرام کو خبیث کہتے ہیں۔ اَلْمَالُ الْحَرَامُ وَالدَّمُ وَمَا أَشْبَهُهَا مِمَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ حرام مال اور خون جو ان کے مشابہ ہو جس سے اللہ تعالیٰ نے بچنے کا حکم دیا ہے اس کو بھی خبیث کہتے ہیں۔ وَيُقَالُ فِي الشَّيْءِ الْكَرِيْهِ الطَّعْمِ وَالرَّائِحَةِ خَبِيْثٌ مِثْلَ الثَّوْمِ وَالْبَصَلِ وَالْكُرَّاثِ وَلِذَالِكَ قِيْلَ مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ الْخَبِيْثَةِ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَجْلِسَنَا نیز بدمزہ بدبودار چیز کو خبیث کہا جاتا ہے۔ جیسے لہسن، پیاز، گندنا وغیرہ۔ اسی وجہ سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو خبیث پودوں یعنی لہسن پیاز وغیرہ سے کچھ کھائے وہ ہماری مجلس کے قریب نہ آئے۔ (اقرب) پس کلمہ خبیثہ کے معنے ہوں گے (۱) گندہ اور برا کلام جسے انسان سن نہ سکے۔ (۲) ایسا کلام جسے سن کر نفرت پیدا ہو۔ (۳) ایسا کلام جس سے اللہ تعالیٰ نے بچنے کا حکم دیا ہے۔ (۴) ایسا کلام جس سے اعلیٰ نتیجہ نہ نکلے۔ (۵) ایسا کلام جس میں اچھی اور بری تعلیم ملی ہوئی ہو وہ فرد کے لئے فائدہ بخش مگر قوم کے لئے مضر ہو۔

اِجْتَثَّهٗ کے معنے ہیں اِقْتَلَعَهٗ۔ اس کو جڑھ سے اکھیڑ دیا۔ اور مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ میں اِجْتُثَّتْ کے یہی معنے مراد ہیں۔ یعنے اُسْتُؤْصِلَتْ جڑھ سے اکھاڑا گیا۔ (اقرب) پس كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ کے معنے ہوں گے کہ وہ برا کلام جو دیرپا نہیں اور اعتراض پر اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتا اور جلدی اس کا اثر باطل ہو جاتا ہے۔

قَرَارٌ قَرَّ کا مصدر ہے اور قَرَّ فِي الْمَكَانِ قَرَارًا کے معنے ہیں ثَبَتَ وَسَكَنَ کسی جگہ پر ٹھہرا اور قرار کے

معنے ہوئے کسی جگہ ٹھہرنا۔ نیز قَرَار کے معنے ہیں مَا قُرَّ فِیْہِ۔ جس میں ٹھہرا جائے۔ اَلْمُسْتَقَرُّ جائے قرار (اقرب) پس مَا لَھَا مِنْ قَرَارٍ کے معنے ہوں گے اس کے لئے کوئی ثبوت اور سکون نہیں۔ اس کے لئے کوئی ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ مراد یہ ہے کہ بری تعلیم کسی ملک میں قائم نہیں رہ سکتی اور اس کے اصول بدلنے کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔

تفسیر۔ جھوٹے مذہب کی علامات شجرۃ طیّبۃ کے مقابلہ میں جو باتیں جھوٹے مذہب کے متعلق پیش کی گئی ہیں یہ ہیں:

(۱) اس کی شکل مکروہ ہو۔ (۲) اعلیٰ اور فاسد تعلیموں کو ملا کر پیش کرتا ہو۔ (۳) اعلیٰ نتائج نہ نکلیں۔ یعنی اس پر چل کر کوئی آدمی ایسے پیدا نہ ہوں جو خدا تعالیٰ تک پہنچ سکیں۔ جیسے بہائی مذہب ہے کہ اسے ظاہر ہوئے قریباً نوے سال ہو گئے ہیں۔ (یعنی باب کے دعویٰ سے لے کر اس وقت تک) لیکن ایک شخص بھی ایسا نہیں کہ جس نے کہا ہو کہ اس تعلیم پر چل کر مجھ سے خدا تعالیٰ کلام کرتا ہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو آئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے کہ ان کے پیروؤں میں سے سینکڑوں گنائے جا سکتے ہیں جو خدا تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔

اجتثت کے لفظ سے کلمہ خبیثہ کی صفات بتائی گئی ہیں۔

کلمہ خبیثہ کی صفات (۱) یہ کہ اس کلام میں سطحی مسائل پر بحث ہو روحانی امور پر نہ ہو۔ بلکہ ایسی باتیں ہوں جن کو عام طور پر لوگ جانتے ہیں۔

(۲) اس کی تعلیم دیرپا نہ ہو۔ بہائی تعلیم کا یہی حال ہے کہ بہاء اللہ نے لکھا دو شادیاں تک جائز ہیں (اقدس صفحہ ۱۸)۔ عباس نے اسے تبدیل کر دیا۔

(۳) اس کی تعلیم اعتراضات کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ذرہ سے اعتراض سے اس کے پیروؤں کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے۔ بہائی تعلیم کا یہی حال ہے۔ وہ لوگ کبھی ایک مقام پر کھڑے نہیں رہ سکتے۔ ہر اعتراض پر اپنی جگہ بدل لیتے ہیں۔

(۴) جلدی اس کے اثر کو باطل کر دیا جائے۔ دیرپا تعلیم تو وہ ہے کہ لمبے زمانہ تک اس کا اثر رہے اور جلدی باطل ہونے والی وہ ہے کہ جلدی ہی قلوب اس سے پھرنے شروع ہو جائیں۔ اس کی مثال کے طور پر اسلامی زمانہ کے اول حصہ میں مسیلمہ وغیرہ کی تعلیم کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور اس زمانہ میں بہائی مذہب کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ خود اس کے اتباع اس کی تعلیم پر عمل نہیں کرتے۔ آج تک کسی ایک گاؤں میں بھی کوئی ایسی جماعت نہیں پائی جاتی جو

بہائی تعلیم پر عمل کرتی ہو۔

(۵) تازہ امداد اس کو نہ ملتی ہو۔یعنی وحی الٰہی کا سلسلہ اس میں جاری نہ ہو۔

(۶) اس کے فروع بلند نہ ہوں۔یعنی اعلیٰ درجے کے اخلاق پر حاوی نہ ہو۔اور ہر قسم کی ضرورت ہائے انسانی پر اس میں بحث نہ ہو۔

مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ کے دو معنی ''مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ'' (۱) وہ کسی ملک میں قائم نہ رہ سکے۔یعنی اس کو ایسا موقعہ ہی نہیں دیا جاتا تا کہ اس کا تجربہ کر کے دنیا کوئی نتیجہ نکالے۔بغیر تجربہ ہی وہ مرجاتی ہے۔

(۲) اس کے اصول کو بدلنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔اسلام نے شروع سے ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کہا اور بعد میں کوئی تبدیلی اس میں نہ ہوئی۔لیکن جو جھوٹا مذہب ہوگا اس میں اصول کو ہمیشہ بدلنا پڑے گا۔مثال کے طور پر بہائیوں کو دیکھ لو۔ایران میں جاؤ تو وہاں بہائیت کی تعلیم اور رنگ میں پیش کی جاتی ہے۔کیونکہ وہاں شیعہ ہیں۔سنی ممالک میں اسی مذہب کی تعلیم اور رنگ میں پیش کی جاتی ہے۔امریکہ میں جا کر اصول بالکل مختلف کر دیئے گئے ہیں۔اسی طرح انگلستان میں وہ باتیں پیش کی جاتی ہیں جن کو وہاں کے لوگ قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔

مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ کی ایک مثال چنانچہ جب میں انگلستان گیا تو بہائیوں میں سے ایک عورت نے میرے ساتھ گفتگو کی۔میں نے کہا بہاء اللہ نے کون سی نئی بات پیش کی ہے۔اس نے کہا کہ بہاء اللہ نے کہا ہے کہ ایک ہی عورت سے شادی کرنی چاہیے۔میں نے کہا کہ اس نے خود دو بیویاں کی ہوئی تھیں۔پہلے اس نے انکار کیا پھر کہا کہ وہ دعویٰ سے پہلے کی بات ہے۔میں نے کہا جب وہ نعوذ باللہ خدا تھا تو پھر پہلے اور پیچھے کا تو سوال ہی نہیں۔عالم الغیب ہستی کے لئے پہلے پیچھے کوئی معنے نہیں رکھتا۔اس کو پہلے ہی علم ہونا چاہیے تھا کہ میں آگے چل کر کیا تعلیم دینے والا ہوں۔نیز اس نے دعویٰ کے بعد اپنے بیٹے عباس کو دو بیویاں کرنے کی اجازت دی۔کیونکہ اس کے ہاں اولاد نہ تھی۔اس پر اس عورت کے کان میں ایک ایرانی بہائی عورت نے جو ایران کی تھی چپکے سے کہا کہ دوسری بیوی کو بہاء اللہ نے بہن بنالیا تھا۔اور یہی بات اس انگریز عورت نے دوہرا دی۔اس پر میں نے کہا کہ بہاء اللہ کے دعویٰ کے بعد دونوں عورتوں سے اولاد ہوئی ہے۔کیا بہن کے ہاں اولاد پیدا کی گئی تھی۔اس پر وہ حیران ہو کر اپنی دوست سے پوچھنے لگی کہ کیا دعویٰ کے بعد دوسری عورت کے ہاں اولاد ہوتی رہی ہے؟ اور جب اس نے کہا کہ ہاں تو مجلس میں سب ہنس پڑے کہ ابھی تو بہن قرار دیا تھا اور ابھی اس کے ہاں اسی زمانہ میں اولاد کا ہونا بھی تسلیم کر لیا۔غرض بہائی لوگ ہر ملک

میں جا کر علیحدہ قانون بناتے ہیں۔ یہی حال عیسائیت کا ہے۔ چنانچہ ان کی مشنری کتب میں کھلے طور پر بحثیں ہوتی رہتی ہیں کہ ہر قوم کے آگے کس رنگ میں مسیح علیہ السلام کو پیش کرنا چاہیے۔ شروع مسیحیت میں بھی روم والوں نے جب مطالبہ کیا کہ سبت ہفتہ کی جگہ اتوار کو ہو تو مسیحیوں نے ان کی خاطر ہفتہ کی بجائے سبت اتوار کو قرار دے دیا۔ اس کے بالمقابل اسلام کو دیکھو شروع سے لے کر اس وقت تک سب تعلیم ایک جڑھ پر قائم ہے۔ نہ کم کرنے کی ضرورت ہوئی نہ زیادہ کرنے کی۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ

جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں اللہ (تعالیٰ) اس قائم رہنے والی (اور پاک) بات کے ذریعہ سے (اس) ورلی زندگی

الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَ يَفْعَلُ

میں (بھی) ثبات بخشتا ہے اور آخرت (کی زندگی) میں بھی (بخشے گا) اور ظالموں کو اللہ (تعالیٰ) ہلاک کرتا ہے

رکوع ۱۶

اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۸﴾ ع

اور اللہ (تعالیٰ) جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

حلّ لُغات۔ يُثَبِّتُ ثَبَّتَ کا مضارع ہے۔ جس کا مجرد ثَبَتَ ہے اور ثَبَتَ الْاَمْرُ عِنْدَ فُلَانٍ کے معنے ہیں تَحَقَّقَ وَ تَاَكَّدَ۔ کوئی امر کسی کے نزدیک یقینی طور پر ثابت ہوگیا۔ ثَبَتَ فُلَانٌ عَلَى الْاَمْرِ۔ دَاوَمَهٗ۔ کسی کام پر دوام اختیار کیا۔ وَاَثْبَتَهٗ وَثَبَّتَهٗ۔ جَعَلَهٗ ثَابِتًا فِي مَكَانِهٖ لَا يُفَارِقُهٗ۔ اور اَثْبَتَهٗ اور ثَبَّتَهٗ کے معنے ہیں اس کو اس کی جگہ پر ایسے طور پر ثبات بخشا اور مضبوط رکھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ سو ثَابِتٌ کے معنے ہوں گے اپنی جگہ پر مضبوط رہنے والا۔ (اقرب) پس يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ کے معنے ہوں گے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ قائم رہنے والی اور مضبوط بات کے ذریعہ سے ثبات اور اپنی جگہ پر مضبوط رہنے کی طاقت بخشتا ہے۔

يُضِلُّ يُضِلُّ اَضَلَّ سے مضارع ہے اور اَضَلَّ کے معنے ہیں اَهْلَكَهٗ اسے ہلاک کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ وہ قول جو ثابت ہے وہ وہی ہے جو کلمہ طیبہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس کی تائید کے لئے

اللہ تعالیٰ الہام نازل کرتا ہے۔ اس کو ثابت اس لئے کہا کہ آج ان کو اور کل ان کے بھائیوں کو حاصل ہوگا۔ اور کبھی یہ سلسلہ نہ ٹوٹے گا۔ اور پھر اس وجہ سے بھی ثابت کہا کہ اس کا اثر یہاں پر بھی اور آخرت میں بھی ہوگا۔ لیکن اس کے خلاف جھوٹے مدعیوں کا کلام مرنے کے بعد کوئی فائدہ نہیں دیتا۔

وَ یُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ وَ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ ظالم وہ ہیں جو کلام الٰہی میں عِوَج چاہتے اور اس کے راستہ میں روکیں ڈالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرے گا سے یہ مراد ہے کہ قرآن کریم کی اشاعت اور اس کے دنیا میں قائم ہوجانے کے متعلق اور اس کے مخالفوں کی تباہی کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسے اللہ تعالیٰ پورا کر کے دکھادے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا

(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں (کی حالت) کو (غور کی نظر سے) نہیں دیکھا جنہوں نے ناشکری سے

قَوْمَھُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۹﴾

اللہ (تعالیٰ) کی نعمت کو بدل ڈالا (اور آپ بھی ہلاک ہوئے) اور اپنی قوم کو (بھی) ہلاکت کے گھر میں (لا) اتارا۔

حلّ لُغات۔ بَوَارٌ بَارَ یَبُوْرُ کا مصدر ہے اور بَارَ کے معنے ہیں ھَلَكَ۔ ہلاک ہوگیا۔ بَارَ السُّوْقُ وَالسِّلْعَۃُ کَسَدَتْ۔ سامان یا بازار کا بھاؤ گر گیا۔ بَارَ الْعَمَلُ بَطَلَ کام باطل ہوگیا۔ بَارَ الْاَرْضُ بَوْرًا لَمْ تُزْرَعْ زمین میں کسی قسم کی کھیتی نہ بوئی گئی۔ بَارَ زَیْدٌ عَمْرًا جَرَّبَہٗ وَاخْتَبَرَہٗ۔ زید نے عمر کا امتحان لیا۔ وَمِنْہُ کُنَّا نَبُوْرُ اَوْلَادَنَا بِحُبِّ عَلِیٍّ۔ اور انہی معنوں میں یہ قول ہے جس کے معنے ہیں ہم اولاد کا امتحان لیا کرتے تھے کہ وہ حضرت علی سے کتنی محبت رکھتے تھے۔ اَلْبَوَارُ اَلْھَلَاكُ۔ ہلاکت۔ اَلْکَسَادُ۔ کسی چیز کی مانگ نہ ہونا (اقرب) پس دَارُ الْبَوَارِ کے معنی ہوئے ہلاکت کا گھر۔ دَارُ الْاِمْتِحَانِ امتحان کا گھر۔ دَارُ الْکَسَادِ ایسا گھر جس کی طرف رغبت نہ ہو۔

تفسیر۔ خدا کی نعمت کو کفر سے بدلنے کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے تو ان پر انعام کیا تھا انہوں نے یہ بدلہ دیا کہ احسان فراموشی سے کام لے کر اس احسان کا یعنی کلمہ طیبہ کا انکار کر کے قوم کو ہلاک کر دیا۔

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۳۰﴾

یعنی جہنم میں وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ جگہ (رہنے کے لحاظ سے) بہت بری ہے

حل لغات اَلْقَرَارُ کے لئے دیکھو حل لغات آیت نمبر ۲۷۔

تفسیر ۔یعنی کلمہ طیبہ کا انکار لازماً تباہی میں ڈالتا ہے اور وہ تباہی بھی جلا دینے والی تباہی ہوتی ہے۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوا

اور انہوں نے اللہ (تعالیٰ) کے ہم رتبہ (اور مخالف) شریک بنا لئے ہیں۔تا (لوگوں) کو اس کی راہ سے برگشتہ

فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۱﴾

کریں۔تو (انہیں) کہہ (کہ اچھا یہ) عارضی فائدہ اٹھالو۔(پھر اس وقت کو یاد کرو گے) کیونکہ (ایک دن) تمہیں یقیناً (دوزخ کی) آگ کی طرف جانا ہوگا۔

حل لغات ۔اَنْدَادٌ نِدٌّ کی جمع ہے اور نِدٌّ کے معنے ہیں اَلْمِثْلُ۔مثل۔ہم رُتبہ۔ وَلَا يَكُوْنُ اِلَّا مُخَالِفًا۔ لفظ نِدٌّ کا استعمال صرف اس نظیر کے لئے ہوتا ہے جو مخالف ہو اور مَالَهٗ نِدٌّ کے معنے ہوں گے مَالَهٗ نَظِيْرٌ کہ اس کا کوئی مثل ہم رتبہ نہیں۔(اقرب)

تفسیر ۔انہوں نے خدا تعالیٰ کے مخالف شریک بنائے ہیں سے یہ مراد نہیں کہ وہ واقعہ میں خدا کے مخالف ہیں یا یہ کہ مشرک انہیں خدا تعالیٰ کے مخالف قرار دیتے ہیں۔بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان بتوں کا وجود ہی خدا تعالیٰ کی شان کے مخالف ہے۔اگر ان کو مانا جائے تو پھر خدا خدا نہیں رہتا۔مطلب یہ کہ کلمہ طیبہ کو چھوڑ کر کن لغو باتوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ یُنْفِقُوْا مِمَّا

(اے رسول) میرے ان بندوں سے جو ایمان لا چکے ہیں (ان سے) کہہ کہ وہ اس دن کے آنے سے پہلے جس میں

رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا

نہ کوئی بیع (وشراء) ہوگی اور نہ (ہی) کوئی گہری دوستی نماز کو عمدگی سے ادا کیا کریں۔ اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے

بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۲﴾

اس میں سے پوشیدگی میں (بھی) اور ظاہر میں (بھی ہماری راہ میں) خرچ کیا کریں

حلّ لُغات۔ خِلَالٌ خُلَّةٌ کی جمع ہے اور خُلَّةٌ خَالَّ سے ہے۔ خَالَّهٗ مُخَالَّةً وَخِلَالًا وَخَلَالًا کے معنے ہیں صَادَقَهٗ وَآخَاهُ۔ اس سے دوستی کی اور اس کا بھائی بنا۔ اَلْخُلَّةُ اَلْمَحَبَّةُ وَالصَّدَاقَةُ لَا خَلَلَ فِیْهَا۔ ایسی محبت اور دوستی جس میں کوئی خلل نہ ہو۔ (اقرب)

تفسیر۔ اگر مومن شجرہ طیبہ یا الہامی کلام کے فوائد کو جلد لانا چاہتے ہیں تو انہیں کہہ دو کہ وہ نمازوں کو ہمیشہ اور باشرائط ادا کیا کریں اور اپنے مالوں کو چھپ چھپ کر اور ظاہراً بھی خرچ کیا کریں۔

ایک نماز جان بوجھ کر چھوڑنے والا نمازی نہیں کہلا سکتا اس حکم سے میرے نزدیک یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جو شخص ایک نماز بھی جان بوجھ کر چھوڑتا ہے وہ نمازی نہیں کہلا سکتا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ

اللہ (تعالیٰ) وہ (ہستی) ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور بادلوں سے پانی اتار کر اس کے ذریعہ سے

مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ

تمہارے لئے پھلوں (کی قسم) سے رزق پیدا کیا ہے۔ اور اس نے کشتیوں کو بلا اجرت تمہاری خدمت پر لگا یا (ہوا)

الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهٰرَ ۚ ﴿۳۳﴾

ہے تاکہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلیں اور دریاؤں (اور نہروں) کو (بھی) اس نے بلا اجرت تمہاری خدمت پر

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ

لگا رکھا ہے۔ اور اس نے سورج اور چاند کو (بھی) بلا اجرت تمہاری خدمت پر لگا رکھا ہے درآنحالیکہ وہ بلا وقفہ

وَالنَّهَارَ ﴿۳۴﴾

(اپنا مفوضہ) کام کرتے ہیں اور اس نے رات اور دن کو (بھی) بلا اجرت تمہاری خدمت پر لگا رکھا ہے۔

حلّ لُغَات - دَآئِبَيْنِ دَأَبَ يَدْأَبُ دَأَبًا فِي عَمَلِهٖ - جَدَّ وَ تَعِبَ وَاسْتَمَرَّ - کام میں محنت کی اور لگاتار کام کیا۔ (اقرب) دَآئِبٌ کے معنے ہیں محنت سے اور لگاتار کام کرنے والا اور دَآئِبَيْنِ اس کا تثنیہ کا صیغہ ہے۔ پس دَآئِبَيْنِ کے معنے ہوں گے کہ وہ دونوں بلا وقفہ اور متواتر کام کرنے والے ہیں۔

تفسیر - **دونوں آیات میں نعمتوں کا ذکر کر کے مومنوں کو ایک نصیحت** ان دو آیات میں نعمتوں کا ذکر کر کے اور اپنے احسانات یاد کرا کے اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ ہم نے یہ تمام چیزیں تمہاری خاطر پیدا کی ہیں۔ اگر تم بجائے ان سے کام لینے کے بیوقوفی سے انہیں پوجنے لگو گے تو نعمت کی ناقدری کی وجہ سے وہ نعمتیں تم سے چھین لی جائیں گی۔ دوسرے یہ بتایا ہے کہ جب یہ نعمتیں ہماری ہیں تو جو ہمارے کلمہ سے تعلق رکھتے ہیں ہم انہی کو ان سے متمتع کریں گے۔ چنانچہ دیکھ لو کس طرح یہ سب چیزیں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں لگ گئیں۔ دن بھی ان کے ہو گئے اور راتیں بھی۔ سمندر بھی ان کے اور جہاز بھی ان کے۔ ان دونوں آیتوں سے پہلے لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُنْفِقُوْا فرمایا تھا۔ ان امور کا تعلق ان دونوں آیتوں سے یہ ہے کہ اقامت صلوٰۃ شرک سے مخالف ہے۔ گویا پہلے سے ہوشیار کر دیا کہ نعمتیں ملنے والی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ شرک کرنے لگو۔ پھر وَ يُنْفِقُوْا کا حکم دے کر اس امر سے ہوشیار کیا کہ جس طرح بعض نعمتوں کو انسان خدا بنا لیتا ہے اور بعض کو ذاتی ملکیت سمجھ لیتا ہے تم یاد رکھنا کہ خدا تعالیٰ نے ان سب کو تم سب کے لئے مسخر کیا ہے اس لئے نہ تو ان کو خدا بنانا اور نہ دوسرے بندوں کو محروم کر کے ان پر اپنا واحد قبضہ جمانا۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی سب مخلوق کو ان میں شریک کرنا اور سب کو حصہ دینا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے وہ نعمتیں سب انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں۔ نہ کہ کسی خاص گروہ کے لئے۔ سب بندوں کا اس میں حصہ ہے۔ پس تم ان کو

دوسروں میں بانٹتے رہنا۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ

اور جو کچھ (بھی) تم نے اس نے مانگا اس نے تمہیں دیا ہے اور اگر تم اللہ (تعالیٰ) کے احسان گننے لگو تو ان کا شمار نہیں

لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۵﴾ ع

کر سکو گے۔ انسان یقیناً بڑا ظالم (اور) بڑا ناشکرا گذار ہے۔

تفسیر۔ مِنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ کا مطلب۔ جس بات کا انسانی فطرت تقاضا کرتی تھی وہ سب خدا تعالیٰ نے مہیا کر دیا مِنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ اگر اس کو ماضی کے معنوں میں مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس بات کا انسانی فطرت تقاضا کرتی تھی وہ سب کا سب خدا تعالیٰ نے مہیا کر دیا۔ زبانی سوال مراد نہیں۔ کیونکہ زبانی سوال تو کوئی رد بھی کر دیئے جاتے ہیں مگر تقاضائے فطرت کبھی رد نہیں کیا جاتا۔ انسان میں اگر تاثر کی طاقت رکھی ہے تو ساتھ ہی تاثیر کرنے والی چیزیں بھی پیدا کر دیں اور اگر اس میں تاثیر کا مادہ رکھا ہے تو اس کے اثر کو قبول کرنے والی چیزیں بھی بنا دی ہیں۔ آنکھ دیکھنے کے لئے بنائی ہے تو اس کے لئے روشنی کے سامان اور خوبصورت نظارے بھی پیدا کئے۔ کان سننے کے لئے بنائے تو اس کے لئے ہوا اور خوش الحان اور سریلی آوازیں بھی پیدا کیں۔ مرد میں تولید کا مادہ پیدا کیا تو اس کے قبول کرنے کے لئے عورت بھی پیدا کر دی۔ غرض ہر تقاضائے فطرت کا جواب پیدا کیا ہے اور یہی اس آیت کے معنے ہیں۔

مِنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ میں ماضی بمعنی مضارع (۲) ماضی بمعنی مضارع بھی ہو سکتی ہے۔ جب یہ یقین دلانا ہو کہ جس امر کا وعدہ ہے اسے تم پورا ہوا ہی سمجھو تو مضارع کی جگہ ماضی کا صیغہ بھی لے آتے ہیں۔ اس صورت میں آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ اے مومنو! تم نے جو خدا سے خواہش کی ہے کہ وہ ایسے علاقے تم کو دے جن میں قرآن کریم کی تعلیم استوار ہو اور جڑھ پکڑے وہ قبول ہو گئی اور سن لو کہ آسمان و زمین کی کل چیزیں تمہارے سپرد کی جائیں گی اور دنیا میں تمہارے لئے سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچائی جائیں گی۔

مومن بحیثیت جماعت خدا تعالیٰ سے یہی مانگا کرتا ہے کہ دین کی اشاعت ہو اور دین کی ترقی کے راستے میں کوئی روک نہ رہے اور یہ سورۃ بھی مکی ہے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے راستہ میں سخت مشکلات تھیں۔ مومن

دعائیں کرتے تھے کہ کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں ہم آزادی سے اسلام کی تعلیم کو رائج کرسکیں۔ تو ان کے جواب میں فرمایا کہ بے شک ایسے علاقے مسخر کردیئے جائیں گے۔ جن میں تم آسانی کے ساتھ اسلامی تعلیم کو قائم کرسکو گے۔

اب پھر اسلام پر ایسا زمانہ آگیا ہے کہ اس کی تعلیم پر کلی طور پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ اور بعض علاقوں میں تو اس کے لئے سب راہیں مسدود ہیں۔ جیسے روس کا علاقہ ہے۔ تبلیغی لحاظ سے بھی میں سمجھتا ہوں سچائی کی تبلیغ اس وقت کہیں بھی نہیں ہوسکتی۔ علماء امراء، آقاؤں، بادشاہوں اور غلاموں وغیرہ نے اپنی ضرورتوں کے مطابق دین کو بدل دیا ہے۔ ان حواشی کو علیحدہ کر کے سچے اسلام کی تبلیغ کسی ملک میں بھی نہیں ہوسکتی۔ پس ہر مخلص مومن کو چاہیے کہ يُقِيمُوا الصَّلٰوةَ پر عمل کرے اور خدا سے دعا کرے تا وہ تبلیغ اسلام کے لئے آسانیاں میسر فرمائے اور اسلام کے قیام کے سامان پیدا کرے۔ اور یہ دعائیں انہی لوگوں کی قبول ہوں گی جو اقامۃ صلٰوۃ کرنے والے ہوں گے۔ جو لوگ نمازیں باقاعدہ اور بلا سخت معذوری کے باجماعت ادا نہیں کرتے ان کی دعا کم سنی جاتی ہے۔

اسی طرح یہ دعا انہی کی سنی جائے گی جو اخلاص سے اسلام کے لئے مالی قربانیاں کرنے والے ہوں گے۔

جماعت احمدیہ کو ایک نصیحت جماعت احمدیہ بے شک چندے دیتی ہے لیکن صحابہ والا انفاق اور تھا۔ وہ تو کوشش کر کے اپنے اوپر غربت لاتے تھے۔ جب تک اسی طرح انفاق نہ ہو ترقی ممکن نہیں ہوا کرتی۔ اسی وجہ سے پہلی آیت میں جہاں خرچ کا حکم دیا ہے وہاں سرًّا کو پہلے رکھا ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ اصل انفاق وہ ہے جو طبعی ہو اور اس میں کسی شہرت وغیرہ کا خیال نہ ہو۔ جو انفاق طبعی ہوگا ظاہر ہے کہ اس کے لئے طبیعت کو ابھارنا نہیں پڑے گا۔ بلکہ اسکے ظہور کو بعض دفعہ روکنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ پس وہی انفاق اس آیت کے ماتحت ہے جو طبعی ہو نہ یہ کہ نفس پر خرچ کرنا تو طبعی ہو اور خدا کے راستہ میں خرچ کرنے کے لئے دوسرے کے کہنے کی ضرورت ہو۔

جب احمدیہ جماعت میں یہ مادہ پیدا ہو جائے گا اور انہیں اپنے آپ پر خرچ کرنے کے لئے تو نفس پر بوجھ ڈالنا پڑے گا اور دین کی راہ میں خرچ کرنا طبعی تقاضا مد نظر آئے گا تب ان کے لئے ترقیات کے راستے کھلیں گے۔

اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ سے مراد آئندہ کے افضال ہیں اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ یہ مراد نہیں کہ ان احسانات کی ظاہری گنتی نہیں کرسکتے۔ یہ تو ایک موٹی بات ہے۔ انسان اگر اپنے جسم کی نعمتوں کو ہی شمار کرنا چاہے تو وہ بھی بے حد و بے قیاس ہیں۔ پس اس سے مراد آئندہ کے افضال ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں تم پر ہوں گی۔ مختلف قسم کے احسان تم سے وہ کرے گا اور اتنے فضل تم پر نازل ہوں گے کہ تم احاطہ بھی نہ کرسکو گے۔

لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ سے مراد لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ کہہ کر یہ اشارہ کیا ہے کہ اگر ان نعمتوں کے باوجود لوگ اسلام سے

غفلت برتیں گے تو وہ ظلوم بھی ہوں گے اور کفار بھی۔ ظلوم اس طرح کہ ایک نئی اور پاک دنیا جو اسلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ قائم کرے گا وہ اس کے تباہ کرنے والے ہوں گے۔ اور کفار اس لئے کہ ان گنت احسانات کے بعد وہ اللہ تعالیٰ سے ناشکری کا معاملہ کرنے والے ہوں گے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ

اور (اے مخاطب اس وقت کو یاد کر) جب ابراہیم نے (دعا کرتے ہوئے) کہا تھا (کہ) اے میرے رب اس

اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ؕ﴿۳۶﴾

جگہ کو امن والی (جگہ) بنا۔ اور مجھے اور میرے بیٹوں کو اس بات سے دور رکھ کہ ہم معبودان باطلہ کی پرستش کریں

حلّ لُغات۔ وَاجْنُبْنِيْ جَنَبَهٗ جَنْبًا دَفَعَهٗ۔ اس کو دور کیا۔ جَنَبَ زَيْدًا اَلشَّيْءَ نَحَّاهُ عَنْهُ۔ اس نے زید کو کسی چیز سے ایک طرف رکھا۔ وَمِنْهُ فِي الْقُرْاٰنِ وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ۔ اَيْ نَحِّنِيْ وَاِيَّاهُمْ کہ مجھے اور میری اولاد کو شرک سے ایک طرف رکھیو۔ (اقرب) یعنی اے خدا! جب تو نے ہمیں طہارت بخشی ہے تو مجھے اور میری اولاد کو ہمیشہ اس پر قائم رکھیو۔

اَلْاَصْنَامُ اَصْنَامٌ صَنَمٌ کی جمع ہے۔ اس کے معنے ہیں اَلْوَثَنُ۔ بت۔ وَهُوَ صُوْرَةٌ اَوْ تِمْثَالُ اِنْسَانٍ اَوْ حَيَوَانٍ يُتَّخَذُ لِلْعِبَادَةِ۔ یہ انسان یا حیوان کے اس مجسمہ پر بولا جاتا ہے جو عبادت کی خاطر بنایا جاتا ہے۔ كُلُّ مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا عبادت کی جائے۔ یہ معرب ہے۔ (یعنی لغت والے کے نزدیک یہ لفظ عربی زبان کا نہیں۔ دوسری زبان سے مانگا ہوا ہے) لیکن عربی زبان میں صَنَمٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں صَنِمَتِ الرَّائِحَةُ۔ خَبُثَتْ۔ ہوا بدبودار ہوگئی۔ اَلْعَبْدُ قَوِيَ۔ طاقتور ہوگیا۔ صَنَّمَ الرَّجُلُ صَوَّتَ آدمی نے آواز نکالی۔ اَلصَّنَمَةُ قَصَبَةُ الرِّيْشِ كُلِّهَا۔ پورا سرکنڈا۔ اَلدَّاهِيَةُ۔ مصیبت۔ (اقرب)

تفسیر۔ یہ بتا چکنے کے بعد کہ پہلے انبیاء بھی بے سامان تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی اور وہ غیر مرئی اسباب سے کامیاب ہوئے۔

آنحضرتؐ کی کامیابی کی بنیاد ہزاروں سال پہلے سے رکھی گئی

اسی طرح اب محمد رسول اللہ صلعم غیر مرئی اسباب سے جن میں سے ایک مثال کلمہ طیبہ کی تمثیل سے مستنبط دلائل ہیں کامیاب ہوں گے۔ اس آیت میں یہ بتایا

گیا ہے کہ اس رسول کی کامیابی کی بنیاد تو ہزاروں سال پہلے سے رکھی گئی ہے۔خصوصاً ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ سے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ مکہ والوں کو الہامی کتاب کی نعمت سے متمتع کرنا ضروری تھا اور انہیں شرک کی ظلمت میں پڑا رہنے نہیں دیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بارہ میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے وعدہ کر چکا ہے اور وہ وعدہ خلاف نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم کو دعا کرتے وقت علم تھا کہ مکہ میں شرک پھیلے گا اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس امر کا علم رکھتے تھے کہ مکہ کے علاقہ میں شرک پھیلنے والا ہے۔تبھی تو انہوں نے دعا کی کہ خدایا مجھے اور میری اولاد کو شرک سے ایک طرف رکھیو۔ ورنہ جس وقت دعا کی گئی تھی مکہ میں شرک کا نام ونشان نہ تھا۔صرف حضرت اسمٰعیلؑ کا گھر آباد تھا یا وہ لوگ بستے تھے جو ان کے تابع تھے۔

موازنہ مذاہب والوں کے خیال کا رد اس دعا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ توحید اور شرک کے دور دنیا پر آتے رہتے ہیں اور موحد قومیں مشرک ہو جاتی ہیں اور مشرک موحد ہو جاتی ہیں اور توحید کے اعلیٰ مقام پر پہنچی ہوئی قوم کی نسبت بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اب وہ شرک کے اثر سے محفوظ ہو گئی ہے۔اس تعلیم سے اس خیال کا رد ہوتا ہے جو موازنہ مذاہب والے لوگ پیش کرتے ہیں۔یعنی توحید شرک سے ترقی کرتے کرتے پیدا ہوتی ہے۔قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ توحید کے بعد شرک اور شرک کے بعد توحید کے دور آتے رہتے ہیں اور ہمیشہ توحید کا دور شرک کے دور سے پہلے ہوتا ہے۔اس اصل کے ماتحت توحید کو الہامی اور شرک کو تنزل کا ایک مقام تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ برخلاف موازنہ مذاہب والوں کے اصول کے کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا خیال خوف اور حیرت سے پیدا ہوا اور شرک سے ترقی کرتے ہوئے توحید کے نقطہ تک پہنچا۔ بظاہر یہ اختلاف معمولی معلوم ہوتا ہے مگر اسی اختلاف کے نتیجہ میں مذہب نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور موازنہ مذاہب والوں نے کہا کہ انسان نے خدا کو پیدا کیا ہے۔یعنی خدا تعالیٰ کا خیال انسانی دماغ کی ایجاد ہے اور اس کی تکمیل انسانی فلسفہ کی تکمیل سے ہوئی ہے۔

اس آیت پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ابراہیم شرک کر سکتے تھے؟ اگر نہیں تو انہوں نے یہ دعا کیوں کی کہ خدایا مجھے شرک سے بچا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی طاقتیں دو قسم کی ہیں۔ایک وہ جو خِلْقَةً اسے اللہ تعالیٰ نے دی ہیں۔ ان کے متعلق وہ دعا نہیں کرتا۔مثلاً یہ نہیں کہتا کہ خدایا میرا ایک ہی سر رہے دو نہ ہو جائیں۔ دوسری وہ طاقتیں ہیں جو انسان کو کَسْبًا یا وَھْبًا ملتی ہیں۔یعنی وہ انہیں آپ ترقی کر کے حاصل کرتا ہے۔ یا خدا تعالیٰ کا خاص فضل دوسرے انسانوں سے ممتاز کر کے اسے عطا کرتا ہے۔ایسی طاقتوں میں چونکہ تنزل کا امکان ہوتا ہے ان کے لئے دعا جاری

رکھی جاتی ہے۔ خواہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہی کیوں نہ ہو کہ وہ اس انعام سے اسے متمتع رکھے گا۔ کیونکہ اس دعا میں درحقیقت اس امر کا اقرار ہوتا ہے کہ یہ نعمت میری ذاتی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے بطور انعام حاصل ہوئی ہے۔ اسی اصل کے ماتحت انبیاء نبوت کے انعامات کے متعلق بھی دعا میں لگے رہتے ہیں۔ جیسے حضرت ابراہیم کی یہ دعا ہے یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا یا استغفار اور توبہ کا انبیاء سے صدور ہے۔

انبیاء کا استغفار ان نکتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگوں نے انبیاء کے استغفار اور توبہ سے دھوکا کھایا ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ گویا وہ گنہگار تھے۔ حالانکہ ان کے استغفار اور توبہ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ جس مقام طہارت پر وہ ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک موہبت ہے اور اس کے جاری رکھنے کے لئے وہ دعا کرتے ہیں کیونکہ اس کا تسلسل اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی ہوتا ہے۔

باوجود کمال کے انسان کو اللہ تعالیٰ پر سہارا رکھنا چاہیے اسی بناء پر قرآن کریم میں بار بار وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ آتا ہے۔ یعنی باوجود کمال کے انسان کو اللہ تعالیٰ پر سہارا رکھنا چاہیے۔ کیونکہ وہ کمال خدا تعالیٰ پر سہارے سے ہی حاصل ہوا ہے۔ اور اس سہارے کا اقرار کرتے رہنا اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ہدایت کا موجب ہوتا ہے۔

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ

اے میرے رب انہوں نے یقیناً بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے پس جس نے میری پیروی (اختیار) کی وہ (تو)

فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۷﴾

مجھ سے (تعلق رکھتا ہے) اور جس نے میری نافرمانی کی تو (اس کے متعلق بھی میری یہی عرض ہے کہ) تو یقیناً بڑا ہی بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر۔ حضرت ابراہیمؑ کی محبت الٰہی کا مظاہرہ محبت الٰہی کا کیسا پاک مظاہرہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں میری اولاد اگر شرک نہ کرے گی تب تو وہ میری اولاد ہے ورنہ نہیں۔ اس آیت سے یہ بھی مستنبط ہے کہ بہت سے گناہوں کا باعث اولاد کی محبت بھی ہوتی ہے۔

اولاد کی محبت اس حد تک ہونی چاہیے جس سے وہ بگڑ نہ جائے حضرت ابراہیمؑ نے ہمیں سبق دیا ہے کہ

اولاد کی محبت اس حد تک ہونی چاہیے جس سے وہ بگڑ نہ جائے۔ ایسی محبت جو اولاد کو خراب کر دے محبت نہیں دشمنی ہے۔ جسمانی آرام سے روحانی اور اخلاقی درستی کا خیال مقدم رہنا چاہیے۔ اگر اولاد باوجود کوشش کے درست نہ ہو تو ایک وقت ایسا آ سکتا ہے کہ اس سے قطع تعلق کرنا ضروری ہو۔ کیونکہ جب ان کو معلوم ہو کہ ماں باپ ہماری غلطی سے چشم پوشی کرتے ہیں تو وہ غلط راہ پر چلتے جاتے ہیں۔ لیکن جب ان کو معلوم ہو کہ ہماری غلطی پر مناسب گرفت ہوتی ہے تو ان کی اصلاح ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ اولاد کی محبت پر خدا کی محبت غالب رکھیں کہ یہ خدا تعالیٰ کی ہی خوشنودی کا موجب نہیں بلکہ اپنی اولاد کی حفاظت کا بھی ذریعہ ہے۔

وَمَنْ عَصَانِيْ فَإِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ پہلے عرض کیا تھا کہ میری اولاد میں سے اگر کوئی شرک میں پڑ جائے تو وہ میری اولاد سے نہیں۔ مگر نبی میں رحم بھی ہوتا ہے اولاد کو اولاد نہ سمجھنا اور خدا کی محبت کو ترجیح دینا اور چیز ہے اور ان کے لئے خدا سے رحم کی درخواست کرنا اور چیز ہے۔ پس حضرت ابراہیمؑ دعا کرتے ہیں کہ اول تو میری اولاد کو شرک سے بچائیے لیکن اگر ان میں سے کوئی میرے طریق کے خلاف کرے تو میں تو اسے یہی کہوں گا کہ وہ میری اولاد نہیں مگر تو چونکہ غفور رحیم ہے اس لئے تیرے غفور رحیم ہونے سے میں یہی امید کرتا ہوں کہ تو ان کے گناہ بخشیو اور ان کی ترقی کے سامان پیدا کرتا رہیو۔ اس میں یہ بتایا کہ اولاد سے ناراضگی کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے دل بھی سخت کر لے بلکہ سزا ظاہری ہو دل میں ان کے لئے دعا کرتا رہے اور ان کی اصلاح مدنظر رکھے نہ کہ ان کی تباہی چاہے۔

رَبَّنَآ إِنِّيْٓ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ

اے میرے رب میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے معزز گھر کے پاس ایک وادی جس میں کوئی کھیتی (بھی)

بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً

نہیں (ہوتی لا) بسایا ہے۔ اے میرے رب (میں نے ایسا اس لئے کیا ہے) تا وہ عمدگی سے نماز ادا کیا کریں پس تو

مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ

(نیک) لوگوں کے دل ان کی طرف جھکا دے اور انہیں (تازہ) پھلوں (کی قسم) سے (بھی) رزق دیتا رہ۔

لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

تا کہ وہ (ہمیشہ تیرا) شکر کرتے رہیں۔

حلّ لُغَات۔ اَلْوَادِیْ کے لئے دیکھیں سورۂ رعد آیت نمبر ۱۸۔

اَفْئِدَۃٌ فُؤَادٌ کی جمع ہے اور اَلْفُؤَادُ کے معنے ہیں اَلْقَلْبُ لِتَوَقُّدِہٖ۔ دل اور قلب کو فُواد اس کے احساسات کی تیزی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ وَقِیْلَ لِتَحَرُّکِہٖ۔ اور بعض نے قلب کو فُواد کہنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ حرکت کرتا ہے۔ کیونکہ فَأَدَ کے اصل معنی حرکت کرنے کے ہیں۔ وَقِیْلَ ھُوَ بَاطِنُ الْقَلْبِ اور بعض کے نزدیک فؤاد دل کے اندرونی حصہ کا نام ہے۔ وَقِیْلَ غِشَاؤُہٗ اور بعض کے نزدیک دل کے اوپر کے حصے کا وَقَالَ جَمَاعَۃٌ مِنَ الْمُفَسِّرِیْنَ یُطْلَقُ الْفُؤَادُ عَلَی الْعَقْلِ اور مفسرین کی ایک جماعت کے نزدیک فُواد کے معنے عقل کے ہیں۔ (اقرب)

تَھْوِیْ ھَوٰی سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور ھَوَتِ الْعِقَابُ کے معنی ہیں اِنْقَضَّتْ عَلٰی صَیْدٍ اَوْ غَیْرِہٖ۔ باز اپنے شکار پر ٹوٹ پڑا۔ ھَوَتْ یَدِیْ لَہٗ: اِمْتَدَّتْ وَارْتَفَعَتْ۔ ھَوَتْ یَدِیْ لَہٗ کے معنے ہیں کہ میرا ہاتھ لمبا ہوا اور بڑھا۔ اَلرِّیْحُ ھَبَّتْ۔ ہوا چلی۔ اَلنَّاقَۃُ بِرَاکِبِھَا۔ اَسْرَعَتْ۔ اونٹنی اپنے سوار کو لے کر تیزی سے چلی۔ اَلشَّیْءُ ھَوِیًّا وَھُوِیًّا۔ سَقَطَ مِنْ عُلُوٍّ اِلٰی اَسْفَلَ۔ کوئی چیز اوپر سے نیچے کو گری (اقرب) پس تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ کے معنے ہوں گے (۱) کہ لوگوں کے دل اُن کی طرف شوق سے بڑھیں۔ (۲) ایسے مائل ہوں جیسے کوئی چیز گر کر تیزی سے آتی ہے۔ (۳) ان کے دل ہر وقت ان کی طرف مائل رہیں۔

اَلثَّمَرَاتُ اَلثَّمَرَۃُ۔ حِمْلُ الشَّجَرِ۔ درخت کا پھل۔ اَلنَّسْلُ۔ نسل۔ اَلْوَلَدُ۔ لڑکا۔ اَلثَّمَرَۃُ مِنَ اللِّسَانِ طَرَفُہٗ وَعَذَبَتُہٗ۔ زبان کی نوک۔ یعنی عمدہ کلام۔ ثَمَرَۃُ الْقَلْبِ۔ اَلْمَوَدَّۃُ۔ دوستی۔ خُلُوْصُ الْعَھْدِ۔ خالص عہد۔ پس وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ کے معنے ہوں گے (۱) کہ ان کو ظاہری پھلوں سے رزق عطا کر۔ (۲) ان کے خلوص دل سے کئے ہوئے اعمال ضائع نہ ہوں بلکہ پھل دار ہوں۔ (اقرب)

تفسیر۔ **حضرت ابراہیم کی اپنی نیت کو خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کر کے دعا** اس آیت میں حضرت ابراہیم اپنی نیت کو خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کر کے اس کے فضل کو طلب کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نیتوں کو دیکھنے والا ہے۔ وہ کبھی کسی اچھے عمل کو جو نیک نیتی سے کیا گیا ہو ضائع نہیں کرتا۔ پس وہ اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں

کہ تیری مقدس عبادت گاہ کی خدمت اور آبادی کے لئے میں نے اپنی اولاد کو یہاں چھوڑا ہے اور اس نیت سے یہاں چھوڑا ہے کہ وہ تیرے ذکر کو بلند کریں اور یہ جانتے ہوئے چھوڑا ہے کہ اس جگہ دنیوی آرام کا کوئی سامان نہ موجود ہے نہ ہوسکتا ہے۔ پس اب میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ ایک تو جس مقصد کے لئے میں نے ان کو یہاں رکھا ہے وہ پورا ہو۔ لوگ ان کی طرف توجہ کریں اور ان کی تبلیغ اور ان کے وعظ میں اثر ہو اور یہ تیری عبادت قائم کرنے میں کامیاب ہوں۔ دوسرے ان کی جسمانی حالت کی درستی کا بھی خیال رکھ۔ اور باوجود اس کے کہ انہیں میں ایسے علاقہ میں چھوڑ رہا ہوں کہ گھاس کی پتی بھی وہاں نظر نہیں آتی تو اعلیٰ سے اعلیٰ پھل بھی ان تک پہنچا۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ جو خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرتا ہے خدا تعالیٰ اسے دنیا میں بھی ضائع نہیں کرتا۔

حضرت ابراہیم کی دعا کا اثر اس دعا کا اثر دیکھو کتنا وسیع ہوا ہے۔ آج سب دنیا مکہ والے کے نام پر قربان ہے اور دل آپ ہی آپ اس کی تعلیم کی طرف جھکے جا رہے ہیں اور اب تو مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت سے اور بھی ترقی کے سامان پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ تو دینی حصہ کی دعا کا حال ہے۔ باقی رہا دنیوی حصہ۔ سو وہ عجیب طرح پورا ہو رہا ہے۔ اس بے آب وگیاہ علاقہ میں ہر قسم کے اور عمدہ سے عمدہ پھل میسر ہیں۔ میں نے ایسے اچھے انگور اور انار مکہ میں کھائے ہیں کہ نہ ہندوستان میں نہ شام میں نہ اٹلی اور فرانس میں ویسے نظر آئے۔ دنیا بھر کا پھل وہاں جاتا اور ابراہیمی دعا کی قبولیت کا ثبوت دیتا ہے۔

اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ میں مِن بعضیہ نہیں بلکہ زائدہ ہے اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ کے متعلق بعض علماء نے کہا ہے کہ اس میں مِن بعضیہ ہے یعنی کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف متوجہ ہوں۔ مگر یہ درست نہیں۔ دعا کرنے والا کبھی تھوڑی چیز نہیں مانگتا۔ پس یہاں مِن بعضیہ نہیں بلکہ زائدہ ہے۔

حروف زائدہ معنوں میں زور پیدا کرنے کے لئے آتے ہیں حروف زائدہ تاکید کے لئے آتے ہیں یعنی وہ معنوں میں زور پیدا کر دیتے ہیں یعنی جو مفہوم بغیر حروف زائدہ کے پیدا ہوتا تھا اس میں ان کے ذریعہ سے قوت اور طاقت پیدا کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ میں سے مِنْ کو اڑا دیا جائے تو اَفْئِدَۃُ النَّاسِ رہ جائے گا اور اس کے معنے ’’لوگوں کے دل‘‘ کے ہوں گے۔ چونکہ ال خصوصیت اور کمال کے لئے بھی آتا ہے اور یہی اس جگہ مراد ہے۔ پس اس جملہ کے معنے ہوئے۔ ’’کامل اور خاص لوگوں کے دل‘‘ مِنْ نے داخل ہو کر ان معنوں میں اور زور پیدا کر دیا اور مراد یہ ہوئی کہ مکہ والوں کی طرف جھکنے والے دل نہایت پاک اور نہایت کامل لوگوں کے دل ہوں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ حروف زائدہ سے مراد لغو اور بے کار اور زائد حروف نہیں بلکہ ان سے مراد معنوں میں زیادتی کرنے والے حروف ہیں اور اسی وجہ سے ان کے معنے تاکید کے ہوتے ہیں۔

وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔ ظاہری پھلوں کے علاوہ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی عبادات اور ان کی قربانیاں ضائع نہ ہوں بلکہ ان کے اعلیٰ نتائج نکلتے رہیں۔

حضرت ابراہیم کی یہ دعا حضرت نبی کریمؐ کے وجود میں پوری ہوئی میرے نزدیک یہ دعا آنحضرت صلعم کے لئے ہے۔ آپؐ سے پہلے تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ کا مفہوم کب پورا ہوا۔ آپؐ سے پہلے صرف عرب لوگ ہی مکہ جاتے تھے۔ مگر اب آنحضرت صلعم کے بعد تمام جہان کے لوگ وہاں دوڑے چلے جاتے ہیں۔ پس میرے نزدیک اس دعا میں ایسے رسول کی دعا کی گئی تھی جو سب دنیا کی طرف مبعوث ہو اور جس کی آواز کو سن کر سب دنیا کے لوگ مکہ میں حج کے لئے جمع ہوں اور مکہ کو توحید کا مرکز بنا کر شرک اور مشرکوں سے پاک کر دیا جائے۔

حضرت ابراہیم کے خواب کی تعبیر میرے نزدیک حضرت ابراہیمؑ نے جو یہ خواب میں دیکھا تھا کہ وہ حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کر رہے ہیں اس کی تعبیر یہی تھی کہ وہ انہیں ایک دن ایک غیر ذی زرع وادی میں چھوڑ جائیں گے۔ ایسی جگہ پر چھوڑنا ان کو اپنے ہاتھ سے ذبح ہی کرنا تھا۔ حضرت ابراہیم نے زمانہ کے رواج کے مطابق اس کی تعبیر غلط سمجھی تھی۔ کیونکہ اس زمانہ میں لوگ انسانوں کی قربانی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کا یہی منشاء ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کر دیا جائے لیکن دراصل اس کی تعبیر یہی تھی کہ وہ ان کو ایک غیر ذی زرع وادی میں چھوڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فوراً ہی خواب کی تعبیر نہ سمجھائی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انسانی قربانی کا منسوخ قرار دینے والا بنائے۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنی خواب کو لفظاً لفظاً پورا کرنے کے لئے تیار ہو گئے تو اس نے انہیں بتا دیا کہ تمہارا اخلاص بھی ظاہر ہو گیا اور یہ حکم بھی قائم ہو گیا کہ آئندہ انسان کو بغیر جنگ یا بغیر قصاص کے قتل نہ کیا جائے گا۔ آئندہ انسانی قربانی بامعنی ہو گی۔ یعنی انسان اپنے وقت، اپنے علم، اپنے مال کو قربان کر کے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرے گا نہ کہ اپنے گوشت کو قربان کرکے۔ پس تم ظاہر میں رد بلا کے طور پر بکرے کی قربانی کر دو۔ اور حقیقت میں اپنے بچہ کی ایک تلخ قربانی کے لئے تیار ہو جاؤ جو آئندہ پیش آنے والی ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ؕ وَمَا يَخْفٰى عَلَى

اے ہمارے رب جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ہم ظاہر کرتے ہیں تو یقیناً (سب) جانتا ہے اور اللہ (تعالیٰ) سے

اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۳۹﴾

کوئی چیز نہ زمین میں چھپی رہ سکتی ہے اور نہ آسمان میں

تفسیر۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے جنگل میں چھوڑا اس آیت میں بتایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ فعل نہایت نیک نیت کی بناء پر تھا۔ ضمناً اس میں بائبل کے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ بائبل میں ہے کہ حضرت سارہؓ ناراض ہوگئی تھیں۔ اس لئے ان کو خوش کرنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کو جنگل میں چھوڑا تھا (پیدائش باب ۲۱ آیت ۸ تا ۱۲)۔ یعنی ایک نبی نے اپنی ایک بیوی کی رضامندی کے لئے بعض بے گناہوں پر ظلم کیا۔ قرآن کریم اس امر کا جو حضرت ابراہیم کے نام پر دھبہ ہے خود حضرت ابراہیم کے منہ سے دفعیہ کرواتا ہے اور ان کی مذکورہ بالا دعا نقل کرکے بتاتا ہے کہ یہ بیان بائبل کا غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ اے رب! تو تو جانتا ہے کہ میری نیت ان کو جنگل میں چھوڑنے سے کیا ہے؟ میں ایسا کسی دنیوی غرض کی وجہ سے نہیں کررہا۔ بلکہ محض تیری خوشنودی کے حصول کے لئے اپنے بیوی بچوں کو اس جنگل میں چھوڑے جارہا ہوں۔

مَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ میں مِنْ کا جو لفظ آیا ہے اس کا مفہوم اس جگہ ''بھی'' کے لفظ سے ملتا ہے۔ یعنی کوئی چیز بھی اللہ سے پوشیدہ نہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس فقرہ کو اس لئے دوہرایا ہے کہ جس طرح ابراہیمؑ نے فرمایا تھا کہ اے اللہ! تو میری نیت کو خوب جانتا ہے اسی طرح اللہ نے بھی ان کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا کہ مَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ۔ بے شک ہم بھی اس کی نیت سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ اس کا یہ فعل بیوی کی رضا حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ ہماری رضا حاصل کرنے کے لئے تھا۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ

ہر ایک (قسم کی) تعریف اللہ (تعالیٰ ہی) کے لئے (مخصوص) ہے (وہ اللہ) جس نے (میرے) بڑھاپے کے

اِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَسَمِیۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۴۰﴾

باوجود مجھے (دو بیٹے) اسمٰعیل اور اسحاق عطا کئے ہیں۔ میرا رب یقیناً خوب (ہی) دعائیں سننے والا ہے

حل لغات۔ وَہَبَ لَہٗ مَالًا ۔ اَعۡطَاہُ اِیَّاہُ بِلَا عَوَضٍ۔ بغیر بدلہ کے اُسے مال دیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ جیسا کہ اوپر کی آیات سے ظاہر ہے اس جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر کے اس حصہ کا ذکر ہے جبکہ وہ خانہ کعبہ کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ کیونکہ جو دعائیں اس جگہ مذکور ہیں وہ اس وقت کی ہیں (دیکھو سورۂ بقرہ ع ۱۵/۱۵)

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الحمد للہ کہنے کا مطلب اس پر کہا جاسکتا ہے کہ پھر اس موقعہ پر اولاد کے ملنے کا ذکر اور اس پر الحمدللہ کہنے سے کیا مراد ہے اور اس کا کیا موقع ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس موقع پر اولاد کے ملنے پر الحمدللہ نہیں کہہ رہے بلکہ اس بات پر الحمد للہ کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں عبادت قائم کرنے کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ ان کو محض اس بات کی خوشی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے ذریعہ سے خدا کی عبادت کی بنیاد رکھ چلے ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسحاقؑ بھی وقف تھے کیونکہ ان کو بھی دعا میں شامل کیا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے ایمان کا یہ آیت ایک بے مثل ثبوت پیش کرتی ہے۔ بڑھاپے کی اولاد بڑا لڑکا بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑ کر آئے ہیں۔ جہاں میٹھے پانی اور خوراک تک کا پہنچنا مشکل ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی باتوں پر اس قدر یقین ہے کہ جب دنیا کی نگاہ میں انہوں نے اپنے بیٹے کے مستقبل کو تباہ کر دیا وہ نہایت جوش و خروش سے اللہ تعالیٰ کے شکریہ میں لگے ہوئے ہیں کہ سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق دیئے اور ان کے حق میں میری دعاؤں کو سنا۔ گویا انہیں اس بڑھاپے میں بھی اولاد کی خواہش تھی تو صرف اس لئے کہ وہ اللہ کی راہ میں قربان ہو اور اس کے دین کو دنیا میں قائم کرے۔ سو اسمٰعیل کی قربانی سے یہ مقصد پورا ہو گیا۔ اپنے پیارے اور بڑے بیٹے کو اس طرح جنگل میں چھوڑ دینے کے بعد جبکہ خطرات سامنے نظر آ رہے تھے اولاد کی پیدائش اور کامیاب زندگی پر خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا صرف ابراہیمؑ اور اس کی قسم

کے لوگوں کا ہی کام ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیۡھِمۡ وَارۡفَعۡ دَرَجَاتِھِمۡ۔

رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ٭ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلۡ

(اے) میرے رب مجھے اور میری اولاد میں سے (ہر ایک کو) نماز کو عمدگی سے ادا کرنے والا بنا (اے) ہمارے

دُعَآءِ ﴿۴۱﴾

رب (مجھ پر فضل کر) اور میری دعا (پوری طرح) قبول فرما

حل لغات۔ مُقِیۡمُ الصَّلٰوۃِ مُقِیۡمٌ اَقَامَ سے اسم فاعل ہے جو قَامَ کا مجرد ہے۔ کہتے ہیں قَامَ الْاَمْرُ۔ اِعْتَدَلَ۔ معاملہ درست ہو گیا۔ عَلَی الْاَمْرِ۔ دَامَ وَثَبَتَ یعنی کسی چیز پر دوام اور ثبات اختیار کیا اور قَامَ السُّوْقُ کے معنے ہیں نَفَقَتْ۔ بازار بارونق ہو گیا اور اَقَامَ الصَّلٰوۃَ کے معنے ہیں اَدَامَ فِعْلَھَا۔ نماز پر دوام اختیار کیا۔ اَقَامَ لِلصَّلٰوۃِ کے معنے ہیں نَادٰی لَھَا۔ نماز کے لئے پکارا۔ اَقَامَ اللّٰہُ السُّوْقَ جَعَلَھَا نَافِقَۃً۔ بازار کو بارونق بنا دیا۔ (اقرب) پس رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ کے معنے ہوں گے کہ ہمیں ایسا بنا دے کہ نماز کا رواج دینے والے ہوں۔ اور لوگوں کو اس طرف لانے والے ہوں اور نماز کی طرف لوگوں کو پکارنے والے ہوں۔

تفسیر۔ **حضرت ابراہیم کا اِقَامَۃِ صَلٰوۃ کی دعا کرنے کا مطلب** حضرت ابراہیمؑ نبوت کے مقام پر پہنچ چکے ہیں اور اولاد بھی ہو چکی ہے۔ پھر وہ جوان ہے اور پھر اس کو دین کے لئے وقف بھی کر چکے ہیں۔ پھر کیوں کہتے ہیں رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ۔ کیا آپ کو اس بات میں کہ آپ نماز کی پابندی کرتے رہیں گے کوئی شبہ تھا۔ اس سے آپ کی مراد یہ نہ تھی کہ میں نماز کو قائم نہ رکھ سکوں گا بلکہ اس طرف اشارہ تھا کہ میرے ذریعہ اور میری اولاد کے ذریعہ سے دنیا میں نماز قائم رہے۔

اِقَامَۃِ صَلٰوۃ شخصی بھی ہو سکتی ہے اور قومی بھی۔ اس جگہ قومی اِقَامَۃِ صَلٰوۃ مراد ہے اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃ شخصی بھی ہو سکتی ہے اور قومی بھی۔ اس جگہ قومی مراد ہے اور حضرت ابراہیم کی دعا کا یہ مطلب ہے کہ میری کوششوں میں ایسا اثر دے کہ ہمیشہ میرے ذریعہ سے ایک نماز گذاروں کی جماعت قائم رہے اور اسی طرح میری اولاد میں سے بھی ہمیشہ ایسے لوگ ہوتے رہیں جو میرا ہاتھ بٹاتے رہیں اور لوگوں کو عبادت الٰہیہ کی طرف لاتے رہیں اور وہ بھی اپنی کوششوں میں کامیاب رہیں۔ اس طرح تاقیامت میں نمازوں کا قائم رکھنے والا بن جاؤں۔ یہ مقام

عام مُقِیْمُ الصَّلٰوۃِ سے بہت بڑھ کر ہے کیونکہ وہ شخص صرف اپنی نماز کو قائم کرتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام دنیا کی نماز قائم کرنے کے لئے دعا کر رہے ہیں۔

حضرت نبی کریمؐ کے متعلق دعا اور پیشگوئی دراصل یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دعا اور پیشگوئی ہے کہ جس طرح میرے ذریعہ سے نمازیں قائم ہوئی ہیں اسی طرح آئندہ بھی میری اولاد سے ایک شخص نمازوں کا قائم کرنے والا پیدا ہو۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ

(اے) ہمارے رب جس دن حساب ہونے لگے اس دن مجھے اور میرے والدین کو

الْحِسَابُ ﴿۴۲﴾ ع ۱۸

اور تمام مومنوں کو بخش دیجیو

حلّ لُغات۔ غَفَرَ اِغْفِرْلِیْ غَفَرَ الشَّیْءَ غَفْرًا کے معنے ہیں سَتَرَہٗ۔ اس کو ڈھانپ لیا۔ اَلْمَتَاعَ فِی الْوِعَاءِ: اَدْخَلَہٗ وَسَتَرَہٗ۔ سامان کو برتن میں داخل کیا اور اس کو ڈھانپ دیا۔ الشَّیْبَ بِالْخِضَابِ۔ غَطَّاہُ سفید بالوں کو خضاب سے ڈھانپا۔ اللہُ لَہٗ ذَنْبَہٗ غَفْرًا غَطّٰی عَلَیْہِ گناہوں پر پردہ ڈالا۔ اَلْاَمْرَ بِغُفْرَتِہٖ۔ اَصْلَحَہٗ بِمَا یَنْبَغِی اَنْ یُّصْلَحَ بِہٖ۔ معاملہ کی اصلاح مناسب طریقہ سے کی۔ (اقرب) پس غَفَرَ کے لفظ میں ڈھانپنے کے معنے پائے جاتے ہیں اور اِغْفِرْلِیْ کے معنے ہوں گے (۱) مجھے ڈھانپ لے۔ مجھ پر پردہ ڈال دے۔ یعنی میرا وجود مٹا کر اپنا وجود میرے ذریعہ سے ظاہر کر۔ (۲) میری بشریت کو الوہیت کی چادر سے ڈھانپ لے۔ یعنی میری کوششوں کے نتائج تیری شان کے مطابق نکلیں۔ (۳) میرے تمام کاموں کی عمدہ طریقوں سے اصلاح فرمادے۔ یعنی میرے تمام کام درست ہوجائیں۔ اور میری اولاد کی کمزوریوں کو ڈھانپ کر ان کو ترقی کے منازل کی طرف لے جا۔

تفسیر۔ انبیاء کے استغفار کرنے کا مطلب نبی خدا کے فضل سے معصوم ہوتا ہے پھر نبی کا یہ کہنا کہ اِغْفِرْلِیْ اس کا کیا مطلب؟ دراصل غیر عارف انسان کی نظر محدود ہوتی ہے۔ اس کی نظر انسان تک ہی جاتی ہے اور انسان تک ہی تسلی پا جاتی ہے مگر عارف کی نظر اوپر جاتی ہے اور بلند ہوتی جاتی ہے۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ بندے کی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کیا ہستی ہے۔ سورج کے سامنے ایک ذرہ کی کیا حیثیت ہے؟ کیونکہ آخر انسان اسی کی مخلوق

ہے۔اس کی زندگی بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہے اور ہدایت بھی اسی کی طرف سے آتی ہے۔غالب نے کیا ہی عمدہ کہا ہے ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اِغۡفِرۡلِیۡ سے مراد پس نبی چونکہ عارف ہوتا ہے وہ اپنی ہستی کو دیکھتا ہے اور جانتا ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ میں نہیں بلکہ خدا ہی کر رہا ہے۔اس لئے وہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! میرے وجود کو زیادہ سے زیادہ مخفی کر دے اور اپنے وجود کو زیادہ سے زیادہ ظاہر فرما۔گویا اِغۡفِرۡلِیۡ کے اس صورت میں یہ معنے ہوتے ہیں کہ اے خدا! تجھے میری ہی محبت کا واسطہ ہے کہ اپنا پردہ مجھ پر ڈال دے۔یعنی میرا وجود مٹا کر تیرا وجود میرے ذریعہ سے ظاہر ہونے لگے اور یہ امر ظاہر ہے کہ بندہ کے ذریعہ سے جس قدر اللہ تعالیٰ کا وجود ظاہر ہوگا اسی قدر وہ اپنے نیک مقاصد میں کامیاب ہوگا۔

غَفَرَ کے لفظ کے معنے حسب مراتب ہوتے ہیں ہاں جب دوسروں کے لئے یہ لفظ آئے تو اس وقت ان کے حسب مراتب اس لفظ کے معنے ہوں گے۔ایک اعلیٰ درجہ کا مومن یہ لفظ استعمال کرے گا تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ کمزوریاں جو حصولِ کمال سے محروم کرتی ہیں ان سے مجھے بچالے۔درمیانی درجہ کے مومن کے لئے یہ لفظ استعمال ہوگا تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ میری خطاؤں کو ڈھانپ کر مجھے اعلیٰ ترقیات کی توفیق دے اور عام مومن یہ لفظ استعمال کرے تو یہ مطلب ہوگا کہ میرے قدم کو ایمان پر استقلال سے قائم رکھ۔میرے گناہ مجھے کہیں لے نہ ڈوبیں اور ایک متلاشی حق یہ لفظ استعمال کرے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ میرے گناہ مجھے ہدایت پانے سے محروم نہ کر دیں۔اس لئے میرے گناہ معاف کر۔اس لفظ کا استعمال مختلف مواقع کے لحاظ سے ایسا ہی ہے جیسے جبار کا لفظ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے لئے آتا ہے تو اس کے معنے مصلح کے ہوتے ہیں اور جب یہی لفظ بندے کے لئے آتا ہے تو اس کے معنے سرکش اور قانون شکن کے ہوتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کی نسبت فرماتا ہے اَللّٰهُ يَجۡتَبِيۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ (آل عمران:۱۸۰)۔تو جب اللہ تعالیٰ ان کو چن لیتا ہے تو پھر ان میں گناہ کہاں سے آسکتا ہے؟ جب وہ دنیا سے الگ کر کے خدا تعالیٰ کے قرب میں بٹھا دیئے گئے تو پھر ان کے پاس شیطان کہاں سے آئے گا؟ شیطان تو خدا تعالیٰ کے نام سے بھی بھاگتا ہے۔

شیطان کا تسلّط اللہ کے بندوں پر نہیں ہوتا اسی طرح دوسری جگہ فرمایا ہے اِنَّ عِبَادِيۡ لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ (الحجر:۴۳)۔میرے بندوں پر یقیناً تجھے کوئی تسلط حاصل نہیں۔پس جب قانون یہ ہے کہ جو ادنیٰ عبودیت

کے مقام پر ہو اللہ تعالیٰ اسے بھی شیطان کے تسلط سے محفوظ رکھتا ہے تو انبیاء اللہ جو اللہ تعالیٰ کی خاص حفاظت میں ہوتے ہیں ان کے پاس شیطان کا گذر کیسے ہو سکتا ہے؟

آیت یوم الحساب والی دعا کا مطلب یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ۔ یہ حساب اس دنیا میں بھی ہوتا ہے اور اگلے جہان میں بھی ہوگا۔ دعا کا مطلب یہ ہے کہ جب اعمال کے نتیجے نکلنے لگیں اس وقت میری بشریت کو الوہیت کی چادر سے ڈھانپ لینا۔ میری بشری کمزوری پر پردہ ڈالنا۔ میری کوششوں کے نتائج میری طاقتوں کے مطابق نہ نکلیں بلکہ تیری شان کے مطابق نکلیں۔ اگر قیامت کا دن مراد لیا جائے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس دن مجھ سے وہ سلوک کیجیئیو جو تیری شان کے مطابق ہو نہ کہ وہ جو میرے اعمال کے مطابق ہو اور میرے والدین اور مومنوں سے بھی ان کے درجہ کے مطابق غفران کا معاملہ کیجیئیو۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۵ اِنَّمَا

اور (اے مخاطب) یہ ظالم جو کچھ کر رہے ہیں اس سے تو اللہ (تعالیٰ) کو بے خبر ہرگز نہ سمجھ۔

يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ﴿۴۳﴾

وہ انہیں صرف اس دن تک ڈھیل دے رہا ہے جس دن (ان کی) آنکھیں (فیصلہ کے انتظار میں) کھلی ہوئی ہوں گی

حلّ لُغَات۔ تَشْخَصُ شَخَصَ سے مضارع ہے۔ شَخَصَ الشَّیْءُ شُخُوْصًا کے معنی ہیں اِرْتَفَعَ بلند ہوئی۔ شَخَصَ بَصَرُہٗ: فَتَحَ عَيْنَيْهِ وَجَعَلَ لَا يَطْرِفُ مَعَ دَوَرَانٍ فِي الشَّحْمَةِ۔ اور شَخَصَ بَصَرُہٗ کے معنے ہیں اپنی آنکھوں کو کھولا اور ایک جگہ ٹکٹکی لگا کر دیکھنا شروع کر دیا اور کسی اور طرف نہ دیکھ سکا۔ اَلْمَيِّتُ بَصَرُہٗ وَبِبَصَرِہٖ۔ میت نے جان کندن کے وقت نظر اوپر اٹھالی۔ شَخَصَ مِنْ بَلَدٍ اِلٰى بَلَدٍ۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کو گیا۔ اَلرَّجُلُ سَارَ فِي ارْتِفَاعٍ بلندی کی طرف چڑھا شَخَصَ السَّهْمُ۔ اِرْتَفَعَ عَنِ الْهَدَفِ۔ تیر نشانہ پر نہ لگا۔ (اقرب) پس تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ۔ کے معنے ہوں گے کہ اس دن ان کی آنکھیں اوپر اٹھیں گی۔ (۲) نظریں چڑھ جائیں گی۔ (۳) پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ وہ آنکھ جھپک نہیں سکیں گے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اور تو ہرگز اللہ تعالیٰ کو غافل مت سمجھ اس سے جو ظالم کرتے ہیں۔ یا ان کے عمل سے۔ غافل کے یہ معنی نہیں کہ واقف نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ مت سمجھو کہ ان کو جب اللہ تعالیٰ سزا

نہیں دیتا تو ان کی طرف توجہ ہی نہیں ہے۔ غافل دو طرح ہوسکتا ہے۔(۱) بے خبری سے (۲) توجہ نہ کرنے سے۔ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بے سزا نہیں چھوڑے گا۔

اِنَّمَا یُؤَخِّرُھُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْہِ الْاَبْصَارُ صرف ان کو ڈھیل دے رہا ہے اس دن کے لئے کہ جس دن لوگوں کی نظریں چڑھ جائیں گی۔ یا پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی اور وہ آنکھ نہیں جھپک سکیں گے۔ جب انسان پر حیرت کا وقت آتا ہے تو وہ آنکھ جھپک نہیں سکتا۔ مطلب یہ کہ خدا تعالیٰ ان کو درمیانی ڈھیل دے رہا ہے۔ اس دن تک جس دن ان پر آخری عذاب آئے گا۔ اس وقت تک ان کو ڈھیل دے گا۔ (اس آیت کی تفسیر اگلی آیت کے ساتھ دیکھیں۔)

مُھْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِھِمْ لَا یَرْتَدُّ اِلَیْھِمْ

(وہ) اپنے سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے خوف زدہ ہو کر دوڑتے آرہے ہوں گے (اور) ان کی نظریں (لوٹ کر)

طَرْفُھُمْ ۚ وَ اَفْـِٕدَتُھُمْ ھَوَآءٌ ﴿۴۴﴾ ط

واپس نہیں آئیں گی اور ان کے دل (امیدوں سے) خالی ہوں گے۔

حل لغات۔ مُھْطِعِیْنَ اَھْطَعَ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔ جس کا مجرد ھَطَعَ ہے۔ کہتے ہیں ھَطَعَ الرَّجُلُ اَسْرَعَ مُقْبِلًا خَائِفًا۔ خوف زدہ ہو کر تیزی سے دوڑتا ہوا آیا۔ اَقْبَلَ بِبَصَرِہٖ عَلَی الشَّیْءِ فَلَمْ یَرْفَعْہُ عَنْہُ۔ کسی چیز پر ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہا۔ اور وہاں سے نظر کو نہ ہٹایا۔ اور اَھْطَعَ الْبَعِیْرُ کے معنی ہیں مَدَّ عُنُقَہٗ وَصَوَّبَ رَاْسَہٗ۔ اونٹ نے گردن کو لمبا کیا۔ اور سر کو اٹھایا۔ اَسْرَعَ وَاَقْبَلَ مُسْرِعًا خَائِفًا لَا یَکُوْنُ اِلَّا مَعَ خَوْفٍ۔ اور اَھْطَعَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں خوف زدہ ہو کر جلدی سے آیا۔ (خوف کا ہونا ضروری ہے) وَقِیْلَ نَظَرَ بِخُضُوْعٍ۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنے عاجزی کی نظر سے دیکھنے کے ہیں۔ (اقرب)

پس مُھْطِعٌ کے معنے ہوں گے (۱) خوف زدہ ہو کر دوڑنے والا۔ (۲) عاجزی سے دیکھنے والا۔ (۳) سر اوپر اٹھانے والا۔ مُھْطِعِیْنَ اس کی جمع ہے۔

مُقْنِعٌ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِھِمْ: اَقْنَعَ رَاْسَہٗ نَصَبَہٗ سر کو سیدھا اٹھایا۔ وَقِیْلَ لَا یَلْتَفِتُ یَمِیْنًا وَشِمَالًا وَ جَعَلَ طَرْفَہٗ مُوَازِیًا لِمَا بَیْنَ یَدَیْہِ اور بعض نے اَقْنَعَ کے یہ معنے کئے ہیں کہ اپنے سر کو اٹھا کر بالکل سیدھا رکھے اور دائیں بائیں نہ موڑے۔ اَقْنَعَ الصَّبِیَّ کے معنے ہیں وَضَعَ اِحْدَی یَدَیْہِ عَلٰی فَأْسِ قَفَاہُ وَجَعَلَ الْاُخْرٰی

تَحْتَ ذَقَنِهٖ وَاَمَالَهٗ اِلَیْهِ فَقَبَّلَهٗ۔ بچے کے سر کے پچھلی طرف ہاتھ رکھ کر اور دوسرا ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اسے اپنی طرف پھیرا اور اسے بوسہ دیا۔ اَقْنَعَ حَلْقَهٗ وَفَمَهٗ۔ رَفَعَهٗ لِاسْتِیْفَاءِ مَا یَشْرَبُهٗ مِنْ مَّاءٍ اَوْلَبَنٍ اَوْغَیْرِهِمَا۔ اس نے اپنے منہ کو اونچا کیا تا کہ پانی وغیرہ پوری طرح پی سکے۔ بِیَدَیْهِ فِی الصَّلٰوۃِ رَفَعَهُمَا فِی الْقُنُوْتِ۔ اپنے ہاتھوں کو نماز میں قنوت کے لئے اٹھایا۔ رَأْسَهٗ وَعُنُقَهٗ رَفَعَهٗ وَشَخَصَ بِبَصَرِهٖ نَحْوَ الشَّیْءِ لَا یَصْرِفُهٗ عَنْهُ۔ اپنے سر کو اٹھایا اور نظر ایسے طور پر کسی چیز پر جمائی کہ اس سے ہٹ نہ سکے۔ (اقرب) مُهْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِهِمْ میں ان کی حیرانگی اور خوف زدہ ہونے کو ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ ان کی حالت ایسی ہوگی کہ وہ اپنے سر بلند کر کے آنحضرتؐ کے لشکر کو دیکھ رہے ہوں گے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ اور وہ سخت خوفزدہ ہو کر بھاگیں گے۔

اَلْهَوَآءُ اَلشَّیْءُ الْخَالِیْ۔ خالی چیز۔ اَلْجَبَانُ لِخُلُوِّ قَلْبِهٖ عَنِ الْجُرْأَةِ۔ بزدل پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا دل جرأت سے خالی ہوتا ہے۔ (اقرب) وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ۔ ان کے دل امیدوں سے خالی ہوں گے۔ ان کے دل بیٹھے جا رہے ہوں گے۔ بزدلی ان پر چھائی ہوگی اور مقابلہ نہ کرسکیں گے۔

تفسیر۔ کفار کو ڈھیل حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے مل رہی تھی یہ بتا کر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسے نبی کے لئے دعا کی تھی جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو قائم کرے۔ مکہ اس کا مرکز ہو اور شرک سے اس کی تعلیم پاک ہو اب اللہ تعالیٰ کفار مکہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور فرماتا ہے کہ بے شک ان کو ڈھیل ملی ہے لیکن اس کی یہ وجہ نہیں کہ ہم ان کے اعمال سے ناواقف ہیں بلکہ اس کی وجہ اور ہے۔ اس وجہ کو لفظاً اس جگہ نہیں بتایا کیونکہ اوپر کے رکوع سے وہ وجہ ظاہر ہو چکی ہے اور وہ بھی ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے کہ اے میرے رب! اگر میری اولاد مشرک ہو تو میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں! آپ بڑے بخشنے والے مہربان وجود ہیں۔ اگر ان سے ترقی کا برتاؤ کریں تو آپ کی شان کے مطابق ہے۔ یہ دعا علاوہ ان کی ہدایت کی خواہش کے اس ڈھیل کا موجب ہو رہی تھی مگر جو لوگ ازلی شقی تھے وہ اس سے الٹے مغرور ہو رہے تھے۔ لیکن کب تک انہیں ڈھیل دی جاسکتی تھی۔ ایک دن اصل دعا اپنا رنگ لائے گی اور مہلت سزا میں بدل جائے گی۔

اس جملہ کو عَمَّا یَفْعَلُ الظّٰلِمُوْنَ سے ختم کیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ جو تیرے مخالف کرتے ہیں یا مکہ والے کرتے ہیں اس سے اول یہ بتانا مطلوب ہے کہ خواہ کتنی ہی ڈھیل ملے ظالم آخر اپنے کیفر کردار کو پہنچ کر ہی رہے گا۔ دوم محمد رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ کے دل کو تسلی دینا مقصود ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ ظالم ہیں اور مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ ہم عدم توجہ کی وجہ سے ان کی طرف سے غافل نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے مظلوم ہونے کا خیال ہے لیکن ابراہیمؑ

کی وہ دعا کہ اے اللہ! میں تجھ سے بھی امید کرتا ہوں کہ میری اولاد غلطی کرے تو تو ان سے غفور رحیم کا سلوک کرے گا۔ ہمیں عذاب میں جلدی کرنے سے روک رہی ہے۔

آنحضرتؐ کے منکرین پر عذاب کی خبر اس اظہار کے بعد کہ کیوں عذاب میں دیر ہوری ہے؟ عذاب کی خبر بھی دے دی اور اس کے متعلق بعض حالات بھی اشارۃً بتا دیئے یعنی وہ یکدم آئے گا۔ یہ لوگ سخت گھبرا جائیں گے۔ حیرت سے سر اٹھا کر عذاب کو دیکھیں گے۔ نظر کو ادھر ادھر نہ ہٹا سکیں گے۔ دل گر رہے ہوں گے۔

مکہ میں لشکر اسلام کا داخل ہونا جب مکہ فتح ہوا تو بعینہٖ یہی حال کفار کا ہوا۔ جب صلح حدیبیہ کے بعد مکہ والوں نے عہد شکنی کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر چڑھائی کی تو آپ نے ایسا انتظام فرمایا کہ کسی کو علم نہ ہوا کہ اسلامی لشکر مکہ پر حملہ آور ہوا ہے۔ ابوسفیان دو دن پہلے ہی مدینہ سے روانہ ہوا تھا۔ جہاں سے وہ ایک ناکام سفیر کی حالت میں لوٹا تھا۔ ابھی وہ مکہ میں داخل نہ ہوا تھا کہ اسلامی لشکر جلد جلد منزلیں طے کرتا ہوا مکہ کے قریب پہنچ گیا۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے دور سے جب لشکر دیکھا تو حیران رہ گئے کہ یہ لشکر کس کا ہے؟ کبھی کہتے فلاں قبیلہ ہے اور کبھی کہتے فلاں ہے۔ انہیں یہ خیال ہی نہ آتا تھا کہ یہ لشکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ جب طلائع (یعنی لشکر کے آگے چلنے والا حصہ) آئے تو ان کو پتہ لگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگئے ہیں۔ تب وہ حیران رہ گئے۔

ابوسفیان کا آنحضرتؐ کی صداقت کو دیکھ کر ایمان لانا وہ حیران کھڑے تھے کہ حضرت عباسؓ نظر آئے۔ وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے آگے آئے (وہ بچپن سے اس کے دوست تھے) دیکھتے ہی کہا ابوسفیان! میرے پیچھے سوار ہو جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔ اس نے لیت ولعل کرنی چاہی تو انہوں نے ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا اور اپنے پیچھے گھوڑے پر چڑھا لیا اور ان کو لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمے کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ کے خیمہ کے پاس پہنچ کر زور سے ابوسفیان کو دھکا دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ حضور یہ مسلمان ہونا چاہتا ہے۔ ابوسفیان گھبرا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیران ہوئے۔ حضرت عباسؓ نے ابوسفیان کی گھبراہٹ کو دیکھ کر کہا ابھی اپنے دین کا جھوٹا ہونا ظاہر نہیں ہوا؟ ہلاکت میں مت پڑ اور مسلمان ہو جا۔ اور ابوسفیان کا ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھایا۔ آپ نے اس خیال سے کہ شاید یہ حضرت عباسؓ کے کہنے پر بیعت کرنا چاہتا ہے کچھ تردد کیا۔ لیکن جب اسے مصر دیکھا اس کی بیعت لے لی۔ ابوسفیان نے کہا یا رسول اللہ! میں اب مسلمان ہوا ہوں۔ مکہ والوں کا سردار ہوں۔ مجھے کچھ اعزاز دیا جائے۔ آپ نے فرمایا جو تمہارے گھر میں داخل ہوگا اسے امان دی جائے

گی۔اس نے کہا میرا گھر بہت چھوٹا ہے۔فرمایا جو کعبہ میں داخل ہوا سے امان دی جائے گی۔اس نے کہا وہ بھی چھوٹا ہے۔آپ نے فرمایا جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے گا اسے امان دی جائے گی۔ابوسفیان نے کہا بس! اب ٹھیک ہے اور دوڑ کر مکہ والوں کو آپ کے حملہ آور ہونے اور مذکورہ بالا امان دینے کا اعلان کیا (السیرۃ الحلبیۃ)۔مکہ والے جو اپنے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں زیادہ طاقتور سمجھتے تھے ان کے دلوں کی اس وقت کی حالت کا اندازہ کرنا آسان کام نہیں۔اپنی حکومت کو پائیدار اور غیر متزلزل سمجھنے والوں نے جب اپنے سردار کے منہ سے جو ایک نیا معاہدہ کرنے مدینہ گیا تھا یہ اعلان سنا ہوگا کہ مکہ والو! اپنے اپنے گھروں میں گھس کر دروازے بند کرلو کہ محمد (رسول اللہ) جسے تم نے دس سال پہلے تنہا مکہ سے نکالا تھا اس کا عظیم الشان لشکر چند فرسنگ پر سرعت سے مکہ کی طرف کو رخ کئے چلا آرہا ہے۔اس لئے فوراً اپنے دروازوں کو بند کرکے بیٹھ جاؤ کہ اب اس سے تمہارے لئے کوئی امان کی صورت نہیں۔تو ان کا کیا حال ہوا ہوگا؟ یقیناً ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہوں گی۔ان کے سر بلند ہو ہو کر اس راستہ کو دیکھ رہے ہوں گے جس پر سے اسلامی لشکر بڑھا چلا آرہا تھا اور دنیا کا اور کوئی مسئلہ ان کی توجہ کو اپنی طرف نہ کھینچ سکتا ہوگا۔اور ان کے دل اندر ہی اندر بیٹھے جاتے ہوں گے۔جب وہ دروازے بند کرکے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے ہوں گے اور جھروکوں اور کواڑوں کے سوراخوں سے اسلامی لشکر کو مکہ کی گلیوں میں کوچ کرتے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے ان کی اس وقت کیا حالت ہوگی؟ اس کا نقشہ ان قرآنی الفاظ سے زیادہ اور کون سے الفاظ کھینچ سکتے ہیں۔

مکہ میں آنحضرتؐ کا لشکر داخل ہونے کے وقت اہل مکہ کی حالت

مکہ والوں کے لئے کیسی تلخی تھی؟ اس خیال میں کہ وہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جسے انہوں نے تاریکی میں جب کہ سب مکہ کے دروازے بند تھے مکہ سے نکلنے پر مجبور کیا تھا اب دن کے وقت مکہ میں داخل ہو رہا تھا۔اور اب بھی مکہ کے دروازے بند تھے۔وہ دروازے جو ہجرت کے دن اس لئے بند تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان میں پناہ نہیں مل سکتی تھی فتح مکہ کے دن اس لئے بند تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ذریعہ سے مکہ والوں کو پناہ دی تھی۔اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

کفار کو آنحضرتؐ کے لشکر کی آمد کا پتہ نہ ملنا خدائی تصرف تھا

یہ صرف خدائی تصرف تھا کہ آپ کے آنے کا مکہ والوں کو پتہ نہ لگا حالانکہ آپ اس راستہ سے آئے تھے جو آمد و رفت کا ایک عام راستہ تھا جہاں سے مکہ والوں کو فوراً خبر پہنچ سکتی تھی لیکن ان کو خبر نہ ہوئی اور اس طرح یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔

وَ اَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ

اور تو لوگوں کو اس دن سے ڈرا جب ان پر وہ (موعود) عذاب آئے گا اور جن لوگوں نے ظلم (کا شیوہ اختیار) کیا ہوگا

ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ

(اس وقت) کہیں گے (کہ اے) ہمارے رب ہمارے معاملہ کو کسی (اور) قریب میعاد تک (کے لئے) پیچھے ڈال

نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ

دے۔ ہم تیری (طرف سے آئی ہوئی) دعوت کو قبول کریں گے اور (تیرے) رسولوں کی پیروی کریں گے (جس پر

مِّنْ زَوَالٍ ۙ﴿۴۵﴾

انہیں جواب ملے گا کہ کیا (ابھی اتمام حجت کی کوئی کسر باقی ہے) اور کیا تم نے پہلے قسم (پر قسم) نہیں کھائی تھی کہ تم پر کسی قسم کا زوال نہیں (آئے گا)

تفسیر۔ یہ اُخروی عذاب کا ذکر ہے۔ جہاں بھی قرآن کریم میں دنیوی عذاب کا ذکر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ آخرت کے عذاب کا بھی ضرور بیان ہوتا ہے کیونکہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب کے لئے دلیل ہوتا ہے۔

وَّ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ

حالانکہ تم نے ان لوگوں کے گھروں کو اپنا گھر بنایا ہوا ہے جنہوں نے (تم سے پہلے) اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور تم پر یہ

لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۶﴾

بات خوب روشن ہو چکی تھی۔ کہ ان کے ساتھ ہم نے کیسا معاملہ کیا تھا اور ہم تمام باتیں تمہارے لئے کھول کر بیان کر چکے ہیں۔

حل لغات۔ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ تمہارے لئے ضروری امور کھول کر بیان کر چکے ہیں۔ دیکھو ابراہیم آیت نمبر ۲۵۔

تفسیر ۔ اکثر تو میں ان علاقوں میں بستی ہیں جہاں پہلے دوسری اقوام بس چکی ہیں اور باوجود طاقت وقوت کے الٰہی آواز کا انکار کر کے عذاب پا چکی ہیں مگر افسوس کہ پھر بھی لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ کے عذاب کو خود چکھنا چاہتے ہیں۔

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ

اور یہ (لوگ) اپنی (ہر ایک) تدبیر عمل میں لا چکے ہیں اور ان کی (ہر) تدبیر اللہ (تعالیٰ) کے ہاں (لکھی ہوئی اور

مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۷﴾

محفوظ) ہے (بھولی نہیں) اور گو ان کی تدبیر ایسی (ہی کیوں نہ) ہو کہ اس کے نتیجہ میں پہاڑ (بھی) اپنی جگہ سے ٹل جائیں (لیکن یہ تیرا کوئی نقصان نہیں کر سکتے)

حلّ لُغات ۔ اَلْجَبَلُ کے لئے دیکھو رعد آیت نمبر ۳۲۔

تفسیر ۔ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۔ اور انہوں نے اپنی تدبیریں کی تھیں جو کچھ ان کے بس میں تھا انہوں نے کیا۔

عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ کے دو معنے وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کا مکر ہونے کے دو معنے ہیں۔

اول۔ ہر تدبیر کا نتیجہ خدا تعالیٰ ہی نکالتا ہے۔ پس ان کے مکر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ وہ ان کی تدبیروں کو ضائع کر دے گا۔

دوم۔ ان کا مکر خدا تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے یعنی یہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان پہنچانے کے لحاظ سے تو ضائع ہو گیا ہے لیکن خود ان کو نقصان پہنچانے کے لحاظ سے ضائع نہیں ہوا۔ خدا تعالیٰ کے پاس موجود ہے وہ اس کی سزا ضرور دے گا۔

مکرھم میں مکر کی اضافت مفعول کی طرف بھی ہو سکتی ہے مَكْرُهُمْ میں مکر کی اضافت مفعول کی طرف بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے مکر کی سزا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو دینی ہے اس کے پاس محفوظ ہے۔ اس صورت میں تقریر عبارت یوں ہو گی مَكْرُهُ الَّذِيْ يَمْكُرُبِهِمْ۔

وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ کے دو معنی وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ۔ ان

کا مکر ایسا تھا کہ اس سے پہاڑ اڑ جائیں۔ جبل کے معنے پہلے آچکے ہیں کہ پہاڑ کو اور بڑے آدمی کو کہتے ہیں اور محاورہ میں مشکلات کے لئے بھی آتا ہے۔ یعنی گو ان کی تدابیر ایسی تھیں کہ بظاہر ان مشکلات کو دور کر سکتی تھیں جو ان کو آگے پیش آنے والی تھیں مگر چونکہ خدا کی تدبیر کا مقابلہ تھا وہ ناکام رہے۔ یا یہ کہ پہلے جو قرآن کے متعلق بتایا تھا کہ اس سے پہاڑ یعنی بادشاہتیں اڑا دی جائیں گی ان کی تدبیروں کے متعلق فرماتا ہے کہ خواہ کتنی ہی مضبوط ہوں پہاڑ اڑانے والی تو نہیں۔ پھر قرآن کریم پر کس طرح غالب آسکتی ہیں کہ وہ تو پہاڑوں کو بھی اڑا دینے والا ہے؟ پہلی صورت میں ان بمعنی ''گو'' اور دوسری میں ان بمعنی ''نہیں'' سمجھا جائے گا۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ

پس (اے مخاطب) تو اللہ (تعالیٰ) کو اپنے رسولوں سے اپنے وعدہ کے خلاف (معاملہ) کرنے والا ہرگز نہ سمجھ۔

ذُو انْتِقَامٍ ؕ ﴿۴۸﴾

اللہ (تعالیٰ) یقیناً غالب (اور برے کاموں کی حقیقی) سزا دینے والا ہے

حلّ لُغات۔ ذُوانْتِقَام عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ۔ اِنْتَقَمَ نَقَمَ میں سے ہے اور نَقَمَ مِنْهُ يَنْقِمُ ونَقِمَ ويَنْقَمُ نَقْمًا کے معنے ہیں عَاقَبَهٗ اس کو سزا دی۔ نَقَمَ عَلَيْهِ اَمْرَهٗ وَمِنْهُ كَذَا اَنْكَرَهٗ عَلَيْهِ۔ اس کی بات کو ناپسند کیا۔ عَابَهٗ۔ اس کی وجہ سے اس پر عیب لگایا۔ كَرِهَهٗ اَشَدَّ الْكَرَاهَةِ لِسُوْءِ فِعْلِهٖ۔ اس شخص کو اس کے برے کام کے باعث نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اِنْتَقَمَ مِنْهُ۔ عَاقَبَهٗ۔ اس کو سزا دی۔ (اقرب) ذُوانْتِقَامٍ کے معنے ہوئے کہ برے کاموں کی سزا دینے والا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا

(اور وہ دن ضرور آنے والا ہے) جس دن اس زمین کو زمین کے سوا (کچھ اور) بنا دیا جائے گا۔ اور آسمانوں کو بھی

لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۹﴾

(کسی اور صورت میں بدل دیا جائے گا) اور یہ (لوگ) اللہ (تعالیٰ) کے جو واحد (اور ہر ایک چیز پر) کامل غلبہ رکھنے والا ہے سامنے ہوں گے۔

بَرَزَ يَبْرُزُ بُرُوْزًا اَخْرَجَ نکل کر سامنے آیا۔ (اقرب)

تفسیر ۔اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلے جہان کے نعماء اس دنیا کی نعمتوں سے بالکل الگ ہیں کیونکہ یہاں فرمایا ہے کہ زمین و آسمان بدل کر دوسرے زمین و آسمان قائم کئے جائیں گے۔ اگر اگلے جہان بھی اسی قسم کے میوے وغیرہ ہونے تھے تو زمین و آسمان کو بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟ پس اس دنیا کی نعمتوں کو اس دنیا کی نعمتوں پر قیاس کرنا بالکل خلاف عقل ہے۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۵۰﴾ ج

اور اس دن تو ان مجرموں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھے گا۔

حلّ لُغات۔ مُقَرَّنِيْنَ قُرِّنَتِ الْاَسَارٰی فِي الْحِبَالِ اَیْ جُمِعَتْ۔ قیدیوں کو رسیوں میں ملا کر اکٹھا باندھا گیا۔ وَشُدِّدَ لِکَثْرَۃٍ وَمِنْهُ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ۔ اور تشدید تکثیر اور مبالغہ کے لئے لائی جاتی ہے۔ جیسے قرآن مجید میں مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ میں مُقَرَّنِيْنَ تشدید کے ساتھ آیا ہے۔ (اقرب)

اَلْاَصْفَادُ کا مفرد اَلصَّفَدُ ہے اور اَلصَّفَدُ کے معنے ہیں اَلْعَطَاءُ بخشش۔ اَلْوَثَاقُ۔ باندھنے کی چیز۔ زنجیر رسہ وغیرہ۔

تفسیر ۔ **رسوں میں باندھنے کا مطلب** اس جگہ سوال ہوسکتا ہے کہ قیامت کے دن رسوں میں باندھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگلے جہان کی زندگی اس جہان کی ظل ہوگی۔ چونکہ ان لوگوں نے یہاں پر بداعمال ایک دوسرے کی شہ اور مدد پر کئے تھے اس لئے اس کا نظارہ اس رنگ میں دکھایا جائے گا کہ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ رسوں میں باندھا جائے گا۔ مطلب یہ کہ برا اتحاد طاقت اور عزت کا موجب نہیں ہوتا۔ بدی

پر جو اتحاد ہو وہ کمزوری اور ذلت کا موجب ہوتا ہے لیکن نبیوں کے مخالف اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اور تقویٰ کے خلاف جتھا بندی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس جتھا بندی کے ذریعہ سے ہم طاقت اور عزت حاصل کر رہے ہیں۔ حالانکہ بدی پر جتھا بندی ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص قیدی کے ساتھ ہتھکڑی میں اپنے ہاتھ بھی بندھوا دے۔ بے شک قیدی پہلے ایک تھا پھر دو ہو جائیں گے لیکن اس سے طاقت زیادہ نہ ہوگی بلکہ کمزوری پیدا ہوگی کیونکہ دو آدمیوں کا ایک ہتھکڑی میں بندھنا زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انبیاء کے دشمنوں کو زنجیروں میں اکٹھا باندھ کر آشکار کرے گا اور انہیں بتائے گا کہ تمہارے جتھے ایسے ہی تھے جیسے قیدیوں کو اکٹھا ایک زنجیر میں باندھ دیا جائے۔

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّ تَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۱﴾

ان کے کرتے (گویا) تارکول کے ہوں گے اور (دوزخ کی) آگ ان کے مونہوں کو ڈھانپ رہی ہوگی

حلّ لُغات۔ سَرَابِيْلُهُمْ سَرَابِيْلُ سِرْبَالٌ کی جمع ہے۔ اَلسِّرْبَالُ اَلْقَمِيْصُ سِرْبَالٌ کے معنی ہیں قمیص۔ وَقِيْلَ اَلدِّرْعُ اور زرہ کو بھی سِرْبَال کہتے ہیں۔ وَقِيْلَ كُلُّ مَا لُبِسَ اور بعض نے اسے عام رکھا ہے کہ ہر وہ چیز جو پہنی جائے سِرْبَال ہے۔ (اقرب)

اَلْقَطِرَانُ سَيَّالٌ دُهْنِيٌّ يُؤْخَذُ مِنْ شَجَرِ الْأَبْهَلِ وَالْأَرْزِ وَنَحْوِهِمَا۔ (اقرب) قطران ایک قسم کا سیال تیل کی قسم کا مادہ ہوتا ہے جو سَرو یا دِیار وغیرہ درختوں سے نکالا جاتا ہے جس میں جل اٹھنے کا مادہ ہوتا ہے۔

تفسیر۔ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ ان کا لباس سوا آگ کے اور کچھ نہ ہوگا۔ یہ فقرہ ایسا ہی ہے جیسے کہہ دیں کہ مٹی کا تیل چھڑک کر انہیں جلا دیا جائے گا۔ لباس چونکہ حفاظت کے لئے ہوتا ہے اس کا یہ مفہوم بھی ہے کہ ان کا کوئی محافظ نہ ہوگا۔ بلکہ جن کو وہ محافظ سمجھتے تھے وہ پھر ان کے دشمن اور مخالف ثابت ہوں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہوں میں لکھا ہے کہ مشرک جن کو خدا بناتے ہیں قیامت کے دن وہ ان سے بیزاری ظاہر کریں گے۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ

(یہ اس لئے ہوگا) تا اللہ (تعالیٰ) ہر شخص کو جو کچھ اس نے (اپنے لئے) کیا ہوگا اس کا بدلہ دے۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً

الْحِسَابِ ﴿۵۲﴾

(بہت) جلد حساب لے لینے والا ہے۔

تفسیر ۔ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ یعنی جو اس نے اعمال کئے تھے ان کے مطابق اس کو ان کا بدلہ مل جائے اور اللہ تعالیٰ یقیناً حساب لینے میں جلدی کرنے والا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جلدی عذاب دیتا ہے کیونکہ خود اس نے فرمایا ہے کہ میں ڈھیل دیتا ہوں بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ حِسَابُهٗ سَرِيْعٌ جب حساب لینے لگتا ہے تو جلدی لے لیتا ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ

یہ (ذکر) لوگوں کے (نصیحت حاصل کرنے کے) لئے کافی ہے اور اس بات کے لئے (بھی) کہ انہیں (آنے والے

وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۳﴾ ع

عذاب سے پورے طور پر) ہوشیار کیا جائے اور اس لئے (بھی) کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ صرف ایک ہی معبود ہے اور اس (بات کے) لئے (بھی) کہ عقل والے (لوگ) نصیحت حاصل کریں

حلّ لُغات۔ اَلْبَلَاغُ الْكِفَايَةُ۔ جو چیز کافی ہو۔ (اقرب)

تفسیر ۔ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ۔ یہ لوگوں کے لئے پیام ہے یعنی اس پیام کے ذریعے لوگوں پر حجت پوری کی جاتی ہے۔

وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ قرآن کریم ایک انذار ہے اس کے ذریعہ لوگوں کو ہوشیار کیا جاتا ہے جو غلطی میں پڑے ہوئے ہیں ان کو وہ بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ ایک ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور جو سمجھ چکے ہیں انہیں وہ ہمیشہ استقلال سے صداقت پر قائم رکھنے کے لئے ہوشیار کرتا رہتا ہے تا کہ وہ روز بروز ہدایت میں بڑھتے رہیں۔ قرآن کریم بھی ایسی

ایک کتاب ہے کہ جس کی آیات ایک ہی وقت میں دونوں کام کرتی ہیں۔ گمراہوں کو ہوشیار کرتی رہتی ہیں اور سمجھ والوں کو ترقی کی طرف توجہ دلاتی رہتی ہیں۔

اس آیت سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن کریم ایک تخریبی تعلیم نہیں کہ اپنے سے پہلے مذاہب کو یا ان کے پیرووٗں کو تباہ کرنے پر بس کرے۔ بلکہ وہ تخریبی ہونے کے علاوہ تعمیری بھی ہے۔ اگر وہ دنیا کو ان تعلیموں سے محروم کرتا ہے جن پر وہ پہلے چل رہی تھی تو وہ ان کی جگہ ایک ایسی تعلیم بھی پیش کرتا ہے جسے عقل تسلیم کرتی ہے اور فہم قبول کرتا ہے۔ اسی طرح اگر اس کے ذریعہ سے پہلا نظام حکومت تباہ کیا جائے گا تو ساتھ ہی ایک ایسا نظام قائم بھی کیا جائے گا جو پہلے سے بہتر ہوگا۔

سُوْرَۃُ الْحِجْرِ مَكِّيَّۃٌ

سورۃ الحجر یہ سورۃ مکی ہے

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ مِائَةُ اٰيَةٍ وَّسِتَّةُ رُكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی ایک سو آیات ہیں۔ اور چھ رکوع ہیں

یہ سورہ مکی ہے بحرِ محیط میں ہے ھٰذِهِ السُّوْرَةُ مَكِّيَّةٌ بِلَا خِلَافٍ۔ خدا کی قدرت ہے کہ اس سورۃ میں بہت سے مسائل ایسے ہیں۔ جن کی شان ہی اس سورۃ کے مکی ہونے سے بڑھتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایسا تصرّف کیا کہ اسے مَكِّيَّةٌ بِلَا خِلَافٍ قرار دلوادیا۔

اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق اس سورۃ کا تعلق پہلی سورۃ سے یہ ہے۔ کہ اس میں بتایا گیا تھا کہ پہلے انبیاء بھی بغیر ظاہری سامانوں کے خدا تعالیٰ کے کلام کی مدد سے فتح پاتے رہے ہیں اب بھی اس طرح ہوگا۔

اب اس سورۃ میں بھی کلام الٰہی کی طاقت پر بحث کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ کلام الٰہی ایسی زبردست طاقت ہے۔ جس کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا اور جھوٹا کلام بنانا آسان کام نہیں۔ خدا تعالیٰ پر افترا کرنے والا بچ نہیں سکتا۔ پس یہ کلام سچا ہے اور اپنا ثبوت اپنے ساتھ لایا ہے۔

سورۃ کے مضامین کا خلاصہ اس سورۃ کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ ایسا کلام ہے کہ اپنا مشابہ آپ ہے۔ یہاں تک کہ ایسے بہت سے مواقع پیش آتے ہیں اور آئیں گے۔ کہ اس کی خوبیوں کو دیکھ کر دشمن بھی دل میں حسرت کرتے ہیں۔ اور کریں گے کہ ایسا کلام ان کے پاس کیوں نہ ہوا۔ مگر اپنی خودغرضیوں کی وجہ سے اس کی طرف قدم نہیں اٹھا سکتے۔ اور سمجھتے نہیں کہ اس قسم کی سستی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان صداقت سے محروم رہ جاتا ہے اور عذاب میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ آخر جب ہم نے ایک کلام اتارا ہے تو یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ مٹ جائے۔ وہ قائم رہے گا اور رکھا جائے گا۔ پس جو اسے قبول کرنے میں سستی کریں گے وہ اپنا نقصان خود کریں گے۔

پہلے نبیوں کے کلام سے بھی تمسخر ہوا۔ مگر لوگ یہ نہیں خیال کرتے کہ خدا تعالیٰ پر افترا کرنا معمولی بات نہیں۔ خدا خود اس امر کی حفاظت کرتا ہے کہ اس پر افترا نہ کیا جائے۔ اور سچے کلام کو خاص امتیاز عطا فرماتا ہے۔ اس کی قبولیت کے سامان پیدا کردیتا ہے اور جو اسے قبول کرتے ہیں۔ انہیں ادنیٰ حالت سے اٹھا کر کمال تک پہنچا دیتا ہے۔

پس جس طرح پہلے انبیاء کے کلام ہی خزانے تھے جن کے ذریعہ سے دنیا فتح ہوئی۔ اسی طرح اب بھی

ہوگا اگر مخالف پرواہ نہیں کرتے نہ کریں۔ وہ اس کی سزا پائیں گے۔ تُو اس خزانہ کو مومنوں میں تقسیم کر اور جو اسے نہیں قبول کرتے اُنہیں سمجھا تارہ۔ اور خدا سے دعائیں کر۔ کہ اسی ذریعہ سے تبلیغ کا رستہ صاف ہوگا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر (شروع کرتا ہوں) جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے

الٓرٰ ۟ قف تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ وَ قُرۡاٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲﴾

الٓرٰ۔ یہ (ایک) کامل کتاب اور (اپنے مطالب کو خود ہی) واضح کر دینے والے قرآن کی آیات ہیں

حلّ لُغات۔ تِلْكَ، آيَاتُ، الْكِتَابِ کی تشریح کے لئے دیکھیں سورۃ یونس آیت نمبر ۲ نیز دیکھیں الرعد آیت نمبر ۲۔

مُبِیْنٌ مُبِیْنٌ اَبَانَ سے اسم فاعل ہے اور اَبَانَ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ یعنی کبھی اس کے معنے ظاہر کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور کبھی ظاہر ہونے کے۔ چنانچہ اقرب الموارد میں ہے۔ اَبَانَ الشَّیْءُ۔ اِتَّضَحَ۔ کوئی چیز ظاہر ہوگئی۔ (لازم) وَفُلَانٌ الشَّیْءَ۔ اَوْضَحَہٗ کسی چیز کو واضح اور ظاہر کیا۔ (متعدی) سورۃ یوسف میں اَلْمُبِیْن کے معنے ظاہر کرنے والی کتاب کے تھے۔ اور اس جگہ خود ظاہر ہونے کے ہیں۔ یعنی یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کتاب اپنی آپ شاہد ہے۔ قراٰن کی تنوین تفخیم (بڑائی کے اظہار) کے لئے ہے۔

تفسیر۔ **کیا اَلْکِتٰبِ اور قرآن میں کوئی فرق ہے؟** اس جگہ لوگوں نے بحث کی ہے کہ کیا اَلْکِتٰب اور قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ میں کوئی فرق ہے؟ کیونکہ یہاں پر درمیان میں واوٴ عاطفہ لائی گئی ہے۔ اور عطف بالعموم مغائر اشیاء میں ہوتا ہے۔ دراصل انہیں یہ غلطی اس بات سے پیدا ہوئی کہ انہوں نے اَلْکِتٰب سے کاغذوں میں لکھی ہوئی کتاب سمجھ لیا ہے۔

اَلْکِتٰبِ اور قُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ کے الفاظ کو مقابل پر رکھنے کی وجہ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اَلْکِتٰبِ اور قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ کے الفاظ کو مقابل پر رکھ کر اس بات کو پیش کیا ہے۔ کہ قرآن مجید کی حفاظت تحریر اور یاد دونوں ذریعوں سے کی جائے گی۔ یہ لکھا بھی جائے گا۔ اور بکثرت پڑھا بھی جائے گا۔ گویا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ

لَحٰفِظُوْنَ (الحجر:۱۰) والے مضمون پر زور دیا گیا ہے اور اس جگہ معنوی طور پر قرآن مجید کی دو صفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اَلْكِتٰبِ میں قرآن مجید کے تحریر میں آنے کی طرف اشارہ ہے اور قُرْآنٍ میں پڑھے جانے کی طرف كِتٰب کے لفظ میں اس کے تحریر میں آنے کی طرف اشارہ ہے اور قُرْاٰنٍ کے لفظ میں اس کے بکثرت پڑھے جانے کی خبر دی گئی ہے۔ گویا یہ دو نام نہیں۔ بلکہ دو صفات ہیں۔ جیسا کہ کبھی محمدؐ کا لفظ بطور صفت کے یعنی بہت تعریف کیا گیا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ دونوں صفات یکجائی طور پر صرف قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے سوا اور دنیا کی کسی الہامی کتاب میں یہ صفات جمع نہیں ہیں۔ انجیل اور توراۃ کثرت سے پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن ان کو یاد کرنے والا کوئی نہیں۔ ویدوں کو یاد کرنے والا چھوڑ۔ ان کے معنے جاننے والے بھی شاذ ہیں۔ اس زمانہ میں سنا ہے پچیس کروڑ ہندوؤں میں سے معارف تو الگ رہے۔ صرف چار آدمی سارے ہندوستان میں ویدوں کا ترجمہ سمجھ سکتے ہیں۔ یہی حال ژنداوستا کا ہے۔ صرف اور صرف قرآن کریم ہے جو کتابی صورت میں بھی پڑھا جاتا ہے اور حفظ بھی کیا جاتا ہے۔ اور دونوں صورتوں میں لاکھوں کروڑوں آدمی اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

لفظ کتاب اور قرآن کو آگے پیچھے لانے کی وجہ اس جگہ ایک اور لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید کے متعلق دو جگہ پر کتاب اور قرآن کا لفظ اکٹھا آتا ہے ایک جگہ قرآن کا لفظ پہلے ہے اور کتاب کا بعد میں (النمل:۲) اور ایک جگہ کتاب کا لفظ پہلے اور قرآن کا لفظ بعد میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں کتاب کا لفظ پہلے ہے اور قراٰن کا بعد میں۔ میرے نزدیک یہ فرق درجہ کے تفاوت کو مدّنظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ سورہ حجر میں کتاب کی صفت سے زیادہ قرآن کی صفت کے اظہار پر زور دیا گیا ہے۔ اس لئے کتاب کو پہلے اور قرآن کو بعد میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ جب درجہ بیان کرنا ہو تو بڑی شے کو چھوٹی کے بعد بیان کیا جاتا ہے۔ اور سورہ نمل میں چونکہ قرآن کریم کی زبانی تلاوت سے زیادہ اس کی تحریر کے اثر کو نمایاں کرنا تھا۔ اس لئے اس میں قرآن کا لفظ پہلے رکھا گیا ہے اور کتاب کا لفظ بعد میں رکھا گیا۔

کتاب اور قرآن کے لفظ کے ساتھ مختلف طور پر مبین کا لفظ لانے کی وجہ ایک اور امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں اَلْكِتَابِ کے ساتھ مُبِيْنٍ کا لفظ نہیں ہے۔ مگر قرآن کے ساتھ مُبِيْنٍ کا لفظ آیا ہے اس کے برخلاف سورہ نمل کے پہلے رکوع میں اس آیت کے مضمون کو اُلٹ کر بیان کیا ہے۔ اور کہا ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ یعنے قرآن کا لفظ پہلے رکھ دیا گیا ہے اور مبین کا لفظ کتاب کے ساتھ لگا دیا گیا ہے۔

مبین کی صفت کا الگ الگ استعمال ہونا سجع کی غرض سے نہیں ممکن ہے بعض ناواقف لوگ جو اسرارِ قرآنیہ سے واقف نہیں یہ خیال کریں کہ سجع کی خاطر ایسا کر دیا گیا ہے۔لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اگر مبین سجع کی خاطر لگایا گیا تھا۔تو قرآن کو کتاب سے پہلے کیوں کیا گیا۔سورہ حجر والی ترتیب قائم رکھی جاتی اور کتاب کو پہلے اور قرآن کو بعد میں رکھا جاتا۔پس ان الفاظ کی ترتیب کو بدل دینے سے صاف ظاہر ہے کہ مُبین کا لفظ سجع کی غرض سے کتاب کے ساتھ نہیں لگایا گیا۔ بلکہ کسی اور حکمت کے ماتحت لگایا گیا ہے مُبین کا لفظ انہی دوسورتوں میں قرآن اور کتاب کے الفاظ کے ساتھ نہیں لگایا گیا بلکہ اور سورتوں میں بھی ایسا کیا گیا ہے۔

مبین کی صفت کے کتاب کے ساتھ آنے کے بارہ مقامات قرآن کے ساتھ ایک تو اس سورۃ میں۔دوسرے سورۂ یٰس :۷۰ میں مبین کی صفت استعمال کی گئی ہے اور کتاب کے ساتھ ایک تو سورہ نمل کی مذکورہ بالا آیت میں اور دوسرے مندرجہ ذیل سورتوں میں یہ صفت بیان کی گئی ہے ۔ (المائدہ:۱۶) (ھود:۷) (الانعام:۶۰)(یونس:۶۲)(سبا:۴)(النمل:۷۶)(الشعراء:۳)(القصص:۳)(یوسف:۲)(الزخرف:۳) (الدخان:۳) گویا بارہ جگہ کتاب کی صفت مبین آئی ہے اور دوجگہ قرآن کی۔پس سجع وغیرہ کا کوئی سوال نہیں۔یہ تغیّر یقیناً کسی حکمت کے ماتحت ہے۔

سورۂ نمل میں کتاب کے ساتھ مبین کی صفات آنے کی وجہ قرآن اور کتاب کے الفاظ اس قسم کے موقع پر دو ہی جگہ جمع ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک میں تو کتاب کو پہلے رکھا گیا ہے اور قرآن کو بعد میں اور قرآن کی صفت مبین بیان ہوئی ہے اور دوسری جگہ قرآن کو پہلے بیان کیا ہے اور کتاب کو بعد میں اور کتاب کے ساتھ مبین کا لفظ بیان ہوا ہے اور اصل مواقع یہی ہیں جو غور طلب ہیں۔کہ کیوں ایک جگہ قرآن کے ساتھ اور دوسری جگہ کتاب کے ساتھ مبین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

سورۂ حجر اور نمل کے مضامین میں فرق اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ حجر اور سورہ نمل کے مضامین میں ایک فرق ہے سورۂ حجر میں ان انبیاء کا ذکر ہے۔اور ان کے حالات زندگی کو بطور تمثیل پیش کیا گیا ہے جن میں کتابت کا رواج کم تھا اور علوم کو زبانی یاد رکھا جاتا تھا۔یعنے حضرت آدمؑ حضرت ابراہیمؑ۔ان کے رشتہ دار۔حضرت لوطؑ اور اصحاب ایکہ یعنے بَن والے لوگ اور قوم صالحؑ۔

قرآن مبین کہنے سے وہ قومیں مخاطب ہیں جن میں تحریر کا رواج کم تھا حضرت آدمؑ کا زمانہ ابتدائی تھا۔ اور غالباً تحریر کا فن ابھی شروع بھی نہ ہوا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ عربی قبائل میں سے تھے۔ اور عراق ان کا مولد تھا ان میں بھی تحریر کا رواج کم تھا۔ اصحاب الایکہ بھی عرب کا قبیلہ تھے اور قوم صالحؑ بھی اور ان سب میں تحریر کا رواج کم تھا پس ان مثالوں سے ثابت ہے۔ کہ سورۂ حجر میں زیادہ تر خطاب ان اقوام سے ہے۔ جن میں تحریر کا رواج کم تھا۔ اور جنھوں نے حفظ کے ذریعہ سے قرآنی علوم سے زیادہ فائدہ اٹھانا تھا۔ پس اس سورۃ میں قرآن کے ساتھ مبین کا لفظ رکھا یہ بتانے کے لئے کہ ان اقوام میں اس کلام کی صفت قرآن لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچائے گی۔ لیکن کتاب کی صفت بھی ساتھ بیان کی تاکہ مکمل حفاظت کا اظہار ہو۔ اس کے بالمقابل سورۂ نمل میں کتاب کے ساتھ مبین کا لفظ لگایا گیا ہے۔ کیونکہ اس سورۃ میں حضرت موسیٰ علیہ لسلام اور حضرت داؤدؑ کے واقعات پر زور دیا گیا ہے جو بنی اسرائیل میں سے تھے۔ جن میں لکھنے کا رواج بہت تھا اور زبانی یاد رکھنے کا رواج کم تھا(The Illustrated Bible Dictionary under the word Writing) اور ان انبیاء کے اتباع نے محمد رسول اللہ صلعم پر نازل ہونے والے کلام کی صفت کتاب سے زیادہ فائدہ اٹھانا تھا بہ نسبت صفت قرآن کے۔ اس لئے اس کی مناسبت سے سورۂ نمل میں قرآن کے لفظ پر زور کم دیا اور کتاب پر زیادہ۔

غرض سورۂ حجر میں تو یہ بتایا ہے کہ قرآن کریم کو لکھا بھی گیا ہے مگر بعض اقوام جو حافظہ سے زیادہ کام لینے والی ہیں۔ اس کو یاد کر کے اور سن کر زیادہ فائدہ اٹھائیں گی۔ اور اس سورۃ میں وہی ہماری بڑی مخاطب ہیں اور سورۃ نمل میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کو حفظ بھی کیا جائے گا لیکن لکھا بھی جائے گا۔ اور بعض قومیں جو تحریر سے زیادہ فائدہ اٹھانے والی ہیں۔ وہ اسے کتاب سے پڑھ کر زیادہ فائدہ اٹھائیں گی اور اس سورۃ میں وہی ہماری بڑی مخاطب ہیں۔

قرآن مجید سے تمام قومیں فائدہ اٹھائیں گی حافظہ سے کام لینے والی بھی اور تحریر سے بھی خلاصہ یہ کہ قرآن کریم قرآن ہونے کے لحاظ سے بھی مبین ہے اور کتاب ہونے کے لحاظ سے بھی۔ اور چونکہ وہ سب دنیا کی طرف ہے اس سے وہ قومیں بھی فائدہ اٹھائیں گی جو حافظہ سے زیادہ کام لیتی ہیں۔ ان کے لئے وہ قرآن مبین ہوگا اور وہ قومیں بھی فائدہ اٹھائیں گی جو تحریر سے وابستہ ہیں اور ان کے لئے وہ کتاب مبین ہوگا۔

کتاب کے ساتھ مبین کی صفت کا کثرت استعمال جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔ قرآن مبین کا لفظ دو دفعہ استعمال ہوا ہے۔ اور کتاب مبین کا بارہ دفعہ۔ اس میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ قرآن کریم کا کتاب ہونے کے لحاظ سے حلقہ وسیع ہوگا اور اکثر لوگ اس کے کتاب ہونے کے لحاظ سے فائدہ اٹھائیں گے۔ یعنی

کثیر التعداد اقوام میں وہ پھیل جائے گا۔ جو کتابت سے علوم کو محفوظ کرتی ہیں میرے نزدیک قرآن کریم میں دس جگہ کتاب کے ساتھ مبین کے لفظ کا استعمال کرنا اور دو جگہ قرآن کے ساتھ مبین کے لفظ کا استعمال اس امر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے کہ کتاب سے فائدہ اٹھانے والے زیادہ ہوتے ہیں بہ نسبت حفظ سے فائدہ اٹھانے والوں کے۔ اور مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ مسلمانوں میں تعلیم کے رواج کو زیادہ کریں۔ تاکہ مسلمان قرآنی فوائد سے محروم نہ رہ جائیں۔

تحریر اور حفظ دونوں مل کر پوری حفاظت کر سکتے ہیں۔ اس سورۃ میں تعلیم اسلام کی حفاظت کا ذکر ہے اس سورۃ میں تعلیم اسلام کی حفاظت کا ذکر ہے اس لئے اس کی دونوں صفات یعنی کتاب اور قرآن بیان کی گئی ہیں۔ کسی مضمون کی حفاظت کبھی مکمل طور پر نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ تحریر اور حفظ دونوں ذریعہ سے محفوظ نہ کیا جائے۔ انسانی حافظہ بھی غلطی کر جاتا ہے اور کاتب بھی بھول چوک جاتا ہے۔ لیکن یہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی غلطی کو نکال دیتے ہیں اور ان دو سامانوں کے جمع ہونے کے بعد غلطی کا امکان باقی نہیں رہ سکتا۔

قرآن کریم کو یہ دونوں حفاظتیں حاصل ہیں۔ یعنے وہ کتاب بھی ہے۔ رسول کریم صلعم کی زندگی سے ہی اس کے الفاظ تحریر کر کے ضبط میں لائے جاتے رہے ہیں اور وہ قرآن بھی ہے۔ یعنے نزول کے وقت سے آج تک سینکڑوں ہزاروں لوگ اسے حفظ کرتے اور اس کی تلاوت کرتے چلے آئے ہیں۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ③ ربع

جن لوگوں نے (اس کا) انکار کیا ہے۔ وہ بسا اوقات آرزو کیا کرتے ہیں۔ کہ کاش وہ (بھی اس کی) فرمانبرداری اختیار کرنے والے ہوتے۔

حل لغات۔ رُبَمَا رُبَّ اور مَا کا مرکب ہے رُبَ کبھی رُبَّ یعنی ب کی تشدید سے بھی استعمال ہوتا ہے اس کے متعلق یہ اختلاف ہے کہ یہ حرف ہے یا اسم۔ بصریوں کے نزدیک اور نیز اکثر ائمہ لغت ونحو کے نزدیک یہ حرف ہے لیکن کوفی نحوی اسے اسم بتاتے ہیں۔ بصری کہتے ہیں کہ رُبَ کے بعد ما کا لفظ اس لئے لایا گیا ہے کہ یہ حرف تھا کیونکہ حرف جرّ فعل پر نہیں آ سکتا۔

رُبَ کے معنوں کے متعلق اختلاف رُبَ کے معنوں کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ اکثر لوگوں نے اسے

تقلیل کے لئے قرار دیا ہے یعنی جس واقعہ پر رُبَمَا داخل ہوتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اور شاذو نادر کے طور پر ہوتا ہے ابوعبداللہ رازی نے لکھا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ یہ تقلیل کے لئے آتا ہے۔ زمخشری کا بھی یہی خیال ہے مگر سیبویہ کی طرف ایک روایت منسوب ہے۔ کہ یہ تکثیر کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ زجاج کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ رُبَمَا نہ تقلیل کے لئے آتا ہے نہ تکثیر کے لئے۔ بلکہ سیاق وسباق کے ماتحت تکثیر یا تقلیل کے معنی دیتا ہے جب تقلیل کا موقع ہو تو تقلیل کے معنے دیتا ہے اور اگر تکثیر کا موقع ہو۔ تو تکثیر کے۔ اس کے ذاتی معنے کوئی نہیں۔ یہ صرف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مابعد کا واقعہ ضرور ہوا ہے (لسان العرب۔ والبحر المحیط والکشاف والرازی)

اس آیت میں رُبَمَا کے معنے تکثیر کے ہی لئے جاتے ہیں جن لوگوں نے ربما کو تقلیل کے لئے قرار دیا ہے انہوں نے بھی اس جگہ تاویل کر کے تکثیر ہی کے معنی لئے ہیں۔ (لسان العرب)

رُبَمَا کے متعلق ایک اور بحث اسی طرح رُبَ کے متعلق ایک اور بحث ہے۔ اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ رُبَمَا ہمیشہ ماضی کے معنوں کے بیان کرنے کے لئے آتا ہے خواہ اس کے بعد فعل مضارع ہی کیوں نہ ہو۔ ان لوگوں نے رُبَمَا یَوَدُّ کے معنے رُبَمَا وَدّ کئے ہیں۔ اور پھر کہا ہے کہ رُبَمَا یَوَدُّ فعل جو قاعدہ کے رو سے ماضی کے معنے دیتا ہے۔

رُبَمَا کا لفظ مستقبل کے معنے میں بھی آتا ہے اس جگہ مستقبل کے لئے اس لئے استعمال کیا گیا ہے۔ تا کہ یقین کے معنوں پر دلالت کرے لیکن عربی زبان کا تفحّص کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رُبَ کا لفظ مستقبل کے معنے میں بھی آتا ہے۔ ہندہ زوجہ ابوسفیان کہتی ہے ؎

یَا رُبَّ قَائِلَةٍ غَدًا
یَالَهْفَ اُمِّ مُعَاوِیَةَ

(البحر المحیط زیر آیت ھذا)

اس میں یقیناً مستقبل کے معنے ہیں۔ جیسا کہ غَدًا کا لفظ دلالت کرتا ہے۔ پھر اسی طرح ایک شاعر سلیم القشیری کا شعر ہے ؎

وَمُعْتَصِمٍ بِالْجُبْنِ مِنْ خَشْیَةِ الرَّدَی
سَیَرْدَی وَغَازٍ مُشْفِقٍ سَیَؤُوْبُ

(البحر المحیط زیر آیت ھذا)

یعنی موت کے ڈر کی وجہ سے بزدلی کی پناہ لینے والا ہلاک ہوجائے گا۔لیکن جو ڈر کو دور پھینک دیتا ہے اور جنگ کے لئے نکل کھڑا ہوتا ہے وہ زندہ سلامت واپس آئے گا۔

اس جگہ پر رُبَّ محذوف ہے۔جیسا کہ مُعْتَصِمٍ کی جَرّ سے ظاہر ہے اور شعر کے معنے یقیناً مضارع پر دلالت کرتے ہیں۔کیونکہ سَیَرْدٰی اور سَیَئُوْبُ مضارع کے صیغے ہیں۔غرض رُبَّ مستقبل کے معنوں میں بھی آتا ہے اور تکثیر کے لئے بھی۔جیسا کہ سیبویہ اور زجاج کے قول سے اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

اَسْلَمَ اَسْلَمَ سے اسم فاعل مُسْلِمٌ آتا ہے۔اور مُسْلِمُوْنَ اس کی جمع ہے اَسْلَمَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں تَدَیَّنَ بِالْاِسْلَامِ مذہب اسلام قبول کرلیا۔اور اَسْلَمَ اَمْرَہٗ اِلَی اللہِ کے معنے ہیں سَلَّمَہٗ کہ اپنے معاملہ کو اللہ کے سپرد کردیا۔(اقرب) رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ کے معنے ہوں گے۔بسا اوقات منکر یہ آرزو کرتے ہیں یا کریں گے کہ وہ اسلام کو قبول کر لیتے (۲) وہ اپنے معاملات کو اللہ کے سپرد کردیتے۔

تفسیر۔ کفار کی خواہش کے متعلق مفسرین کی بحث کفار کی اس خواہش کے متعلق مفسرین نے بحث کی ہے کہ کب انہوں نے خواہش کی کہ وہ مسلمان ہوں؟ بعض نے مجبور ہو کر کہا کہ وہ اس وقت یہ خواہش کریں گے جب مسلمانوں کی فتح ہوگی۔بعض نے قیامت پر چسپاں کیا ہے کہ اس وقت کہیں گے کہ کاش ہم مسلمان ہوتے۔اور بعض نے اس سے ترقیات اسلامی مراد لی ہیں۔یعنی جب بھی ترقی ہوگی وہ یہ خواہش کریں گے۔

(تفسیر فتح البیان تفسیر سورۃ حجر زیر آیت ھذا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر معمولی ترقی سے کفار مسلمان ہونے کی خواہش کرتے ہیں یہ معنے بھی درست ہیں۔ان پر کوئی اعتراض نہیں۔کیونکہ جب دشمنی بلاوجہ ہوتی ہے جیسا کہ کفار عرب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تھی تو دشمن کی ترقی پر انسان کو اکثر یہ خیال آجاتا ہے کہ میں اس کی دشمنی نہ کرتا۔تو اچھا تھا۔آج فائدہ ہی اٹھالیتا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی محض حسد کی وجہ سے تھی۔اور آپؐ کی غیر معمولی ترقیات سے وہ حسد کے مواقع ہی جاتے رہے۔اس لئے ان کو بارہا خیال آتا ہوگا کہ کاش ہم مسلمان ہوتے۔اسی طرح جب وہ بدر کے مقام پر قتل ہو رہے تھے تو ان کا دل یہی چاہتا ہوگا کہ کاش ہم مسلمان ہوتے۔

غرض اسلام کی فتوحات دشمنوں کے دلوں میں یہ حسرتیں ضرور پیدا کرتی ہوں گی۔کہ کاش ہم بھی ساتھ ہوتے۔منافقوں کا قول تو قرآن مجید میں صریح طور پر بیان ہوا ہے کافروں کی بھی یہی حالت ہوتی ہوگی۔یہ ایک طبعی بات ہے اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔

اس آیت کے ایک اور معنے میرے نزدیک ان کے علاوہ آیت کے ایک اور معنے بھی ہیں۔ مفسّرین عام طور پر ظاہری لطافت۔فصاحت و بلاغت اور معجزات پر بحث کرتے ہیں۔اور قرآن مجید کی تعلیمی خوبیوں پر بہت کم بحث کرتے ہیں۔میرے خیال میں سب سے بڑی چیز جس کے لئے قرآن کریم آیا ہے۔وہ اس کی کامل اور دلکش تعلیم ہے اور اسی کی طرف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ میں اشارہ کیا ہے۔اور آیت رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں انہی تعلیمی خوبیوں پر رشک کا ذکر کیا ہے یعنی فرماتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کی خوبیوں کو دیکھ کر بارہا کافر کہہ اٹھتے ہیں اور کہہ اٹھیں گے۔کاش ہم بھی مسلمان ہوتے اور یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

حضرت عمرؓ سے ایک یہودی نے کہا کہ قرآن مجید میں ایک آیت ہے۔اگر وہ ہماری کتاب میں اترتی تو ہم اس دن عید مناتے۔حضرت عمرؓ نے کہا کہ وہ کون سی آیت ہے۔اس نے جواب دیا۔اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ۔الآیہ۔آپ نے فرمایا۔وہ دن تو ہمارے لئے دو عیدوں کا دن تھا۔یعنی جمعہ کا دن اور عرفہ کے دن یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ (بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة)۔

ایک یہودی کا اسلامی شریعت کے اعلیٰ ہونے کا اعتراف ایسا ہی ایک اور یہودی نے کہا کہ آپ کی شریعت میں ایک بات دیکھ کر حیرت ہوجاتی ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی حصہ نہیں جس پر اس شریعت نے روشنی نہ ڈالی ہو (الترمذی ابواب الطھارة ،باب الاستنجاء بالحجارة)۔یہ خواہشات ہیں جو ہزاروں کے دلوں میں پیدا ہوئی ہوں گی۔مگر اظہار ان کا دو ایک کے منہ سے ہوا۔اور قرآن مجید نے بھی فرمایا ہے يَوَدُّ (ان کے دل چاہتے ہیں) يقول نہیں فرمایا (کہ وہ منہ سے بھی اظہار کرتے ہیں)۔

اس زمانہ میں اسلامی تعلیم کے قابل رشک مسائل اس زمانہ میں بھی طلاق کا مسئلہ۔شراب کا مسئلہ۔ورثہ کا مسئلہ۔اور ایسے ہی اور بہت سے مسائل ہیں کہ جن پر دنیا رشک کر رہی ہے۔جب ایک یورپین کے دل میں خیال آتا ہے کہ ہمارے ہاں بھی طلاق کا قانون بننا چاہیے۔تو دوسرے معنوں میں وہ یہی کہتا ہے کہ کاش میں مسلمان ہوتا۔ایسا ہی جب ایک امریکن کے دل میں یہ تحریک پیدا ہوتی ہے کہ شراب بند ہونی چاہیے۔تو وہ گویا رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ کی تصدیق کرتا ہے۔

ایک ہندو کا اسلامی ازدواجی قانون پر رشک ابھی کچھ عرصہ ہوا ہندوستان کی لیجسلیٹو اسمبلی کے ایک ہندو ممبر نے صغرسنی کی شادی کے متعلق مسودہ قانون پیش کیا تھا۔اس نے دورانِ تقریر میں کہا۔میں بڑی حسرت سے دیکھتا ہوں کہ جس طرح اسلام نے شادی کا قانون بنا کر مسلم قوم کو محفوظ کر دیا ہے۔ویسا قانون

ہمارے ہاں کوئی نہیں۔

آیت میں بھی رُبَمَا کا لفظ رکھا گیا ہے۔ جو کئی دفعہ پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی ان لوگوں کو بحیثیت مجموعی اسلام لانے کا خیال پیدا نہ ہوگا۔ بلکہ الگ الگ مسائل پر ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ کاش یہ مسئلہ بھی ہمارے پاس ہوتا۔ یہ بھی ہوتا۔

مسلم کے معنے سپرد کر دینے والے کے مُسْلِم کے معنے سپرد کر دینے والے کے بھی ہیں۔ جیسے فرمایا اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (البقرۃ: ۱۳۲) میں نے اپنا سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیا۔ پس اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ جب کفار اپنی دنیوی تدابیر کو بیکار جاتے دیکھتے ہیں اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کئے بیٹھے ہیں۔ کامیاب ہوتے دیکھتے ہیں۔ تو ان کا غرور ایک وقت کے لئے کمزور پڑ جاتا ہے اور ان کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہم بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھتے اور اپنے معاملات اس کے سپرد کر دیتے۔ تو ان ذلّتوں اور شکستوں کا منہ نہ دیکھتے۔

مسلم کے معنی امن دینے والے کے ہیں مسلم کے معنے امن دینے والے کے بھی ہوتے ہیں۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کی ترقیات کو دیکھ کر کبھی کبھی کافروں کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش ہم اس قوم سے لڑائی نہ چھیڑتے اور صلح رکھتے اور یہ روزِ بد نہ دیکھتے۔ جو اَب دیکھنا نصیب ہوا۔

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۴

تو ان کو (اپنے حال پر) چھوڑ دے کہ وہ (بیٹھے کھانے) کھاتے رہیں۔ اور وقتی سامانوں سے نفع اٹھاتے رہیں اور (انکی جھوٹی) امیدیں انہیں غافل کرتی رہیں۔ کیونکہ وہ جلد (ہی حقیقت) معلوم کر لیں گے۔

حلّ لُغات۔ اَلْاَمَلُ وَالْاَمْلُ اس کی جمع آمَالٌ ہے۔ اور اَلْاَمَلُ کے معنے ہیں۔ الرَّجَاءُ۔ امید۔ تَاَمَّلْتُ الشَّيْءَ اَیْ نَظَرْتُ اِلَيْهِ مُسْتَثْبِتًا لَهٗ۔ تَاَمَّلْتُ الشَّیْءَ کے معنے ہیں۔ اسے غور سے دیکھا۔ ٹکٹکی لگا کر دیکھا۔ (اقرب)

تفسیر ۔اس آیت میں یہ بتلایا ہے کہ یہ لوگ مختلف مسائل میں اسلام کی برتری تو تسلیم کرتے ہیں ۔ اور کریں گے ۔مگر پھر بھی اسلام کی طرف قدم اٹھانا نصیب نہ ہوگا۔یورپ کے لوگ اسلامی مسائل کی برتری کو مانتے ہیں مگر اسلام لانے کے لئے طیار نہیں۔کیونکہ سوسائٹی کا سوال ہے۔

فرمایا وہ اپنے اکل وشرب کی وجہ سے اپنی تجارتوں اور صنعتوں کی وجہ سے اور اپنی بعید آرزوؤں کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوتے۔اس میں گویا پہلی آیت کے مفہوم پر جو سوال پیدا ہوتا تھا۔اس کا جواب دیا گیا ہے۔یعنی جب وہ لوگ خواہش کرتے ہیں اور کریں گے' کاش وہ مسلمان ہوتے' تو وہ مسلمان ہوتے کیوں نہیں؟ فرمایا ان کی عیاشی دولت کی حرص اور طولِ امل ان کے راستہ میں روک بن رہے ہیں۔

صداقت قبول کرنے کے لئے کھانے پینے میں سادگی ضروری ہے اس آیت سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ صداقت کو قبول کرنے کے لئے کھانے پینے میں سادگی دنیا کی حرص سے اجتناب اور طول امل سے بچنا ضروری امور ہیں جو شخص صداقت کا جویا ہو اس کے لئے ان سے بچنا ضروری ہے اگر کوئی ان تین باتوں سے نہیں بچتا تو اس کا صداقت کی جستجو کرنا فضول امر ہے۔اگر حق اس پر کھل بھی جائے گا تب بھی وہ اس کے قبول کرنے سے محروم رہے گا یہ اشارہ بھی اس آیت میں ہے کہ کفار لوگوں پر رعب جمانے کے لئے اپنے دسترخوان کو خوب وسیع کرتے دولت کماتے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فتح پانے کے لئے دور دور کی تدابیر اختیار کرتے تھے جبکہ محمد رسول اللہ صلعم ان سب باتوں سے خالی تھے مگر باوجود اس کے فرماتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی جیتیں گے اور کفار کے دلوں میں آپؐ کی کامیابی دیکھ کر حسرت پیدا ہوگی۔

لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ کہنا کفار کا عارضی جذبہ ہے اس آیت سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ کفّار کا عارضی جذبہ ہے ورنہ اصل میں وہ کھانے پینے اور دولت کمانے میں لگے ہوئے ہیں اور عارضی جذبات انسان کو نفع نہیں دیتے بلکہ مستقل جذبات فائدہ دیتے ہیں مسلمانوں کا مستقل جذبہ مسلم ہونے کا ہے عارضی طور پر وہ کھاتے پیتے دولت کماتے اور بعض تدابیر بھی آئندہ کے لئے کر لیتے ہیں پس باوجود ان کاموں کے وہ ہدایت پا رہے ہیں جبکہ کافر ہدایت نہیں پاتے۔

وَ مَاۤ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ۵

اور ہم نے کبھی کسی بستی کو بغیر اس کے کہ اس کے متعلق (پہلے سے) ایک معلوم فیصلہ ہو چکا ہو ہلاک نہیں کیا۔

حلّ لُغات۔ اَلۡقَرۡيَة کے معنی بستی کے ہیں۔ نیز قریہ بول کر اہل قریہ بھی مراد لیتے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھو حل لغات یوسف آیت نمبر ۸۳ نیز یونس آیت نمبر ۹۹۔

القرية اَلۡمِصۡرُ اَلۡجَامِعُ بڑا شہر۔ كُلُّ مَكَانٍ اِتَّصَلَتۡ بِهِ الۡاَبۡنِيَةُ وَاتُّخِذَ قَرَارًا ہر آبادی کی جگہ خواہ شہر ہو یا گاؤں۔ جَمۡعُ النَّاسِ۔ لوگوں کی جماعت۔ (اقرب)

اَلۡقَرۡيَةُ اِسۡمٌ لِلۡمَوۡضَعِ الَّذِيۡ يَجۡتَمِعُ فِيۡهِ النَّاسِ۔ قَرية اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ وَلِلنَّاسِ جَمِيۡعًا اور جمع شدہ لوگوں کو بھی قرية کہتے ہیں۔ وَيُسۡتَعۡمَلُ فِيۡ كُلِّ وَاحِدٍ مِنۡهُمَا۔ اور قریہ ان ہر دو معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ قَالَ تَعَالٰى وَاسۡئَلِ الۡقَرۡيَةَ قَالَ كَثِيۡرٌ مِّنَ الۡمُفَسِّرِيۡنَ مَعۡنَاهُ اَهۡلَ الۡقَرۡيَةِ مذکورہ بالا آیت میں وَاسۡئَلِ الۡقَرۡيَةَ کے معنے اکثر مفسرین نے اَهۡلُ قَرۡيَةٍ "یعنی بستی کے رہنے والے" کئے ہیں۔ وَقَالَ بَعۡضُهُمۡ بَلِ الۡقَرۡيَةُ هٰهُنَا الۡقَوۡمُ اَنۡفُسُهُمۡ اور بعض مفسرین نے یوں کہا ہے کہ قریہ سے مراد خود لوگ ہی ہیں اہل قریہ نہیں۔ (مفردات)

وَلَهَا میں واؤ حالیہ ہے وَ مَاۤ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ۔ وَ لَهَا میں واؤ حالیہ ہے۔ قاضی منذر نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد کا مذکور اس کے قبل کے مذکور سے زمانہ میں پہلے واقعہ ہو چکا ہے۔ جیسا کہ آتا ہے حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡهَا فُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا (الزمر: ۷۴) (البحر المحیط تفسیر سورۃ الحجر زیر آیت هٰذا)

تفسیر۔ قرية سے مراد نبی کے تمام مخاطب ہوتے ہیں یاد رکھنا چاہیے کہ قریہ سے مراد گاؤں یا بستی نہیں بلکہ وہ قوم مراد ہے جن کی طرف نبی آتا ہے۔ یہ قرآن مجید کا محاورہ ہے کہ وہ قریہ کا لفظ بول کر مراد نبی کے تمام مخاطب لیتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے مخاطب نبی کے گاؤں یا شہر والے ہی ہوتے ہیں۔ دوسروں کو ان کے تابع کر دیا جاتا ہے۔

نبی کی بستی کو اُمّ القریٰ قرار دیا جاتا ہے جب ماں مر جائے تو بچے آپ ہی بے غذا مر جاتے ہیں۔

اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ سے مراد اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ میں مراد وہی قریہ ہے جس میں نبی آتا ہے دوسری بستیوں کا ذکر اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ اس بستی کے تابع ہیں اس کا مزید ثبوت اگلی آیت میں من امة کے لفظ

سے مل جاتا ہے۔

ایک اعتراض کا جواب یاد رکھنا چاہیے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں فلاں گاؤں ہلاک ہو گیا فلاں شہر میں بیماری پڑی مگر اس میں کوئی نبی نہ تھا ان کا یہ اعتراض غلط ہے اس آیت میں اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے

نبی کی بعثت کے بعد اس کے مخاطبین کی سب بستیاں عذاب کی مستحق ہو جاتی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ جب نبی مبعوث ہو تو اس کے مخاطبین کی سب بستیاں اس کی بستی کے تابع سمجھی جاتی ہیں اور اس بستی میں نبی کی بعثت کے بعد سب بستیاں عذاب کی مستحق ہو جاتی ہیں اگر وہ ایک قوم کی طرف مبعوث ہو تو وہ ساری قوم انکار کے باعث مستحقِ عذاب ہوتی ہے خواہ ان کی بستیوں میں سے وہ نبی گزرا بھی نہ ہو اور اگر وہ سب دنیا کی طرف ہو تو سب دنیا مستحق عذاب ہو جاتی ہے نیز اس آیت سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ کسی بستی پر عذاب آنا اس بات کی علامت نہیں کہ ضرور کوئی نبی آیا ہو بلکہ اسی قدر وسیع عذاب جس قدر وسیع نبی کا حلقہ ہو نبوت کی دلیل ہوتا ہے اگر ایک قوم کی طرف نبی ہو تو قومی عذاب نبی کی علامت ہے اور اگر ایسے نبی کا زمانہ ہو جو سب دنیا کی طرف مبعوث ہوا ہو تو پھر عالمگیر عذاب ہی اس کی علامت ہے یہ کہنا حماقت ہے کہ اگر عذاب بغیر نبی کے نہیں ہوتا تو فلاں گاؤں کیوں ہلاک ہوا تھا اس وقت کون نبی آیا تھا یہ عذاب جو نبوت کی علامت ہوتا ہے اس وسیع حلقہ کا احاطہ کرتا ہے جو نبی کا مخاطب ہوتا ہے بنی اسرائیل کے نبیوں کے لئے کسی ایک گاؤں کا عذاب نہیں بنی اسرائیل کی قوم کا عذاب علامت تھا اور محمد رسول اللہ صلعم کے لئے کسی قوم کا عذاب نہیں بلکہ دنیا بھر کی تباہیاں علامت تھیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں عرب پر خصوصاً عذاب آیا جیسا کہ تاریخ شاہد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب پر خصوصاً عذاب آیا مگر ساری دنیا پر بھی اللہ تعالیٰ نے ایک قلیل عرصہ میں تباہی نازل کی۔ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الدخان باب یغشی الناس ھذا عذاب الیم)

کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ سے مراد کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ سے مراد وہ مدت ہے جو انبیاء کے ذریعہ سے بتا دی جاتی ہے اور اس جگہ قریۃ سے مراد وہی لوگ ہیں جن کو نبیوں کی مخالفت کی وجہ سے عذاب ملتا ہے۔ ایسے لوگوں پر عذاب ہمیشہ کھلی پیشگوئیوں کے بعد آتا ہے۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ⑥

کوئی قوم بھی اپنی (ہلاکت کی) میعاد سے بھاگ (کر بچ) نہیں سکتی۔ اور نہ ہی پیچھے رہ (کر اس سے بچ) سکتی ہے

حلّ لُغات۔ الاجل کی تشریح کے لئے دیکھو سورۃ رعد آیت نمبر ۳۹۔

اَلْاُمَّةُ اَلْجَمَاعَةُ۔ امت کے معنے ہیں جماعت۔ اَلْجِيْلُ مِنْ كُلِّ حَيٍّ۔ ہر قبیلے کے ہمعصر لوگ۔ (اقرب)

تفسیر۔ مَا تَسْبِقُ اور مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ کا مفہوم بالعموم لوگوں نے مبہم سا بیان کیا ہے۔ میرے نزدیک ماتسبق کا مطلب یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ عذاب سے کوئی قوم جس کے متعلق عذاب کی خبر ہو دامن چھڑا کر نکل جائے یعنے عذاب تو وقت پر آجائے لیکن نقصان نہ پہنچائے اور وہ ہلاکت سے بچ جائے اور نہ یہ ہوسکتا ہے کہ قوم عذاب سے پیچھے رہ جائے یعنے عذاب ٹلتا ہی چلا جائے اور ملتوی ہوتا جائے گویا ڈھیل بے شک ایک ضروری شے ہے اور نبی کے مخالفوں کو ضرور ملتی ہے تا جو ہدایت پانے کے قابل ہیں ہدایت پا جائیں مگر یہ نہیں ہوتا کہ ڈھیل ہی ملتی جائے اور عذاب نبی یا اس کے اتباع کے زمانہ میں ظاہر ہی نہ ہو۔

اس آیت میں کفار کو ایک تنبیہ اس آیت میں کفار کو اس سے متنبہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھیں کیونکہ وہ دو ہی طرح محفوظ رہ سکتے ہیں (۱) یا تو عذاب آئے مگر ان کو ہلاک نہ کرے۔ (۲) یا پھر عذاب ٹلتا ہی جائے۔ فرمایا یہ دونوں باتیں نہ ہوں گی۔ پس ڈھیل پر دلیر نہ ہوں۔

وَ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ؕ ⑦

اور انہوں نے (بڑے زور سے) کہا ہے (کہ) اے وہ شخص جس پر یہ ذکر اتارا گیا ہے تو یقیناً دیوانہ ہے

حلّ لُغات۔ الذّکر۔ اَلذِّكْرُ التَّلَفُّظُ بِالشَّيْءِ وَاِحْضَارُهٗ فِي الذِّهْنِ بِحَيْثُ لَا يَغِيْبُ عَنْهُ۔ ذکر کے معنی ہیں۔ کسی چیز کا منہ سے ذکر کرنا اور ایسے طور پر یاد اور مستحضر فی الذھن کرنا۔ کہ وہ بھول نہ جائے۔ اَلصِّيْتُ۔ شہرت وَمِنْهُ لَهٗ ذِكْرٌ فِي النَّاسِ۔ اور انہی معنوں میں لَهٗ ذِكْرٌ فِي النَّاسِ کا فقرہ بولتے ہیں۔ کہ فلاں شخص کو لوگوں میں شہرت حاصل ہے۔ اَلثَّنَاءُ۔ تعریف۔ اَلشَّرَفُ۔ شرف۔ وَفِي الْقُرْاٰنِ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ۔ اور قرآن مجید میں اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہ قرآن مجید کا نزول تیرے

اور تیری قوم کے لئے شرف کا موجب ہے ۔وَالصَّلَاۃُ لِلّٰہِ تَعَالٰی وَالدُّعَاءُ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا۔ چنانچہ انہی معنوں میں یہ فقرہ استعمال ہوتا ہے ۔اِذَا حَزَبَہٗ اَمْرٌ فَزِعَ اِلَی الذِّکْرِ کہ جب مصیبت کا سامنا ہوا۔ تو اس نے دعا کی طرف جلدی کی ۔اَلْکِتَابُ فِیْہِ تَفْصِیْلُ الدِّیْنِ وَوَضْعُ الْمِلَلِ ایسی کتاب جس میں دین کی تفصیل ہو۔ اور شریعت کے اصول بیان کئے گئے ہوں۔مِنَ الرِّجَالِ ۔اَلْقَوِیُّ الشُّجَاعُ الْاَبِیُّ۔ ایسا بہادر شخص جو کسی کا رعب برداشت نہ کرے ۔مِنَ الْمَطَرِ ۔اَلْوَابِلُ الشَّدِیْدُ۔ سخت موسلا دھار بارش۔مِنَ الْقَوْلِ ۔اَلصُّلْبُ الْمَتِیْنُ۔ پکی بات ۔(اقرب)

المجنون اَلْمَجْنُوْنُ جُنَّ الرَّجُلُ۔ جَنًّا وَجُنُوْنًا زَالَ عَقْلُہٗ وَقِیْلَ فَسَدَ۔ عقل جاتی رہی یا عقل میں فتور آ گیا۔ الْجُنُوْنُ مَصْدَرُ جُنَّ جنون ۔جَنَّ کا مصدر ہے جس کے معنے ہیں چھپانا۔ زَوَالُ الْعَقْلِ۔ عقل کا جاتے رہنا۔وَقِیْلَ فَسَادُہٗ عقل میں خرابی کا پیدا ہونا۔ اَلْمَجْنُوْنُ مَنْ زَالَ عَقْلُہٗ اَوْ فَسَدَ اور مجنون ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کی عقل جاتی رہے یا عقل میں فتور پیدا ہو جائے ۔(اقرب)

القاموس العصری میں (جو انگریزی اور عربی کی اچھی لغت ہے) مجنون کے معنے میں لکھا ہے :۔

Mad, Crazy, Insane, Fool, Foolish

دیوانہ۔ کم عقل ۔ پاگل ۔ احمق ۔ بےوقوف۔

مفردات میں ہے ۔اَلْجِنَّۃُ جَمَاعَۃُ الْجِنِّ قَالَ تَعَالٰی مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ ۔وَقَالَ تَعَالٰی وَجَعَلُوْا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْجِنَّۃِ نَسَبًا ۔جِنَّۃٌ کے دو معنے ہیں ۔ایک یہ کہ لفظ جنّ کی جمع ہے جیسا کہ قرآن کریم کی مذکورہ بالا دو آیات سے ظاہر ہے یعنی مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ اور جَعَلُوْا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْجِنَّۃِ نَسَبًا سے اور دوسرے معنے اس کے جنون کے ہیں۔ جیسا کہ لکھا ہے اَلْجِنَّۃُ ۔اَلْجُنُوْنُ وَقَالَ تَعَالٰی مَا بِصَاحِبِکُمْ مِنْ جِنَّۃٍ ۔اَیْ جُنُوْنٍ ۔یعنی جِنَّۃٌ کے معنے جنون کے بھی ہیں جیسا کہ قرآن کریم کی آیت مَا بِصَاحِبِکُمْ مِنْ جِنَّۃٍ سے ظاہر ہے ۔وَالْجُنُوْنُ حَائِلٌ بَیْنَ النَّفْسِ وَالْعَقْلِ اور جنون ایک قسم کی روک کا نام ہے جو انسان کی طبیعت اور اس کی عقل کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے ۔وَجُنَّ فُلَانٌ قِیْلَ اَصَابَہُ الْجِنُّ یعنی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب جُنَّ فُلَانٌ کہا جائے ۔تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے جن چمٹ گئے ہیں ۔وَبُنِیَ فِعْلُہٗ عَلٰی فُعِلَ کَبِنَاءِ الْاَدْوَاءِ نَحْوُ زُکِمَ لُقِیَ وَحُمَّ اور جُنّ بصیغہ مجہول اس لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ یہ بھی ایک بیماری ہے اور بیماریوں کے لئے یہ صیغہ بالعموم استعمال ہوتا ہے ۔مثلاً زکام والے لقوہ والے اور تپ والے کے متعلق زُکِمَ ۔لُقِیَ اور حُمَّ استعمال ہوتا ہے ۔وَقِیْلَ اُصِیْبَ جَنَانُہٗ ۔اور بعض

لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے دل کو صدمہ پہنچ کر عقل ماری گئی ہے۔ وَقِيْلَ حِيْلَ بَيْنَ نَفْسِهٖ وَعَقْلِهٖ فَجُنَّ عَقْلُهٗ بِذٰلِكَ۔ اور بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس کے اور اس کی عقل کے درمیان کوئی روک پیدا ہوگئی ہے۔ اس وجہ سے وہ عقل سے کام نہیں لے سکتا یہ مفردات والے نے مختلف لوگوں کا خیال جنون کی ماہیت کے متعلق بتایا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ ضروری نہیں کہ جب کسی کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ مجنون ہے تو عربی زبان میں اس کے یہی معنے ہوں کہ اسے جن چمٹ گیا بلکہ اس کے اصل معنے تو یہی ہوں گے کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ باقی بعض لوگ جو وہمی ہیں جنون کی تشریح یہ کریں گے کہ کسی جن نے ناراض ہو کر اس کا دماغ خراب کردیا ہے۔ بعض لوگ جو احساسات کو بیماریوں کا منبع قرار دیتے ہیں یہ کہیں گے کہ اس کے دل کو کوئی صدمہ پہنچا ہے اور بعض لوگ جو طبیعی ہیں یہ قرار دیں گے کہ اس کے دماغ میں کوئی نقص ہوگیا ہے۔ غرض کہ جنون کے معنے جن چمٹ جانے کے نہیں بلکہ جنون کا سبب بعض کے نزدیک جن کا چمٹ جانا ہے۔ وَقَوْلُهٗ مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ اَیْ ضَامَّهٗ مَنْ يُّعَلِّمُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ كَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ قرآن مجید کی آیت مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ اور لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ میں مجنون کے معنے مَنْ يُّعَلِّمُهُ الْجِنُّ کے ہیں یعنی جسے جن سکھاتے ہیں۔ (مفردات کے یہ معنے تفسیری ہیں یعنی مختلف تفاسیر کے اثر کے نیچے انہوں نے یہ معنے لکھ دیئے ہیں ورنہ محقق لغت میں یہ معنی نہیں۔ لغت میں مجنون کے معنے یہی ہیں۔ کہ جسے جنون کی بیماری ہو)۔

تفسیر ۔ پہلے فرمایا تھا۔ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ کہ بارہا کفار مسلم ہونے کی خواہش کریں گے۔ اب فرمایا کہ کفار اس بات کو سن کر کہ وہ ہلاک کردیئے جائیں گے نہایت تعجب کریں گے اور کہیں گے کہ تُو ضرور پاگل ہے۔ جو ایسی باتیں کرتا ہے ہم تو جلد ہی تجھے اور تیرے متبعین کو کچل ڈالیں گے۔

رُبَمَا کے معنے مستقبل کے لینے کی صورت میں اس آیت کے معنے ربما کے معنے مستقبل کے کئے جائیں اور یہ مراد ہو کہ اسلام کی ترقیات کو دیکھ کر کفار کبھی کبھی یہ خواہش کریں گے کہ کاش ہم مسلمان ہوتے یا کاش ہم مسلمانوں کا مقابلہ نہ کرتے یا کاش ہم اللہ تعالیٰ کے توکل پر عمل پیرا ہوتے تو اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ جب کفار اس اعلان کو سنتے ہیں کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ اسلام کی ترقی کو دیکھ کر کفار کہیں گے کہ کاش ہم مسلمان ہوتے تو وہ اس دعویٰ کو مجنونانہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو پاگل ہے جو ایسے دعوے کرتا ہے۔ ہم اسلام کے دشمن ایسی خواہش کس طرح کر سکتے ہیں اور ایسی ترقی تجھے اور تیرے اتباع کو کب مل سکتی ہے۔

الذِّكْرُ قرآن مجید کا نام ہے اس آیت میں الذِّكْرُ کا لفظ آیا ہے یہ قرآن مجید کا نام کفار میں بھی معروف

معلوم ہوتا ہے۔ ذکر کے معنی شرف کے ہوتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْهِ ذِکْرُکُمْ (انبیاء:۱۱) ہم نے تمہاری طرف وہ کتاب اتاری ہے جس میں تمہاری عزت کے سامان ہیں چونکہ اس جگہ اسلام کی ترقی کا ذکر ہے اور کفار کی ذلت کا۔ اس لئے کفار طنزاً الذکر کے لفظ سے قرآن کا ذکر کرتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ''اے وہ شخص! جس پر ایسا معزز اور ممتاز کلام اُترا ہے کہ ہم جیسے بھی خواہش کریں گے کہ ہم اس کے ماننے والے ہوتے۔ تو پکا پاگل ہے''۔ بظاہر اس کلام کا پہلا حصہ دوسرے کے خلاف ہے ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص! جس پر یہ دنیا کو عزت دینے والا کلام نازل کیا گیا ہے اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ تو پاگل ہے۔

کفار الذِّکْرُ کا لفظ طنزاً کہتے ہیں

مگر طنزیہ کلام کی صورت میں یہ اختلاف باقی نہیں رہتا۔ یہ فقرہ ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں دوزخیوں کے متعلق آتا ہے کہ ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ (الدخان:۵۰) اے معزز اور شریف انسان! دوزخ کا عذاب چکھ۔ یعنی تم اپنے آپ کو عزیز و کریم کہتے تھے۔ اب دیکھو کہ تمہاری عزت اور کرم نے تم کو کس حالت تک پہنچا دیا ہے؟

اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ سے عیسائیوں کا اعتراض

اِنَّکَ مَجْنُوْنٌ اس کے متعلق عیسائیوں نے اعتراض کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ضرور کوئی جنون کا مادہ تھا ورنہ عرب لوگ آپؐ کو کیوں مجنون کہتے۔ اچھے بھلے آدمی کو کون پاگل کہتا ہے۔

مجنون کے معنوں کی تعیین میں عیسائیوں کی غلطی

اس اعتراض کے بیان میں انہوں نے پہلے تو مجنون کے معنوں کی تعیین میں غلطی کی ہے۔

سیل اس آیت کا ترجمہ یوں کرتا ہے۔

Thou art certainly possessed by a Devil

ضرور تجھ پر کوئی شیطان قابض ہے۔ (تفسیر القرآن از وہیری)

روڈویل اس کا ترجمہ یوں کرتا ہے:۔

Thou art surely possessed by a Jinn

تجھ پر یقیناً کسی جن کا سایہ ہے۔ (ترجمۃ القرآن از روڈویل)

پامر لکھتا ہے:۔

Verily thou art possessed

تو تو بُری روحوں کے قبضہ میں ہے۔(ترجمۃ القرآن ازای۔ایچ پامر)

مجنون کے معنے دیوانہ یا پاگل کے ہوتے ہیں گویا مجنون ان کے نزدیک وہ شخص ہوتا ہے جس پر کوئی شیطان یا جن قابض ہو۔حالانکہ اس جگہ یہ معنی مراد نہیں ہو سکتے۔اور نہ ہیں۔بلکہ جیسا کہ اوپر حل لغات میں بتایا گیا ہے مجنون کے معنے پاگل یا دیوانہ ہوتے ہیں۔

مجنون کے معنے اقرب الموارد میں لکھے ہیں۔مَنْ زَالَ عَقْلُهٗ اَوْفَسَدَ جس کی عقل جاتی رہے یا عقل میں خرابی آجائے۔(تفصیل کے لئے دیکھو حل لغات)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر عیسائیوں کا الزام اپنے عیب کو چھپانے کے لئے ہے اصل میں یوروپین مصنفین نے اپنے عیب کو چھپانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمے یہ الزام لگانے کی کوشش کی ہے۔کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ یہودی حضرت مسیحؑ کو کہتے تھے کہ اس پر جن سوار ہے۔مگر انہوں نے اتنا غور نہ کیا کہ وہاں کہنے والے یہودی ہیں اور اس جگہ مشرکین۔یہودیوں کے نزدیک تو جنّ ایک ناپاک روح ہے جس پر وہ سوار ہو اس کے معنے ہیں کہ وہ گندا ہے مگر مشرکین کے ہاں تو جنّوں کی پوجا کی جاتی تھی۔اگر کفار کا یہی مطلب ہوتا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت نہ کرتے بلکہ آپؐ سے ڈرتے۔

عیسائی معترضعین کا غلط استدلال پھر عیسائی معترضین نے دوسرا ظلم یہ کیا ہے کہ وہ لکھتے ہیں۔کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اہلِ مکہ جو مجنون کہتے تھے اس کا ضرور کوئی سبب چاہیے اور وہ سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ آپؐ کو نَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ ذَالِکَ مرگی کے دورے پڑتے تھے۔اس کی تائید میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ واقعہ نقل کیا ہے جو آپؐ کو حلیمہ دائی کے ہاں بقول بعض مؤرخین پیش آیا تھا۔وہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ آپؐ نے جنگل میں دیکھا (جہاں بعض بڑے بچے جانور چرا رہے تھے) کہ دو آدمی براق لباس پہنے ہوئے آئے ہیں۔انہوں نے آپؐ کو گرا لیا اور آپؐ کے سینہ کو چاک کیا اور کوئی سیاہ سی چیز اندر سے نکال کر پھینک دی (مسند احمد بن حنبل، مسند الشامیین حدیث عقبۃ بن عبد السلمی)۔عیسائی اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت بچے تھے اس لئے جھوٹ تو نہیں بولتے تھے لہٰذا مرگی کا دورہ ماننا پڑے گا۔

میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑتا کہ مرگی کے دورہ میں انسان اس قسم کے واقعات اور نظارے دیکھتا سوچتا اور انہیں یاد رکھ سکتا ہے یا کہ نہیں میں نے ڈاکٹری کتابیں دیکھی ہیں۔جن میں اس مرض کی اقسام اور ان کی کیفیات بیان ہیں ان میں یہ ہرگز نہیں لکھا کہ انسان اس دورے کی حالت میں کسی نظارہ کو دیکھ کر باترتیب یاد رکھ

سکتا ہے اور پھر مرگی کے دورے والے کی آنکھیں شکل اور عقل اور دوسرے حالات سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ مرگی کا مریض ہے۔ بلاوجہ معمولی سی تکالیف کو بار بار دوہرانا۔ خالی الذہن نظر آنا۔ اور معمولی معمولی باتوں پر غصہ کرنا ایسے شخص کی عادت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایسی کوئی بات پائی نہ جاتی تھی۔

یسوع کو لوگ آسیب زدہ کہتے تھے عیسائی پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی وجہ نہ تھی تو ساری قوم انہیں کیوں مجنون کہہ رہی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے دنیا میں یسوع نامی ایک اور آدمی بھی پیدا کیا ہے۔ جس کو لوگ آسیب زدہ قرار دیتے تھے اور مجنون کہتے تھے۔ چنانچہ (یوحنا باب ۱۰ آیت ۱۹، ۲۰) میں لکھا ہے۔ کہ ’’ان باتوں کے سبب یہودیوں میں پھر اختلاف ہوا۔ ان میں بہتیرے تو کہنے لگے کہ اس میں بدروح ہے۔ اور وہ دیوانہ ہے۔ تم اس کی کیوں سنتے ہو۔‘‘ اس بزرگ کے ایک شاگرد پولوس نامی کی نسبت بھی لکھا ہے۔ ’’جب وہ اس طرح جوابدہی کر رہا تھا۔ تو فیتس نے بڑی آواز سے کہا۔ اے پولوس تُو دیوانہ ہے۔ بہت علم نے تجھے دیوانہ کر دیا ہے۔‘‘ (اعمال باب ۲۶ آیت ۲۴) اب عیسائیوں کو چاہیے کہ وہ پہلے مسیحؑ اور پولوس کو دیوانہ کہنے کا سبب مرگی کا دورہ ثابت کریں اس کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی طرف توجہ کریں۔ کیونکہ اپنے گھر کا کام مقدم ہوتا ہے۔

مسیحی معترضین کے اعتراض کا بطلان کاش یہ مسیحی معترضین انصاف سے کام لیتے۔ اور غور کرتے۔ تو اگر حضرت مسیحؑ کو بغیر مرگی کے دوروں کے صرف وعظ سن کر پاگل کہا جا سکتا ہے تو کیوں رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ کے عظیم الشان دعویٰ کرنے والے کو روحانی عالم سے ناواقف لوگ پاگل نہیں کہہ سکتے تھے۔

مسیحیوں کا یہ اعتراض اور بھی قابل تعجب ہو جاتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگلی آیات میں کفار کی پیش کردہ وجہ بھی بیان ہے جس کی بنا پر وہ آپؐ پر جنون کا الزام لگاتے تھے۔ وہ اس الزام کی وجہ مرگی کو بیان نہیں کرتے۔ بلکہ آپؐ کے دعاوی کے بعید از عقل ہونے کو اس کی وجہ قرار دیتے ہیں اور یہ بات ہر نبی میں پائی جاتی ہے۔ کوئی نبی نہیں جس نے وہ باتیں نہ کی ہوں جن کو اس زمانہ کے لوگ ماننے کو تیار نہ تھے۔

لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۸

اگر تو سچا ہے تو کیوں ملائکہ کو ہمارے سامنے نہیں لاتا۔

حلّ لُغات۔ لَوْ مَا لَوْمَا اور لَوْ لَا اور ھَلَّا ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ نحاس کا قول ہے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کیوں ایسا نہیں کرتے۔ مطلب یہ کہ ایسا کرو۔ (تفسیر القرطبی تفسیر سورۃ الحجر زیر آیت ھذا)

تفسیر۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دعویٰ گزشتہ سورتوں میں یہ پیش کیا گیا تھا اور اس سورۃ کا شروع بھی اسی تسلسل میں تھا کہ اسلام کی فتح اس کلام کے ذریعہ سے ہوگی۔ جو خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا ہے۔ وہ کلام اپنے اندر ایسی خوبیاں رکھتا ہے کہ اس کے مقابل پر کفار کا زور نہ چل سکے گا۔

کفار کا لاجواب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجنون کہنا کفار نے اس دعویٰ کے بالمقابل لاجواب ہو کر یہ دعویٰ پیش کر دیا کہ تم تو مجنون ہو اور مجنون ہونے کی یہ دلیل دی کہ تم کہتے ہو کہ یہ کلام تم پر فرشتے لے کر آتے ہیں۔ اگر تمہارا یہ قول درست ہوتا تو پھر وہ فرشتے دوسرے لوگوں کو بھی نظر آتے۔ لیکن چونکہ وہ دوسرے لوگوں کو نظر نہیں آتے۔ معلوم ہوا کہ یہ تمہارا وہم ہے۔ اور تمہارے جنون کی علامت ہے۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۹

(کیا انہیں معلوم نہیں کہ) ہم (جب بھی) فرشتوں کو (اتارتے ہیں تو) حق کے مطابق اتارتے ہیں اور (جب کافروں کے لئے اتارتے ہیں تو) اس وقت انہیں (ذرّہ بھی) مہلت نہیں دی جاتی۔

حلّ لغات۔ حَقّ کی تشریح کے لئے دیکھیں سورۃ رعد آیت نمبر ۱۵۔

مُنْظَرِيْنَ اَنْظَرَہُ الدَّيْنَ۔ اَخَّرَہٗ۔ قرض ادا کرنے کے لئے قرض دار کو مزید مہلت دی۔ یُقَالُ كُنْتُ اُنْظِرُ الْمُعْسِرَ اَیْ اُمْهِلُهٗ یعنی كُنْتُ اُنْظِرُ الْمُعْسِرَ کا فقرہ انہی معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ میں تنگدست قرض دار کو مہلت دیا کرتا تھا۔ (اقرب)

تفسیر۔ **بِالْحَقِّ کے تین معنے** حقّ کے معنے پہلے گزر چکے ہیں اس جگہ یا تو اس کے معنے سچے کلام کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ فرشتے کلام الٰہی کے ساتھ اُترا کرتے ہیں۔ مگر تم نہ رسول ہو کہ تم پر فرشتے اتریں اور نہ ہی

تم اس بات کے مستحق ہو کہ تمہیں کلام الٰہی سے مشرف کیا جائے یا اس جگہ پر حق کے معنے استحقاق کے ہیں۔ یعنے جیسا جیسا کسی کا حق ہو اس کے مطابق فرشتے اُترتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور مومنوں پر ان کے حق کے مطابق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو فرشتے اترتے ہیں وہ تو رحمت کے فرشتے ہیں وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی نظر آسکتے ہیں۔ وہ ان خدا تعالیٰ کا غضب سہیڑنے والوں کو کس طرح نظر آجائیں ان پر تو جب فرشتے اتریں گے غضب ہی کے اتریں گے اور اس وقت فرشتوں کا دیکھنا انہیں نفع نہ دے گا کیونکہ وہ ان کے ہلاک کرنے کے لئے آئیں گے اور ان کے آنے کے بعد آئمۃ الکفر کو ڈھیل نہ ملے گی۔ چنانچہ بدر کے موقعہ پر یہ سزا دینے والے فرشتے آئے اور بعض کفار کو کشفی حالت میں وہ نظر بھی آئے مگر وہ وقت ان کی ہلاکت کا تھا ان سے وہ کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے؟ (سیرۃ النبویۃ لابن ھشام باب غزوۃ بدر شھود الملائکۃ وقعۃ بدر)

ملائکہ کا کلام انسان کے قلب کے مطابق ہوتا ہے اس جگہ ایک بہت بڑا نکتہ بیان فرمایا گیا ہے وہ یہ کہ ملائکہ کا کلام انسان کے قلب کے مطابق ہوتا ہے جیسا انسان ہوگا ویسے ہی اس کے الہام ہوں گے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ الہام ہو گیا تو ہم بڑے آدمی ہو گئے حالانکہ یہ کافی نہیں کیونکہ الہام انسان کی اپنی فطرت کے مطابق ہی ہوا کرتا ہے۔

پہاڑی مزدور کا واقعہ قادیان میں ایک پہاڑی شخص مزدوری وغیرہ کی غرض سے آیا کرتا تھا وہ عموماً ہمارے ہاں ہی مزدوری وغیرہ کرتا تھا بعض اوقات کسی کام کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کے پاس چلا جاتا تو حضرت خلیفۃ اوّلؓ اسے نماز کی تاکید فرمایا کرتے تھے جس پر وہ جواب دیا کرتا کہ ’’نماز سانوں پجدی نئیں‘‘ (یعنی نماز ہمارے مناسب حال نہیں) اتفاقاً ایک روز آپ نے اسے مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا۔ فراغت کے بعد پوچھا کیا بات ہے؟ تو اس نے جواب دیا آج مجھے الہام ہوا ہے کہ ’’اُٹھ اوئے سورا نماز پڑھ‘‘ اَے سوَر اٹھ کر نماز پڑھ۔ اس لئے میں نے نماز شروع کر دی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ الہام شیطان کی طرف سے تو ہو نہیں سکتا یہ یقیناً خدائی الہام تھا مگر اس کے درجہ کے مطابق تھا۔ پس خالی الہام کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اس الہام کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا محبت کا بھی اظہار ہے یا اس بندے کی شان کے اظہار کی بھی کوئی صورت ہے؟

اس آیت سے ایک عام قانون کا پتہ چلتا ہے اور وہ یہ کہ فرشتے بالحق نازل ہوا کرتے ہیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ مومنوں میں ادنیٰ، اعلیٰ، مامور و غیر مامور سب ہی شامل ہیں۔ اسی طرح نبیوں میں مرتبہ کا تفاوت پایا جاتا ہے حضرت خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اسی طرح نبی کہلاتے ہیں جس طرح زکریا، الیاس اور یوسف علیہم السلام۔

پس جس طرح درجہ میں نام کی شرکت سب کو برابر نہیں بنا دیتی اسی طرح سب کی وحی وحی کہلا کر ایک سی نہیں ہو سکتی۔

ہر ایک نبی کا کلام اس کی شان کے مطابق ہوتا ہے ہر ایک نبی کا کلام اس کی شان کے مطابق ہوگا۔ اس اصل کو مدّ نظر رکھیں تو یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ تورات، انجیل، زبور وغیرہ کیوں قرآن کریم کی طرح بے نظیر نہیں۔ جن انبیاء پر وہ کلام نازل ہوئے انہی کی شان کے مطابق ان میں خدا تعالیٰ نے برکت رکھی۔ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ مختلف درجوں کے کام مختلف نبیوں کے سپرد کرتا لیکن سامان سب کو ایک سا دیتا بہرحال کام کے مطابق ہی اس نے سامان دینے تھے اور کام کے مطابق ہی اس نے کارکن مقرر کرنے تھے۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۱۰﴾

اس ذکر کو ہم نے ہی اُتارا ہے اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے

حلّ لُغات۔ الذِّکۡرَ کی تشریح کے لئے دیکھیں حل لغات سورۃ ہذا آیت نمبر ۷ و یوسف آیت نمبر ۱۰۵۔

تفسیر۔ ذکر کے معنے بتائے جا چکے ہیں کہ علاوہ اور معنوں کے اس لفظ کے معنے شرف اور نصیحت کے بھی ہیں۔ اس جگہ یہی معنے ہیں کفار نے طنزاً کہا تھا۔ کہ اے وہ شخص! جس پر یہ عزت بخش کلام نازل ہوا ہے۔ تو یقیناً مجنون ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے۔ یقیناً ہم نے ہاں! ہم نے اس عزت بخش کلام کو نازل کیا ہے۔

آیت کا پہلی آیت سے تعلق یہ ایک نہایت ہی زبردست آیت ہے۔ اور ایسی عجیب ہے کہ اکیلی ہی قرآن مجید کی صداقت کا بیّن ثبوت ہے۔ اس میں کتنی تاکیدیں کی گئی ہیں۔ پہلے اِنَّ لایا گیا ہے پھر نا کی تاکید نَحۡنُ سے کی گئی ہے۔ اور پھر آگے چل کر ایک اور اِنَّ اور لام لایا گیا ہے۔ گویا تاکید پر تاکید کی گئی ہے۔ کفّار نے اِنَّکَ لَمَجۡنُوۡنٌ کے جملہ میں دوسری تاکید سے کام لے کر تمسخر کیا تھا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ تاکید کے چار ذرائع استعمال کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ سنو! ہم نے ہاں! یقیناً ہم نے ہی اس شرف و عزت والے کلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اُتارا ہے اور ہم اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یقیناً ہم اس کی خود حفاظت کریں گے۔ اللہ اللہ کتنا زور ہے کس قدر حتمی وعدہ ہے!!

اس آیت کے متعلق یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کفار کے طنز میں ایک یہ معنے بھی پائے جاتے ہیں کہ ایسا بڑا زبردست کلام جس نے دنیا کو شرف بخشنا ہے اس کے ساتھ تو فرشتے بھی آنے چاہیے تھے۔ اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے کہ اے نادانو! تم فرشتے کہتے ہو اس کلام کی تو وہ عظمت ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہم خود آئیں گے اور دیکھیں گے کہ کون اس کلام پر بدنیتی سے ہاتھ ڈالتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فرشتے قرآن کریم کی حفاظت نہیں کرتے۔ کیونکہ جب خدا جو آقا ہے وہ حفاظت کرتا ہے تو فرشتے تو بدرجہ اولیٰ حفاظت کریں گے مگر اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ فرما کر ایک زائد بات بیان کی کہ اس میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جن کی حفاظت فرشتے بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمّے لی ہے۔ ہر چیز کی حفاظت فرشتے کرتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کے براہِ راست حفاظت کرنے میں ایک حکمت ہے اور قرآن مجید کو عام چیزوں سے ممتاز کرنے والا فرق ہے جسے میں آگے چل کر بیان کروں گا۔

یہ آیت اسلام کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت ہے اور اگر کوئی بے تعصب انسان اس آیت پر غور کرے تو سمجھ سکتا ہے کہ یہ دعویٰ انسانی نہیں۔ تمام مفسّر متفق ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ یہ آیت دعویٰ نبوت کے چوتھے سال میں نازل ہوئی۔ انگریز مصنف عام طور پر اس بات کے شائق ہوتے ہیں کہ وہ مسلمان مفسرین سے اختلاف کریں اور اس کے لئے انہوں نے ایک انٹرنل شہادت (اندرونی شہادت) کا قاعدہ بنا رکھا ہے یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ بات قرآن کے اندر سے نکلتی ہے۔ مگر وہ اس طریق کو ایسا غلط اور بے جا استعمال کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ اندرونی شہادت قرآن کی نہیں ہوتی بلکہ ان کے نفس کی ہوتی ہے۔ مگر اس ضمن میں مجھے انگریزی حوالے دیکھتے ہوئے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس بارہ میں مستشرقین کو بھی اختلاف کی گنجائش نہیں ملی۔ چنانچہ سپرینجر نے کہا ہے۔ کہ یہ سورۃ دعویٰ نبوت کے چوتھے سال میں نازل ہوئی تھی۔ روڈویل جس نے ترتیب کی تحقیق کے متعلق بزعم خود ایک کمال حاصل کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ یہ سورۃ ابتدائی سالوں کی سورتوں میں سے ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی ترتیب میں اسے ابتدائی سالوں کی سورتوں میں ہی رکھا ہے۔ نولڈک نے کسی قدر اختلاف کیا ہے اور اس کی بنیاد وہی غلط قاعدہ (انٹرنل شہادت کا) ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

(۱) اس میں کفار کی سختیوں کا ذکر ہے اس لئے یہ ابتدائی سالوں کی سورۃ نہیں ہو سکتی

(۲) اس میں یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ آتا ہے۔ یہ باقی ابتدائی سورتوں میں نہیں آتا۔ لہٰذا یہ بھی ابتدائی زمانہ کی نہیں

(۳) اس میں مشرکین کا لفظ ہے اس لئے یہ ابتدائی زمانہ کی نہیں ہو سکتی ہاں مکّی ضرور ہے۔ مکی زندگی کے آخری ایام میں اُتری ہے۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ نولڈک کی بات درست ہے یا دوسروں کی۔ مَیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نئی تحقیق

والے عرب اور یوروپین مصنف مفسرین کے ساتھ مل کر بالاتفاق کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ مکی زندگی کے آخری سال بھی نہایت ہی خطرناک تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھیوں سمیت شعب ابی طالب میں محبوس تھے جبکہ مسلمانوں کو اپنی حفاظت کے لئے جگہ نہ ملتی تھی۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ فرشتوں کی کیا ضرورت ہے ہم خود اس کی حفاظت کریں گے کتنا زوردار اور پُرشوکت دعویٰ ہے۔ اس فقرہ (اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ) کی طاقت کو وہی لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو عربی جانتے ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جب مسلمان خود گھرے ہوئے تھے اور ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ تم سارا زور لگالو اور قرآن مجید کے مٹانے کے لئے پوری طاقت خرچ کردو ہم خود اس کی حفاظت کریں گے اور ایک دن ایسا آتا ہے کہ ان مخالفتوں کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی آزاد ہوتے ہیں۔ آپؐ کو ترقی ملتی ہے ایک عظیم الشان جماعت آپ کے ساتھ ہو جاتی ہے اور قرآن مجید کی کما حقہ حفاظت ہوتی ہے اور آج تک ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ کیا یہ بے نظیر حفاظت دنیا کی اور کسی مذہبی کتاب کو حاصل ہوئی ہے؟ سرولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں بحث کے بعد لکھتا ہے۔

"What we have, though possibly created and modified by himself is still his own."

ترجمہ۔ اب جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ گو یہ بالکل ممکن ہے کہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے زمانہ میں اسے خود بنایا ہو اور بعض دفعہ اس میں خود ہی بعض تبدیلیاں بھی کردی ہوں۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ وہی قرآن ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں دیا تھا۔ (لائف آف محمد صفحہ ۵۶۲)

(۲) پھر لکھتا ہے۔

" We may upon the strongest presumption affirm that every verse in the Qur'an is genuine and unaltered composition of Muhammad himself."

ترجمہ۔ ہم نہایت مضبوط قیاسات کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہر ایک آیت جو قرآن میں ہے وہ اصلی ہے اور محمدؐ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی غیر محرّف تصنیف ہے۔ (لائف آف محمد صفحہ ۵۶۲)

(۳) پھر یہ بحث کرنے کے بعد کہ قرآن کی ترتیب ہمیں سمجھ نہیں آتی لکھتا ہے کہ:۔

" There is otherwise every security internal and external that we possess the text which Muhammad himself gave forth and used."

ترجمہ۔اس کے علاوہ ہمارے پاس ہر ایک قسم کی ضمانت موجود ہے۔اندرونی شہادت کی بھی اور بیرونی کی بھی کہ یہ کتاب جو ہمارے پاس ہے وہی ہے جو خود محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی اور اسے استعمال کیا کرتے تھے۔(لائف آف محمد صفحہ ۵۶۲)

(۴) پھر لکھتا ہے:۔

" And conclude with atleast a close approximation to the verdict of Van Hammer that we hold the Qu'ran to be as surely Muhammad's words as the Muhammadan held to be the word of God."

ترجمہ۔ہم وان ہیمر کے مندرجہ ذیل فیصلہ کے بالکل مطابق نہ سہی کم سے کم اس کے خیال کے بہت موافق فیصلہ تک پہنچتے ہیں۔وان ہیمر کا فیصلہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو قرآن موجود ہے اس کے متعلق ہم ویسے ہی یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اصلی صورت میں محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا بنایا ہوا کلام ہے جس یقین سے کہ مسلمان کہتے ہیں کہ وہ خدا کا غیر مبدّل کلام ہے۔

(۵) نولڈک کا قول ہے۔

" Slight clerical errors there may have been, But the Qu'ran of Othman contains none but genuine elements, though sometimes in very strange order. Efforts of European scholars to prove the existence of later interpolations in the Qu'ran have failed."

نولڈک کا اعتراف کہ قرآن مجید میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ترجمہ۔ممکن ہے کہ تحریر کی کوئی معمولی

غلطیاں (طرز تحریر) ہوں تو ہوں۔لیکن جو قرآن عثمانؓ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اس کا مضمون وہی ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے پیش کیا تھا۔گو اس کی ترتیب عجیب ہے۔یوروپین علماء کی یہ کوششیں کہ وہ ثابت کریں کہ قرآن میں بعد کے زمانہ میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی ہے بالکل ناکام ثابت ہوئی ہیں۔(انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ قرآن Koran)

یہ وہ شہادتیں ہیں جو اسلام کے شدید ترین دشمنوں کی ہیں۔اور اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ۔

قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے پر کتنی بڑی شہادت ہے کہ قرآن کریم امّیوں میں آتا ہے اور ہر طرح سے محفوظ رہتا ہے مگر تورات اور انجیل اپنے زمانہ کی علمی قوموں میں آئیں لیکن محفوظ نہ رہ سکیں۔میور اس کے متعلق کیا ہی پُرحسرت الفاظ لکھتا ہے۔

" To compare there pure texts with the various readings of our scriptures is to compare things between which there is no Analogy."

قرآن مجید کے غیر محرف ہونے کے متعلق میور کا اعتراف ترجمہ: مسلمانوں کی بالکل پاک اور غیر تبدیل شدہ کتاب اور ہماری کتب کے مختلف نسخوں کے باہمی اختلاف کا مقابلہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ دو ایسی چیزوں کا مقابلہ کیا جائے جن میں باہمی کوئی بھی مشابہت نہیں۔(لائف آف محمد صفحہ ۵۵۸)

قرآن شریف کا محفوظ ہونا اتفاقی بات نہیں اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ ایک اتفاق ہے کہ قرآن شریف آج تک محفوظ ہے؟ اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ اتفاق نہیں بلکہ اس کی ظاہر حفاظت الکتاب اور قرآن مبین کے دو ذریعوں سے ہوتی ہے جن کا ذکر اس سورۃ کے شروع ہی میں کیا گیا ہے۔شروع نزول ہی سے اس کی آیات لکھی جانے لگیں اور اس کی حفاظت ہوتی گئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے اسے ایسے عشاق عطا کئے جو اس کے ایک ایک لفظ کو حفظ کرتے اور رات دن خود پڑھتے اور دوسروں کو سناتے تھے۔اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے کسی نہ کسی حصے کا نمازوں میں پڑھنا فرض مقرر کر دیا اور شرط لگا دی کہ کتاب میں سے دیکھ کر نہیں بلکہ یاد سے پڑھا جائے۔اگر کوئی کہے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک بات سوجھ گئی تھی تو ہم کہتے ہیں کہ یہی بات زرتشت، موسیٰ اور وید والوں کو کیوں نہ سوجھی۔معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سوجھانے والا کوئی اور ہے۔کولمبس جب امریکہ کو دریافت کر کے واپس آ گیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے ہم جاتے تو ہم بھی امریکہ کو دریافت کر لیتے۔مگر کولمبس نے

اس کے جواب میں ایک انڈا دے کر کہا کہ تم یہ انڈا میز پر کھڑا کر دو سب نے کوشش کی مگر وہ کھڑا نہ ہوا۔ آخر میں کولمبس اُٹھا اور اُس نے ایک سوئی سے اس میں چھید کیا اور اس سے جو لعاب نکلا اس کی مدد سے اسے میز پر کھڑا کر دیا اس پر لوگوں نے کہا کہ ایسا تو ہم بھی کر سکتے تھے کولمبس نے کہا کہ امریکہ کی دریافت کے بارہ میں تو تم نے کہہ دیا کہ ہمیں موقع نہیں ملا مگر اس بارہ میں تو تم کو موقعہ مل گیا تھا کیوں نہ تم نے اپنی عقل سے کام لیا۔ پس ایسا ہی ہم بھی کہتے ہیں کہ وہ ذرائع حفاظت کے جو قرآن کے بارہ میں استعمال کئے گئے آخر کیوں قرآن کریم کے پیش کرنے والے کو ہی سوجھے کیوں دوسری جماعتوں نے اسے استعمال نہ کیا؟

یہ بھی یاد رہے کہ ایسے آدمیوں کا میسر آنا جو اسے حفظ کرتے اور نمازوں میں پڑھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طاقت میں نہ تھا۔ ان کا مہیا کرنا آپؐ کے اختیار سے باہر تھا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کہ ایسے لوگ ہم پیدا کرتے رہیں گے جو اسے حفظ کریں گے۔ آج اس اعلان پر تیرہ سو سال ہو چکے ہیں اور قرآن مجید کے کروڑوں حافظ گذر چکے ہیں بعض یوروپین ناواقفیت کی وجہ سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ اتنا بڑا قرآن کس کو یاد رہتا ہوگا مگر قادیان ہی میں کئی حافظ مل سکتے ہیں جنہیں اچھی طرح سے قرآن یاد ہے چنانچہ میرے بڑے لڑکے ناصر احمد سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی گیارہ سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔

قرآن مجید ایسے الفاظ میں نازل ہوا ہے کہ وہ سہولت سے یاد ہو جاتا ہے اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اپنے خاص تصرف سے ایسے الفاظ اور ایسی ترکیب سے نازل فرمایا ہے کہ وہ سہولت سے حفظ ہو جاتا ہے۔ قرآن شعر نہیں مگر شعر سے بھی زیادہ جلد یاد ہو جاتا ہے۔ اردو یا انگریزی کی عبارتوں کی نسبت قرآن شریف کے حفظ کرنے پر نصف وقت بھی صرف نہیں ہوتا۔

ایک انگریز مترجم قرآن لکھتا ہے کہ قرآن ایسی عبارت میں ہے کہ اس کو بغیر ترتیل کے پڑھنے کے چارہ ہی نہیں۔ پس قرآن مجید کی زبان ان اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ سامانوں میں سے ہے جن کے ذریعہ سے قرآن مجید کی حفاظت کی جاتی ہے۔

قرآن مجید کی حفاظت کے چار سامان سب سے اول اللہ تعالیٰ نے ایسے آدمیوں کو پیدا کیا جو اسے شروع سے لے کر آخر تک حفظ کرتے تھے۔ دوسرے اس کی زبان ایسی سہل اور دلنشین بنائی کہ سہولت سے یاد ہو جائے۔ سوم اس کی تلاوت نمازوں میں فرض کر دی۔ چہارم لوگوں کے دلوں میں اس کے پڑھنے کی غیر معمولی محبت پیدا کر دی۔

قرآن کریم کو بغیر معنے پڑھنے پر عیسائیوں کا اعتراض اور اس کا جواب عیسائی لوگ ہمیشہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ مسلمان قرآن کریم کو بے معنی ہی پڑھتے رہتے ہیں۔اس کے معنی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ بھی اس آیت میں مذکور وعدہ کی تصدیق ہے۔مسلمانوں کے دل میں اللہ تعالیٰ نے کس طرح قرآن کریم کی محبت ڈال دی ہے کہ معنی آئیں یا نہ آئیں وہ اسے پڑھتے چلے جاتے ہیں۔یقیناً ہر مسلمان کا فرض ہے کہ قرآن کریم کو بامعنی پڑھے اور اس طرف سے تغافل بڑی تباہی کا موجب ہوا ہے۔مگر باوجود معنے نہ جاننے کے مسلمانوں کا قرآن کریم کو یاد کرتے چلے جانا یقیناً اس آیت میں مذکور وعدہ کے پورا ہونے کی دلیل ہے۔

آج اگر بائیبل کے سارے نسخے جلا دیئے جائیں تو بائبل کے پیرو اس کا بیسواں حصہ بھی دوبارہ جمع نہیں کر سکتے لیکن قرآن مجید کو یہ فخر حاصل ہے کہ اگر (بفرض محال) سارے نسخے قرآن مجید کے دنیا سے مفقود کر دیئے جائیں تب بھی دو تین دن کے اندر مکمل قرآن مجید موجود ہو سکتا ہے۔اور بڑے شہر تو الگ رہے ہم قادیان جیسی چھوٹی بستی میں اسے فوراً حرف بحرف لکھوا سکتے ہیں۔

دنیا کی کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں کہ جسے مٹا دیا جائے اور وہ پھر بھی محفوظ رہے سوائے قرآن پاک کے۔

ایک ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کے لئے یہ مقرر فرمایا کہ ایسے سامان کر دیئے کہ قرآن مجید اپنے نزول کے معاً بعد تمام دنیا میں پھیل گیا اور اب اس میں تغیر و تبدل کا امکان ہی نہیں رہا۔کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ روسی حکومت نے ارادہ کیا کہ جہاد کی آیات نکال کر قرآن چھپوائیں مگر اسے بتایا گیا کہ قرآن مجید تو تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور یہ آیات ہر جگہ موجود ہیں پھر تم ان کو کیسے نکال سکو گے۔اس سے وہ اپنے ارادوں سے باز رہی۔

ایک ذریعہ قرآن مجید کی حفاظت کا یہ تھا کہ اسلامی علوم کی بنیاد قرآن مجید پر قائم ہوئی۔اس ذریعہ سے اس کی ہر حرکت و سکون محفوظ ہو گئے مثلاً نحو پیدا ہوئی تو قرآن مجید کی خدمت کے لئے چنانچہ نحو کے پیدا ہونے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ابوالاسود دوَلی حضرت علیؓ کے پاس آئے کہ ایک نیا مسلمان ''اِنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ وَرَسُوْلُهٗ'' کی بجائے وَرَسُوْلِهٖ پڑھ رہا تھا جس سے ڈر ہے کہ نومسلموں کو قرآن مجید کے مطالب سمجھنے میں مشکل پیش آئے۔حضرت علیؓ اس وقت گھوڑے پر سوار جا رہے تھے اسی حالت میں آپ انہیں بعض قواعد نحو بتاتے چلے گئے اور فرمایا کہ اسی قسم کے قواعد کو ضبط میں لے آؤ۔اس سے ان نومسلموں کو صحیح تلاوت کی توفیق ملے گی اور کچھ قواعد بنا کر فرمایا اُنْحُ نَحْوَهٗ یعنی اسی رنگ میں اور قواعد تیار کر لو۔اس فقرہ کی وجہ سے عربی گریمر کا نام نحو پڑ گیا۔پھر مسلمانوں نے تاریخ ایجاد کی تو قرآن مجید کی خدمت کی غرض سے کیونکہ قرآن مجید میں مختلف اقوام کے حالات آئے

تھے۔ان کو جمع کرنے لگے تو باقی دنیا کے حالات ساتھ ہی جمع کر دیئے۔پھر علم حدیث شروع ہوا تو قرآن مجید کی خدمت کے لئے تا معلوم ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے کیا معنے کئے ہیں؟

قرآن مجید کی حفاظت کے لئے علوم کی تجدید پھر اہل فلسفہ کے قرآن مجید پر اعتراضات کے دفعیہ کے لئے مسلمانوں نے فلسفہ وغیرہ علوم کی تجدید کی اور علم منطق کے لئے نئی مگر زیادہ محقق راہ نکالی۔پھر طب کی بنیاد بھی قرآن مجید کے توجہ دلانے پر ہی قائم ہوئی۔نحو میں مثالیں دیتے تھے تو قرآن مجید کی آیات کی۔ادب میں بہترین مجموعہ قرآن مجید کی آیات کو قرار دیا گیا تھا۔غرض ہر علم میں آیاتِ قرآنی کو بطور حوالہ نقل کیا جاتا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان سب کتابوں سے آیات کو جمع کیا جائے تو ان سے بھی سارا قرآن جمع ہو جائے گا۔مسلمانوں میں قرآن کریم کی خدمت کے لئے دوسرے علوم کی طرف رجوع کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوا کہ پہلی کتابوں سے تو دنیوی علماء کا طبقہ سخت بے زار تھا مگر مسلمانوں میں سے ان علوم کے ماہر ہمیشہ قرآن مجید کے خادم رہے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم سچے علوم کا دشمن نہیں بلکہ مؤید ہے۔

قرآن مجید کی حفاظت کے لئے علمی عربی زبان کی تبدیلی بند ہوگئی ایک بہت بڑا ذریعہ قرآن مجید کی حفاظت کا یہ بھی ہوا کہ نزول قرآن کے بعد علمی عربی زبان کی تبدیلی بند ہوگئی۔عربی کے سوا دنیا میں کوئی ایسی زبان نہیں پائی جاتی جو آج بھی وہی ہو جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھی چاسر اور شیکسپیر کی تین سو سال قبل کی انگریزی کی تشریح کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ بہت بدل چکی ہے مگر قرآن مجید کے سمجھنے کے لئے پرانی لغتوں کی ضرورت نہیں کیونکہ جو شخص علمی عربی آج پڑھتا ہے وہ قرآن کریم کو بھی بغیر کسی کی مدد کے سمجھ سکتا ہے۔

قرآن مجید کی حفاظت الہام کے ذریعہ ان ظاہری سامانوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا ایک ایسا ذریعہ بھی مقرر کیا جس میں ملائکہ کا بھی دخل نہیں اور وہ الہام ہے۔الہام میں ملائکہ بعض اوقات صرف پہنچانے والے ہوتے ہیں مگر انہیں اس کا سبب نہیں قرار دیا جا سکتا۔

قرآن مجید کی حفاظت مامورین اور مجددین کے ذریعہ حق یہ ہے کہ خدا کا کلام بندے کے ساتھ براہ راست ہوتا ہے۔ملائکہ صرف بطور واسطہ کے ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ’’اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ‘‘ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ ہم اس کلام کی آئندہ تازہ بتازہ الہام کے ذریعہ سے حفاظت کرتے رہیں گے یعنی مجدد اور مامور وغیرہ مبعوث کرتے رہیں گے۔

یہ ظاہر ہے کہ جس کتاب کے لفظ تو محفوظ ہوں۔مگر معنوں کی حفاظت نہ ہو وہ محفوظ کتاب نہیں کہلا سکتی مثلاً وید

ہیں اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ وہ لفظاً محفوظ ہیں ۔تو بھی وہ کتاب کامل ہونے کے لحاظ سے محفوظ نہیں کیونکہ جس زبان میں وہ نازل ہوئے ہیں وہ محفوظ نہیں رہی اس لئے اس کے معانی بالکل مشتبہ ہو گئے ہیں ۔اب اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام پا کر کوئی شخص اس کے صحیح معانی نہ بتائے تو کون یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ اس کا صحیح مطلب بیان کر رہا ہے یا اس کے مطابق عمل کر رہا ہے ۔یہ نقص اسی صورت میں دور ہو سکتا ہے کہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد ایسے لوگ کھڑے ہوتے رہیں جو کتاب کے صحیح مفہوم کی طرف لوگوں کو لاتے رہیں اور یہ حفاظت دائمی طور پر قرآن کریم ہی کو حاصل ہے ۔بے شک دوسری کتب سماویہ کو بھی اُس عرصہ میں کہ وہ زندہ کتب تھیں یعنے دنیا کے لئے قابل عمل تھیں یہ حفاظت حاصل تھی مگر اب نہیں ۔اب صرف قرآن کریم ہی کو یہ حفاظت حاصل ہے صرف اس کے ماننے والے ہر زمانہ میں خدا تعالیٰ سے براہ راست الہام پانے کے مدعی ہوتے چلے آئے ہیں ۔

قرآن مجید کی حفاظت کے لئے حضرت مسیح موعود کی بعثت اور اس زمانہ میں کہ دین سے غفلت انتہا کو پہنچ گئی ہے ۔اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا مامور مبعوث فرمایا ہے جس نے کلی طور پر قرآن کی تفسیروں کو زوائد اور حشو سے پاک کر کے اصلی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے حتیٰ کہ قرآن جو اسی زمانہ کے علوم کے سامنے ایک معذرت خواہ کی صورت میں کھڑا تھا ۔اب ایک حملہ آور کی صورت میں کھڑا ہے جس کے سامنے سب فلسفے اور مذاہب اس طرح بھاگ رہے ہیں جیسے شیر کے سامنے سے لومڑ ۔فَسُبْحَانَ اللّٰہِ الْمَلِکِ الْعَزِیْزِ ۔اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرا دعویٰ ہے کہ اس مامور کی اتباع کی برکت سے کسی علم کا متبع خواہ قرآن کریم کے کسی مسئلہ پر حملہ کرے ۔میں اس کا معقول اور مدلّل جواب دے سکتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر ذی علم کو ساکت کر سکتا ہوں خواہ وقتی جوش کے ماتحت وہ علی الاعلان اقرار کرنے کے لئے تیار نہ ہو میں نے اس کا ربع صدی سے زیادہ عرصہ میں تجربہ کیا ہے ۔میں سمجھتا ہوں کہ جب سے اس میدان میں داخل ہوا ہوں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ظاہر و باطن میں کبھی مجھے اس بارہ میں شرمندہ ہونے کا موقعہ نہیں ملا ۔

قرآن مجید کی معنوی حفاظت غرض خدا تعالیٰ نے قرآن مجید کی معنوی حفاظت کا مدار صرف عقل پر ہی نہیں رکھا اور اس کی تشریح کا انحصار صرف انسانی دماغ پر ہی نہیں چھوڑا بلکہ خود اپنے کلام سے اس کو ظاہر فرمانے کا ذمہ لیا ہے جس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جب اس طرح سے عملی پھل ظاہر ہوتے ہیں تو قرآن مجید کے محفوظ ہونے کا ایک بیّن ثبوت ملتا رہتا ہے ۔دوائی اگر فائدہ کرتی ہے تو ہم اسے تازہ سمجھتے ہیں ورنہ بوسیدہ سمجھتے ہیں ۔قرآن مجید کے تازہ پھل بھی ثابت کرتے رہتے ہیں کہ قرآن مجید محفوظ اور زندہ کتاب ہے اور یہ قرآن مجید کی حفاظت کا ایسا زبردست

ذریعہ ہے جو اور کسی کتاب کو میسر نہیں اور نہ کبھی ہوگا۔

قرآن مجید کا نام ذکر رکھے جانے کی وجہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ ذِکر کے معنے شرف اور نصیحت کے بھی ہیں قرآن کریم کا نام ذکر اس لئے رکھا گیا کہ اس کے ذریعہ سے اس کے ماننے والوں کو شرف اور تقویٰ حاصل ہوگا۔ پس اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ کلام جس کا یہ دعویٰ ہے کہ میرے ذریعہ سے ماننے والوں کو شرف اور عزت اور تقویٰ ملے گا۔ ہمارا ہی اُتارا ہوا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں یعنی ان صفات کو عملاً پورا کرنا ہمارا ہی کام ہے۔ اگر یہ صفات اس کی ظاہر نہ ہوں تو گویا اس کی تعلیم ضائع گئی مگر ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

اس آیت میں کفار کی تباہی اور مسلمانوں کے غلبہ کی بھی پیشگوئی ہے کیونکہ قرآن کریم ہر قسم کی سیاسی، اقتصادی اور نظامی تعلیمات کا مجموعہ ہے اور شرعی کلام جب تک اپنے ابتدائی ایام میں ایک حکومت کے ساتھ متعلق نہ ہو اس کی تعلیم کے عملی حصہ کی خوبیاں پوری طرح ظاہر نہیں ہوسکتیں۔ پس الذکر کی حفاظت کے لئے ایک حاکم قوم کی ضرورت تھی اور ایسی قوم کے قیام سے پہلے عرب کی موجود الوقت حکومت کی تباہی لازمی تھی۔

لوگ اسلامی حکومت کے قیام کو ایک اتفاق کہہ دیا کرتے ہیں۔ اول تو محض اسلامی حکومت کا قیام بھی ان حالات کو دیکھتے ہوئے جن میں وہ قائم ہوئی کسی صورت میں اتفاق نہیں کہلا سکتا لیکن اس پیشگوئی کو دیکھتے ہوئے تو کوئی انسان جس میں ذرا بھر بھی عقل ہو اسے اتفاق نہیں کہہ سکتا۔

قرآن یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ عربوں کی حکومت ٹوٹ کر ان کی جگہ مسلمانوں کی حکومت ہوجائے گی۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئے گی (۱) جو خدا ترس ہوں گے۔ (۲) جو دنیا کی نگاہ میں اعلیٰ شرف والے قرار پائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہزاروں حکومتیں ٹوٹتی ہیں اور دوسری ان کی جگہ لیتی ہیں مگر کیا ہر حکومت کے ٹوٹنے کے بعد جو دوسری حکومت جگہ لیتی ہے وہ انہی صفات کی حامل ہوتی ہے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے؟ مگر اس پیشگوئی کے نتیجہ میں عرب کی حکومت ٹوٹ کر کیسی حکومت قائم ہوئی؟ شدید سے شدید دشمن بھی جو اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالیاں دیتا ہے جب ابوبکرؓ اور عمرؓ تک پہنچتا ہے تو عزت سے گردن جھکا لیتا ہے اور ان کے تقویٰ اور عقل اور فہم اور نیک انتظام اور ایثار اور قربانی کا اعتراف کرتا ہے۔ اس قسم کی حکومت کا قائم ہوجانا بھی کیا اتفاق کہلا سکتا ہے خصوصاً جبکہ وہ پیشگوئی کے ماتحت تھی اور قرآن کریم میں صاف کہہ دیا گیا تھا کہ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ کِتٰبًا فِیۡہِ ذِکۡرُکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (الانبیاء:۱۱) ہم نے یقیناً تمہاری طرف ایک ایسی کتاب اتاری ہے

جس میں تمہارے شرف دینی اور دنیوی عزت کے سامان موجود ہیں پھر تم کیوں مخالفت سے باز نہیں آتے؟

لفظ ذکر میں مسلمانوں کی ترقی کی پیشگوئی اسی صفت کے کمال کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن کریم کا نام بعض دفعہ اَلذِّکْر آتا ہے اور آیت زیر تفسیر میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اے کفار! تم طنز سے کہتے ہو کہ اے وہ شخص! جس پر وہ کلام نازل ہوا ہے جس میں ماننے والوں کے لئے بڑی عزت اور تقویٰ کا دعویٰ کیا گیا ہے تو پاگل ہے۔ مگر مَیں تم کو بتاتا ہوں کہ یہ کلام میرا ہی نازل کیا ہوا ہے اور میں اس شرف کے وعدہ کو ضرور پورا کرکے رہوں گا کیونکہ یہ شرعی کلام ہے اور بغیر اس کے کہ ابتدائی زمانہ میں اس کے ماننے والوں کو حکومت ملے اور دینی رتبہ کے ساتھ دنیوی رتبہ بھی حاصل ہو۔ یہ کلام عملی جامہ نہیں پہن سکتا اور غیر محفوظ ہوجاتا ہے پس ضرور ہے کہ میں موجودہ نظام کو توڑ کر وہ نظام قائم کروں جس میں مسلمانوں کو قرآنی تعلیم کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ ملے اور ان کو ایسے شرف اور تقویٰ کے اظہار کا موقعہ ملے جس کا وعدہ قرآن میں کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اس آیت کو وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ (الحجر: ۵) والی آیت کے ساتھ ملا کر دیکھنے سے اور بھی واضح ہوجاتا ہے۔

ہر نبی کے کلام کی حفاظت کئے جانے کے متعلق ایک سوال کا حل ایک سوال کا حل اس موقعہ پر ضروری ہے میں نے اس نوٹ کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ ہر نبی کے کلام کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اگلی آیات اس مضمون کی تصدیق کرتی ہیں اور یہ قانون ہر نبی کے متعلق ہے اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ درست ہے تو کیا (۱) پہلے انبیاء کی وحی اب تک بعینہٖ محفوظ ہے؟ (۲) اگر نہیں تو پھر یہ کیونکر تسلیم کیا جائے کہ قرآن کریم ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ کیوں نہ تسلیم کیا جائے کہ یہ بھی پہلے انبیاء کی وحیوں کی طرح کسی وقت بگڑ جائے گا۔ اس سوال کا جواب خود آیت زیر تفسیر کے الفاظ ہی دے رہے ہیں قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ ہم قرآن کی حفاظت کریں گے یا کتاب کی حفاظت کریں گے بلکہ الذکر کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔

جب تک کوئی کلام الذِّکْر رہے اس کی حفاظت کی جاتی ہے اس لفظ کو استعمال کرکے حفاظت کے دائرہ کو محدود کردیا گیا ہے جب تک کوئی کلام الذکر رہے یعنے (۱) ایک طرف تو بندہ اور خدا تعالیٰ کے تعلق کو قائم کرتا رہے (ذکر کے معنے یاد کرنے کے ہیں) اور بندہ کو ایسے قیام پر کھڑا رکھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں سرشار رہے اور (۲) دوسری طرف اسے ایسا مقام عطا کرے کہ اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد کرتا رہے یعنے خدا تعالیٰ کی وحی اور نصرت اور امداد بندہ کو حاصل رہے اس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ ذمہ لیتا ہے جو کلام ان خوبیوں کا حامل رہے گا۔ خدتعالیٰ اس کی حفاظت کرے گا اور جو کلام ان خوبیوں کا حامل نہ ہوگا اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت چھوڑ دے گا۔

یہ امر ظاہر ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی کلام کو دنیا کے لئے قابل عمل سمجھے گا۔ اس میں یہ خوبیاں پائی جائیں گی اور جب اللہ تعالیٰ کسی کلام کو ضرورت زمانہ کے پورا کرنے سے قاصر قرار دے دے گا اور اس کی حفاظت چھوڑ دے گا تا کہ نئے سرے سے ایسا کلام نازل کرے۔ جو ضرورت زمانہ کے مطابق ہو تو مذکورہ بالا امور اس نئے کلام کے ذریعہ سے پورے ہونے لگیں گے اور سابق کلام سے پورے نہ ہوں گے اور جب وہ ضرورت جس کے لئے کلام الٰہی نازل ہوتا ہے۔ پوری نہ ہوگی۔ تو اس کی حفاظت کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی حفاظت اُٹھ جائے گی تو شرارتی لوگوں کو اس کلام میں دخل دینے کا اور تحریف کرنے کا موقعہ بھی ملتا رہے گا۔

ہر نبی کی وحی جب تک الذکر رہی اس کی حفاظت ہوتی رہی خلاصہ کلام یہ کہ باوجود اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے کہ وہ ہر نبی کی وحی کی حفاظت کرے گا۔ پہلے انبیاء کی وحی اگر محفوظ نہیں رہی۔ تو قابل اعتراض نہیں۔ کیونکہ قرآن نے الذکر کی شرط لگائی ہے۔ جب تک وہ الذکر رہے۔ ان کی حفاظت ہوتی رہی۔ جب وہ الذکر نہ رہے ان کی حفاظت کا وعدہ ختم ہو گیا۔ اور یہ کہ وہ الذکر نہ رہے۔ ایک بدیہی بات ہے۔ کم سے کم اپنے زمانہ میں ہم میں سے ہر اک اس کا تجربہ کر سکتا ہے۔ آج کل سوائے اسلام کے ایک مذہب بھی نہیں جو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ اس کے پیرووں میں کوئی ایسا شخص موجود ہے۔ جو الذکر کا عملی ثبوت ہو یعنے اس کا یہ دعویٰ ہو کہ اپنے مذہب کی کتاب پر چل کر اسے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو گیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ اسے یاد کرتا ہے یعنے اس سے کلام کرتا ہے اور اس کے لئے اپنی قدرتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ جو الذکر کا مفہوم ہے۔ پس جب عملاً وہ کتب الذکر کا مصدق نہیں رہیں۔ تو ان کی حفاظت بھی جاتی رہی اور ان کے محرّف و مبدّل ہونے میں کوئی آسمانی روک نہیں۔

قرآن مجید اب تک ذکر ہے باقی رہا سوال کا یہ حصہ کہ پھر کیوں قرآن کریم کی نسبت بھی یہ نہ تسلیم کیا جائے کہ وہ بھی حفاظت سے باہر ہو گیا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اب تک الذکر ہے۔ اس پر چل کر آج بھی انسان خدا تعالیٰ کو پا سکتا ہے۔ پس چونکہ وہ اس ضرورت کو پورا کر رہا ہے جس کے لئے اسے نازل کیا گیا تھا وہ خدا تعالیٰ کی حفاظت سے باہر نہیں ہو سکتا اور کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اس کے اندر کوئی تغیّر و تبدّل کرے۔

اب رہا سوال آئندہ کا سو اس کا اول تو یہ جواب ہے کہ اس وقت تک اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا اور آئندہ کے لئے قرآن کریم میں پیشگوئیاں موجود ہیں کہ جب بھی مسلمان اسلام سے غافل ہوں گے اللہ تعالیٰ مامور بھیجتا رہے گا۔ پس اس وعدہ کی موجودگی میں ہم یقین رکھتے ہیں کہ چونکہ قرآن کریم سے ہمیشہ دنیا کی ضرورت پوری ہوتی رہے گی وہ نسخ کو قبول نہیں کرے گا اور جب وہ نسخ کو قبول نہیں کرے گا تو یقیناً وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے

گا کیونکہ کوئی عقلمند اپنی کارآمد شے کو تباہ نہیں ہونے دیتا اور اللہ تعالیٰ تو سب عقلمندوں سے بڑھ کر عقلمند ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ⑪

اور ہم نے اگلے (زمانہ کے) لوگوں کی جماعتوں میں (بھی) تجھ سے پہلے رسول بھیجے تھے۔

حلّ لُغات - شِيَعٌ - شِيَعٌ شِيْعَةٌ کی جمع ہے - شِيْعَةُ الرَّجُلِ ۔اَتْبَاعُهٗ وَاَنْصَارُهٗ شِيْعَةُ الرَّجُلِ کے معنے ہیں۔آدمی کے اتباع اور مددگار (اقرب) شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ کے متعلق فراء نے کہا ہے کہ یہ اِضَافَةُ الشَّیْءِ اِلٰی صِفَتِهٖ کی طرز پر ہے۔یعنی اس کے معنے ہیں پہلے جتھے۔(بحر محیط)

تفسیر ۔**اللہ تعالیٰ نے تمام گروہوں کو شیعہ کہا ہے** اللہ تعالیٰ نے تمام گروہوں کو شیعہ کہا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی تردید ہوتی جو کہا کرتے ہیں کہ ہم ہر طرح سے آزاد ہیں جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں وہ نہ آزاد ہوتے ہیں اور نہ اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں وہ یہ فقرہ صرف چالاکی سے کہتے ہیں تا کہ وہ تو اعتراض کرتے چلے جائیں لیکن ان پر کوئی اعتراض نہ کر سکے۔

آزادی کا دعویٰ کرنا غلط ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بات ہی غلط ہے کہ کوئی آزاد بھی ہوتا ہے ہر آدمی کسی نہ کسی کے ماتحت یا کسی نہ کسی جتھے میں ضرور ہوتا ہے۔خواہ مذہب کی بنا پر ہو خواہ رسم کی بناء پر خواہ فلسفہ کی بنا پر کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ آزاد ہو ہر انسان کو اپنی زندگی میں اتنے امور سے واسطہ پڑتا ہے کہ ہر امر کی بابت تحقیق کرنا اس کے لئے ناممکن ہوتا ہے۔اس لئے کچھ نہ کچھ امور میں وہ ایسے لوگوں کے خیالات کو قبول کر لیتا ہے جن پر اسے اعتقاد ہوتا ہے۔

شیع الاولین سے انسان کے نقل کرنے کی طرف اشارہ سائیکالوجی والے (علم النفس کے ماہرین) کہتے ہیں کہ انسان میں نقل کرنے کا مادہ اس کا سب سے بڑا خاصہ ہے۔اسی بات کو اس جگہ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ کہہ کر بیان کیا گیا ہے یعنے مختلف جتھے جو کسی نہ کسی سبب سے آپس میں متحد تھے۔

اس آیت کا پہلی آیت سے تعلق اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے بھی نبی گزرے ہیں اور ان کی تعلیم کی بھی اللہ تعالیٰ نے حفاظت کی ہے اسی طرح اس رسول کی تعلیم کی بھی حفاظت کرے گا حفاظت سے مراد جیسا کہ بتایا جا چکا ہے نہ صرف لفظی حفاظت ہے بلکہ معنوی حفاظت بھی ہے جو شرعی نبیوں کے

زمانہ میں علاوہ اور ذرائع کے اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ان کے زمانہ میں ہی حکومت ان کی جماعت کو مل جاتی ہے اور وہ عملاً اس شریعت کو رائج کر کے اس کے اصلی معنوں کو ظاہر کر جاتے ہیں اور جو شرعی نبی نہ ہوں۔ ان کی جماعت کو بھی اللہ تعالیٰ غلبہ دیتا ہے تا کہ ان کی تعلیم کے عملی ثمرات ظاہر ہوں لیکن ان کے لئے فوری حکومت کا ملنا ضروری نہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ کلام الٰہی کی حفاظت کا سلسلہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے اسی رنگ میں تم اب نشان دیکھ لوگے۔

نہایت تعجب کی بات ہے کہ انبیاء کے منکرین اس سہل ترین راستہ کو قبول کرنے سے ہمیشہ پہلو تہی کرتے ہیں جو انہیں یقینی طور پر سچے نبی کی شناخت میں ممد ہو سکتا ہے اور وہ راستہ منہاج نبوت کے مطابق مدعی کے دعویٰ کو پرکھنا ہے۔ اگر منہاج نبوت کے مطابق مدعی کے دعویٰ کو پرکھا جائے تو اس کی صداقت یا اس کے کذب کو معلوم کرنا ایک ساعت کا کام ہوتا ہے مگر اسی راستہ کو قبول کرنے سے وہ پہلو تہی کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صداقت کو معلوم کرنا مطلوب نہیں ہوتا بلکہ خلط مبحث کر کے سچائی سے گریز کرنا مطلوب ہوتا ہے۔

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۱۲﴾

اور جو رسول بھی ان کے پاس آتا تھا وہ اس کی ہنسی اُڑاتے تھے۔

تفسیر ۔ اِسْتِهْزَاءٌ اس ہنسی کو کہتے ہیں جس میں تحقیر پائی جائے۔ اس آیت کا تعلق ایک تو يٰاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ سے ہے کہ اس میں کفار کے تمسخر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

کفار کا انبیاء سے تمسخر فرماتا ہے اس نبی سے تم نے تمسخر کر لیا تو کیا ہوا وہ انبیاء جن کو تم مانتے ہو ان سے بھی تو تمسخر ہوتا رہا ہے۔ دوسرے یہ بتایا کہ ہر نبی کے کلام اور اس کی تعلیم کی حفاظت کا وعدہ ہوتا ہے اور یہ امر کفار کو عجیب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری مخالفت کے باوجود یہ تعلیم کس طرح باقی رہ جائے گی اور وہ اس دعویٰ کو غیر معقول سمجھ کر اس سے ہنسی کرتے رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ ہر نبی سے تمسخر ہوا ہے پھر بھی جب کوئی نیا نبی آتا ہے دنیا اس سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ کیوں اسے خاص شان نہیں ملی۔ اگر خاص شان اور طاقت سے نبی آتے تو گزشتہ نبیوں سے تمسخر کیونکر ہو سکتا تھا؟

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۙ﴿۱۳﴾

اسی طرح ہم اس (عادت استھزاء) کو مجرموں کے دلوں میں داخل کرتے ہیں۔

حلّ لُغات۔ نَسْلُكُهٗ نَسْلُكُ سَلَكَ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور سَلَكَ الْمَكَانَ سَلْكًا وَسُلُوْكًا کے معنی ہیں دَخَلَ فِيْهِ کسی جگہ میں داخل ہوا اور اس کے اندر گیا سَلَكَ الطَّرِيْقَ اَيْ دَخَلَهٗ وَسَارَ فِيْهِ مُتَّبِعًا اِيَّاهُ۔ فَهُوَ سَالِكٌ۔ اور سَلَكَ الطَّرِيْقَ کے معنی ہیں۔ راستہ اختیار کرکے اس پر چل پڑا اور اس سے اسم فاعل سَالِكٌ (یعنی راستہ اختیار کرکے اس پر چلنے والا) آتا ہے۔ سَلَكَ الشَّيْءَ فِي الشَّيْءِ۔ اَدْخَلَهٗ فِيْهِ كَمَا تُسْلَكُ الْيَدُ فِي الْجَيْبِ وَالْخَيْطُ فِي الْاِبْرَةِ۔ اور سَلَكَ الشَّيْءَ فِي الشَّيْءِ کے معنی ہیں۔ ایک چیز کو دوسری چیز کے اندر داخل کیا جیسے گریبان میں ہاتھ ڈالنا یا سوئی کے سوراخ میں تاگہ ڈالنا۔ وفی القرآن سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ۔ اور قرآن مجید کی آیت سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے۔ وَسَلَكَ فُلَانًا الْمَكَانَ کے معنے ہیں اَدْخَلَهٗ۔ فلاں شخص کو مکان میں داخل کیا۔ (اقرب)

المجرمین اَلْمُجْرِمِيْنَ (جَرَمَ۔ يَجْرِمُ۔ جَرْمًا) جَرَمَهٗ کے معنی ہیں۔ قَطَعَهٗ۔ کاٹا۔ وَمِنْهُ جَرَمَ النَّخْلَ جَرْمًا اِذَا صَرَمَهٗ کھجور کو کاٹ کر جدا کردیا۔ جَرَمَ زَيْدٌ۔ اَذْنَبَ۔ زید نے جرم کا ارتکاب کیا۔ جَرَمَ عَلٰى قَوْمِهٖ وَاِلٰى قَوْمِهٖ جَرِيْمَةً جَنٰى۔ جِنَايَةً قوم پر زیادتی کی۔ وَجَرَمَ لِاَهْلِهٖ۔ كَسَبَ۔ کمایا۔ وَمِنْهُ فِي الْقُرْاٰنِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اَيْ لَا يَكْسِبَنَّكُمْ وَفُسِّرَ اَيْضًا بِلَا يَحْمِلَنَّكُمْ۔ اور قرآن مجید کی آیت لَا يَجْرِمَنَّكُمْ میں جرم کے معنے کمانے کے کئے گئے ہیں۔ یعنے دشمن کی دشمنی تمہارے لئے اس امر کی محرک نہ ہو کہ تم ظلم کماؤ۔ اس کے علاوہ اس سے یہ بھی مراد لی گئی ہے۔ کہ لَا يَحْمِلَنَّكُمْ یعنی تم کو آمادہ نہ کرے۔ اَجْرَمَ۔ اَذْنَبَ۔ عَظُمَ جُرْمُهٗ۔ اَجْرَمَ کے معنے ہیں۔ قصور کیا اور اس کا قصور بڑا تھا۔ اَجْرَمَ عَلَيْهِمْ جَنٰى ظلم کیا۔ (اقرب) ان تمام محاورات سے ظاہر ہے کہ اصل میں جرم کے معنے قطع کے ہوتے ہیں۔ گناہ چونکہ خدا تعالیٰ سے قطع تعلق کرواتا ہے اور بنی نوع انسان سے بھی۔ اس لئے اسلامی شریعت میں گناہ کو جرم کہا جاتا ہے اور گناہ وہی ہوتا ہے۔ جس سے یا خدا سے تعلق ٹوٹے یا بندوں سے بگاڑ پیدا ہو۔ پس اَلْمُجْرِمُ کے معنے ہونگے صَارَ اِذَا جُرْمٍ یعنی تعلق کو کاٹنے والا۔

تفسیر۔ **نَسْلُكُهٗ کی ضمیر کے مرجع کے متعلق اختلاف** اس آیت میں نَسْلُكُهٗ کی ضمیر کے

مرجع کے متعلق مفسرین میں اختلاف ہوا ہے بعض نے اسے لَا یُؤْمِنُوْنَ کی طرف بطور ضمیر مقدم کے راجع کیا ہے اور بعض اس کو پہلی آیت کی طرف لے گئے ہیں (مجمع البیان زیر آیت ھذا) ۔مگر میرے نزدیک اس کا مرجع استہزاء ہے۔ جو پہلی آیت میں مذکور ہوا ہے۔

نَسْلُكُهٗ کی ضمیر کا مرجع استہزاء ہے كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ۔ کہہ کر اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ جب انسان برے فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو صرف اس گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ بلکہ گناہ کی نفرت بھی اس کے دل سے کم ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کے دل میں گناہ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور گناہ اس کے دل میں گھر بنا لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ گناہ کے طبعی نتائج نکالتا ہے اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو گنہگار نہیں بناتا۔ بلکہ گناہ کے طبعی نتائج نکالتا ہے۔ اور اس کا الزام اللہ تعالیٰ پر نہیں بلکہ خود گنہگار پر آتا ہے۔

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۴﴾

یہ (لوگ) اس پر ایمان نہیں لاتے۔ حالانکہ پہلوں (کے متعلق اللہ تعالیٰ) کی سنت گزر چکی ہے۔

حلّ لُغات ۔اَلسُّنَّةُ اَلسُّنَّةُ اَلسِّيْرَةُ سنت کے معنی ہیں دستور۔ اَلطَّرِيْقَةُ۔ طریقہ۔ اَلطَّبِيْعَةُ۔ طبیعت عادت۔ (اقرب)

تفسیر ۔**استہزاء سے دل سخت ہو جاتے ہیں** یعنے استہزاء کی جب عادت ہو جاتی ہے تو دل سخت ہو جاتے ہیں اور آخر باوجود کھلے نشانات دیکھنے اور واضح ثبوت موجود ہونے کے لوگ ایمان سے محروم ہو جاتے ہیں یہی حال پہلی قوموں کا ہوا۔ یہی ان کا ہوگا۔ استہزاء کر کے کس نے ہدایت پائی کہ اب یہ پائیں گے۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ

اور اگر (بالفرض) ہم ان پر (شناخت کی) کوئی آسمانی راہ کھول (بھی) دیتے۔ اور وہ اس میں چڑھنے لگتے

يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۵﴾ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ

(اور قرآن مجید کا منجانب اللہ ہونا ان پر ظاہر ہو جاتا) تو (بھی) وہ (یہی) کہتے (کہ) محض ہماری نظروں پر پردہ

قَوۡمٌ مَّسۡحُوۡرُوۡنَ ؑ ⑯

ع ۱۶

ڈالا گیا ہے (ورنہ حقیقت کچھ بھی نہیں) بلکہ ہم (لوگوں) پر (کوئی) جادو کر دیا گیا ہے۔

حلّ لُغات -**یَعۡرُجُوۡنَ** یَعۡرُجُوۡنَ عَرَجَ یَعۡرُجُ عُرُوۡجًا سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے۔ اور عَرَجَ الرَّجُلُ فِی الدَّرَجَۃِ وَالسُّلَّمِ کے معنی ہیں۔اِرۡتَقٰی۔آدمی سیڑھی پر چڑھا۔وعُرِجَ بِہٖ عَلَی الۡمَجۡھُوۡلِ۔ صُعِدَ بِہٖ۔اور مجہول ہو تو اس کے معنے ہیں۔اس کو چڑھا کر لے جایا گیا۔(اقرب)

سُکِّرَتۡ سُکِّرَتۡ سَکَرَ (یَکۡسُرُ سَکۡرًا) اَلۡاِنَاءَ کے معنے ہیں۔مَلَأَہٗ۔برتن کو بھر دیا۔سَکَرَتِ الرِّیۡحُ۔ سَکَنَتۡ بَعۡدَ الۡھُبُوۡبِ ہوا چلنے کے بعد تھم گئی۔سَکَرَتۡ عَیۡنُہٗ۔تَحَیَّرَتۡ وَ سَکَنَتۡ عَنِ النَّظَرِ۔آنکھ حیران ہوگئی اور دیکھنے سے رک گئی۔سَکَرَ الۡبَابَ۔سَدَّہٗ۔دروازہ بند کر دیا۔سُکِرَت اَبۡصَارُنَا مَجۡھُوۡلًا حُبِسَتۡ۔آنکھیں روکی گئیں۔سُکِّرَت اَبۡصَارُنَا مَجۡھُوۡلًا۔حُبِسَتۡ وحُیِّرَتۡ۔آنکھیں حیران کردی گئیں اور روکی گئیں۔(اقرب)

اَبۡصَارُنَا اَبۡصَارُنَا اَبۡصَارٌ۔بَصَرٌ کی جمع ہے۔اور اَلۡبَصَرُ کے معنی ہیں۔حَاسَّۃُ الرُّؤۡیَۃِ۔دیکھنے کی حس۔ اَلۡعَیۡنُ آنکھ۔اَلۡعِلۡمُ علم۔(اقرب)

مَسۡحُوۡرُوۡنَ سَحَرَ۔یَسۡحَرُ۔سِحۡرًا کے معنے ہیں۔عَمِلَ لَہُ السِّحۡرَ وخَدَعَہٗ۔اس پر سحر کیا اور اسے دھوکا دیا۔سَحَرَ عَنۡہُ۔تَبَاعَدَ۔دور ہو گیا۔سَحَرَ فُلَانًا عَنِ الۡاَمۡرِ صَرَفَہٗ۔کام سے روک دیا۔سَحَرَ بِکَلَامِہٖ وَالۡحَاظِہٖ۔اِسۡتَمَالَہٗ وَسَلَبَ لُبَّہٗ۔اپنے کلام اور نظروں سے مائل کر لیا اور عقل کو چھین لیا۔سَحَرَ الۡمَطَرُ الطِّیۡنَ وَالتُّرَابَ سَحۡرًا اَفۡسَدَہٗ فَلَمۡ یَصۡلَحۡ لِلۡعَمَلِ۔بارش نے مٹی اور کیچڑ کو خراب کر دیا اور وہ کام کے قابل نہ رہی۔ اَلۡمَسۡحُوۡرُ اَیۡضًا اَلۡمُفۡسَدُ مِنَ الطَّعَامِ وَالۡمَکَانِ لِکَثۡرَۃِ الۡمَطَرِ اَوۡ مِنۡ قِلَّۃِ الۡکَلَاءِ۔مسحور کے ایک معنے برے کھانے کے ہیں اور ایسی جگہ پر بھی مسحور کا لفظ بولتے ہیں جو کثرت بارش یا گھاس کی کمی کی وجہ سے خراب ہو جاوے۔(اقرب)

تفسیر۔ کفار کی طرف سے فرشتوں کے دکھانے کے مطالبے پر دو جواب لَوۡ مَا تَاۡتِیۡنَا بِالۡمَلٰٓئِکَۃِ کی آیت میں کفار کی طرف سے مطالبہ بیان ہوا تھا کہ اگر اس کا دماغ (نعوذ باللہ) خراب نہیں اور اسے وہم نہیں تو جو فرشتے اس پر نازل ہوتے ہیں وہ ہمیں کیوں نہیں دکھاتا۔

پہلا جواب اس کا جواب ایک تو یہ دیا تھا کہ فرشتے ہر ایک کے مناسب حال نازل ہوتے ہیں۔ یہ تو عذاب کے مستحق ہیں۔ عذاب ہی کے فرشتے ان پر نازل ہوں گے مگر ان کے نزول سے یہ ہلاک ہونے کے بعد کیا فائدہ اُٹھائیں گے۔

دوسرا جواب دوسرا جواب یہ دیا کہ تم فرشتوں کا کہتے ہو اور ان کے نزول پر تعجب کرتے ہو۔ ہم تو اس پر نازل ہونے والے کلام کی خود حفاظت کریں گے کیونکہ وہ ہمارا کلام ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ واری سب سے زیادہ ہم پر پڑتی ہے۔ آخر ہم پہلے نبیوں کے زمانہ میں بھی یہ کام کرتے آئے ہیں۔ اب کیوں نہ کریں گے پھر فرمایا تھا کہ یہ استہزاء ان کا تعجب انگیز نہیں کہ سب نبیوں کے دشمنوں نے ان سے استہزاء کیا اور اس قدر استہزاء کیا کہ آخر گناہ ان کی غذا ہو گیا اور اس میں ان کو لذت آنے لگی اور وہ ایمان سے محروم ہو گئے یہی ان کا حال ہے۔

کفار کے مطالبہ کا ایک اور طریق پر جواب اب ایک اور طریق پر انہیں جواب دیتا ہے۔ فرماتا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ فرشتے ہمیں کیوں نہیں دکھاتا آپ ہی گھر میں بیٹھا دیکھ لیتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا ہر بات کو ہر شخص سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ جب تک دل میں اس سے مناسبت نہ ہو بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ تم کو تو الٰہی علوم سے اس قدر بُعد ہے کہ اگر اسی قسم کے نظارے تم کو نظر آنے لگیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر آتے ہیں اور تم کو روحانی مدارج کی سیر بھی کرائی جائے تو تم کبھی نہ مانو گے بلکہ یہی کہو گے کہ ہماری آنکھوں پر جادو کر دیا گیا ہے ہمیں عجیب عجیب قسم کے نظارے نظر آتے ہیں کیونکہ تمہارے قلوب میں روحانی علوم سے کوئی لگاؤ نہیں۔

آسمانی دروازہ کھلنے اور اوپر چڑھنے سے مراد گویا آسمانی دروازہ کے کھلنے سے مراد اس جگہ آسمانی انکشاف ہے اور اوپر چڑھنے سے مراد بعض روحانی مدارج کا کھلنا ہے۔

بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ سے ایک اور نمونہ دکھائے جانے کی طرف اشارہ ہے اگر کہا جائے کہ جس پر آسمانی دروازہ کھولا گیا وہ ایمان سے کس طرح محروم رہ سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ کہا گیا ہے یعنے کوئی دروازہ جس سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ کلی طور پر آسمانی علوم سے آشنا نہ کیا جائے اور ہر قسم کی معرفت کی راہیں اس کے لئے نہ کھولی جائیں بلکہ بوجہ اس کے انکار کے اسے ایک نمونہ دکھایا جائے اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جب تک دل میں مناسبت پیدا نہ ہو جائے انسان محض نمونہ دیکھ کر فائدہ نہیں اٹھاتا اور وہ نظارہ صرف حجت پوری کرنے کے کام آتا ہے۔ ایمان کا موجب نہیں بنتا۔

کفار کی عادت یہ ایک تجربہ شدہ امر ہے کہ کئی لوگ مامورین کا انکار کرتے ہیں اور یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر

کوئی نشان نظر آ جائے تو پھر مانیں گے لیکن جب نشان نظر آ جائے تو پھر کبھی تو کوئی بہانہ بنا لیتے ہیں ۔کبھی تعبیر غلط کر لیتے ہیں کبھی کہہ دیتے ہیں کہ خواب الہام کیا شے ہے یونہی وہم ہے ۔غرض نشان دیکھ کر بھی فائدہ نہیں اٹھاتے اور اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ دل میں خشیت اللہ نہیں ہوتی اس لئے نشان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۔اسی حالت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ماننے کے لئے پہلے دل کی حالت کی درستی ضروری ہے ۔خشیت اللہ ہو تو پھر ایمان نصیب ہوتا ہے ورنہ ایک چھوڑ سو فرشتے نظر آئیں انسان اپنے دل کی تسلی کے لئے کئی بہانے بنا لیتا ہے اور ایمان لانے سے انکار کر دیتا ہے۔

اس آیت کے یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ ان پر عذاب آتے ہیں ۔عذاب کو دیکھ کر ان میں خشیت پیدا ہوتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ عذاب ٹل جائے تو ہم مان لیں گے جیسا کہ فرعون کے ذکر میں قرآن کریم میں آتا ہے ۔ان معنوں کی رو سے فَتَحنَا بابًا من السماء کے معنے رحمت کے دروازے کا کھولنا اور عذاب کا ٹلا دینا ہوگا ۔اور ظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ سے مراد آرام کی ساعتوں میں دنیوی ترقیات کے حاصل کرنے میں مشغول ہو جانا ہوگا ۔عذاب کا ذکر پہلے مَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ میں آچکا ہے ۔مطلب یہ ہے کہ تم لوگ تو ایسے سنگدل ہو کہ عذاب آنے پر ندامت کا اظہار کرو گے اور پھر منکر ہو جایا کرو گے۔

وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۷﴾

اور یقیناً ہم نے آسمان میں (ستاروں کی) کئی منزلیں بنائی ہیں اور ہم نے اسے دیکھنے والوں کیلئے (ستاروں کے

وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۸﴾

ذریعہ سے) خوبصورت بنایا ہے ۔اور (نیز) ہم نے اسے ہر ایک سرکش (اور) دھتکارے ہوئے (کی رسائی) سے محفوظ کر دیا ہے۔

حلّ لُغات۔اَلسَّمَآءُ کے معنے ہیں آسمان مزید تشریح کے لئے دیکھو یونس آیت نمبر ۴۔

اَلسَّمٰوٰتُ سَمَآءٌ کی جمع ہے ۔اَلسَّمَآءُ ۔آسمان ۔كُلُّ مَا عَلَاكَ فَاَظَلَّكَ ۔ ہر اوپر سے سایہ ڈالنے والی چیز ۔سَقْفُ كُلِّ شَيْءٍ وَبَيْتٍ چھت رُوَاقُ الْبَيْتِ برآمدہ ۔ظَهْرُ الْفَرَسِ گھوڑے کی پیٹھ ۔اَلسَّحَابُ ۔ بادل ۔اَلْمَطَرُ بارش ۔اَلْمَطْرَةُ الْجَيِّدَةُ ایک دفعہ کی برسی ہوئی عمدہ بارش ۔اَلْعُشْبُ سبزہ و گیاہ ۔(اقرب)

بُرُوْجًا۔ بُرُوْجًا بُرُوْجٌ کا مفرد بُرْجٌ ہے ۔اور اَلْبُرْجُ کے معنے ہیں ۔الرُّکْنُ وَالْحِصْنُ ۔مضبوط سہارا۔ پناہ گاہ۔ قلعہ۔ اَلْقَصْرُ ۔محل ۔ وَاحِدُ بُرُوْجِ السَّمَاءِ آسمان کے برجوں میں سے ایک برج یعنی ستاروں کے چکر لگانے کی منزل۔ بُرْجٌ کی جمع بُرُوْجٌ کے علاوہ اَبْرَاجٌ اور اَبْرِجَةٌ بھی آتی ہے۔ (اقرب)

البروج اَلْقُصُوْرُ۔ محلات ۔منازل ۔وَبِهٖ سُمِّیَ بُرُوْجُ النُّجُوْمِ لِمَنَازِلِهَا الْمُخْتَصَّةِ بِهَا ۔ اور ستاروں کی منازل کو بھی بروج کہا جاتا ہے۔ (مفردات)

لِلنّٰظِرِیْنَ نَظَرَ سے اسم فاعل نَاظِرٌ آتا ہے اور اس کی جمع نَاظِرُوْنَ آتی ہے۔ نَظَرَ اِلَیْهِ نَظَرًا کے معنے ہیں اَبْصَرَہٗ ۔ کسی چیز کو دیکھا ۔وتَأَمَّلَهٗ بِعَیْنِهٖ کسی چیز کو آنکھ سے خوب غور سے دیکھا ۔مَدَّ طَرْفَهٗ اِلَیْهِ رَاٰہُ اَوْلَمْ یَرَہٗ۔ کسی چیز کی طرف نگاہ اٹھائی خواہ چیز کو دیکھ سکے یا نہ دیکھ سکے ۔ونَظَرَتِ الْاَرْضُ ۔اَرَتِ الْعَیْنَ نَبَاتَهَا ۔ زمین نے اپنی سرسبزی آنکھ کو دکھائی ۔نَظَرَ بَیْنَ النَّاسِ ۔حَکَمَ وَفَصَلَ دَعَاوِیْهِمْ لوگوں کے دعاوی کا فیصلہ کیا۔ نَظَرَ فِی الْاَمْرِ نَظَرًا تَدَبَّرَہٗ وَفَکَّرَ فِیْهِ یُقَدِّرُہٗ وَیَقِیْسُهٗ۔ کسی معاملہ کو سوچا اور معاملہ پر قیاس کرتے ہوئے اس پر غور کیا۔ (اقرب)

شیطان کے معنے کے لئے دیکھو سورۃ یوسف آیت نمبر ۱۰۱۔

شَیْطٰنُ کا لفظ دو مختلف مادوں سے بن سکتا ہے۔ (۱) شَطَنَ ۔ (۲) شَاطَ ۔ یا تو یہ شَطَنَ سے فَیْعَالٌ کے وزن پر ہے اور شَطَنَ عَنْهُ کے معنے ہیں اَبْعَدَ دور ہو گیا۔ اور شَطَنَ الدَّارُ کے معنے ہیں گھر دور ہو گیا۔ پس اس مادہ کے لحاظ سے اس کے معنے ہوں گے کہ وہ ہستی جو حق سے خود بھی دور ہے اور دوسروں کو بھی دور کرنے والی ہے اور اگر شَاطَ اس کا مادہ مانا جائے تو اس کے معنے ہوں گے کہ وہ ہستی جو حسد اور تعصب کی وجہ سے جل جائے یا ہلاک ہو جائے۔ کیونکہ شَاطَ الشَّیْءُ کے معنے ہیں اِحْتَرَقَ جل گئی اور شَاطَ فُلَانٌ کے معنی ہیں هَلَكَ ہلاک ہو گیا۔ شَیْطٰنٌ اس سے فَعْلَانٌ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ ان معنوں کے علاوہ شَیْطٰنٌ کے معنے لغت میں مندرجہ ذیل لکھے ہیں۔ رُوْحٌ شِرِّیْرٌ ۔ بدروح ۔ کُلُّ عَاتٍ مُتَمَرِّدٍ ۔ سرکش اور حد سے بڑھنے والا ۔ الْحَیَّةُ سانپ۔ (اقرب)

رَجِیْم رَجِیْمٌ رَجَمَ میں سے ہے۔ اور رَجَمَهٗ رَجْمًا کے معنے ہیں ۔رَمَاہُ بِالْحِجَارَۃِ۔ اس پر پتھر برسائے۔ قَتَلَهٗ اس کو قتل کیا۔ قَذَفَهٗ۔ اس پر تہمت لگائی ۔لَعَنَهٗ۔ لعنت کی ۔شَتَمَهٗ۔ گالی دی ۔هَجَرَہٗ۔ چھوڑ دیا۔ ترک کر دیا۔ اَلْقَبْرَ ۔عَلَّمَهٗ۔ قبر پر نشان لگایا۔ جَاءَ یَرْجُمُ کے معنے ہیں ۔اِذَا مَرَّ وَهُوَ یَضْطَرِمُ فِیْ عَدْوِهٖ۔ تیزی سے دوڑتا ہوا گزرا۔ الرَّجُلُ ۔تَکَلَّمَ بِالظَّنِّ ظنی بات کی۔ (اقرب)

اَلرَّجْمُ اَیْضاً اَنْ یَّتَکَلَّمَ بِالظَّنِّ۔ رجم کے معنے غیر یقینی بات کرنے کے بھی ہیں جیسے آیت رَجْمًا بِالْغَیْبِ میں رجم کے معنے ہیں۔ لَایُوْقَفُ عَلٰی حَقِیْقَتِہٖ۔ یعنی بات کی حقیقت سے واقف نہ تھا۔ اِسْمُ مَایُرْجَمُ بِہٖ جس چیز سے مارا جائے اس کو بھی رجم کہتے ہیں۔ اس کی جمع رُجُوْم آتی ہے۔ (اقرب)

اَلرِّجَامُ اَلْحِجَارَۃُ۔ رجام کے معنے پتھروں کے ہیں۔ اور الرَّجْمُ کے معنے ہیں۔ اَلرَّمْیُ بِالرِّجَامِ کسی کو پتھر مارنا۔ جب کسی پر پتھراؤ کیا جائے۔ تو رُجِمَ بصیغہ مجہول استعمال کرتے ہیں۔ وَیُسْتَعَارُ الرَّجْمُ لِلرَّمْیِ بِالظَّنِّ۔ اور اِسْتِعَارَۃً رجم کا لفظ خیالی اور غیر یقینی بات کے کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ وَالتَّوَھُّمِ وَلِلشَّتْمِ وَالطَّرْدِ۔ نیز یہ لفظ وہم سے بات کرنے۔ گالی دینے اور دھتکارنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اَلشَّیْطَانُ الرَّجِیْمُ کے معنے ہیں۔ اَلْمَطْرُوْدُ عَنِ الْخَیْرَاتِ۔ نیکیوں سے دور خوبیوں سے محروم و عاری۔ وَعَنْ مَنَازِلِ الْمَلَاءِ الْاَعْلٰی فرشتوں کے مقامات سے دور کیا ہوا (مفردات) اور مجمع البحار میں ہے۔ وَرُجُوْمًا لِلشَّیَاطِیْنِ وَعَلَامَاتٍ ھُوَ جَمْعُ رَجْمٍ مَصْدَرٌ سُمِّیَ بِہٖ۔ رجم کا لفظ مصدر ہے جو اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اور رجوم اس کی جمع ہے۔ وَیَجُوْزُ کَوْنُہٗ مَصْدَرًا لَا جَمْعًا اور یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ رجوم مصدر ہو نہ کہ جمع۔ وَمَعْنَاہُ اَنَّ الشُّھُبَ الَّتِیْ تَنْقَضُّ مُنْفَصِلَۃً مِنْ نَارِ الْکَوَاکِبِ وَنُوْرِھَا لَا اَنَّھُمْ یُرْجَمُوْنَ بِاَنْفُسِ الْکَوَاکِبِ لِاَنَّھَا ثَابِتَۃٌ لَا تَزُوْلُ کَقَبَسٍ تُؤْخَذُ مِنْ نَارٍ۔ یعنی وہ شہب جو ستاروں کی آگ سے علیحدہ ہو کر ٹوٹتے ہیں۔ وہ خود ستارے نہیں ہوتے۔ بلکہ ستاروں سے روشنی گرتی ہے کیونکہ ستارے اپنی جگہ پر قائم ہیں اور شہب کا گرنا اسی طرح ہوتا ہے جیسے ایک چنگاری آگ سے لی جاتی ہے۔ وَقِیْلَ اَرَادَ بِالرُّجُوْمِ الظُّنُوْنَ الَّتِیْ تُحْزَرُ وَمِنْہُ وَیَقُوْلُوْنَ خَمْسَۃٌ سَادِسُھُمْ کَلْبُھُمْ رَجْمًا بِالْغَیْبِ۔ اور بعض محققین نے یہ کہا ہے کہ رجوم سے مراد وہ خیالات ہیں جو اپنے قیاس سے بغیر دلیل کے انسان بنالیتا ہے اور انہی معنوں میں قرآن میں لفظ رجمًا بالغیب استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ غیب کے متعلق صرف اندازے لگاتے ہیں۔ (اس آیت کی تفسیر اگلی آیت کے ساتھ دیکھیں)

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۹﴾

(ہاں) مگر جو شخص (وحی الٰہی کی کوئی) سنی ہوئی بات (جس کا اعلان ہو چکا ہو) چُرا لے تو (یہ اور صورت ہے اور اس صورت میں بھی) ایک روشن شعلہ اس کا پیچھا کرے گا۔

حلّ لُغات - اِسْتَرَقَ اِسْتَرَقَ سَرَقَ سے باب افتعال ہے۔ اور سَرَقَهٗ وَمِنْهُ الشَّیْءَ کے معنے ہیں۔ اَخَذَهٗ خُفْيَةً مِنْ حِرْزٍ۔ کہ کسی چیز کو محفوظ جگہ سے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھتے ہوئے لے لیا۔ أَوِالسِّرْقَةُ اَخْذُ الشَّیْءِ فِی خَفَاءٍ وَحِيْلَةٍ۔ نیز حیلہ سے مخفی طور پر کسی چیز کو نکال لینے کا نام بھی سرقہ ہے اور اِسْتَرَقَ السَّمْعَ کے معنے ہیں۔ اِسْتَمَعَ مُسْتَخْفِيًا۔ پوشیدہ ہو کر کسی بات کو سنا۔ اَلْكَاتِبُ بَعْضَ الْمُحَاسَبَاتِ۔ لَمْ يُبْرِزْهُ۔ محرر نے اپنے بعض حسابات کو چھپایا یعنی ظاہر نہ کیا۔ (اقرب)

اَلسَّمْعُ السَّمْعُ یہ سَمِعَ يَسْمَعُ کا مصدر ہے۔ اور سَمِعَ الصَّوْتَ يَسْمَعُ سَمْعًا کے معنے ہیں۔ اَدْرَكَهٗ بِحَاسَّةِ الْاُذُنِ۔ آواز کو کان کی حس کے ساتھ محسوس کیا۔ اور اَلسَّمْعُ کے معنے ہیں۔ حِسُّ الْاُذُنِ۔ شنوائی۔ وَالْاُذُنُ۔ مَاوَلَجَ فِيْهَا مِنْ شَیْءٍ تَسْمَعُهٗ اور جو آواز کان میں پڑے اس پر بھی سمع کا لفظ بولتے ہیں۔ اَلذِّكْرُ الْمَسْمُوْعُ سنی ہوئی بات۔ لفظ سَمْعٌ واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے کیونکہ دراصل یہ مصدر ہے۔ جو قلّت اور کثرت کا احتمال رکھتا ہے۔ اس کی جمع اَسماعٌ ہے۔ (اقرب)

اَلسَّمْعُ۔ قُوَّةٌ فِی الْاُذُنِ بِهٖ يُدْرِكُ الْاَصْوَاتَ یعنی سمع کان کی ایک قوت (شنوائی) کا نام ہے جس کے ذریعہ سے انسان آواز کو معلوم کرتا ہے۔ وَفِعْلُهٗ يُقَالُ لَهُ السَّمْعُ اَيْضًا۔ اور سننے کے فعل کا نام بھی سمع رکھا جاتا ہے وَيُعَبَّرُ تَارَةً بِالسَّمْعِ عَنِ الْاُذُنِ۔ اور کبھی لفظ سمع بول کر کان مراد ہوتا ہے۔ وَتَارَةً عَنْ فِعْلِهٖ كَالسِّمَاعِ اور کبھی لفظ سمع سے اس کا فعل مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ۔ کہ ان کو سننے کے فعل سے روک دیا گیا ہے۔ وَتَارَةً عَنِ الْفَهْمِ اور کبھی لفظ سمع سے مراد بات کا سمجھنا ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں۔ لَمْ تَسْمَعْ مَا قُلْتُ کہ جو میں نے کہا تو نے نہیں سمجھا۔ وَتَارَةً عَنِ الطَّاعَةِ اور کبھی اس سے مراد اطاعت ہوتی ہے۔ (مفردات)

اَتْبَعَهٗ اَتْبَعَهٗ تَبِعَ سے ہے۔ اور تَبِعَ کے معنے ہیں۔ سَارَ فِی اِثْرِهٖ۔ اس کے قدموں کے نشانات پر چلا۔ مَشٰی خَلْفَهٗ اَوْمَرَّبِهٖ فَمَضٰی مَعَهٗ۔ اس کے پیچھے چلا یا اس کے پاس سے گزرا۔ اور پھر ساتھ چل پڑا۔ اَتْبَعَهٗ تَبِعَهٗ وَذَالِكَ اِذَا كَانَ سَبَقَهٗ فَلَحِقَهٗ اس سے پیچھے رہ گیا اور پھر اس سے جا ملا۔ (اقرب)

شِھَابٌ شُعْلَۃٌ مِنْ نَارٍ سَاطِعَۃٍ۔ بھڑکتی ہوئی آگ کا شعلہ۔ اَوْ کُلُّ مَضِیْئٍ مُتَوَلِّدٌ مِنَ النَّارِ یا ہر چمکتی ہوئی چیز جو آگ سے پیدا ہو۔ وَمَا یُرٰی کَاَنَّہٗ کَوْکَبٌ اِنْقَضَّ۔ ٹوٹتا ہوا ستارہ۔ وَقَدْ یُطْلَقُ عَلَی الْکَوْکَبِ اَوِ الدَّرَارِیْ مِنَ الْکَوَاکِبِ لِشِدَّۃِ لَمَعَانِہَا۔ اور کبھی شہاب کا لفظ ستارے پر یا چمکتے ہوئے ستاروں پر ان کی شدت چمک کے باعث بولا جاتا ہے۔ یُقَالُ اِنَّ فُلَانًا شِھَابُ حَرْبٍ اِذَا کَانَ مَاضِیًا فِیْہَا اور اس شخص کو جو لڑائی میں تیز ہو۔ اور جہاں جائے مارتا چلا جائے شِھَابُ حَرْبٍ کہتے ہیں۔ تُطْلَقُ الشُّھُبُ عَلٰی ثَلَاثِ لَیَالٍ وَھِیَ اللَّیَالِیْ الْبِیْضِ۔ اور شہب کا لفظ تین پوری چاندنی راتوں (۱۳۔۱۴۔۱۵) پر بھی بولتے ہیں۔ پس شہاب مجازاً ان چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو روشن ہوں اور اسی طرح ان لوگوں کے لئے بھی جو چست ہوں اور کام میں خوب ہوشیار ہوں۔ (اقرب)

اَلشِّھَابُ الشُّعْلَۃُ السَّاطِعَۃُ مِنَ النَّارِ الْمُوْقَدَۃِ جلتی ہوئی آگ کا روشن شعلہ۔ وَالشُّعْلَۃُ السَّاطِعَۃُ مِنَ الْعَارِضِ فِی الْجَوِّ۔ فضا میں کسی چیز کے گزرنے کے باعث کسی روشنی اور شعلے کے پیدا ہونے کو بھی شہاب کہتے ہیں۔ (مفردات)

مبین۔ واضح کرنے والا اور واضح اور ظاہر۔ مزید تشریح کے لئے دیکھیں سورۃ حجر آیت نمبر ۲۔

تفسیر۔ **بروج کے مختلف معانی**۔ بعض نے بروج کے معنے ستاروں کے کئے ہیں۔ جیسے قتادہ نے (بحر محیط۔ در منثور۔ ابن کثیر زیر آیت وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا) لیکن لغت میں بروج جس کا مفرد بُرج ہے اس کے معنے ستاروں کی منزل کے ہیں یعنی جن دائروں میں ستارے چکر لگاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بُرج کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے محل اور قلعہ کے بھی ہیں۔ علماء ادب میں سے بھی زجاج نے بُرج کے معنے کوکب یعنی ستارہ کے کئے ہیں۔ (تاج العروس)

بعض مفسرین نے بروج کے معنے ستاروں کے کئے ہیں جن مفسرین نے بُرج کے معنے ستاروں کے کئے ہیں۔ وہ اس سے دلیل پکڑتے ہیں۔ کہ چونکہ دوسری جگہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ ۣالْکَوَاکِبِ (الصّٰفّٰت:۷) ہم نے ورلے آسمان کو ستاروں کی زینت کے ساتھ مزین کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بُروج سے مراد ستارے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ائمہ نے بروج کے معنے کواکب یعنے ستاروں کے کئے ہیں۔ لیکن مذکورہ بالا آیت سے جو استدلال کیا گیا ہے۔ وہ یقینی نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وَ زَیَّنّٰہَا لِلنّٰظِرِیْنَ میں دوسرا مضمون ہو اور آیت کا مفہوم یہ ہو کہ ہم نے آسمان میں ستاروں کی منازل بنائیں۔ اور ان میں چلنے کے لئے

ستارے بنائے جن کی وجہ سے آسمان خوبصورت نظر آتا ہے۔

بروج کے معنی ستاروں کے کرنا ضروری نہیں پس جبکہ ضروری نہیں۔ کہ اس آیت کے یہی معنی ہوں۔ کہ بروج ہی سے زینت کا اظہار کیا گیا ہے۔ بروج کے معنی ستارے کرنے کی کوئی خاص مجبوری نہیں ہے۔

کلام الٰہی کی حفاظت اور آسمانوں کی حفاظت کا جوڑ بہرحال بروج سے مراد خواہ متداول معنی یعنے ستاروں کی منازل کے کئے جائیں یا ستاروں کے معنے لئے جائیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ قرآن کریم یا اس سے پہلے کی کتب سماوی کی حفاظت اور آسمانوں کی حفاظت کا آپس میں جوڑ کیا ہے۔ اور کیوں کلام الٰہی کی حفاظت کے ذکر کے بعد آسمانوں کی حفاظت کا ذکر کیا گیا ہے۔ مفسرین نے اس بارہ میں مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جن میں سے بعض محض قصوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ ان کا کوئی ثبوت ہے اور نہ خدائی کلام سے وہ کوئی دور کی بھی مناسبت رکھتے ہیں۔ مگر بہرحال ان قصوں اور حدیثوں اور تفسیروں کے متعلق میں اصل مضمون بیان کرنے کے بعد اپنی تحقیق بیان کروں گا پہلے میں وہ معنے بیان کر دیتا ہوں جو میرے نزدیک قرآن کریم کے سیاق و سباق کو دیکھ کر ان آیات سے نکلتے ہیں۔

ظاہری نظام اور روحانی نظام میں مماثلت قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظاہری نظام اور روحانی نظام میں ایک شدید مماثلت اور مشابہت کا دعویٰ کرتا ہے اور بار بار روحانی عالم کے سمجھانے کے لئے جسمانی عالم کی مثالیں دیتا ہے۔ کبھی الہام کو پانی کے مشابہ قرار دے کر اس کے اثرات اور کلام الٰہی کے اثرات کی مشابہت کو پیش کرتا ہے۔ کبھی زمین و آسمان کے تعلقات سے روح اور جسم کے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے۔ کبھی روشنی اور آنکھ کے تعلقات سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اندرونی قابلیتوں کے بغیر صداقت نفع نہیں دیتی۔ غرض بیسیوں بلکہ سینکڑوں سبق جسمانی نظام سے حاصل کرنے کے لئے وہ ہمیں توجہ دلاتا ہے اس آیت میں بھی ایسی ہی مشابہت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

زمین کے رہنے والوں کو ایک آسمان اپنے سروں پر نظر آتا ہے۔ اس میں ستاروں کا ایک نظام ہے جو اپنے اپنے وقت پر اور اپنے اپنے دائرہ میں کام کر رہے ہیں۔ اس نظام کو بدلنے کی کوئی طاقت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی حفاظت کے سامان موجود ہیں۔

ظاہری نظام کی مثال سے روحانی نظام کو پیش کیا گیا ہے اسی مثال کو لے کر قرآن کریم میں متعدد بار روحانی آسمان کے نظام کو پیش کیا گیا ہے چنانچہ اس جگہ بھی میرے نزدیک اسی نظام کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتا ہے

کہ جس طرح جسمانی نظام مضبوط بنیادوں پر قائم ہے روحانی نظام بھی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے اور ہم نے اسے بھی جسمانی نظام کی طرح کئی طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ جو اس کے اوپر کے طبقے ہیں۔ وہ تو محفوظ ہیں ہی۔ جو نیچے کا طبقہ ہے۔ اس میں شرارت کا امکان ہوسکتا تھا۔ سو اسے بھی ہم نے ستاروں سے مزین کیا ہے اور ان کے ذریعے اس نچلے آسمان کی حفاظت کی ہے۔

جس طرح جسمانی ستاروں سے جسمانی آسمان کا قیام ہے اس طرح روحانی ستاروں سے روحانی آسمان کا مطلب یہ کہ جس طرح ظاہری آسمان کا نچلا حصہ ایک نظام اور اس کے ماتحت کے ستاروں اور سیاروں کا نام ہے اسی طرح روحانی آسمان کا نچلا حصہ بھی ایک نظام اور چند ستاروں کا نام ہے جو روحانی آسمان کی حفاظت کرتے ہیں۔ جس طرح جسمانی ستاروں کے وجود سے جسمانی آسمان کا قیام ہے اسی طرح روحانی ستاروں کے وجود سے روحانی آسمان کا قیام ہے۔

جس طرح ظاہری ستارے ظاہری آسمان کی زینت کا موجب ہیں ایسے ہی روحانی ستارے روحانی آسمان کی زینت کا بلکہ جس طرح جسمانی سماء الدنیا ستاروں کے مجموعہ کا نام ہے اور وہی اس کی زینت کا موجب ہیں۔ اسی طرح روحانی سماء الدنیا روحانی ستاروں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور وہی اس کی زینت کا موجب ہیں۔ اور جس طرح جسمانی ستارے سماء الدنیا کی حفاظت کا موجب ہیں۔ کیونکہ وہ اس کے اجزاء ہیں۔ اگر ان میں خرابی ہو تو سارا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ اسی طرح روحانی ستارے روحانی سماء الدنیا کی حفاظت کا موجب ہیں۔ اگر ان میں خرابی ہو۔ تو روحانی سماء الدنیا درہم برہم ہوجائے۔ اس لئے جب کوئی اس میں خرابی پیدا کرنا چاہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے اس پر مار پڑتی ہے اور آگ اور پتھر برستے ہیں۔ جیسا کہ **رجوم** اور **شھب** کے الفاظ سے بتایا گیا ہے۔

آگ اور پتھر کے محاورہ سے مراد آسمانی عذاب ہوتا ہے یہ آگ اور پتھر کا محاورہ آسمانی عذاب کے متعلق عام ہے چنانچہ قرآن کریم میں کفار کی نسبت آتا ہے کہ وہ ایک ایسے عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے۔ جو آگ اور پتھروں پر مشتمل ہوگا۔ چنانچہ فرماتا ہے فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ (البقرۃ:۲۵) اس آگ سے بچو جس میں دوزخی لوگ اور پتھر ڈالے جائیں گے یعنے اس آگ کے بھڑکانے کا روحانی موجب تو گنہگار انسان ہوں گے اور جسمانی ذریعہ پتھر ہوں گے۔ غرض قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب الٰہی کو آگ اور پتھر سے تشبیہ دی جاتی ہے اور ان آیات میں بھی شہب اور رجم کا ذکر کر کے یہی بتایا ہے کہ ایسے آدمی عذاب الٰہی

میں مبتلا ہوں گے۔

روحانی نظام کو جسمانی نظام سے قرآن کریم میں مشابہت اب میں یہ بتاتا ہوں کہ قرآن کریم میں روحانی نظام کو جسمانی نظام سے مشابہت دی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ رسول کریمؐ کی نسبت فرماتا ہے یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا۔ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا۔ (الاحزاب:۴۶،۴۷) اے نبیؐ! ہم نے تجھے گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن سورج بنا کر بھیجا ہے۔ جیسا کہ دوسری آیات سے ظاہر ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نظام نبوت کے لئے بطور مرکز کے ہیں۔ جس طرح سورج نظام دنیاوی کے لئے بطور مرکز کے ہے۔ پس آپؐ کو سورج کہہ کر بتایا ہے کہ روحانی آسمان میں تیرے سوا اور ستارے اور چاند بھی ہیں۔ جو سب کے سب تیرے گرد گھومتے ہیں۔ یہ ستارے اور چاند دوسرے انبیاء ہیں جن کی نبوتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بطور ارہاص کے تھیں اور سب نبی آپؐ کے گرد ستاروں کی طرح چکر کھاتے ہیں۔ جس طرح وسیع روحانی نظام میں دوسرے انبیاء رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بمنزلہ ستاروں کے تھے اور آپؐ ان میں سورج کے طور پر تھے۔ اسی طرح ایک چھوٹے دائرہ میں آپ بمنزلہ سورج کے تھے۔ اور آپؐ کے صحابہ بمنزلہ ستاروں کے تھے۔

آنحضرتؐ اپنے صحابہ کے درمیان ایک سورج کی طرح تھے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمُ اهْتَدَیْتُمْ۔ (مشکوٰۃ کتاب المناقب و الفضائل باب مناقب الصحابۃ) میرے صحابہ میرے گرد ایسے ہیں جس طرح سورج کے گرد ستارے اور جس طرح ستارے جب تک سورج کے نظام سے وابستہ رہتے ہیں۔ لوگوں کو راہ دکھانے کا موجب ہوتے ہیں۔ اسی طرح میرے اصحاب میں سے جو میرے نظام سے وابستہ رہیں گے وہ ستاروں کا کام دیں گے۔ جزوی اختلافات کے باوجود ان میں سے جس کی اتباع بھی تم کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

نظام کو سورج چاند اور ستاروں سے مشابہت اس امر کا مزید ثبوت کہ روحانی نظام کو سورج چاند ستاروں سے مشابہت دی جاتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی رویاء سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک دن اپنے والد سے کہا کہ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ (یوسف:۵) اے میرے باپ میں نے گیارہ ستاروں کو اور سورج اور چاند کو دیکھا کہ میری فرمانبرداری میں مشغول ہیں۔ اور اس کی تعبیر آگے چل کر اس طرح بیان ہوئی ہے۔ وَ رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا

لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا (یوسف :۱۰۱) یعنے یوسف کے بھائیوں کے آنے کے بعد جب ان کے ماں باپ بھی آ گئے اور انہوں نے اپنے ماں باپ کو تخت پر اپنے پاس بٹھایا اور وہ شکرانہ کے طور پر سجدہ میں گر گئے۔ تو حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ اے میرے باپ! یہ میری اس خواب کی جو میں پہلے زمانہ میں دیکھ چکا ہوں تعبیر ہے۔ میرے رب نے اس خواب کو آخر سچا کر ہی دکھایا کہ باپ ماں اور بھائیوں کو میرے ماتحت علاقہ میں لے آیا۔

الہامی زبان میں خاندانی یا مذہبی نظام کو نظام شمسی سے مشابہت دی جاتی ہے اس خواب اور اس کی تعبیر سے جو خود قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے ظاہر ہے کہ الہامی زبان میں خاندانی یا مذہبی نظام کو نظام شمسی سے مشابہت دی جاتی ہے۔ اور میرے نزدیک آیت زیر بحث میں بھی یہی معنے مراد ہیں۔

کلام الٰہی کی حفاظت کے ذکر کے ساتھ نظام شمسی کی تمثیل اس تمہید کے بعد میں بتانا چاہتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے کلام الٰہی کی حفاظت کا ذکر فرمایا تو ساتھ ہی نظام شمسی کی تمثیل سے یہ سمجھایا کہ کس طرح یہ حفاظت کی جائے گی۔ چنانچہ بتایا کہ ظاہری مادی نظام میں جس طرح ایک آسمان ہے یعنی مختلف ستاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ اسی طرح نظام روحانی بھی مختلف انبیاء کا ایک مجموعہ ہے۔ اور وہ روحانی آسمان کہلاتا ہے۔

ظاہری ستارے ظاہری آسمان کی حفاظت اور زینت کا موجب ہیں۔ ہر نبی روحانی آسمان کی زینت اور حفاظت کا موجب ہوتا ہے جس طرح ہر ستارہ اپنی اپنی جگہ اس آسمان کے لئے زینت کا موجب ہے اور کشش ثقل کے اصول سے اور دیگر ایسے ذرائع سے جن کا علم شاید بندوں کو ابھی تک حاصل نہیں ہوا اس کی حفاظت کر رہا ہے اسی طرح ہر نبی نظام روحانی کے لئے زینت کا موجب ہے اور اس کی حفاظت کا موجب ہے۔

ایک نبی بھی نہیں جو بے موقع یا بلا ضرورت آیا ہو۔ ہر نبی کا ایک معین کام تھا جو اس کے بغیر کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اور ہر نبی نے آسمان روحانی کی حفاظت کا کام انجام دیا ہے اور کلام الٰہی کی خدمت کی ہے۔ اور اس کی حقیقت اور برتری اور تاثیر کو اپنے وجود سے اور اپنے تابعین کے وجود سے ثابت کیا ہے اور وہ شیطانی صفت لوگ جنہوں نے خدائی کلام کو بگاڑنا چاہا انہیں شکست دی اور ذلیل کیا۔ گویا وہ ان پر پتھر اور آگ کی طرح گرے اور انہیں ناکام کر دیا۔

نظام جسمانی میں تو شیطانوں کا تصرف ہے لیکن آسمان پر نہیں اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ جس طرح

نظام جسمانی میں شیطانوں کا یعنی برے انسانوں کا زمین پر تو تصرف ہے کہ وہ اس جگہ ظلم اور فساد پیدا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آسمان پر کوئی تصرف نہیں۔ ظالمانہ طور پر وہ دنیوی نعمتوں پر تو قابض ہو جاتے ہیں۔ لیکن آسمانی نعمتوں جیسے ستاروں کی تاثیرات نور ہوا وغیرہ کے فوائد سے لوگوں کو محروم نہیں کر سکتے اور نہ آسمان پر ان کا کوئی اختیار ہے۔ سورج چاند ستارے ان کے تصرف سے بالا ہیں۔ یہی حال روحانی عالم کا ہے کہ شیطانوں کا کوئی تصرف انبیاء اور ان کے کامل متبعوں پر نہیں ہو سکتا۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ۔(الحجر:۴۳) میرے کامل بندوں پر تیرا کوئی اثر اور قبضہ نہ ہوگا۔ نیز جس طرح آسمان جسمانی کی نازل کردہ برکات پر شیطانوں کا کوئی تصرف نہیں۔ وہ روشنی، ہوا اور تاثیرات سماوی میں روک نہیں ڈال سکتے اسی طرح روحانی آسمان یعنی انبیاء کے ذریعہ سے ظاہر ہونے والے فیض یعنی کلام الٰہی اور معجزات ونشانات پر بھی شیطانوں کو کوئی تصرف حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ آسمان روحانی یعنے انبیاء کو اور ان کی تاثیرات کو کلی طور پر شیطانی دخل سے پاک رکھتا ہے۔ یہ گویا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کی تشریح فرمائی ہے۔

جملہ انبیاء مسِ شیطان سے پاک ہیں تعجب ہے اس آیت کی موجودگی میں مسلمان اس عقیدہ پر قائم ہیں کہ سوائے حضرت عیسیٰ اور ان کی ماں مریم کے کوئی بھی خواہ نبی ہو مس شیطان سے پاک نہیں (قرطبی زیر آیت وانی اعیذھا بک۔۔)۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں آسمان روحانی کے محفوظ ہونے کا ذکر فرماتا ہے جس میں آدم سے لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سب نبی اور ان کے کامل اَتباع شامل ہیں۔

شہاب کے ساتھ مبین کی صفت لگانا ظاہر کرتا ہے کہ جسمانی نظام کی حفاظت مراد نہیں اس کے بعد فرماتا ہے اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ الآیہ۔ ہاں اگر کوئی سنی سنائی بات چرالے تو اس پر شہاب مبین گرتا ہے اس آیت نے صاف واضح کر دیا کہ یہاں آسمان اور نظام شمسی کو بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے ورنہ جسمانی نظام مراد نہیں کیونکہ اول تو سنی سنائی بات کے چُرا لینے کا آسمان جسمانی سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسرے شہابؓ کے ساتھ جو مبین کی صفت لگائی ہے۔ اس کا جسمانی شہاب سے کوئی تعلق نہیں۔

شہاب کے معنی کیونکہ شہاب یا تو آگ کے شعلے کو کہتے ہیں یا وہ روشنی جو آسمان پر نظر آتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ستارہ ٹوٹا۔ ان دونوں چیزوں کے لئے مبین کی صفت بے محل اور بے معنی ہے۔

شہاب سے مراد انبیاء لئے جاویں تو مبین کی صفت برمحل اور مناسب معلوم ہوتی ہے لیکن اگر روحانی آسمان مراد لیا جائے اور شہاب سے مراد انبیاء لئے جائیں جو آسمانی تائیدات اور نشانات لے کر آتے ہیں

اور کلام الٰہی میں رخنہ ڈالنے والوں کے خلاف کام کرتے ہیں۔تو مبین کی صفت بالکل برمحل اور مناسب حال معلوم ہوتی ہے۔کیونکہ اس صورت میں شہاب کے ساتھ مبین کے لفظ کا استعمال ایک مزید فائدہ کے لئے اور ایک روشن نشان کے معنوں پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام جب تک آسمان پر ہوتا ہے اور جب تک روحانی آسمان کے اجرام یعنی انبیاء پر نازل ہوتا ہے اس وقت تک تو بالکل محفوظ ہوتا ہے لیکن نچلے آسمان پر نازل ہونے کے بعد جب بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور مسموعات میں سے ہوجاتا ہے یعنی سنی ہوئی باتوں میں شامل ہوجاتا ہے۔ پردۂ غیب سے پردۂ شہود پر آجاتا ہے۔اور لوگ ایک دوسرے کو وہ کلام سنانے لگ جاتے ہیں۔

شیطانوں کا انبیاء کے کلام کو چرانا تو شیطان یعنے انبیاء کے دشمن اس کلام کو چرا لیتے ہیں یعنی بغیر حق کے اس کلام کو لے لیتے ہیں اس کا غلط استعمال کرتے ہیں۔

انبیاء اور ان کے اتباع کا چوروں کے فریب کو ظاہر کرنا تب یا تو وقت کے نبی کی معرفت ان پر آسمانی عذاب نازل ہوتا ہے یا پھر انبیاء اور ان کے اتباع اس کلام کی اصل حقیقت کو دنیا پر ظاہر کر کے ان چوروں کے فریب کو ظاہر کر دیتے ہیں۔اور وہ ذلت کے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں اور سچائی کی روشنی میں ان چوروں کی حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے۔

کلام الٰہی کے چرا لینے سے مراد اس آیت میں کلام کے چرا لینے سے مراد یہ ہے کہ جس طرح چور ناحق دوسرے کے مال کو لیتا ہے۔اسی طرح وہ کلام الٰہی کو ناحق لیتے ہیں یعنے اس کے معنوں کو سمجھ کر ایمان نہیں لاتے بلکہ صرف اس لئے کلام کو اخذ کرتے ہیں۔تا اس کا ناجائز استعمال کریں اور اس کے غلط معنے کر کے لوگوں کو گمراہ کریں۔

جس طرح چوری کا لباس چور کے بدن پر ٹھیک نہیں آتا اسی طرح انبیاء کی تعلیم چوروں کے معتقدات کے ساتھ مطابق نہیں آتی کلام کی چوری کرنے کے یہ معنی بھی ہیں کہ انبیاء کی بعض تعلیمات کو اس زمانہ کے لوگ اپنا بنا کر پیش کرتے ہیں۔اور اس طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ گویا ان کو بھی انہی علوم پر دسترس ہے۔جن پر انبیاء کو ہے بلکہ انبیاء نے ان کے علوم چرا لئے ہیں۔لیکن جس طرح چوری کا لباس پہچانا جاتا ہے۔وہ چور کے بدن پر ٹھیک نہیں آتا اسی طرح انبیاء کی چوری کی ہوئی تعلیم چونکہ ان چوروں کے دوسرے معتقدات کے ساتھ مطابق نہیں آتی۔جب انبیاء اور ان کے اتباع ان کی حقیقت کو کھولتے ہیں تو ان کی چوری ظاہر ہوجاتی ہے۔

ہر نبی کا کلام چرایا گیا یہ دونوں امر سب نبیوں کے ساتھ پیش آئے ہیں۔انبیاء کی اعلیٰ تعلیمات کو لوگ اپنی

تعلیمات ظاہر کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔اور اس طرح ان کی اہمیت کو گرانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حملہ سب نبیوں سے زیادہ ہوا ہے۔

مسیحی اور آریہ مصنفین کے قرآن کریم کی تعلیمات پر بے جا اعتراضات مسیحی اور آریہ مصنفین کثرت سے قرآن کریم کی تعلیمات کے ٹکڑے لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اُن کے مذاہب کی کتب میں پائے جاتے ہیں۔لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نور کو ظاہر کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے۔کہ جس ٹکڑے کو تم نے لے لیا ہے۔وہ تو ایک لمبی زنجیر کی کڑی ہے۔اور وہ ساری زنجیر ایسے وسیع مطالب رکھتی ہے کہ تمہارے خواب وخیال میں بھی موجود نہیں۔تو ان کی پردہ دری ہو جاتی ہے۔

مصنف ینابیع الاسلام کے قرآنی مطالب پر اعتراضات ایسے ہی حملہ کرنے والوں میں ینابیع الاسلام کا مصنف ہے۔جس نے نہایت دیدہ دلیری سے قرآنی مطالب کے ٹکڑوں کو لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ گویا وہ پہلے مذاہب کی کتب سے لئے گئے ہیں۔حالانکہ وہ ٹکڑے ایک کُل کا حصہ ہیں اور ان کو کُل سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔اور اس کُل میں وہ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ان کو کسی اور شئے کا جزو قرار دیا ہی نہیں جاسکتا۔اس کے لئے دیکھو سورہ فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ پر بحث۔جسے مصنف ینابیع الاسلام نے زردشتی کتب کی چوری قرار دیا ہے۔(ینابیع الاسلام فصل پنجم)

دوسرے معنے جو کلام چرا لینے کے میں نے یہ کئے ہیں کہ الٰہی کلام کے بعض ٹکڑوں کو لے کر غلط طور پر انہیں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔یہ بھی سب نبیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ہر نبی کے الہام کو اس کے مخالف بگاڑ کر پیش کرتے رہے ہیں۔تا لوگوں کو ان کے خلاف جوش دلائیں وہ اصل مطلب کو بگاڑ بگاڑ کر ان کے الہامات کو پھیلاتے رہے ہیں۔اور چوروں کی طرح ان کا ناجائز استعمال کرتے رہے ہیں۔یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کی نشانات اور معجزات سے مدد کی۔

خدا تعالیٰ کا قہری نشانوں اور قدرت نمائی سے دشمنوں کو ہلاک کرنا اور ایک طرف تو دلائل سے معترضین کے غلط معنوں کو ردّ کیا۔اور دوسری طرف قہری اور قدرت نمائی کے نشانات کے ذریعہ سے اپنے نبیوں کی تائید کر کے ان کے دشمنوں کو ہلاک کروایا اور اس طرح اپنے کلام کی حفاظت کی۔

بعض دفعہ نبی کے اتباع بھی دین سے بے بہرہ ہو کر اور بے دینی کا شکار ہو کر دین کو بگاڑ لیتے ہیں اور کلام الٰہی کے معنی کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں اور اس کی خوبیوں کو غلط تفسیروں سے چھپا دیتے ہیں۔تب اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے

اتباع میں سے کسی کو شہاب ثاقب یا شہاب مبین بنا کر یعنے اپنا تازہ الہام دے کر اور اپنے نشانات سے مؤیّد کر کے آسمان روحانی سے نازل کرتا ہے تا وہ ایسے شیاطین کی سرکوبی کر کے کلام الٰہی کو پھر اس کی اصل جگہ پر لے آئیں اور اس طرح وہ کلام جو بکھر جانے اور تباہ ہونے کے خطرہ میں پڑ گیا تھا پھر محفوظ ہو جائے۔ اور اس کے صحیح مطالب پھر لوگوں پر آشکار ہو جائیں۔

اوپر کے مضمون سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان آیات میں ستاروں سے انبیاء مراد ہیں اور شہاب مبین یا شہاب ثاقب سے مراد وقت کا نبی ہے۔ کیونکہ ہر نبی ایک ستارہ ہے اور آسمان روحانی کے لئے زینت کا موجب ہے لیکن ہر نبی ہر وقت شہاب کا کام نہیں دے رہا۔ یعنے وہ شیطان جو دین میں رخنہ اندازی کر رہے ہیں ان کی ہلاکت کا موجب نہیں بن رہا۔ یہ کام صرف وقت کا نبی کرتا ہے۔ یا وہ نبی کرتا ہے جس کی نبوت زندہ ہو۔ اور جس کی شریعت قابل عمل ہو ایسے نبی کی امت میں خرابی پیدا ہو کر اگر دوسرا تابع نبی مبعوث بھی ہو تب بھی چونکہ اس کی قوت قدسیہ اس تابع نبی کے ذریعہ سے کام کر رہی ہوتی ہے۔ وہ شہاب ہی کہلاتا ہے۔ چنانچہ اس تشریح کے ماتحت حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور دوسرے سابق انبیاء آسمان روحانی کے ستارے تو ہیں۔ مگر شہاب نہیں۔ کیونکہ اس وقت شیطانوں کے مارنے کے لئے اللہ تعالیٰ انہیں استعمال نہیں کر رہا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہاب ہیں کیونکہ ان کے اظلال یہ کام قیامت تک کریں گے۔

اس آیت میں نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ کی حقیقت بتائی گئی ہے خلاصہ کلام یہ کہ ان آیات میں اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کی حقیقت بتائی گئی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر اس کلام کی جو اس کی طرف سے اترا ہو اور الذکر کہلانے کا مستحق ہو کس کس طرح حفاظت کرتا ہے۔ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی اور نبی کے زمانہ میں بھی اور اسکے بعد بھی۔ اور یہ کہ وہ قرآن کریم کی حفاظت بھی ان سب سامانوں کے ذریعہ سے کرے گا۔

کلام الٰہی کی حفاظت کا ذکر سورۃ حج میں یہ آیات گویا سورہ حج کی مندرجہ ذیل آیات کے ہم معنے ہیں۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (الحج: ۵۳) یعنی ہر نبی اور رسول کے ساتھ یہ معاملہ گزرا ہے کہ جب اس نے خدا کا کلام پڑھ کر لوگوں کو سنایا شیطان نے ہمیشہ ہی ان کے سنائے ہوئے کلام میں اپنی طرف سے کچھ معنے شامل کر کے لوگوں کو یہ بدلے ہوئے مضامین سنانے شروع کئے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس کی ملائی ہوئی باتوں کو تو مٹا دیا اور خدائی کلام کو قائم رکھا یعنے لوگ کلام الٰہی کو بگاڑ بگاڑ کر لوگوں کو گمراہ تو کرتے ہیں مگر آخر کلام کی سچائی ظاہر ہو جاتی ہے۔

اور وہ لوگ ناکام ونامراد ہو جاتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں شدید مشابہت ہے۔سورہ حجر میں بھی یہ ذکر ہے کہ روحانی آسمان کی حفاظت کی جاتی ہے۔اور یہاں بھی یہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کلام الٰہی کی حفاظت کرتا ہے۔سورہ حجر میں بھی ہے کہ شیطان آسمان میں دخل دینا چاہتے ہیں اور سورہ حج میں بھی ہے کہ وہ کلام الٰہی میں دخل دینا چاہتے ہیں سورہ حجر میں بھی ہے کہ دخل دینے والوں کو خدا تباہ کر دیتا ہے۔اور سورہ حج میں بھی ہے کہ کلام الٰہی کو بگاڑنے کی سعی کرنے والوں کے فعل کو خدا تعالیٰ مٹا دیتا ہے۔غرض دونوں کے مفہوم سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک ہی مضمون بتایا گیا ہے۔اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آسمانوں کی زینت اور ان کی حفاظت کا بیان ہر جگہ کلام الٰہی کے ذکر کے بعد بیان ہوا ہے۔تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جگہ روحانی آسمان اور اس کی حفاظت کا ذکر ہے۔نہ کہ جسمانی آسمان اور اس کی حفاظت کا۔جسمانی آسمان سے صرف تشبیہ دی گئی ہے۔اس سے زیادہ اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ان آیات میں یہ بھی بتایا گیا کہ ذکر محفوظ کی یہ علامت ہے کہ اس کے اندر جب کوئی دخل دینا چاہے اس کی حفاظت کے لئے شہاب اترتے ہیں پس جس کلام کی حفاظت کے لئے شہاب نہ اتریں ماننا پڑے گا کہ اب وہ کلام محفوظ نہیں رہا۔اور الذکر کے مقام سے گر گیا ہے۔

شہاب کے معنے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ گو شہاب کے تین معنے ہیں (۱) شعلہ (۲) ستاروں کی طرح چمکنے والی روشنی جو آسمانی پتھروں کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے اور (۳) ستارہ۔لیکن اس جگہ ستارہ ہی مراد ہے۔کیونکہ دوسری جگہ صافات (ع۱) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔کہ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۟الْكَوَاكِبِ۔ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (الصافات:۷،۸) یعنی آسمان پر ستارے زینت کے لئے اور حفاظت کے لئے بنائے گئے ہیں۔پس حفاظت کا کام ستاروں کے سپرد کیا گیا ہے پھر سورہ مُلک میں ہے۔وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (الملک:۶) یعنے ہم نے آسمان قریب کو ستاروں سے مزین کیا ہے اور ان ستاروں کو شیطانوں پر پتھراؤ کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہاب ستاروں کا ہی نام رکھا گیا ہے۔

شہاب کے پیچھے لگانے سے مراد پس شہاب کے پیچھے لگانے سے یہ مراد ہے کہ جب تک کوئی کلام الٰہی زندہ ہوتا ہے اور الذکر کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

کلام الٰہی کی حفاظت کے لئے شہاب بھیجنے سے مراد ماموروں کی بعثت اللہ تعالیٰ دشمنوں سے اس کی حفاظت کے لئے شہاب یا ستارے یا دوسرے الفاظ میں مامورین بھیجتا رہتا ہے۔اور زیر بحث آیات میں قرآن

کریم کی حفاظت کے لئے خاص طور پر اس طریق کے استعمال کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس سے زیادہ مضبوط طریق حفاظت کا ناممکن ہے۔ کیونکہ مامورین نہ صرف نشانات سے شیطانوں کے حملوں سے شریعت حقہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ بلکہ بوجہ الہام سے مؤیّد ہونے کے ان کی تشریحات سے مومنوں کو کلام الٰہی کے وہ صحیح معنے بھی معلوم ہوتے ہیں ۔جن کے بارہ میں شک کیا ہی نہیں جاسکتا اور ان کی وجہ سے وہ ان تفسیری اختلافات سے نجات پا جاتے ہیں جو اس سے پہلے لوگوں کے خیالات کو مشوّش کر رہے ہوتے ہیں۔

کلام الٰہی کی حفاظت کے لئے مامورین کا آنا نہایت ضروری ہے مذکورہ بالا تفصیل سے یہ امر روشن ہو جاتا ہے کہ کلام سابق کی حفاظت یعنے اسے شیطانی وساوس سے پاک کرنے اور اس کی زندگی کا تازہ نشانات سے ثبوت دینے کے لئے مامورین کا آنا نہایت ضروری ہے ۔لیکن افسوس کہ آج مسلمان اس فضیلت کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی تابع نبی بھی نہیں آسکتا۔ حالانکہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ جب تک کوئی کلام الذکر ہے ۔اس کی حفاظت اور دشمنوں کے حملوں سے بچانے کے لئے آسمانِ روحانی کے ستارے اور شہاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے رہیں گے۔

پہلے مذاہب میں انبیاء کی بعثت کا بند ہونا ان کی کتب کے الذکر نہ ہونے کی علامت تھی پہلے مذاہب میں جو انبیاء کی بعثت کا سلسلہ بند ہوگیا ہے ۔یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کی کتب الذکر نہیں رہیں ۔قرآن کریم چونکہ الذکر ہے اور قیامت تک رہے گا۔ اس کی حفاظت کا یہ ذریعہ بھی قائم رہے گا۔ اور اس سے اس کا درجہ گھٹتا نہیں بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم اب تک الذکر ہے ۔یعنی اللہ تعالیٰ اور بندہ میں تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس کی ظاہری حفاظت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ مامورین بھیج کر اندرونی اور بیرونی شیطانوں کے حملوں کو دور کر کے اس کی معنوی حفاظت بھی کرتا ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اب شہاب مبین یعنے آسمانِ روحانی کے ستارے بھیجنے کا سلسلہ قرآن کریم کی حفاظت کے لئے بھی بند ہو گیا ہے وہ دوسرے لفظوں میں یہ کہتا ہے کہ نعوذ باللہ من ذالک قرآن کریم اب الذکر نہیں رہا اور اس کی حفاظت کے لئے اور شیطانوں کی سرکوبی کے لئے اب روحانی آسمان سے ستاروں کا نزول بند ہو گیا ہے۔

یہ خیال کہ پہلے الہاموں کی حفاظت بندے کرتے تھے درست نہیں ایک موجودہ زمانہ کے مفسر نے لکھا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ اس سے پہلے الہاموں کی حفاظت بندے کرتے تھے۔ اور اس کے ثبوت میں اس نے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ اور سورہ مائدہ کی مندرجہ ذیل آیت کو پیش کیا ہے۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّ نُوۡرٌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَ الرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوۡا عَلَيۡهِ شُهَدَآءَ (المائدۃ:۴۵) ہم نے تورات کو جس میں ہدایت اور نور تھے نازل کیا تھا۔اس کے ذریعہ سے وہ انبیاء جو تورات کے مومنوں میں شامل تھے۔نیز ربانی اور احبار لوگ یہودیوں کے لئے فیصلے کیا کرتے تھے۔کیونکہ ان کے سپرد کتاب اللہ کی حفاظت کی گئی تھی ور وہ اس پر بطور نگران تھے(بیان القرآن زیر آیت انا نحن نزلنا الذکر۔۔۔)۔میرے نزدیک یہ استدلال اسی صورت میں درست ہوسکتا تھا۔اگر اس جگہ نبیوں کا ذکر نہ ہوتا مگر اس جگہ تو یہ بتایا گیا ہے کہ نبیوں کے سپرد تورات کی حفاظت کی گئی تھی اور یہ ظاہر ہے کہ نبی اپنی طاقت سے کام نہیں کرتا۔خدا تعالیٰ کی طاقت سے کام کرتا ہے۔پس اس صورت میں کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ بندوں کے سپرد تورات کی حفاظت تھی؟ فرض کرو کہ کسی نے تورات کے مضمون کو بدل دیا ہوتا اور خدا تعالیٰ ایک نبی کو اس کی اصلاح کا کام سپرد کرتا۔تو وہ نبی غلطی کیونکر معلوم کرسکتا تھا؟ خدا تعالیٰ کے الہام کے سوا اس کے پاس اصل حقیقت معلوم کرنے کا کونسا ذریعہ ہوسکتا تھا۔اور جب خدا تعالیٰ الہام سے کسی کو کسی غلطی پر اطلاع دے گا۔تو وہ حفاظت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی نہ کہ بندہ کی طرف سے۔یا مثلاً چند شیطان اگر اس کلام کے معانی کو بگاڑنے کی کوشش کرتے اور دنیا کو گمراہ کرتے۔تو نبی جو معجزات اور نشانات اور براہین سماویہ سے ان کا مقابلہ کرتا تھا۔وہ اس کا کام نہیں کہلاسکتا۔بلکہ اللہ تعالیٰ کا کام کہلائے گا۔پس یہ درست نہیں کہ پہلی کتب کی حفاظت بندوں کے سپرد تھی اور قرآن کریم کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی۔

اللہ تعالیٰ نے سب ذکروں کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب ذکروں کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے۔جیسا کہ اوپر کی آیات سے ثابت ہے۔ہاں! اگر بعض کام وہ بندوں سے لیتا تھا تو وہ صرف اس کا ہتھیار ہونے کی صورت میں وہ کام کرتے تھے۔اب قرآن کریم جو سب دنیا میں پھیل گیا اور زبردست حافظہ والوں نے اسے حفظ کیا۔یہ بظاہر بندوں کا کام ہے لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کریم کی حفاظت بندوں کے سپرد ہے۔کیونکہ یہ انتظام بھی تو اللہ تعالیٰ نے ہی کیا ہے۔

حفاظت کے سلسلہ میں قرآن کریم کو دوسری کتب پر فضیلت اس بارہ میں نہیں کہ اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔اور دوسری کتب کی حفاظت انسان کرتے ہیں۔بلکہ اس بارہ میں ہے کہ وہ ایک محدود عرصہ تک الذکر رہیں اور قرآن کریم قیامت تک کے لئے الذکر ہے اور اس کی تائید کے لئے ہمیشہ مامورین آتے رہیں گے۔جبکہ دوسری کتب کی حفاظت اللہ تعالیٰ دیر سے چھوڑ چکا ہے اور شیطانوں کے حملوں سے انہیں بچانے کے لئے اب آسمان سے

شہاب نازل نہیں ہوتے۔ دوسری فضیلت اس بارہ میں قرآن کریم کو یہ حاصل ہے۔ کہ وہ سب کا سب کلام اللہ ہے یعنے اس کا ایک ایک لفظ الہامی ہے۔ جبکہ پہلی کتب کا یہ حال نہ تھا۔ وہ کلام الٰہی اور تشریح کلام الٰہی کے مجموعہ ہوتے تھے۔ جیسا کہ عہد قدیم کی کتب اور انجیل سے روز روشن کی طرح ثابت ہے۔ پس ان کتب کے مضمون کی حفاظت کافی سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ اس زمانہ میں الذکر مفہوم کا نام تھا۔ الفاظ کا نہیں اور خدائی الہام کو انبیاء یا ان کے تابع اکثر اپنے الفاظ میں بیان کردیتے تھے۔ اور اس میں حرج نہ سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم کی وحی چونکہ دائمی وحی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے وقت سے طریق وحی کو بدل دیا۔ اور خود الفاظ کا محفوظ رکھنا ان کی حرکات سمیت ضروری قرار پایا۔ پس قرآن کریم کا ہر لفظ لکھا گیا، یاد کیا گیا اور محفوظ رکھا گیا۔ اس قسم کی حفاظت پہلی کسی وحی کو حاصل نہ تھی۔ نہ اللہ تعالیٰ کے ذریعہ سے۔ نہ بندوں کے ذریعہ سے۔ ہاں معنوی حفاظت ایک محدود عرصہ کے لئے اسی طرح دوسری کتب کو حاصل تھی جس طرح کہ قرآن کو قیامت تک کے لئے حاصل ہے۔

ظاہری شہب کو انبیاء سے تشبیہ دینے کا مطلب ایک سوال ابھی قابل جواب رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظاہری آسمان پر سے جو شہب گرتے ہیں۔ ان کی کیا توجیہہ ہے۔ آخر ان سے جو انبیاء کو مشابہت دی ہے۔ تو ضرور ہے کہ وہ بھی کوئی ایسا فائدہ دیتے ہوں۔ جو شیطان پر چوٹ سمجھے جانے کے قابل ہو۔

نبیوں کے ظہور کے وقت دو قسم کے نشانات اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سے یہ سنت ہے کہ نبیوں کے ظہور کے وقت وہ دو قسم کے نشان دکھاتا ہے۔ ایک قسم کے نشان تو انسانوں کے قریب ہوتے ہیں۔ یعنی اس دنیا کی اشیاء میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ بعض شکی مزاج لوگ ان کے متعلق خیال کرتے ہیں۔ کہ شاید نبی کی چالاکی یا ہوشیاری کا ان میں دخل ہو۔ وہ ایک دوسری قسم کے نشان بھی ظاہر کرتا ہے۔ جو آسمانی اجرام سے تعلق رکھتے ہیں۔

انبیاء کے ظہور کے وقت شہب کے گرنے کا نشان ان میں سے ایک نشان ستاروں یعنی شہب کے ٹوٹنے کا بھی ہے۔ جہاں تک تاریخی انبیاء کا تعلق ہے۔ حضرت مسیحؑ ناصری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ امر تاریخ سے ثابت ہے کہ اس وقت ستارے کثرت سے ٹوٹے تھے اور یہ نشان یا تو اس نبی کی اپنی پیشگوئی کے ماتحت ظاہر ہوتا ہے یا اس سے پہلے کے نبیوں یا ولیوں کی پیشگوئیوں کے ماتحت ہوتا ہے۔

آنحضرتؐ کے زمانہ میں شہب بکثرت گرے چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں بھی شہب کثرت سے گرے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو اس کثرت سے گرے کہ کفار نے خیال کیا کہ شاید آسمان و زمین تباہ ہونے لگے ہیں۔ اور اہل سماء

ہلاک ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ابن کثیر نے بہ حوالہ لکھا ہے۔ کہ فَلَمَّا بَعَثَ اللهُ مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبِيًّا رَسُولًا رُجِمُوا لَيْلَةً مِنَ اللَّيَالِي فَفَزِعَ لِذٰلِكَ اَهْلُ الطَّائِفِ فَقَالُوا هَلَكَ اَهْلُ السَّمَاءِ لَمَّا رَأَوْا مِنْ شِدَّةِ النَّارِ فِي السَّمَاءِ وَاخْتِلَافِ الشُّهُبِ فَجَعَلُوا يُعْتِقُونَ اَرِقَّاءَهُمْ وَيُسَيِّبُوْنَ مَوَاشِيَهُمْ فَقَالَ لَهُمْ عَبْدُ يَالِيْل بْنُ عَمْرِو بْنِ عُمَيْرٍ وَيْحَكُمْ يَامَعْشَرَ اَهْلِ الطَّائِفِ اَمْسِكُوا عَنْ اَمْوَالِكُمْ وَانْظُرُوا اِلَى مَعَالِمِ النُّجُوْمِ فَاِنْ رَأَيْتُمُوْهَا مُسْتَقِرَّةً فِي اَمْكِنَتِهَا فَلَمْ يَهْلِكْ اَهْلُ السَّمَاءِ اِنَّمَا هٰذَا مِنْ اَجْلِ ابْنِ اَبِي كَبْشَةَ يَعْنِي مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِنْ نَظَرْتُمْ فَلَمْ تَرَوْهَا فَقَدْ هَلَكَ اَهْلُ السَّمَاءِ فَنَظَرُوْا فَرَأَوْهَا فَكَفُّوْا عَنْ اَمْوَالِهِمْ (ابن کثیر تفسیر سورۃ الجن زیرآیت انا لمسنا السماء) یعنے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول بنا کر مبعوث فرمایا۔ تو ایک رات شیطانوں پر سخت سنگ باری ہوئی (یعنے شہب گرے) تو اسے دیکھ کر طائف کے لوگ سخت گھبرا گئے اور آسمان پر بار بار اور کثرت سے شہب کے ٹوٹنے کا نظارہ دیکھ کر کہنے لگے کہ معلوم ہوتا ہے آسمان کے باشندے ہلاک ہو گئے ہیں۔ اس گھبراہٹ میں انہوں نے اپنے غلام آزاد کرنے شروع کر دیئے اور جانوروں کی رسیاں کھول کر انہیں کھلا چھوڑ دیا۔ اس پر ان کے سردار عبد یالیل نے کہا کہ اے طائف کے لوگو! تمہارا برا حال ہو اپنے مالوں کو سنبھال کر رکھو اور آنکھیں اُٹھا کر ستاروں کو دیکھو۔ اگر وہ اپنی جگہ پر قائم ہیں تو معلوم ہوا ستارے نہیں ٹوٹ رہے شہب گر رہے ہیں اور آسمان کے ساکن ہلاک نہیں ہوئے۔ بلکہ یہ نشان ابن ابی کبشہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے دکھایا گیا ہے۔ اور اگر تم دیکھو کہ ستارے آسمان پر اپنی جگہوں پر نہیں ہیں تو سمجھو کہ آسمان کے لوگ ہلاک ہو گئے ہیں (اور قیامت آ گئی ہے) اس پر انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ تو ستاروں کو اپنی جگہ پر پایا اور اپنے اموال لٹانے بند کر دیئے۔

آنحضرتؐ کے وقت بعض آسمانی تغیرات کی انبیاء بنی اسرائیل سے خبر

یہ نشان سابق پیشگوئیوں کے مطابق ظاہر ہوا تھا۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض آسمانی تغیرات کی انبیاء بنی اسرائیل نے زمانہ نبویؐ کے وقت کے متعلق خبر دی تھی۔ بخاری میں ہے۔ اِنَّ هِرَقْلَ حِيْنَ قَدِمَ اِيْلِيَاءَ اَصْبَحَ يَوْمًا خَبِيْثَ النَّفْسِ فَقَالَ بَعْضُ بَطَارِقَتِهِ قَدْ اَنْكَرْنَا هَيْئَتَكَ۔ قَالَ ابْنُ النَّاطُوْرِ وَكَانَ هِرَقْلُ حَزَّاءً يَنْظُرُ فِي النُّجُوْمِ فَقَالَ لَهُمْ حِيْنَ سَأَلُوْهُ اِنِّي نَظَرْتُ اللَّيْلَةَ حِيْنَ نَظَرْتُ فِي النُّجُوْمِ اَنَّ مَلِكَ الْخِتَانِ قَدْ ظَهَرَ۔ (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ۔۔) یعنی ہرقل زمانہ نبویؐ میں دورہ کرتے ہوئے ایلیا کے مقام پر آیا۔ تو ایک دن صبح کے وقت اس کی طبیعت پریشان تھی۔ اس پر کلیسیائی جرنیلوں میں سے ایک نے پوچھا

کہ آج آپ کی طبیعت کچھ پریشان معلوم ہوتی ہے۔ ابن ناطور کہتا ہے کہ یہ ہرقل علم ہیئت کا ماہر تھا اور رصدگاہوں میں بیٹھ کر ستاروں کو دیکھا کرتا تھا۔ اس نے اس سوال کا یہ جواب دیا کہ جب آج رات میں ستاروں کا معائنہ کر رہا تھا۔ میں نے وہ علامات دیکھیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کا بادشاہ (یعنی نبی آخر الزمان) ظاہر ہو گیا ہے اس لئے پریشانی ہے۔

اوپر کے حوالوں سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں شہب غیر معمولی طور پر زیادہ گرے تھے اور اسی طرح بعض دوسری علامات آسمان میں ظاہر ہوئی تھیں۔ جو آپ کی آمد کا نشان تھیں اور جیسا کہ بعض اور احادیث سے ثابت ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی شہب کثرت سے گرے تھے۔ (مجمع البحار)

مسیح کی آمد ثانی کے وقت شہب گرنے کی پیشگوئی انجیل میں بھی مسیح کی دوبارہ آمد کے متعلق لکھا ہے ''سورج اور چاند اور ستاروں میں نشان ظاہر ہوں گے'' (لوقا باب ۲۱۔ آیت ۲۵) پس یہ امر واقعات اور احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کے ظہور کی علامت کے طور پر اللہ تعالیٰ نے شہب کا گرنا سنت کے طور پر مقرر کر رکھا ہے اس کی ظاہری وجہ تو جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں یہ ہے کہ تا اس آسمانی نشان کو دیکھ کر لوگ اس وسوسہ سے نجات پائیں کہ شاید اس کے معجزات کسی انسانی تدبیر کا نتیجہ ہوتے ہوں۔ مگر کوئی تعجب نہیں کہ اس کے علاوہ بھی کوئی مخفی وجہ نبی کے زمانہ میں شہب کے گرنے کی ہو۔ اور اس میں کوئی روحانی تاثیرات بھی ہوں۔ جو گو انسانی نگاہ سے مخفی ہوں۔ لیکن ان شیطانی تدابیر کا ازالہ کرنے میں مد ہوتی ہوں۔ جو انبیاء کے دشمن کرتے رہتے ہیں۔

قرآن مجید میں مختلف مواقع پر آسمانوں کی حفاظت اور شہب گرنے کا ذکر اس کے بعد میں ان مختلف آیات اور ان کی تفاسیر کو لیتا ہوں جو مفسرین نے کی ہیں۔

شہب گرنے کا ذکر سورۃ صافات، جن اور حم سجدۃ میں قرآن کریم میں آسمان سے شہب یا پتھر پڑنے کا ذکر یا آسمانوں کی حفاظت کا ذکر مندرجہ ذیل سورتوں میں ہے (۱) سورۂ حجر زیر تفسیر آیت (۲) سورۂ مُلک (ع ۱) اس میں آتا ہے وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (الملک:۶) ہم نے سماء دنیا کو ستاروں سے مزیّن کیا ہے اور انہیں شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا ہے (۳) سورۂ صٰفّٰت (ع ۱) اس میں ہے اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ۔ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ۔ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ۔ دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ۔ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۷ تا ۱۱)۔ ہم نے ورلے آسمان کو ستاروں سے مزیّن کیا ہے اور ہر باغی شیطان سے اسے محفوظ بنایا ہے وہ ملاءِ اعلیٰ کی بات نہیں سن سکتے اور ہر طرف

سے انہیں بھگانے کے لئے ان پر پتھراؤ ہوتا ہے اوراس کے علاوہ بھی انہیں قائم رہنے والا عذاب ملے گا (وہ سن تو نہیں سکتے) لیکن اگر کوئی بات اچک لے جائے۔ تو اس کے پیچھے چمکتا ہوا شہاب جاتا ہے (اور اسے تباہ کر دیتا ہے) (۴) سورۂ جنّ میں ہے۔ وَّ اَنَّا لَمَسۡنَا السَّمَآءَ فَوَجَدۡنٰهَا مُلِئَتۡ حَرَسًا شَدِیۡدًا وَّ شُهُبًا۔ وَّ اَنَّا كُنَّا نَقۡعُدُ مِنۡهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمۡعِ ؕ فَمَنۡ یَّسۡتَمِعِ الۡاٰنَ یَجِدۡ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا۔ (الجن: ۹، ۱۰) اور ہم نے آسمان کے بارہ میں جستجو کی ہے اور یہ معلوم کیا ہے۔ کہ اس میں سخت پہرہ لگا ہوا ہے۔ اور شہب بھی مقرر ہیں۔ اور اس سے پہلے تو ہم آسمان میں سننے کی جگہوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ مگر اب جو سننے لگتا ہے وہ اپنے پر ایک شہاب کو نگران پاتا ہے (۵) حٰمٓ سجدہ میں ہے وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ ۖ وَ حِفۡظًا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ (حم السجدۃ: ۱۳) اور ہم نے ورلے آسمان کو چراغوں سے مزیّن کیا ہے۔ اور ان کو ذریعہ حفاظت بھی بنایا ہے۔ یہ غالب اور علم والے خدا کی تقدیر ہے۔

شہب گرنے کے متعلق مختلف مفسرین کا بیان یہ پانچ مقام ہیں جن میں اس مضمون کو تفصیلاً یا اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ مفسرین اس کی حقیقت یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب اپنی وحی ملائکہ پر نازل کرتا ہے تو وہ درجہ بدرجہ نیچے اترتی ہے جب سماء الدنیا تک پہنچتی ہے تو جنّ ایک دوسرے پر چڑھ کر آسمان تک پہنچتے ہیں اور اس خبر کو اُڑانے کی کوشش کرتے ہیں کچھ خبریں اُچک اُچکا کر جب وہ دوڑتے ہیں۔ تو ان کے پیچھے شہب مارے جاتے ہیں اس کے آگے اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی طرف یہ روایت منسوب کی جاتی ہے۔ کہ شہب شیطانوں کو مارنہیں سکتے۔ بلکہ زخمی کر دیتے ہیں یا بعض عضو توڑ ڈالتے ہیں لیکن حسن بصریؒ اور ایک اور گروہ کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ شیطان قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ شیطان قتل کر دیئے جاتے ہیں وہ آگے پھر مختلف الخیال ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جب وہ ساحروں اور کاہنوں کو خبر پہنچا لیتے ہیں تو پھر مار دیئے جاتے ہیں اور ماوردی کا قول یہ ہے کہ خبر پہنچانے سے پہلے ہی شہب ان کو جا پکڑتے ہیں اور مار دیتے ہیں۔ (فتح البیان زیر آیت ھٰذا) پھر مفسرین نے یہ بحث بھی کی ہے کہ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی شہاب پھینکے جاتے تھے اکثروں نے تو کہا ہے۔ کہ ہاں پہلے بھی پھینکے جاتے تھے۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ نہیں۔ آپؐ کی بعثت سے پہلے (یعنی زمانہ فترۃ میں) نہیں پھینکے جاتے تھے۔ دوسرے خیال کے ظاہر کرنے والوں میں علامہ زجاج بھی ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی علامت تھی۔ آپؐ کی بعثت سے پہلے شہب نہ گرتے تھے ورنہ شعراء کے کلام میں اس کا ذکر ہوتا۔ مؤلف فتح البیان لکھتے ہیں کہ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو شہب کثرت سے گرے تا کہ غیب کی حفاظت اچھی طرح کی جاوے اور آپؐ کی بعثت سے پہلے کم گرتے

تھے۔ تو دونوں اقوال میں تطابق ہوسکتا ہے۔ (فتح البیان زیر آیت ھذا) درمنثور میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ (درمنثور سورۂ جن زیر آیت اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ) بیان ہوا ہے۔ کہ شیطان آسمان کی باتیں سنا کرتے تھے جو سنتے اس میں سو جھوٹ ملا دیا کرتے تھے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو وہ اس سے روکے گئے۔ اس پر انہوں نے ابلیس سے ذکر کیا۔ اس نے تحقیق کے لئے ایک وفد بھجوایا۔ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جبلِ نخلۃ میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اور ابلیس کو خبر دی۔ اس نے کہا بس یہی سبب مار پڑنے کا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ابلیس نے زمین کی مٹی منگوائی۔ اور سونگھ کر کہا کہ تہامہ کی زمین میں نبی ظاہر ہوا ہے۔

شہب کے گرنے والی آیات کی تفاسیر میں مفسرین کی بداحتیاطی افسوس کہ ان بزرگ مفسرین نے جنہوں نے قرآنی تفسیر کے بیان کرنے میں نہایت محنت اور کوشش سے کام کیا ہے اس معاملہ میں سخت بے احتیاطی برتی ہے اور غیر معروف روایات کے رعب میں آگئے ہیں۔ حالانکہ وہ قرآن کریم کے صریح خلاف ہیں۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) شیطان آسمان کی باتوں کو سن لیتے تھے (۲) ان خبروں میں غیب بھی ہوتا تھا (۳) ابلیس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر ان شہب کی مار پیٹ سے ہوئی پہلے نہ تھی۔

ان آیات کی تفاسیر کے تین غلط اصول ان تفاسیر کے یہ تین بنیادی اصول ہیں۔ ان تینوں باتوں کو نکال دیا جائے۔ تو روایات میں کچھ رہتا ہی نہیں۔ لیکن یہ تینوں باتیں کیسی غلط ہیں۔ پہلی بات کہ شیطان آسمان سے باتیں سن سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات کے خلاف ہے (۱) سورہ طور میں ہے۔ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (الطور: ۳۹) یعنی کیا آسمان کی بات سننے کے لئے ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس کے ذریعہ سے یہ آسمان پر جا کر خدا تعالیٰ کی بات سن لیتے ہیں؟ (یعنے ایسا ہرگز نہیں) اگر ان میں سے کوئی اس امر کا مدعی ہے تو وہ سامنے آئے اور اپنی دلیل پیش کرے۔

شیطان آسمان سے باتیں نہیں سنتے اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ آسمان پر جا کر بات سننا تو الگ رہا وہاں تک جانے کی قابلیت بھی کفار اور ان کے مددگاروں میں تسلیم نہیں کی گئی۔ اگر یہ درست ہوتا کہ جنّ ایک دوسرے پر چڑھ کر آسمان تک جا پہنچتے تھے۔ تو کیا کفار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ جواب نہ دیتے۔ کہ ایک طرف آپ اس امر کے قائل ہیں کہ جنّ ایک دوسرے پر چڑھ کر آسمان تک جا پہنچتے ہیں۔ اور دوسری طرف آپ یہ کہتے ہیں۔ کہ آسمان تک جانے کی ان کے پاس کون سی سیڑھی موجود ہے۔

شیطانوں وجنوں کو غیبی امور معلوم ہوجانے کے متعلق قرآن مجید کا بیان (۲) سورۂ شعراء میں ہے

وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ۔ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَ مَا يَسْتَطِيْعُوْنَ۔ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (الشعراء: ۲۱۱، ۲۱۳) یعنے کفار کا یہ الزام کہ اس شخص پر شیطان کلام نازل کرتا ہے درست نہیں۔ کیونکہ (الف) اس کا اپنا چال چلن ایسا اعلیٰ اور پاکیزہ ہے۔ کہ ایسے آدمیوں سے شیطان کو کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔

(ب) جو تعلیم اس پر نازل ہوئی ہے وہ ایسی مطہّر اور پاک ہے کہ ناپاک شیطان اس تعلیم کو اُتار ہی نہیں سکتا۔ کس طرح ممکن ہے کہ شیطان خود اپنے خلاف تعلیم اُتارے۔ (ج) اس میں آسمانی علوم ہیں اور شیطان آسمانی علوم کے سُننے کی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے انہیں آسمان کی باتیں سننے سے محروم کیا ہوا ہے۔

ان زبردست قرآنی دلائل کی موجودگی میں یہ خیال کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ شیطان آسمان کی باتیں سن لیتے ہیں۔ دوسرا دعویٰ ان روایات میں یہ کیا گیا ہے۔ کہ شیطانوں یا جنّوں کو بعض غیبی امور بھی معلوم ہو جاتے تھے اور وہ زبردستی اخبارِ غیبیہ کو اچک لیتے تھے۔ یہ دعویٰ بھی مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنیہ سے بالبداہت غلط ثابت ہوتا ہے۔

(۱) فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (یونس: ۲۱) غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے (اگر وہ غیب تم کو ملے گا تو تم سچے مجھے ملے گا تو میں سچا) پس آؤ! دونوں خدائی فیصلہ کا انتظار کریں۔ اس آیت کے ہوتے ہوئے کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ کہ قرآن کریم کے رُو سے جنّات غیب کا علم آسمان سے اُچک لیتے تھے۔

(۲) سورہ طور میں ہے۔ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ (طور: ۴۲) کیا ان کے پاس غیب معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہے۔ جس سے غیب معلوم کر کے وہ لکھ لیتے ہیں؟ یعنے ایسا ہرگز نہیں ہے (۳) یہی آیت سورۂ قلم میں بھی ہے (۴) سورۂ سباء میں ہے۔ وَّ قَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ يَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ۔ وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ۔ (سبا: ۵۴، ۵۵) یعنے یہ لوگ تیرا انکار شروع سے کرتے چلے آئے ہیں۔ اور غیب کے امور کے دریافت کرنے کے لئے دُور سے بیٹھے ہوئے ڈھکو نسلے مارتے رہے ہیں۔ مگر کامیاب نہیں ہو سکے ان کی غیب دانی کی خواہش کے راستہ میں اللہ تعالیٰ نے روکیں پیدا کر رکھی ہیں جس طرح ان لوگوں کی خواہش کو پورا کرنے میں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں روکیں پیدا کر رکھی تھیں۔ اور یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں (ایسے لوگوں کو غیب مل ہی کب سکتا ہے۔ یعنی غیب تو اس قلب پر نازل ہوتا ہے جو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہو) اور یقین اور ایمان کے اعلیٰ مقام پر پہنچ چکا ہو۔ اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ وہ آسمان پر نہ جاتے تھے۔ بلکہ دور بیٹھے ڈھکو نسلے مارا کرتے تھے۔

غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے

(۵) وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ

بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ۔(الانعام:۱۱۳) یعنے جس طرح تیرے زمانہ میں ہورہا ہے۔اسی طرح ہم نے ہر نبی کے زمانہ میں انسان شیطانوں اور جن شیطانوں کو چھوڑ رکھا تھا۔کہ وہ ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کے لئے جھوٹی باتیں سناتے تھے۔اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ بھی نہ کر سکتے۔(مگر اس کی مشیت یہی ہے)اس لئے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے اور ان کے افتراؤں کی طرف توجہ ہی نہ کر۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ انبیاء کے دشمن جنّ وانس ایک دوسرے کو غیب کی باتیں نہیں بتاتے بلکہ جھوٹ بتاتے ہیں۔آیت کے آخر میں بھی یہ نہیں کہا کہ یہ آسمان کی باتیں سنتے ہیں۔تو ان سے الگ رہ۔بلکہ یہ فرمایا ہے۔کہ یہ افتراء کرتے ہیں۔اس لئے تو ان سے الگ رہ۔اس افتراء کا جواب خدا تعالیٰ ہی دے گا۔

غیب کا اظہار اللہ تعالیٰ صرف رسولوں پر کرتا ہے (۶) عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۔ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (الجنّ:۲۷-۲۹) یعنے اللہ تعالیٰ غیب کا جاننے والا ہے اور وہ اپنے غیب کو سوائے اپنے رسولوں کے جو اس کے منتخب ہوتے ہیں اور کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس رسول کے آگے اور پیچھے نگران اور پہرہ دار چلتے ہیں۔تا کہ اسے یہ علم بھی حاصل ہوجائے۔کہ ان رسولوں نے اپنے رب کی بات لوگوں تک پہنچا دی ہے۔اور ان کے تمام امور کا وہ احاطہ کئے رکھتا ہے اور ہر اک چیز کی تعداد بھی اس کے پاس محفوظ رہتی ہے۔یعنے کمیّت اور کیفیت دونوں کا ریکارڈ اس کے پاس ہوتا ہے کسی چیز میں کمی بیشی کا ہونا ممکن نہیں۔

یہ آیت کس وضاحت سے مذکورہ بالا تفاسیر کو باطل کرتی ہے فرماتا ہے نہ صرف یہ کہ غیب کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ بلکہ اس غیب کا پہلا اظہار صرف رسولوں پر ہوتا ہے۔رسول بھی وہ جن کو اللہ تعالیٰ خود منتخب فرماتا ہے نہ بندوں کے چُنے ہوئے رسول۔پھر فرماتا ہے کہ جب تک وہ کلام رسول تک پہنچ نہ جائے ہم اس کی حفاظت کرتے ہیں تا اس میں کوئی دوسرا دخل نہ دے سکے۔جب رسولوں تک وہ کلام پہنچ جاتا ہے۔تو پھر بھی اللہ تعالیٰ حفاظت نہیں چھوڑتا۔بلکہ حفاظت کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ رسول اس کلام کو بندوں تک پہنچا دیں اور اس طرح مکمل طور پر پہنچا دیں۔کہ اس کی کمیت اور کیفیت دونوں میں کوئی فرق نہ آئے۔

جب تک رسول لوگوں تک کلام پہنچا نہ لیں شیطان کو اس کا علم ہی نہیں ہوسکتا گویا جب تک رسول لوگوں تک خدا تعالیٰ کا کلام پہنچا نہ دیں۔اس وقت تک شیطان کو اس کلام کے متعلق کوئی علم ہی نہیں ہوسکتا۔ہاں! جب وہ انسانوں میں پھیل جاتا ہے تو جیسا کہ دوسری آیات سے ثابت ہے۔شیطان اس کلام کے بارہ میں شرارتیں

شروع کرتا ہے۔مگر پھر بھی وہ ناکام رہتا ہے۔غرض اس آیت سے ثابت ہے کہ شیطان کا کلام الٰہی کو اچکنے کا کام کلام الٰہی کے اعلان کے بعد شروع ہوتا ہے۔اور اس بارہ میں سماء الدنیا سے مراد نبی کی مجلس ہے۔نہ کہ وہ فضاء یا جَوّ جو ہمیں اپنے سروں کے اوپر نظر آتا ہے۔

نہ رسول کریم صلعم کے وقت نہ اس سے پہلے کبھی جنوں کو غیب کا علم ہوا (۷) یہ تو عام آیات تھیں۔ایک آیت خاص جنّوں کے متعلق بھی ہے۔جس سے ظاہر ہے کہ نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وقت میں نہ اس سے پہلے کبھی بھی جنّوں کو غیب کا علم حاصل ہوا ہے نہ پورا نہ ادھورا۔اور وہ آیت یہ ہے۔فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ۔(سبا:۱۵) یعنے جب حضرت سلیمان پر ہم نے موت وارد کی تو ان کی موت کا علم جنّوں کو اس وقت تک نہ ہو سکا۔جب تک کہ دابۃ الارض نے جوان کے عصا کو کھا رہا تھا انہیں خبر نہ دی پھر جب وہ گر گئے تو جنّوں نے یہ امر معلوم کر لیا۔کہ اگر انہیں غیب کا کچھ بھی علم ہوتا تو وہ اس ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پہلے زمانہ میں بھی جنّوں کو غیب کا علم حاصل نہ تھا۔اگر وہ آسمان پر سے سنا کرتے ہوتے تو انہیں حضرت سلیمان کی وفات کا علم کیوں حاصل نہ ہوتا۔یہ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمان چونکہ نبی تھے۔ان کی وفات کی خبر ضرور الہاماً اور خاص اہتمام سے فرشتوں پر نازل ہوئی ہوگی۔کیونکہ نبی کی بعثت اور موت دونوں اہم امور ہوتے ہیں۔

تفاسیر کا یہ دعویٰ کہ جنوں کو رسول کریم صلعم کی بعثت کا علم شہب کے گرنے سے ہوا غلط ہے تیسرا دعویٰ تفاسیر میں یہ کیا گیا ہے کہ جنّوں کو بلکہ ابلیس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کا علم آسمانی شہب کے بعد ہوا ہے اور وہ بھی جب کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو با جماعت نماز پڑھتے ہوئے انہوں نے دیکھا۔جیسا کہ تاریخوں سے ثابت ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نماز با جماعت پبلک میں کئی سال بعد شروع کی ہے(سیرۃ النبی لابن ھشام باب اسلام عمر بن الخطاب)۔پس اگر یہ معنے درست ہیں۔تو اس کے یہ معنے ہوں گے۔کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے کئی سال بعد تک ابلیس کو یہ معلوم ہی نہ تھا۔کہ کوئی رسول مبعوث ہوا ہے۔حالانکہ یہ صریح تعلیم قرآن کے خلاف ہے اور واقعہ کے خلاف ہے۔

نبی کی بعثت پر شیطان کے گھر میں ماتم نبی کے دعویٰ کے ساتھ ہی شیطان کے گھر میں ماتم پڑ جاتا ہے اور اسی وقت سب شیطان خواہ شیاطین الانس ہوں۔خواہ شیاطین الجنّ ہوں۔اس کی اور اس کی جماعت کی مخالفت

شروع کر دیتے ہیں۔ پس یہ کہنا۔ کہ کئی سال تک ابلیس کو اور دوسرے شیاطین کو اس کا علم ہی نہ تھا۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو چکے ہیں۔ سنت الٰہیہ کا ردّ ہے اور واقعات کے خلاف۔ اگر شیطان کو آپؐ کی بعثت کا علم نہ تھا۔ تو مکہ میں مخالفت کا طوفان بے تمیزی کہاں سے اٹھ رہا تھا۔ ابلیس کے کوئی بھی معنی کرو۔ اس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ناواقف رہنا خلاف عقل۔ خلاف قرآن اور خلاف سنت الٰہیہ ہے۔ قرآن کریم صاف فرماتا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ (الانعام: ۱۱۳)

شیٰطین الانس و الجن کو نبی کی بعثت کا علم فوراً ہو جاتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ خود شیاطین الانس والجنّ کو نبیوں کی بعثت کا علم مناسب ذرائع سے دے دیتا ہے اور وہ نبی کی بعثت کے معاً بعد اُس کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد شروع کر دیتے ہیں پھر ابلیس یا اس کے چیلوں کا اس خبر سے ناواقف رہنا کیا معنے رکھتا ہے یاد رہے کہ اس مضمون میں بغرض سہولت اور حجت ابلیس یا جن وغیرہ کے الفاظ کے متداول معنے میں نے لئے ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے۔ کہ میرے نزدیک وہی معنی درست ہیں۔ اس کی بحث اپنے موقعہ پر آئے گی کہ میرے نزدیک ابلیس شیطان یا جنّ کے کیا معنے ہیں؟

جنوں کا ایک دوسرے پر چڑھ کر غیب کا حاصل کرنے کا مطلب اس جگہ ایک سوال رہ جاتا ہے۔ کہ جب غیب کا علم آسمان سے لینا یا آسمان سے خبروں کا سننا جنّوں کے لئے ناممکن ہے تو پھر حدیثوں میں جو آتا ہے کہ جنّ ایک دوسرے پر چڑھ کر آسمان کی خبر سنتے ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اس سے مراد انبیاء کی باتوں کو سننا ہے اور ایک دوسرے پر چڑھ کر سننے سے یہ مراد ہے۔ کہ آئمۃ الکفر خود انبیاء کی مجالس میں حاضر نہیں ہوتے اور براہ راست اپنے دلوں کے شکوک کو دُور نہیں کرواتے۔ بلکہ ہمیشہ کئی واسطوں اور بزعم خود ہوشیاری سے ان کی تبلیغ اور تعلیم کو معلوم کرتے ہیں۔ پھر چونکہ اوّل تو اُن کی اپنی نیّت خراب ہوتی ہے۔ دوسرے وہ سنی سنائی باتوں پر اپنی مخالفت کی بنیاد رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قدر جھوٹ ان کے بیان میں مل جاتا ہے کہ ایک بات سچی ہو تو سو جُھوٹی ہوتی ہیں۔

شیطانوں پر شہاب گرنے سے مراد اور یہ جو حدیثوں میں آتا ہے کہ کبھی شیطان لوگوں تک بات پہنچا دیتے ہیں۔ اور پھر شہاب ان پر گرتا ہے۔ اور کبھی بات پہنچانے سے پہلے شہاب ان پر گر جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ نبیوں پر گستاخی کرنے کے جرم میں فوراً پکڑے جاتے ہیں۔ اور بعض کو حکمت الٰہی لمبی مہلت دے دیتی ہے۔ اور وہ لوگوں کو خوب بھڑکاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن شہاب ان کو بھی آ کر پکڑ لیتا ہے۔

شیطانوں پر شہب کے گرنے کا دو حدیثوں میں ذکر میں اس جگہ دو حدیثیں بھی درج کر دیتا ہوں تاکہ اصل الفاظ حدیث کے بھی مستحضر رہیں۔ ایک روایت بخاری کی ہے جو یہ ہے...... عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ یَبْلُغُ بِهِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا قَضَی اللّٰهُ الْاَمْرَ فِی السَّمَاءِ ضَرَبَتِ الْمَلَائِکَةُ بِاَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهِ کَالسِّلْسِلَةِ عَلٰی صَفْوَانٍ قَالَ عَلِیٌّ وَقَالَ غَیْرُهُ صَفْوَانٍ یَنْفُذُهُمْ ذٰلِكَ فَاِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّکُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْ قَالَ الْحَقُّ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ فَیَسْمَعُهَا مُسْتَرِقُوا السَّمْعِ وَمُسْتَرِقُوا السَّمْعِ هٰکَذَا وَاحِدٌ فَوْقَ آخَرَ وَوَصَفَ سُفْیَانُ بِیَدِهِ وَفَرَّجَ بَیْنَ اَصَابِعِ یَدِهِ الْیُمْنٰی نَصَبَهَا بَعْضَهَا فَوْقَ بَعْضٍ فَرُبَّمَا اَدْرَكَ الشِّهَابُ الْمُسْتَمِعَ قَبْلَ اَنْ یَرْمِیَ بِهَا اِلٰی صَاحِبِهِ فَیُحْرِقَهُ وَرُبَّمَا لَمْ یُدْرِکْهُ حَتّٰی یَرْمِیَ بِهَا اِلَی الَّذِیْ یَلِیْهِ اِلَی الَّذِیْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْهُ حَتّٰی یُلْقُوْهَا اِلَی الْاَرْضِ وَرُبَّمَا قَالَ سُفْیَانُ حَتّٰی تَنْتَهِیَ اِلَی الْاَرْضِ فَتُلْقَی عَلٰی فَمِ السَّاحِرِ فَیَکْذِبُ مَعَهَا مِائَةَ کَذْبَةٍ فَیُصَدَّقُ فَیَقُوْلُوْنَ اَلَمْ یُخْبِرْنَا یَوْمَ کَذَا وَکَذَا یَکُوْنُ کَذَا وَکَذَا فَوَجَدْنَاهُ حَقًّا لِلْکَلِمَةِ الَّتِیْ سُمِعَتْ مِنَ السَّمَاءِ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الحجر باب قوله الا من استرق السمع) دوسری روایت ابن ابی حاتم کی ہے۔ جو یہ ہے۔ قَالَ اِبْنُ اَبِیْ حَاتِمٍ...عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی اَنْ یُّوْحِیَ بِاَمْرِهِ تَکَلَّمَ بِالْوَحْیِ فَاِذَا تَکَلَّمَ اَخَذَتِ السَّمٰوٰتُ مِنْهُ رَجْفَةً اَوْقَالَ رِعْدَةٌ شَدِیْدَةٌ مِنْ خَوْفِ اللّٰهِ تَعَالٰی فَاِذَا سَمِعَ بِذَالِكَ اَهْلُ السَّمٰوٰتِ صَعِقُوْا وَخَرُّوْا لِلّٰهِ سُجَّدًا فَیَکُوْنُ اَوَّلُ مَنْ یَرْفَعُ رَأْسَهُ جِبْرِیْلَ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ فَیُکَلِّمُهُ اللّٰهُ مِنْ وَحْیِهِ بِمَا اَرَادَ فَیَمْضِیْ بِهِ جِبْرِیْلُ عَلَیْه الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَی الْمَلٰئِکَةِ فَکُلَّمَا مَرَّ بِسَمَاءٍ سَمَاءٍ یَسْأَلُهُ مَلَائِکَتُهَا مَاذَا قَالَ رَبُّنَا یَاجِبْرِیْلُ فَیَقُوْلُ عَلَیْهِ السَّلَامُ قَالَ الْحَقُّ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ ۔ فَیَقُوْلُوْنَ کُلُّهُمْ مِثْلَ مَا قَالَ جِبْرِیْلُ فَیَنْتَهِیْ جِبْرِیْلُ بِالْوَحْیِ اِلٰی حَیْثُ اَمَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی مِنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ (تفسیر ابن کثیر سورۃ الحجر)۔

ابن ابی حاتم کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی جبریل کی حفاظت میں اس مقام تک پہنچادی جاتی ہے جو وحی کے لئے مقرر ہے یعنے رسول تک ۔ پس دوسری روایات جو بتاتی ہیں ۔ کہ جنّ اسے چک لیتے ہیں ۔ ان کے یہی معنے ہوسکتے ہیں کہ موردوحی کے پاس جب وحی پہنچ جاتی ہے ۔ اور جب وہ اس کا اعلان کر دیتا ہے ۔ اس کے بعد شیطان اُسے اچکتے ہیں ۔ اور کئی جھوٹ ملا کر انہیں اپنے اتباع میں پھیلا دیتے ہیں ۔ نبیوں کی باتیں اس زمانہ کے

لوگوں کے لئے عجیب تو ہوتی ہی ہیں پہلے تو لوگ حیران ہوتے ہیں کہ کیا یہ مدعی ایسی ایسی باتیں کرتا ہے؟ مگر کبھی نبی کے اتباع سے جب وہ اس حصہ کو سنتے ہیں جو شیطانوں نے صحیح بیان کیا تھا۔ تو ان کے اتباع یقین کر لیتے ہیں۔ کہ جو دوسری باتیں انہوں نے بیان کی تھیں۔ وہ بھی صحیح تھیں۔ اور آپس میں کہتے ہیں کہ دیکھا فلاں بزرگ نے فلاں دن ان کے بارہ میں یہ بات کہی تھی۔ وہ درست نکلی۔ اس مدعی کے مرید خود اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ پس اس سے ان کو ان جھوٹوں پر بھی یقین آجاتا ہے۔ جو ان کے سرداروں نے نبیوں کی طرف منسوب کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ نبی کے اتباع ان باتوں کو ہم سے چھپاتے ہیں۔ اصل بات وہی ہے جو ہمارے لیڈروں نے کہی تھی۔ یہ ایک عجیب سلسلہ ہے جو ہر نبی کے وقت میں چلتا ہے اور لاکھوں آدمی جو اپنی تحقیق کا مدار اپنے لیڈروں کے بیانات پر رکھتے ہیں۔ اور ذاتی تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اس بلا میں گرفتار ہو کر صداقت سے محروم رہ جاتے ہیں۔

ان آیات کے متعلق جو معانی عوام میں مشہور ہیں۔ یا بعض مفسرین نے صحیح روایات کا مفہوم غلط سمجھنے کی وجہ سے یا کمزور روایات کو صحیح تسلیم کر لینے کی وجہ سے قرآن کریم کے منشاء کے خلاف لکھے ہیں۔ ان کے متعلق بعض اور غور طلب امور بیان کر کے میں اس تعلیق کو ختم کرتا ہوں۔

گرنے والے وجود سے مراد ستارے نہیں بلکہ شہب ہیں گرنے والے وجود سے مراد ستارے نہیں بلکہ شُہب ہیں۔ پس وہ معترضین جو کہتے ہیں کہ گویا قرآن کریم کے نزدیک آسمان سے گرتی ہوئی نظر آنے والی روشنی حقیقی ستارے ہوتے ہیں۔ درست نہیں۔ نہ یہ بات قرآن کریم میں ہے نہ اس کے معتبر مفسر یہ معنے کرتے ہیں۔ بلکہ مفسرین تو الگ رہے کفار تک بھی اس امر کو سمجھتے تھے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی علامت یہ نہ تھی کہ ستارے ٹوٹیں بلکہ یہ تھی کہ شُہب گریں۔ (جیسا کہ اوپر طائف والوں کا واقعہ بیان ہو چکا ہے۔)

آسمان کے محفوظ ہونے کے باعث شیطان وہاں سے کوئی بات نہیں اچک سکتے قرآن کریم میں متواتر یہ بیان ہوا ہے کہ ہم نے آسمان کی حفاظت کی ہے۔ پس جس کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے کی ہے اس سے شیطان کس طرح کوئی بات اُچک سکتے ہیں۔

جب سماء دنیا تک کلام اُتر آتا ہے۔ اور شیطان وہاں سے اسے اُچک لیتے ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا فرشتے اس کلام کو نبی پر جلدی اتارتے ہیں۔ یا شیطان اپنے اولیاء پر۔ اگر فرشتے پہلے اُتار دیتے ہیں۔ تو شیطانوں کو آسمان سے اُچکنے کا کیا فائدہ ہوا۔ نبی کے منہ سے اس خبر کو دنیا پہلے ہی سن چکی ہوگی۔ اور اگر یہ کہا جائے۔ کہ فرشتے نبی تک دیر میں پہنچتے ہیں شیطان اپنے اولیاء تک جلد پہنچ جاتے ہیں۔ تو سارے خدائی سلسلہ پر اعتراض ہوگا۔ اگر باوجود

اس قدر حفاظت کے جو اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے۔ شیطان کلام کے پہنچنے سے پہلے ہی اسے اچک لیتے ہیں تو پھر نبیوں کے کلام پر کیا اعتبار رہا۔ جس طرح شیطان اسے اچک سکتے ہیں اس میں کچھ ملا بھی سکتے ہیں (گو بعض لوگوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ شیطان نبی کی زبان پر بھی بعض کلمات جاری کر دیتا ہے۔ العیاذ باللہ) (تفسیر ابن کثیر زیر آیت وما ارسلنک من قبلک من رسول۔)

اگر یہ ممکن ہے کہ شیطان باوجود حفاظت کے خدائی کلام کو اُچک لیتے ہیں۔ تب تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے۔ خدا تعالیٰ کی حفاظت کے باوجود وہ نبی کو ہلاک بھی کر دیں نعوذ باللہ من ذالک۔ مگر جس طرح یہ نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ کہ کلام الٰہی کو شیطان اُچک کرلے جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں اِلَّا مَنِ اسۡتَرَقَ السَّمۡعَ یا اِلَّا مَنۡ خَطِفَ الۡخَطۡفَةَ فرما کر خود ہی فرمادیا ہے کہ شیطان کچھ سن لیتا ہے یا اچک لیتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اِلَّا اللہ تعالیٰ کے فعل کے بارہ میں نہیں۔ بلکہ شیطان کے بارہ میں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ ہم اپنے کلام کی حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے کچھ تھوڑے سے کلام کے جو ہم شیطان کو دے دیتے ہیں۔ تب تو یہ جواب صحیح ہوتا کہ خدا تعالیٰ کی طاقت پر اعتراض نہیں کیونکہ وہ اپنی مرضی سے دیتا ہے۔ لیکن عبارت یوں نہیں۔ عبارت تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تو حفاظت کرتا ہے لیکن شیطان اچک لے جاتا ہے اور یہ معنی نہ صرف نبی اور کلام الٰہی کی شان کے خلاف ہیں بلکہ ان سے تو نعوذ باللہ من ذالک اللہ تعالیٰ کی بے بسی اور بے کسی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

اگر یہ معنے درست ہوں۔ تو چاہیے کہ جب کوئی نجومی حساب لگائے اور کوئی زائچہ تجویز کرے۔ اسی وقت شُہب آسمان سے گرنے لگیں۔ مگر یہ نہیں ہوتا۔ پس واقعات ان معنوں کو ردّ کر رہے ہیں۔ رات دن ہزاروں نجومی۔ کاہن۔ رمّال۔ جفّار۔ جوتشی۔ پنڈت۔ سٹرانومر۔ سٹارلوجر ان کاموں میں مشغول ہیں اور غیب کی خبریں معلوم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کا تعلق شیطانوں سے ہے اور شیطان آسمان سے اچک کر انہیں خبریں بتاتے ہیں۔ تو رات اور دن شہب کی بارش ہوتی رہنی چاہیے۔ اگر کہا جائے کہ شہب اسی وقت گرتے ہیں۔ جبکہ شیاطین باتیں سنیں۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ نبیوں کے زمانہ میں شیطان زیادہ باتیں سنتے ہیں اور اچک کرلے جاتے ہیں۔ حالانکہ نبی کا زمانہ تو زیادہ محفوظ زمانہ ہوتا ہے۔ اور ہونا چاہیے۔ پھر سوال یہ ہے۔ کہ یہ امتیاز کیونکر کیا جائے۔ کہ نبی کے زمانہ میں تو نجومی شیطانوں سے خبریں سن کر لوگوں کو سناتے ہیں اور دوسرے زمانہ میں صرف حساب لگا کر سنا دیتے ہیں؟ کیونکہ دونوں قسم کی خبروں میں کوئی فرق کرنا پڑے گا۔ یا تو یہ کہنا ہوگا۔ کہ نبی کے

زمانہ میں نجومیوں کی باتیں زیادہ سچی ہوتی ہیں۔ جو بالبداہت غلط ہے یا پھر ماننا پڑے گا۔ کہ ہر زمانہ میں ہی نجومی شیطانوں سے باتیں پوچھ کر آگے لوگوں کو سناتے ہیں اور جو شخص ستاروں کا تھوڑا سا علم بھی جانتا ہو۔ وہ بتا سکتا ہے کہ یہ خلاف عقل بات ہے۔ علم نجوم و رمل وغیرہ گو لغو اور فضول ہیں۔ مگر حسابی اصول پر قائم ہیں۔ جنّات کا اس معاملہ میں کوئی بھی دخل نہیں۔

ہاں ایک گروہ ہے۔ جو ارواح سے اپنا تعلق ظاہر کرتا ہے اور وہ وہ گروہ ہے جو اپنے آپ کو روحانی کہتے ہیں انگریزی میں یہ لوگ سپر چولسٹ کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے۔ کہ وہ ارواح سے ملتے اور باتیں کرتے ہیں۔ ان کا ذکر بھی آیات مذکورہ میں نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ان کے متعلق بھی ہم نہیں دیکھتے کہ اِدھر وہ حاضرات کا عمل کریں اور اُدھر شہب گرنے لگیں۔ اس نام نہاد علم کی طرف منسوب ہونے والے لوگ یا تو ٹھگی اور فریب کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان کی بھی کافی تعداد ہے یا پھر وہ دھوکہ خوردہ لوگ ہیں جو انسانی دماغ کی باریکیوں کو نہ سمجھتے ہوئے بعض باریک روحانی قویٰ کو عالم اُخروی کی ارواح کا عمل اور تاثیر قرار دے لیتے ہیں۔ بہر حال نہ ان کی مزعومہ ارواح آسمان سے سنتی ہیں اور نہ ان پر شہاب گرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ان آیات میں کلام الٰہی کی حفاظت کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نبی پر کلام کے نازل ہونے تک کوئی اسے معلوم نہیں کرسکتا۔ جب وہ نازل ہوجاتا ہے تو پھر شیاطین الانس والجن اسے مختلف ذرائع سے اچک کر اس میں جھوٹ ملا کر لوگوں میں پھیلاتے ہیں اور نبی کے خلاف انہیں اکساتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے ہی موقع پر جھوٹ ملانے کا فائدہ ہوسکتا ہے۔ ورنہ جنّ آسمان سے غیب سنیں تو وہ پاگل ہیں کہ اس میں جھوٹ ملا کر اپنی عزت کھوئیں۔ ہاں! نبی کے کلام میں ان کے دشمن جھوٹ ملاتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو جوش دلائیں اور ان کے خلاف اُکسائیں۔ کوئی صحیح حوالہ لیا۔ اس کے غلط معنے کئے یا ایک ٹکڑہ لیا۔ اور سیاق وسباق سے الگ کر کے اس کے مضمون سے لوگوں کو جوش دلایا۔ یہ نبیوں کے دشمنوں کا روزمرہ کا مشغلہ ہے۔ اور یہی وہ اچکنا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ کی مشیت نے جائز رکھا ہے۔ اور اس سے نبی کے مشن کی حفاظت نہیں کی۔

شیطانوں کو کلام الٰہی کے غلط معانی پھیلانے کی اجازت اللہ تعالیٰ نے کسی مصلحت کی بناء پر دے رکھی ہے

بلکہ فرماتا ہے۔ کہ ہم دشمنوں کو اس کا خود موقع دیتے ہیں جیسے خود فرمایا وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (الانعام: ۱۱۳) اور فرماتا ہے۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا (الانعام: ۱۲۴) اور اسی طرح ہم نے ہر (نبی کی) بستی میں اس کے بڑے

مجرموں کو ایسا ہی بنا دیا ہے۔ (اس کا ذکر پہلی آیت میں آیا ہے۔ کہ شیطان اپنے دوستوں کو الہام کرتے اور نبی کے خلاف جھگڑنے کے لئے اُکساتے ہیں) اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نبی کے خلاف خوب تدبیریں کرتے ہیں۔ غرض جہاں کلام الٰہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حفاظت حاصل ہے۔ کہ اس میں کوئی ظاہری یا باطنی دشمن تبدیلی نہیں کرسکتا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے شیطانی لوگوں کو اپنی مصلحت سے اس امر کی اجازت دے رکھی ہے۔ کہ اس کلام کے غلط معنے لوگوں میں پھیلائیں۔ یا نبی کی وحی کے متعلق جھوٹ بول بول کر لوگوں کو جوش دلائیں۔ لیکن جب وہ ایسا کر چکتے ہیں تو پھر ان پر آسمان سے شہاب گرتا ہے۔ اور نبی کے ذریعہ سے ان کے فریب کا پردہ چاک کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ استثناء ہے کہ اس سے نہ خدا تعالیٰ کی طاقت پر حرف آتا ہے نہ دین مخدوش ہوتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کی شرارت کو اللہ تعالیٰ نے خود ہی مستثنیٰ کر دیا ہوا ہے۔ نیز اس قسم کی شرارت سے دین میں کچھ حرج نہیں آتا۔ وہ اپنی جگہ محفوظ رہتا ہے۔ یہ جھوٹی باتیں صرف دشمنوں میں پھیلائی جاتی ہیں اور دشمن کی چندروزہ خوشی کا موجب ہوتی ہیں۔

کلام الٰہی کے خلاف شرارتیں کرنے والے دو قسم کے لوگ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ کلام الٰہی کے خلاف اس قسم کی شرارتیں کرنے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک اندرونی دشمن یعنی منافق۔ اور ایک بیرونی دشمن۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ سورۂ حجر اور سورۂ ملک میں تو شیطان رجیم کی طرف اس فعل کو منسوب کیا گیا ہے۔ اور سورۂ صافات میں شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ کی طرف۔ اور لغت میں جہاں رجیم کے معنے دھتکارے ہوئے دور رکھے گئے کے ہیں مَارِدٍ کے معنی باغی کے ہیں۔ پس سورۂ حجر اور سورۂ ملک میں ان دشمنانِ دین کا ذکر ہے جو کفار میں سے ہوں۔ یعنی جن کو ظاہر میں بھی اسلام کے قریب آنے کی توفیق نہ ملی ہو۔ بلکہ وہ اس سے دور رکھے گئے ہوں اور بتایا ہے کہ ان کے حملوں سے اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی حفاظت کرے گا۔ اور سورۂ صافات میں یہ بتایا ہے کہ بعض لوگ مسلمان کہلاتے ہوئے بھی نادانستہ یا شرارتاً قرآنی مطالب کو بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ شیطان ماردٍ ہوں گے۔ یعنے ظاہر میں تو مسلمان کہلائیں گے لیکن درحقیقت اسلام کے دانستہ یا نادانستہ باغی ہوں گے ان کے فساد کو بھی اللہ تعالیٰ دور کرے گا۔ یہ آئندہ کے لئے پیشگوئی ہے اور بتایا ہے۔ کہ جب بھی مسلمان قرآنی مطالب کے سمجھنے سے قاصر ہو جائیں گے اور اس کے مطالب کو بگاڑ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ مامور مبعوث کر کے ان کے شر اور فتنہ سے قرآن کریم کو محفوظ کرے گا۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

ایک بات اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ منجمین اور نام نہاد روحانیین کے بارہ میں ہے۔ انبیاء کا وجود

ان کے خیالات کا قلع قمع بھی کرتا رہتا ہے پس ضمنی طور پر ان کے متعلق بھی یہ آیت چسپاں ہو سکتی ہے مگر خود علم نجوم یا تاثیرات نجوم کا تعلق جہاں تک حقائق سے ہے۔ یہ ہرگز اسلام کے خلاف نہیں۔ قرآن کریم ہمیں قوانین نیچر کے سیکھنے کا خود حکم دیتا ہے۔ پس یہ ناممکن ہے کہ ایک طرف تو وہ علم ہیئت میں حکمتیں رکھے۔ ان کے سیکھنے کا حکم دے اور پھر جو ان حکمتوں کو سیکھنا چاہے۔ اس پر شہب مارے جائیں۔ اسلام وہم اور شرک سے روکتا ہے۔ پس جہاں تک ان علوم کا تعلق تخمین اور وہم سے ہے وہ ناجائز ہیں اور جب ان کو مذہب کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ وہ شرک بن جاتے ہیں ستاروں کی حرکات میں تاثیرات یقیناً ہیں لیکن وہ قانون قدرت کا ایک جزو ہیں۔ ہزاروں امور ایک وقت میں تاثیر ڈال رہے ہوتے ہیں۔ اپنی ذات میں کامل تاثیر جو دوسرے کی محتاج نہیں صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔

ستاروں کی قطعی تاثیر کا خیال رکھنے والا مشرک ہے پس ستارے کیا کسی اور مادی سبب کے متعلق بھی اگر کوئی شخص خیال کرے کہ وہ قطعی اور یقینی تاثیر رکھتا ہے تو وہ مشرک ہے۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَ كَذَا فَهُوَ كَافِرٌ بِي وَمُؤمِنٌ بِالْكَوْكَبِ جو کہے فلاں فلاں ستارہ کی تاثیر کی وجہ سے ہم پر بارش ہوئی وہ کافر ہے (بخاری کتاب الاذان باب یستقبل الامام الناس اذا سلم) ستاروں کی تاثیرات میں اول تو سینکڑوں وہمی باتیں شامل کر دی گئی ہیں لیکن جو علمی طور پر ثابت ہیں وہ بھی ہزاروں اسباب میں سے ایک سبب ہے مسبب الاسباب خدا ان کا نگران اور موکل ہے پس اسی پر توکل چاہیے۔

نجومیوں کے لحاظ سے رجم شیاطین کے معنے نجومیوں وغیرہ کے لحاظ سے اس رجم شیاطین کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جس زمانہ میں نبی نہیں ہوتے۔ یہ لوگ خوب دعویٰ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب نبی ظاہر ہوتے ہیں تو ان کو خوب مار پڑتی ہے یعنی فریب کھل جاتا ہے۔ اور لوگ مصفّٰی علم غیب اور تک بندی میں فرق معلوم کر لیتے ہیں۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا

اور (ضرور) ہم نے زمین کو پھیلایا ہے اور اس میں ہم نے محکم پہاڑ قائم کئے ہیں اور (نیز) ہم نے اس میں ہر قسم کی

مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۲۰﴾

موزون (ومناسب) چیزوں کو (پیدا کیا اور) بڑھایا ہے۔

حل لغات۔ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا زمین میں ہم نے کھاد ڈالی ہے۔ یا ہم نے

اس کو پھیلایا ہے۔مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۃ رعد آیت نمبر ۴۔

مَوْزُوْنٌ وَزَنَ سے اسم فاعل ہے۔اور وَزَنَهٗ ۔وَزْنًا کے معنے ہیں رَازَ ثِقْلَهٗ وخِفَّتَهٗ وَامْتَحَنَهٗ بِمَا يُعَادِلُهٗ کہ کسی چیز کے بھاری اور ہلکے ہونے کا اندازہ کیا۔اور اس کے بالمقابل وزن کی چیز سے اس کے وزن کا اندازہ معلوم کیا (جیسے بٹّوں سے تولتے ہیں) وَفِی الْاَسَاسِ ''وَزَنْتُ الشَّیْءَ وَرَزَنْتُهٗ وَثَقَلْتُهٗ اِذَا رُزْتَهٗ بِيَدِكَ لِتَعْرِفَ وَزْنَهٗ'' اور اساس میں یوں لکھا ہے۔کہ وَزَنَ ۔رَزَنَ اور ثَقَلَ ہم معنے ہیں۔اور ان کے معنے ہیں کہ کسی چیز کو ہاتھ میں لے کر اس کے وزن کا اندازہ کیا جائے۔اور وَزَنَ تَمْرَ النَّخْلَةِ وَزْنًا کے معنے ہیں۔خَرَصَهٗ وَحَزَرَهٗ کھجور کے پھل کی مقدار کا اندازہ کیا۔(اقرب) پس موزون کے معنے ہوں گے اندازہ کی ہوئی چیز۔وزن کی ہوئی چیز یا متناسب۔

تفسیر ۔زمین کو پھیلانے اور اس میں کھاد ڈالنے کا مطلب زمین کو ہم نے پھیلایا ہے یا اس میں کھاد ڈالی ہے۔دونوں معنے ہی اس آیت میں چسپاں ہوتے ہیں زمین کو اللہ تعالیٰ نے انسانی ضرورت کے مطابق پھیلایا ہے یعنی اس قدر وسیع بنایا ہے کہ باوجود گول ہونے کے وہ انسان کے لئے تکلیف دہ نہیں۔بلکہ اس کی گولائی کو وہ محسوس بھی نہیں کرتا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس میں کھاد ڈالی ہے کیونکہ زمین نئی نئی طاقتیں دوسرے ستاروں سے حاصل کرتی رہتی ہے۔بلکہ علم ہیئت سے ثابت ہے کہ دوسرے سیاروں سے ذرات زمین پر گرتے رہتے ہیں اور اس کا حجم بڑا ہو رہا ہے۔وہ بیرونی کھاد اس کی طاقت کو بہت بڑھاتی رہتی ہے۔کھاد کے بعد پانی کی ضرورت ہوتی ہے سو اس کے متعلق فرمایا۔کہ ہم نے اس میں پہاڑ بنائے ہیں۔جو برفوں کو سمیٹ کر رکھتے ہیں اور پانیوں کا ذخیرہ ان کے ذریعہ موجود رہتا ہے اور دریاؤں کی مدد سے سب دنیا میں پھیل کر اسے سیراب کرتا ہے۔

اَنْبَتَ کے دو معنی اس کے بعد فرماتا ہے۔ہم نے ہر مناسب شے مناسب مقدار میں اُگائی یا بڑھائی ہے اَنْبَتَ نَبَاتًا (یعنے اُگانا) زمین سے کسی چیز کو بطریقہ نشوونما نکالنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔لیکن محاورہ میں اس کے معنی بڑھانے کے بھی آتے ہیں۔مثلاً قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے متعلق آتا ہے۔وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (آل عمران:۳۸) اس جگہ یہ لفظ بڑھانے اور ترقی دینے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

اس آیت میں انبت کے دونوں معنی چسپاں ہوتے ہیں آیت زیر بحث میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔اور اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ کے معنے ہیں ہم نے زمین میں ہر مناسب چیز پیدا کر رکھی ہے۔یا اسے ترقی دے رہے ہیں۔یا ہر چیز جس کا ایک اندازہ لگایا گیا ہے اُسے اُگایا۔یا اسے ترقی دی ہے۔

یعنی ہر چیز جو اہل دنیا کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی تھی وہ ہم نے اس میں رکھ دی اور وزن کے معنے اندازہ کے بھی ہیں۔تو اس لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ ہر چیز اندازے کے مطابق اس میں رکھ دی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے وہ جانتا ہے کہ کس چیز کی اس میں ضرورت ہے اور کتنی ضرورت ہے۔اس نے کمیت اور کیفیت دونوں کو ملحوظ رکھا ہے۔

اس آیت کا پہلی آیتوں سے تعلق اس آیت کا تعلق پہلی آیتوں سے یہ ہے کہ ان میں قرآن کریم کے نزول اور اس کی حفاظت کے غیر معمولی سامانوں کا ذکر تھا۔جو ایک آسمانی مثال سے ثابت کیا گیا تھا۔

زمین کے نشوونما پانے اور اس کو کمزوری سے بچانے کے لئے تین سامان اب زمین کی مثال دی کہ زمین میں بھی ہم نے اس کے نشوونما پانے اور اسکے کمزوری سے بچانے کے لئے غیر معمولی سامان پیدا کرر کھے ہیں کچھ بیرونی ہوتے ہیں کچھ اندرونی۔(۱) آسمان سے گرنے والا مادہ (۲) پہاڑ (۳) اس کی اندرونی طاقتیں۔ یہی حال الٰہی کتاب کا ہوتا ہے۔وہ آسمان سے مدد پاتی رہتی ہے اس کی تائید میں ائمہ لگے رہتے ہیں اور وہ اپنے اندر ذاتی خوبیاں رکھتی ہے۔جن کی وجہ سے اس کے مطالب ہر طبقہ کے لوگوں کے لئے جاذب رہتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۱﴾

اور اس میں ہم نے تمہارے لئے اور (ہر) اس (مخلوق) کے لئے (بھی) جسے تم رزق نہیں دیتے معیشت کے سامان پیدا کئے ہیں۔

حلّ لُغات۔مَعَایِش مَعَایِش مَعِیْشَۃٌ کی جمع ہے۔اور مَعِیْشَۃٌ کے معنے ہیں۔اَلَّتِیْ تَعِیْشُ بِهَا مِنَ الْمَطْعَمِ وَالْمَشْرَبِ۔وہ کھانا اور پینا جس سے انسان زندہ رہتا ہے۔وَمَا تَكُوْنُ بِهِ الْحَيَاةُ جس پر زندگی کا دارومدار ہو۔وَمَا يُعَاشُ بِهِ مِنْ طَعَامٍ وَنَحْوِهٖ مِمَّا يُكْسَبُ۔کھانا اور اس جیسی اور ضروریات جن کو انسان کما کر حاصل کرتا ہے۔اس پر بھی معیشت کا لفظ بولا جاتا ہے۔اَوْ يُعَاشُ فِيْهِ مِنْ مَكَانٍ وَزَمَانٍ وہ وقت یا جگہ جس میں زندگی بسر کی جائے۔(اقرب)

تفسیر۔زمین میں تمہارے لئے ہر قسم کے سامان پیدا کئے گئے ہیں۔اور ان کا رزق بھی پیدا کیا گیا ہے

جن کو تم رزق نہیں دے سکتے۔ انسان دوسرے حیوانوں پر برتری کا دعویدار ہے۔لیکن رزق جمع کرنے میں کس قدر تکلیف اٹھاتا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ نے ہزاروں ہزار کیڑوں مکوڑوں کا رزق کس طرح مہیا کر رکھا ہے۔انسان تو ان کو رزق نہیں دیتا۔مگر پھر بھی سب کو رزق مل رہا ہے۔یہ ایک بالا ہستی کا ثبوت ہے جس کی نظر سے اس کی کوئی مخلوق پوشیدہ نہیں۔اوپر کی آیات سے اس آیت کا یہ بھی تعلق ہے کہ روحانی غذاؤں کا بھی انسان ہر زمانہ میں محتاج ہوتا ہے۔ ایک زمانہ کے لوگ دوسرے زمانہ کے لوگوں کے لئے صحیح روحانی غذا مہیا نہیں کر سکتے۔اس لئے انسانی علوم بدلتے رہتے ہیں۔اس لئے فرمایا کہ ایسے وسیع مطالب والے الہامی کلام کی جو آسمان سے نازل ہوا اور اسے محفوظ رکھا جائے ایک یہ بھی ضرورت ہے کہ اگر انسانوں پر معاملہ چھوڑ دیا جائے۔تو آئندہ نسلوں کا وہ کبھی خیال نہ رکھیں۔اپنے زمانہ کے حالات اور علوم کے مطابق کلام الٰہی کو ڈھال لیں اور اگلے لوگ حیران و پریشان رہ جائیں۔گذشتہ علوم ان کی تسلی کا موجب نہ ہوں۔اور نئی ضرورتوں کو کلام الٰہی پورا نہ کرتا ہو۔پھر وہ کیا کریں؟ اس لئے فرمایا۔کہ جس طرح ان جانداروں کا رزق ہم نے مہیا کیا ہے۔جن کو تم رزق نہیں دے سکتے یا نہیں دیتے۔اسی طرح ان انسانوں کے لئے ہم نے اس کلام میں ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔جو بعد میں آنے والے ہیں۔اور پہلے زمانہ کے لوگ ان کی روحانی غذا کا انتظام نہیں کر سکتے۔جب وہ وقت آئے گا اللہ تعالیٰ ان خزانوں کو ان کے لئے کھول دے گا۔اور وہ روحانی غذا حاصل کر لیں گے۔اللہ تعالیٰ کا کیسا احسان ہے۔اگر قرآن کریم کے علوم گذشتہ زمانہ تک محدود ہوتے۔تو آج روحانی غذا کے طالبوں کے لئے سخت مشکلات ہوتیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو ویسا ہی وسیع بنایا ہے جیسے مادی دنیا کو مگر اللہ تعالیٰ نے اس کلام کو ویسا ہی وسیع بنایا ہے۔جیسا کہ مادی دنیا کو بلکہ اس سے زیادہ اور ہر زمانہ کے مطابق اس میں سے علوم نکلتے رہتے ہیں۔

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ ٝ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا

اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے (غیر محدود) خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور اسے ہم ایک معیّن اندازے سے

بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾

ہی اُتارتے ہیں۔

حلّ لُغَات۔نُنَزِّلُ نُنَزِّلُ نَزَّلَ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے۔اور نَزَّلَهٗ کے معنے ہیں۔صیّرَہٗ

نَازِلًا اس کو اترنے والا کر دیا۔ یعنی ایسی حالت میں کر دیا کہ اُترے۔ القومَ۔ اَنْزَلَهُمُ الْمَنَازِلَ۔ لوگوں کو ان کی جگہوں پر اتارا۔ الشَّیْءَ۔ رَتَّبَهٗ۔ کسی چیز کو مرتب کیا۔ عِیْرَهٗ۔ قَدَّرَلَهَا الْمَنَازِلَ۔ قافلہ کے امام نے قافلہ کے لوگوں کے لئے جگہیں مقرر کر دیں۔ (اقرب) تَنْزِیل اصل میں آہستہ آہستہ اتارنے کو کہتے ہیں۔

اَلْقَدَرُ اَلْقَدَرُ مَایُقَدِّرُہُ اللّٰہُ مِنَ الْقَضَاءِ۔ وہ قضا جس کا اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتا ہے۔ وعَرَفَهٗ بَعْضُهُمْ بِاَنَّهٗ تَعَلُّقُ الْاِرَادَةِ بِالْاَشْیَاءِ فِیْ اَوْقَاتِهَا۔ اور بعض نے قدر کی یہ تعریف کی ہے کہ اشیاء کا اپنے اوقات پر وقوع پذیر ہونا قدر کہلاتا ہے۔ مَبْلَغُ الشَّیْءِ کسی چیز کی حد اور انتہاء۔ الطَّاقَةُ۔ طاقت۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں ایک بہت بڑی صداقت بیان کی گئی ہے۔ اور پہلی آیت کی مزید تفصیل کی گئی ہے ہر چیز کے خزانے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھے ہیں۔ اور ضرورت کے مطابق وہ انسانی ذہن کو ادھر منتقل کر دیتا ہے۔ اور لوگ ان خزانوں سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ زمین میں سبھی کچھ تھا۔ مگر ایک وقت تک انسان نے لوہے کا علم حاصل نہ کیا تھا۔ پھر لوہا نکلا۔ اور اسے لوگوں نے خوب استعمال کیا۔ مگر لوہا بے جان تھا۔ جب انسان کی ضرورت بڑھی اور اس نے دنیا میں کثرت سے پھرنا چاہا۔ تو پتھر کے کوئلے اور بھاپ کی دریافت ہوئی اور بے جان لوہا جانداروں کی طرح کام کرنے لگا۔ ضرورت نے ترقی کی۔ تو تار کی بجلی کی ایجاد ہوئی۔ اس کے بعد بے تار کی بجلی کی۔ غرض ہر زمانہ کے مطابق زمین خزانے اگلتی چلی جاتی ہے۔

کلام الٰہی کے خزانے حسب ضرورت نازل کئے جاتے ہیں اسی طرح فرماتا ہے۔ الٰہی کلام کی بھی حفاظت کی جاتی ہے اس کے خزانے محفوظ رکھے جاتے ہیں اور زمانہ کی ضرورت کے مطابق نازل کئے جاتے ہیں۔ پس کلام الٰہی کو صرف ایک کتاب نہیں سمجھنا چاہیے کہ نازل ہوگئی اور پھر خدا تعالیٰ نے اس سے تعلق چھوڑ دیا۔ بلکہ کلام الٰہی ایک دنیا ہے جو ہزاروں خزانوں پر مشتمل ہے جو مختلف زمانہ کے لوگوں کے لئے ہیں جب تک وہ خزانہ سب کا سب مستحقین میں تقسیم نہ ہو جائے اس کلام کو بے حفاظت کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے۔ ہاں جس کلام کا خزانہ خالی ہو جائے چونکہ اس میں کوئی چیز پہنچانے والی نہیں رہتی اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ان آیات میں مسلمانوں کو خطاب یاد رہے کہ پچھلی آیات میں گو مضمون وہی حفاظت قرآن کا ہے لیکن ان میں مسلمانوں کو بھی خطاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اور حفاظت قرآن کے عقیدہ کے متعلق مسلمان جن غلطیوں میں پڑ سکتے تھے۔ ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔

وَ اَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

اورہم نے (بخارات کو) اُٹھانے والی ہوائیں (بھی تمہارے لئے) چھوڑ رکھی ہیں۔اور (انکے ذریعہ سے) ہم نے

فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۳﴾

بادلوں سے پانی اُتارا ہے۔پھروہ تمہیں پینے کو دیا ہے اورتم (خود) اسے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

حلّ لُغَات۔لَوَاقِحَ لَوَاقِحَ يُقَالُ لَقِحَتِ النَّاقَةُ لَقَاحًا وَ كَذٰلِكَ الشَّجَرَةُ۔اونٹنی حاملہ ہوگئی اور درخت ثمردار ہوگیا۔وَاَلْقَحَ فُلَانٌ النَّخْلَ کھجور کے نرومادہ کو ملایا۔وَاَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ اَيْ ذَوَاتِ لَقَاحٍ۔یعنی لَوَاقِح کے معنے ہیں۔وہ ہوائیں جو درختوں سے نرکا مادہ لے کر درختوں تک پہنچاتی ہیں (مفردات) اَللَّوَاقِحُ مِنَ الرِّيَاحِ الَّتِيْ تَحْمِلُ النَّدَى ثُمَّ تَمُجُّهُ فِي السَّحَابِ فَاِذَا اجْتَمَعَ فِي السَّحَابِ صَارَ مَطَرًا۔ لَوَاقِح ان ہواؤں کو کہتے ہیں۔جو زمین پر سے اُٹھنے والے بخارات کو لے کر چلتی ہیں۔پھر بادلوں میں ان کو ملا دیتی ہیں۔(اقرب)

تفسیر۔**لَوَاقِح سے مراد** لَوَاقِح ان ہواؤں کو کہتے ہیں جو درختوں میں سے نرکا مادہ لے کر درخت تک پہنچاتی ہیں۔اوراس طرح درختوں کو پھل آتا ہے۔اسی طرح ان ہواؤں کو بھی لواقح کہتے ہیں جو زمین پر سے اُٹھنے والی رطوبت کو لے کر اُڑتی ہیں۔یہاں تک کہ وہ بادلوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں لَوَاقِح سے مراد پانیوں کو جمع کرکے بادل بنانے والی ہوائیں ہوں۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں ہی معنے اس جگہ مراد ہوں یعنے ہم وہ ہوائیں بھی چلاتے ہیں جو نر درختوں کا مادہ مادہ درختوں پر ڈال کر انہیں پھل لانے کے قابل بناتی ہیں اور وہ ہوائیں بھی چلائی ہیں جو زمینی رطوبتوں کو جمع کرکے بادل کی صورت میں تبدیل کر دیتی ہیں اور زمین پر بادلوں کو برسا کر ان درختوں کو جو پہلی قسم کی ہواؤں کے ذریعہ سے نر و مادہ کا میل کر چکے ہیں کثرت سے پھلدار بناتی ہیں آخر میں یہ بتایا کہ پانی کیسی ضروری شے ہے اور کبھی عام مگر انسان اسے بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا پھر روحانی امور میں وہ کیونکر اپنے آپ کو محافظ کے مقام پر کھڑا کرنا چاہتا ہے۔

کفار کے اس شبہ کا جواب کہ پہلی کتب کی موجودگی میں قرآن کریم کی کیا ضرورت ہے اس آیت میں حفاظت کلام الٰہی کے بارہ میں کفار اور مسلمانوں دونوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔کفار کے اس شبہ کا جواب دیا گیا ہے

کہ پہلی کتب کی موجودگی میں قرآن کریم کی کیا ضرورت ہے؟ اور بتایا ہے کہ پانی کی موجودگی میں بادلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر آسمانی بارش کے زمینی پانی کام کا نہیں رہتا۔

اس آیت سے مسلمانوں کو نصیحت اور مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ قرآن کریم کی موجودگی سے مغرور نہ ہونا۔ آسمانی پانی آسمان ہی سے صاف ہو کر ملتا ہے۔ جب کبھی تم لوگ اپنے خیالات کو ملا کر کلام الٰہی کے مطالب کو گندا کر دو گے اللہ تعالیٰ آسمان سے ایسے سامان کرے گا کہ پھر قرآنی مطالب صاف ہو کر دنیا کو پہنچا دیئے جائیں گے۔

وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۴﴾

اور یقیناً ہم ہی (ہر ایک کو) جلاتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی (سب کے) وارث ہیں

حلّ لُغات۔ اَلْوَارِثُ اَلْوَارِثُ وَرِثَ سے اسم فاعل ہے۔ نیز اَلْوَارِثُ کے معنی ہیں۔ اَلْبَاقِیْ بَعْدَ فَنَاءِ الْخَلْقِ۔ یعنی وارث کا لفظ خدا تعالیٰ پر اس لحاظ سے بولتے ہیں کہ وہ مخلوق کے فنا ہونے کے بعد باقی رہے گا۔ وَفِی الدُّعَاءِ ''اَللّٰھُمَّ اَمْتِعْنِیْ بِسَمْعِیْ وَبَصَرِیْ وَاجْعَلْہُ الْوَارِثَ مِنِّیْ'' اَیْ اَبْقِھِمَا مَعِیْ صَحِیْحَیْنِ حَتّٰی اَمُوْتَ۔ اور حدیث میں ایک دعا ہے جس میں کان اور آنکھ کے لئے وارث کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنے ہیں کہ موت تک وہ صحیح سلامت رہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرمایا ہم ہی باقی رہنے والے ہیں۔ تم جو فانی ہو بھلا کلام الٰہی کی کیسے حفاظت کر سکتے ہو۔ اس لئے ہم اپنا کلام بندوں کے سپرد نہیں کر سکتے۔

وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ ﴿۲۵﴾

اور ہم تم میں سے آگے نکل جانے والوں کو (بھی) یقیناً جانتے ہیں اور (اسی طرح) ہم (تم میں سے) پیچھے رہ جانے والوں کو (بھی) یقیناً جانتے ہیں

تفسیر۔ قرآن کریم کی حفاظت محض ظاہری علوم پر مبنی نہیں بلکہ قلبی طہارت سے تعلق رکھتی ہے یعنی یہ خیال نہ کرو کہ آخر مومن بندے دنیا میں موجود ہیں۔ وہ کیوں حفاظت کا کام نہیں کر سکتے۔ فرماتا

ہے ایمان کا دل سے تعلق ہے۔ اور دل کے حالات اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ قرآن کریم کی حفاظت محض ظاہری علوم پر مبنی نہیں بلکہ قلبی طہارت سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے کہ کون نیکی میں بڑھا ہوا ہے اور کون نہیں۔ پس یہ کام اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے جسے وہ مستقدم دیکھے گا اس کے سپرد یہ کام کرے گا اور جو قلبی طہارت میں متاخر ہوں گے خواہ ظاہری علوم میں کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں وہ اس کام کے اہل نہ سمجھے جائیں گے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦﴾ ع ۲

اور یقیناً تیرا رب ہی انہیں جمع کرے گا وہ یقیناً حکمت والا (اور) بہت جاننے والا ہے

حلّ لُغات ۔ يَحْشُرُ يَحْشُرُ حَشَرَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور حَشَرَ النَّاسَ کے معنے ہیں۔ جَمَعَهُمْ۔ لوگوں کو جمع کیا۔ وَيَوْمُ الْحَشْرِ۔ يَوْمُ الْبَعْثِ وَالْمَعَادِ وَهُوَ مَأْخُوْذٌ مِنْ حَشَرَ الْقَوْمَ اِذَا جَمَعَهُمْ۔ اور یوم البعث کو یوم حشر انہی معنوں کی رو سے کہتے ہیں کہ اس دن اگلے پچھلے لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ وَالْحَاشِرُ اِسْمٌ مِنْ اَسْمَاءِ نَبِيِّ الْمُسْلِمِيْنَ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک نام حاشر بھی ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ حشر کے معنے حشر کے معنے جمع کرنے کے ہیں اور حشر انہی معنوں کے رو سے بعث مابعد الموت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس دن اگلے پچھلے سب انسانوں کو جمع کیا جائے گا۔ حشر کا لفظ اس اجتماع کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو نبیوں کے ذریعہ سے اس دنیا میں ہوتا ہے یعنی ساری قوم کو اختلاف اور جھگڑے سے نکال کر وحدت کی رسی میں پرو دیا جاتا ہے۔

ہر نبی کے زمانہ میں حشر ہوا کوئی نبی نہیں آیا جس کے ذریعہ سے حشر نہ ہوا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے زمانہ میں دیکھو کیسا حشر ہوا کہ مختلف الخیال لوگوں کو ایک کلمہ پر جمع کر دیا گیا اور پھر ساری دنیا میں پھیلا دیا گیا۔ اس آیت میں دونوں حشر کی طرف اشارہ ہے۔ دنیوی حشر کی طرف اس طرح کہ گو آج تیری قوم تیرے خلاف ہے۔ لیکن ایک دن سب کو تیرے ہاتھ پر جمع کر دیا جائے گا۔ حکیم وعلیم کی صفات سے یہ بتایا ہے کہ فوری طور پر اس لئے جمع نہیں کیا گیا کہ یہ حکمت کے خلاف ہے۔ فوراً لوگ اسی طرح جمع ہو سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر تصرف کر کے انہیں جبر کے ذریعہ سے مسلمان بنا دیتا مگر اس کا کیا فائدہ تھا وہ لوگ جو اس طرح مسلمان ہوتے کسی انعام

کے مستحق نہ ہوتے۔

آنحضرتؐ کے زمانہ میں حشر دوسرے ان لوگوں میں جو خاص روحانی طاقتیں رکھتے ہیں اور نبی کو اس کے شروع زمانہ میں پہچان لیتے ہیں ان میں اور کمزوروں میں کوئی امتیاز نہ رہتا اگر ایسا ہوتا تو ابوبکرؓ اور ابوجہل میں کیا فرق رہ جاتا۔سب ہی ایک دم مسلمان ہوجاتے اور دنیا ابوبکرؓ کی قابلیتوں کو اور ابوجہل کی نالائقیوں کو جان نہ سکتی۔ پس ایسا کرنا حکمت کے خلاف تھا۔اس لئے خدا تعالیٰ نے جبر سے کام نہیں لیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قابل جوہروں اور ناقص لوگوں اور بالکل نا قابل لوگوں کے حالات دنیا کو معلوم ہو گئے اور اس کے نتیجہ میں دنیا نے ابوبکر عمر اور عثمان اور علی رضوان اللہ علیہم سے اپنے اپنے وقت میں فائدہ اٹھایا۔اگر سب ہی پہلے دن مسلمان ہوجاتے تو ممکن ہے پہلی سیادت کی وجہ سے لوگ ابوبکرؓ کی جگہ ابوجہل یا ویسے ہی کسی آدمی کو اپنا سردار بناتے اور ان فوائد سے محروم رہ جاتے جو ابوبکر وغیرہ سابق الایمان صحابہؓ سے ان کو پہنچے۔

ھو یحشرھم میں علیم کہنے کی وجہ علیم کہہ کر یہ بتایا کہ گو اس حکمت کی وجہ سے دیر ہوئی ہے مگر اس سے مایوس نہ ہونا چاہیے خدا جو علیم ہے تم کو بتاتا ہے کہ آگے چل کر سب عرب اس دین کے اصول پر جمع ہو جائے گا۔اُخروی زندگی کے لحاظ سے یہ بتایا کہ ایک دن سب اگلے پچھلے لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور جمع کئے جائیں گے اور اپنے اپنے اعمال کی جزا پائیں گے۔پس وہ ابتدائی تکالیف جو مسلمانوں کو پہنچ رہی ہیں ان کا خیال نہ کرنا چاہیے نہ ان لوگوں کو ناکام سمجھنا چاہیے جو اس شیطانی اور رحمانی جنگ میں فتح سے پہلے مارے جائیں گے کیونکہ اصل روزِ جزا تو مرنے کے بعد آنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور علم نے اس دنیا کو اصل روزِ جزا نہیں بنایا۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ

اور انسان کو ہم نے یقیناً آواز دینے والی مٹی سے یعنی سیاہ گارے سے جس کی ہیئت تبدیل ہوگئی تھی

مَّسْنُوْنٍ ۚ﴿۲۷﴾

پیدا کیا ہے۔

حلّ لُغات۔صَلْصَال صَلْصَالٌ اسم ہے اس سے فعل ماضی صَلْصَلَ ہے۔اور صَلْصَلَ الشَّیْءُ کے معنے ہیں صَوَّتَ۔اس چیز نے آواز دی۔صَلْصَلَ الْجَرْسُ۔رَجَّعَ صَوْتُہٗ۔اور اگر صَلْصَلَ الْجَرْسُ کہیں تو یہ

معنی ہوں گے کہ گھنٹی میں سے سُردار (یعنی وہ جوٹن کر کے لمبی آواز نکلتی ہے) آواز نکلی۔ صَلْصَلَ فُلَانًا۔ اَوْعَدَہٗ وَهَدَّدَہٗ۔ صَلْصَلَ فُلَانًا کے معنے ہیں کہ اس کو ڈرایا اور دھمکایا جب صَلْصَلَ زَیْدٌ کہیں۔ تو اس کے معنے ہوں گے۔ قَتَلَ رَئِیْسَ الْعَسْکَرِ زید نے لشکر کے سردار کو قتل کیا (کیونکہ سردار کے قتل کرنے سے ایک شور پڑ جاتا ہے) صَلْصَلَ الرَّعْدُ۔ صَفَا صَوْتُہٗ۔ بجلی کی آواز میں سریلی گونج پیدا ہوئی اور صَلْصَالَ کے معنے ہیں اَلطِّیْنُ الْحُرُّ خُلِطَ بِالرَّمْلِ وَقِیْلَ الطِّیْنُ مَالَمْ یُجْعَلْ خَزَفًا وہ مٹی جو خالص ہو اور اس کے ساتھ ریت ملی ہوئی ہو اور بعض کہتے ہیں کہ وہ مٹی جو پکائی نہ گئی ہو۔ (اقرب) اور تاج العروس میں اس کے یہ معنے کئے گئے ہیں کہ صَلْصَلَ اللِّجَامُ وَ کَذٰلِكَ كُلُّ یَابِسٍ یُصَلْصِلُ امْتَدَّ صَوْتُہٗ کہ لگام سے سُردار آواز نکلی اور ایسے ہی ہر خشک چیز سے جو سُردار آواز پیدا ہو اسے صَلْصَالٌ کہتے ہیں۔ وَفِیْ رِوَایَةٍ اَحْیَانًا یَأْتِیْنِیْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کبھی وحی مجھ پر اس طرح نازل ہوتی ہے جیسے گھنٹی کی لمبی آواز۔ وَالصَّلْصَالُ: اَلطِّیْنُ الْحُرُّ خُلِطَ بِالرَّمْلِ فَصَارَ یَتَصَلْصَلُ اِذَا جَفَّ اور خالص مٹی جس میں ریت ملا دی گئی ہو اسے صَلْصَال کہتے ہیں فَاِذَا طُبِخَ فِی النَّارِ فَهُوَ الْفَخَّارُ۔ مگر اسے جب آگ میں پکایا جائے تو اسے فخّار کہتے ہیں۔ وَقَالَ مُجَاهِدٌ اَلصَّلْصَالُ حَمَأٌ مَّسْنُوْنٌ۔ اور مجاہد نے کہا ہے کہ صلصال کے معنے سڑی ہوئی مٹی کے ہیں۔ وَصَلْصَلَ الرَّجُلُ۔ اَوْعَدَ وَتَهَدَّدَ اور صلصل کا فعل جب کسی انسان کی طرف منسوب کریں تو معنے یہ ہوں گے کہ اس نے دھمکی دی۔ اور ڈرایا۔ وَاَیْضًا اِذَا قَتَلَ سَیِّدَ الْعَسْکَرِ۔ یا یہ کہ اس نے سردار لشکر کو قتل کر دیا۔ وَتَصَلْصَلَ الْغَدِیْرُ اِذَا جَفَّتْ حَمْأَتُہٗ۔ تَصَلْصَلَ الْغَدِیْرُ اس وقت کہتے ہیں کہ جب جوہڑ کا گارا خشک ہو جائے۔ وفرس صَلْصَالٌ۔ حَادُّ الصَّوْتِ دَقِیْقُہٗ اور گھوڑے کو صلصال کہتے ہیں جب اس کی آواز تیز اور باریک ہو۔ وَقَالَ اَبُوْ اَحْمَدَ الْعَسْكَرِیُّ یُقَالُ لِلْحِمَارِ الْوَحْشِیِّ الْحَادِّ الصَّوْتِ صَالٌّ وَصَلْصَالٌ۔ اور ابو احمد عسکری نے کہا ہے کہ وہ گورخر جس کی آواز تیز ہو اسے بھی صَالٌّ اور صَلْصَال کہتے ہیں۔ وَبِهٖ فُسِّرَ الْحَدِیْثُ اَتُحِبُّوْنَ اَنْ تَكُوْنُوْا مِثْلَ الْحَمِیْرِ الصَّالَّةِ كَاَنَّهٗ یُرِیْدُ الصَّحِیْحَةَ الْاَجْسَادِ الشَّدِیْدَةَ الْاَصْوَاتِ لِقُوَّتِهَا وَنَشَاطِهَا اور انہی معنوں کی رو سے اس حدیث کی تفسیر کی جاتی ہے۔ جس میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ صالّہ گورخروں کی طرح ہو جاؤ یعنی وہ جو اپنی مضبوطی اور قوت کی وجہ سے صحیح جسموں والے تیز آواز والے ہوتے ہیں ویسے تم بھی ہو جاؤ (تاج العروس)۔ یہ روایت مجمع البحار میں بھی آئی ہے اور مجمع البحار میں یہ بھی لکھا ہے کہ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ الصَّلْصَالُ هُوَ الْمَاءُ یَقَعُ عَلَى الْاَرْضِ فَتَنْشَقُّ فَیَجِفُّ وَیَصِیْرُ لَهٗ صَوْتٌ یعنی

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ صلصال اس پانی کو کہتے ہیں جو زمین پر گر کر خشک ہو جائے اور وہ مٹی جس پر وہ گرے خشک ہو کر آواز دینے لگے (خشک زمین کی پپڑیاں) وَالصَّلْصَالُ۔ اَلطِّیْنُ اَلْیَابِسُ یَصِلُّ اَیْ یُصَوِّتُ عِنْدَ النَّقْرِ اَوِ الْمُنْتِنُ (مجمع البحار زیر مادہ صلل)۔ صلصال اس خشک مٹی کو کہتے ہیں جو ٹھکرانے پر آواز دیوے اسی طرح سڑی ہوئی مٹی کو بھی کہتے ہیں۔

حَمَأٍ حَمَأَ یَحْمَأُ الْبِئْرَ۔ نَزَعَ حَمَأَتَهَا حَمَأَ الْبِئْرَ کے معنے ہیں کنوئیں میں سے گارا نکالا۔ اَلْحَمَأُ کُلُّ مَا کَانَ مِنْ قِبَلِ الزَّوْجِ مِثْلَ الْاَخِ وَالْاَبِ اور حمأ خاوند کی طرف سے رشتہ داروں کو بھی کہتے ہیں جیسے خاوند کا بھائی یا باپ وغیرہ ہما۔ اَلْحَمَأُ: اَلطِّیْنُ الْاَسْوَدُ اور حمأ کالی مٹی کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب)

مَسْنُوْنٍ مَسْنُوْنٌ سَنَّ یَسُنُّ سَنًّا سے اسم مفعول ہے اور سَنَّ السِّکِّیْنَ کے معنے ہیں اَحَدَّہٗ چھری کو تیز کیا۔ وَهٰذَا مِمَّا یَسُنُّكَ عَلَی الطَّعَامِ اَیْ یَشْحَذُكَ عَلٰی اَکْلِهٖ وَیُشَهِّیْهِ اِلَیْكَ یعنی یہ چیز ان چیزوں میں سے ہے جو تجھے کھانے کے لئے تیار کر دے گی اور اس کی تجھے رغبت دلائے گی۔ سَنَّ الطِّیْنَ۔ عَمِلَهٗ فَخَّارًا اور سَنَّ الطِّیْنَ کے معنے ہیں کہ مٹی کو پکا کر سخت کر دیا۔ سَنَّ الشَّیْءَ: سَهَّلَهٗ کسی چیز کو آسان کر دیا۔ صَوَّرَهٗ یا اس کی شکل بنادی۔ سَنَّ عَلَی الْقَوْمِ سُنَّةً۔ وَضَعَهَا کوئی طریق مقرر کیا (اسی سے لفظ مسنون نکلا ہے کہ جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے یہ طریق مقرر کیا ہے) اور مسنون کے معنے ہیں۔ الْمُنْتِنُ یعنی بدبودار چیز اَلْمَسْنُوْنَةُ الْاَرْضُ الَّتِیْ اُکِلَ نَبَاتُهَا اور ایسی زمین کو بھی جس کا گھاس ختم ہو چکا ہو مسنون کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ میں من کے متعلق اختلاف اس آیت میں یہ جو فرمایا ہے مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۔ اس کے بارہ میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ میں مِنْ کے کیا معنے ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ اپنے مجرور کے ساتھ مل کر صفت ہے۔ صَلْصَال یعنی وہ صلصال جو حَمَاءٍ سے بنا ہے (ابو البقاء۔ کشاف زیر آیت ھذا) بعض نے کہا ہے کہ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ بدل ہے من صلصال کا (بحر محیط لأبی حیان و املاء مامن بہ الرحمن لابی البقاء) اس صورت میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ صلصال سے ہماری مراد حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ہے۔ گویا پہلی ترکیب کے لحاظ سے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ انسان کی پہلی حالت حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کی تھی پھر اس سے صلصال بنا۔ اور دوسری ترکیب کے لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ صلصال اور حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے ایک ہی حالت کی طرف اشارہ کرنا مطلوب ہے۔ صرف مضمون کی وضاحت کے لئے دو ہم معنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ بدل کے معنوں کی صورت میں مِنۡ حمَاٍ مسنون کو عطف بیان قرار دینا زیادہ صحیح ہے کیونکہ بدل میں مقصود دوسرا اسم ہوتا ہے۔ اور پہلا اسم اس کے مفہوم کو قریب کرنے کے لئے لایا جاتا ہے۔ اور عطف بیان میں مقصود اسم اول ہوتا ہے اور دوسرا اسم اس کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے لایا جاتا ہے۔ اور اس آیت میں میرے نزدیک پہلا جملہ یعنی من صلصالٍ اصل مقصود ہے اور من حماءٍ مَّسۡنُون اس کے بیان کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس ترکیب کے لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے بنیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر بنانے والا ہوں جو آواز دینے والی مٹی سے پیدا ہوگا یعنے ایسے کیچڑ سے جو ایک خاص صورت میں ڈھالا گیا ہو یعنی انسانی پیدائش ایسی پانی ملی ہوئی مٹی سے ہے جسے ایک خاص شکل دی گئی ہے۔ اور وہ کھوکھلی ہے جسے ٹھکورنے سے وہ آواز دیتی ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اول انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے۔ دوم اسے خاص ترکیب دے کر ایسی طرح تیار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر خلاء رکھتا ہے۔ سوم جب اسے ٹھکورا جاتا ہے تو وہ آواز دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر خدا تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہنے کی طاقت ہے جس طرح خلا دار چیز کو ٹھکوریں تو وہ بولتی ہے۔ اسی طرح انسان کو جب اللہ تعالیٰ ٹھکورتا ہے یعنے اس کا امتحان لیتا ہے تو جو انسان سلامت اور اچھا ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ٹھکورنے پر جواب دیتا ہے اور اس میں سے جواباً آواز آتی ہے اور یہی خصوصیت انسان کی ایسی ہے جو اسے دوسری اشیاء سے ممتاز کرتی ہے یعنی انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کے امتحان کو قبول کرنے کی اور پھر اس کا جواب دینے کی قابلیت ہے۔

یہ کہ وہ صورت جس میں انسان پہلے بنایا گیا اور جس پر حَمَاٍ مَّسۡنُون کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کیا تھی اس کا قرآن کریم نے ذکر نہیں کیا۔ ممکن ہے وہ بالکل غیر مرئی ہو اور خوردبینی ہو۔ بہر حال جو صورت مٹی سے انسان کو ابتداً ملی۔ وہ اسی وقت سے صلصال تھی یعنے یہ قابلیت رکھتی تھی کہ خدا تعالیٰ اس کا امتحان لے اور وہ اس کا جواب دے۔

قرآن کریم انسانی پیدائش میں ارتقاء کا قائل ہے اس مضمون سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم انسانی پیدائش میں ایک ارتقاء کا تو قائل ہے۔ مگر ایسے ارتقاء کا نہیں جو اتفاقاً ہو گیا بلکہ وہ انسانی پیدائش کو درجہ بدرجہ تو بتاتا ہے لیکن یہ نہیں تسلیم کرتا کہ انسان بننے والا ذرہ کسی وقت بھی انسان کے سوا کچھ اور تھا بلکہ اس کے نزدیک وہ جب بھی اور جس صورت میں بنا تھا اس میں انسان بننے اور الہام کو قبول کرنے کی قابلیت موجود تھی۔ اپنے تمام دوروں میں ایک خاص مقصد کی طرف وہ قدم بڑھا رہا تھا اور ڈارون کی تھیوری کے مطابق یہ نہ تھا کہ اس کے بعض حصے نامکمل صورت میں الگ شاخوں میں تقسیم ہوتے گئے ہوں اور کچھ اچھے حصے الگ ہو کر آگے بڑھتے گئے ہوں۔

مسنون کے معنے صورت والی شے کے میں نے مسنون کے معنے صورت والی شے کے کئے ہیں گو عام طور پر مفسر اس کے معنے سڑی ہوئی شے کے کرتے ہیں (بحر محیط زیر آیت ھذا)۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ علامہ ابوحیان نے لکھا ہے سڑنے کے معنے آسَنّ سے پیدا ہوتے ہیں جو رباعی مزید کا صیغہ ہے اور اس سے اسم مفعول کا صیغہ مسنون نہیں بلکہ مُسَنٌّ بنتا ہے۔سَنَّ کے معنے ایک طریق کو جاری کرنے یا صورت دینے یا تیز کرنے یا مٹی کو پکا کرا سے ایسا بنا دینے کے ہوتے ہیں کہ وہ آواز دینے لگے۔

مسنون کے معنی سڑی ہوئی مٹی کے مجازی ہیں پس سڑی ہوئی مٹی کے معنے ایک مجازی معنی ہیں۔حقیقی معنے ایک خاص شکل پر بنائی ہوئی شے یا آواز دینے کے قابل بنی ہوئی شے کے ہیں۔

الہام الٰہی کو عجیب سمجھنے والوں کو جواب اس آیت میں ان لوگوں کا جواب دیا ہے جو الہام الٰہی کو عجیب سمجھتے ہیں اور حیرت کرتے ہیں کہ انسان کو الہام ہو کس طرح سکتا ہے اور فرمایا کہ تعجب کے قابل یہ بات نہیں کہ الہام کیونکر ہوتا ہے تعجب اس بات پر ہونا چاہیے کہ کسی کو الہام کیوں نہ ہو۔کیونکہ انسانی پیدائش کی ابتداء سے الہام کی قابلیت انسان میں رکھی گئی ہے اور اس کی پیدائش کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ کامل ہو کر الہام الٰہی کو حاصل کرے پس اس پر تعجب نہ کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو الہام کیونکر ہو گیا۔یا اس الہام کی حفاظت کے لئے آئندہ اس کے اَتباع کو کس طرح الہام ہو گا۔تعجب اپنی حالت پر کرو کہ من صلصال ہوتے ہوئے تم کو کیوں الہام نہیں ہوتا۔اور اپنی حالت کے بدلنے کی طرف توجہ کرو۔

قرآن کریم میں جہاں خلق آدم کا ذکر ہے اس سے پہلے حشر کا ذکر یا بعث بعد الموت کا ذکر اس آیت سے پہلی آیت یہ ہے وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ۔اس کے بعد اس آیت میں خلق آدم کا ذکر شروع کیا ہے۔یہ کوئی اتفاقی امر نہیں بلکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بھی خلق آدم کا ذکر ہے اس سے پہلے حشر کا ذکر یا بعث بعد الموت کے واقعات میں سے کسی حصہ کا ذکر ضرور موجود ہے۔

بقرۃ اور اعراف میں آدم کی پیدائش کا ذکر چنانچہ (۱) بقرہ میں آدم کی پیدائش کا ذکر کیا ہے۔اس سے پہلے فرمایا ہے۔ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (البقرۃ:۲۹)۔تم اللہ تعالیٰ (کی طاقتوں) کا کس طرح انکار کرتے ہو۔حالانکہ تم پہلے بے جان تھے۔اس نے تم کو جان دی پھر وہ تم کو مارے گا اور پھر زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔یہاں بھی موت حیات اور پھر اس کی طرف جانے یعنے حشر کا ذکر ہے (۲) سورۂ اعراف میں آدم کا ذکر ہے وہاں بھی اس سے پہلے حشر کا ذکر کیا ہے

یعنی رکوع اول میں تو حشر کا ذکر ہے اور رکوع دوم میں آدم کی خلق کا۔ (۳) الحجر کی زیر تفسیر آیت میں بھی ایسا ہی ہے کہ پہلے حشر کا ذکر ہے اور بعد میں ساتھ ہی خلق آدم کا (۴) سورہ کہف میں بھی خلق آدم کا ذکر ہے۔ وہاں بھی پہلے جزاو سزا اور مر کر اُٹھنے کا ذکر ہے۔ پھر خلق آدم کا۔ فرمایا وَ یَوْمَ نُسَیِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا۔ وَ عُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ ۫ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا۔ (الکہف: ۴۷، ۴۹) اور پھر فرمایا وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ الآیۃ (الکہف: ۵۱) (۵) طٰهٰ میں جہاں آدم کا ذکر ہے وہاں پر بھی رکوع ۵ میں حشر کا ذکر ہے فرماتا ہے یَّوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا (طٰه: ۱۰۳) اور اس کے آگے تفصیلات بھی حشر کی بیان ہوئی ہیں۔ پھر رکوع چھ کے آخر میں اور رکوع سات میں آدم کی پیدائش کا ذکر شروع ہوگیا ہے۔ فرماتا ہے وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ (طٰه: ۱۱۶) الآیہ (۶) سورہ ص میں بھی دوزخ و جنت کا ذکر کر کے حضرت آدم ؑ کا ذکر کیا ہے۔ (رکوع ۴ و ۵) غرض ان ساری آیات پر غور کرنے سے ایک معاند قرآن بھی سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کریم کے نازل کرنے والے کے ذہن میں کوئی ترتیب ضرور ہے اور وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ قرآن میں کوئی ترتیب نہیں وہ غلطی پر ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ موسیٰ اور دیگر انبیاء کا ذکر تو بغیر حشر کے ذکر کے آجائے مگر جہاں بھی حضرت آدم کی پیدائش کا ذکر آئے اس سے پہلے حشر کا ذکر ضرور ہو۔ خواہ وہ منکر اس ترتیب کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ بہر حال اس پر اس قدر تو ضرور ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کریم کے نازل کرنے والے کے ذہن میں ضرور کوئی خاص ترتیب تھی جس کی وجہ سے آدم ؑ کا ذکر ہمیشہ حشر کے ذکر کے ساتھ آتا ہے۔

قرآن کریم میں اسلام کی آئندہ ترقی کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم میں ایسی کئی مثالیں ہیں کہ کئی جگہ پر ایک ہی طرز کا ذکر بار بار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک بات کو بیان کرتا ہوں کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں اسلام کی آیندہ ترقی اور عالمگیر تبلیغ کا ذکر آتا ہے وہاں پر ضرور حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ تمام قرآن کریم میں تین جگہ یہ ذکر ہے اور تینوں جگہ مسیح علیہ السلام کا ذکر ہے۔

سورۃ بقرۃ کی کنجی میرے نزدیک قرآن کریم کے مضامین کی ایک نہ ایک کنجی ضرور ہوتی ہے۔ بعض وقت اس کنجی کا علم الہام کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے۔ اور بعض وقت انسان خود غور و فکر کر کے اپنی عقل سے مدد لے کر اس کو پالیتا ہے۔ مجھے ایک دفعہ بطور القاء بتایا گیا تھا کہ سورہ بقرہ کی کنجی یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ والی آیت ہے۔ چنانچہ میں نے اس کنجی کی مدد سے تمام بقرہ کو حل کر لیا تھا۔

ہر سورۃ کی کنجی ایسا ہی ایک دفعہ خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ بِسۡمِ اللّٰہِ ہر ایک سورۃ کی کنجی ہے۔تبھی ہر سورۃ کے ساتھ نازل ہوئی ہے(سورۃ توبہ علیحدہ کوئی سورۃ نہیں بلکہ انفال کا حصہ ہے) یہ تو ایک ضمنی بات بیان ہوگئی۔

حشر اور آدم کے واقعات میں گہرا تعلق میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہر جگہ حشر کے ساتھ آدم کا مذکور ہونا بتلاتا ہے کہ ان دونوں امور میں گہرا تعلق ہے۔وہ تعلق کیا ہے؟

حشر اور آدم کے واقعات کا پہلا تعلق اول تو یہ تعلق ہے کہ حشر اجساد کا مسئلہ کلی طور پر آدم کی پیدائش کے ساتھ وابستہ ہے۔کیونکہ اگر ایک عاقل و قادر وجود نہ ہو تو حشر اجساد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔حیوانات کسی شریعت پر عامل نہیں کیونکہ وہ معذور ہیں۔اس لئے کسی سزا جزا کے مستحق نہیں اور کسی حقیقی حشر کے محتاج نہیں۔فرشتے بھی کسی جزا و سزا کے مستحق نہیں کیونکہ گو وہ نیک ہیں لیکن بہر حال مجبور ہیں اور یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ (نحل:۵۱) کے مقام والا کسی حشر کا محتاج یا مزید جزاء کا مستحق نہیں ہوتا۔شیطان کی پیدائش انسان کے تابع ہے۔مگر بہر حال انسان کے سوا جو بھی شیطان ہے وہ کسی سزا کا مستحق نہیں کیونکہ اپنا فرض پورا کر رہا ہے۔جس طرح اس دنیا کی گندی اشیاء سزا کی مستحق نہیں کہ وہ کیوں گندی ہیں۔اسی طرح انسان کے سوا جو شیطان ہیں۔وہ بھی سزا کے مستحق نہیں ہاں جو انسانوں میں سے شیطان ہیں وہ ضرور سزا کے مستحق ہیں اور حشر انہی بد انسانوں اور نیز نیک انسانوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

خلق انسان حشر کی دلیل ہے پس پیدائش انسانی ہی حشر کا موجب ہے۔اور اس وجہ سے ہر جگہ جہاں آدم کی پیدائش کا ذکر ہے اس سے پہلے حشر کا ذکر کیا گیا ہے تا بتایا جائے کہ انسانی پیدائش کا تقاضا ہے کہ کوئی حشر ہو اور حشر کا تقاضا ہے کہ کوئی شریعت ہو ورنہ بغیر حجت کے سزا جزا بے معنی ہو جاتی ہے۔

دوسرا تعلق دوسرا تعلق ان دونوں مضامین کا یہ ہے کہ خلق انسانی حشر کی دلیل ہے۔میں بعض دلائل اس دعویٰ کی تائید میں ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

(۱) انسانی پیدائش کائنات کی ادنیٰ ترین حالتوں سے ترقی کر کے مکمل ہوتی ہے۔پس یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی دار الجزاء بھی ہے۔اگر انسان پہلے سے ہی ایک خلقت میں پیدا ہوتا۔تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ اتفاقی واقعہ ہے دوسری چیزیں بھی طبعی تغیرات کے نتیجہ میں بن گئی تھیں۔یہ بھی بن گیا۔لیکن ادنیٰ حالتوں سے مختلف تغیرات کے بعد انسان کا بننا اور انسان کے بن جانے کے بعد نئی مخلوق کے لحاظ سے ترقی کا رک جانا یہ بتاتا ہے کہ انسانی پیدائش ایک ارادے کے ماتحت تھی اور تخلیق کا مقصود تھی۔

(۲) دنیا میں دو طاقتوں کا وجود پایا جاتا ہے ایک طاقت خیر کی ہے اور دوسری شرّ کی ہے۔انسان کے اندر ان

دونوں طاقتوں کا پایا جانا اور پھر اس میں دونوں پر قبضہ پانے کی قابلیت کا ہونا بتا تا ہے کہ انسان کو دنیا پر حکومت کرنے کے لئے بنایا گیا تھا پس اس کی زندگی کا نتیجہ اس کے عمل سے کچھ زیادہ ہونا چاہیے اور اس کا تقاضا حشر ہے۔

(۳) اس دنیا کی ترقیات طبعی قوانین سے وابستہ ہیں نہ کہ اخلاقی اور روحانی امور سے اور انسانی پیدائش صاف طور پر ظاہر کر رہی ہے کہ اس کے وجود کا بڑا اجزو اخلاقی اور روحانی حالات ہیں۔ پس اس دنیا کی ترقیات اس کے لئے منزل مقصود نہیں ہو سکتیں اور اخلاقی اور روحانی قربانیوں کے لئے کوئی اور مقام جزا ہونا چاہیے۔

یہ جو فرمایا ہے مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ اس سے یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش پانی اور مٹی سے ہے کیونکہ حَمَاءٍ مٹی اور پانی کی ملی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ دوسری جگہوں پر خدا تعالیٰ نے علیحدہ علیحدہ ان دونوں چیزوں سے پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً پانی کے متعلق فرمایا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیاء: ۳۱) دوسری جگہ مٹی سے پیدائش کو یوں ظاہر فرمایا ہے کہ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران: ۶۰) ان دونوں آیتوں میں تو پیدائش کا ذکر علیحدہ علیحدہ طور پر پانی اور مٹی سے کئے جانے کا کیا ہے۔ مگر یہاں سورۃ الحجر میں دونوں کو جمع کر دیا ہے کہ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے انسان پیدا ہوا ہے۔ یعنی اس مٹی سے جس میں پانی ملایا گیا اور پھر ایک خاص صورت دے کر اسے بولنے کے قابل بنایا گیا چنانچہ مِنْ صَلْصَالٍ کہہ کر قوت ناطقہ کی طرف واضح طور پر اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ایک حد تک سب ہی حیوانوں کی پیدائش حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے ہوئی ہے۔ لیکن انسانی پیدائش میں حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کی صفت صلصالیت کا ظہور نمایاں ہے۔ اسی لحاظ سے انسان کو حدیث میں صالّۃ بھی کہا گیا ہے۔ اور وہ بھی صلصال کی طرح کا لفظ ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ صال کا لفظ تو انسان کے لئے بولا جاوے مگر صلصال کا لفظ نہ بولا جائے اس لفظ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کا بولنا خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ کیونکہ صلّ یا صلصل ایسی آواز پر دلالت کرتا ہے جو ٹھکورنے سے پیدا ہوتی ہے اور یہی حقیقت انسان کی ہے کہ وہ کلام جس کی خاطر اس کو پیدا کیا گیا ہے وہ اس میں سے تبھی پیدا ہوتا ہے جب اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ٹھکورا جاتا ہے یعنی الہام الٰہی نازل ہوتا ہے اور اس کو مشکلات اور مشقتوں سے گذارا جاتا ہے۔

انسان کے مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے بنائے جانے کا مطلب اور یہ جو فرمایا کہ انسان حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے بنایا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے جان مٹی سے بن گیا ہے بلکہ (۱) چونکہ حیوانی مادہ بغیر جسم کے ترقی نہیں کر سکتا اور جسم مٹی سے بنتا ہے اس لئے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تا انسان کو معلوم ہو کہ اس کی ابتداء کہاں سے

ہوئی ہے۔

آیت مِنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ سے انسان کی ابتداء کی طرف اشارہ نہیں یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سائنس کا یہ دعویٰ کہ حیوانی مادہ حیوان سے ہی پیدا ہوسکتا ہے۔خود قابل تحقیق ہے کیونکہ اس کی دلیل صرف ہمارا موجودہ مشاہدہ ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ جس وقت یہ حیوانی مادہ پیدا ہوا اس وقت کے حالات اور موجودہ حالات میں بڑا فرق ہے۔سائنس بھی اس امر کو تسلیم کرتی ہے کہ یہی حیوانی مادہ کسی وقت میں ترقی کر کے انسان بن گیا تھا لیکن اب ویسا نہیں ہوتا پس اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش کے حالات میں اور اس وقت کے حالات میں بہت بڑا تغیر ہے۔اس وقت زندگی پیدا کرنے کی رَو نہایت ہی تیز تھی اور اب اتنی نہیں۔پس ہوسکتا ہے کہ ان حالات کے ماتحت بے جان ذرات ہی بعض تغیرات کے ماتحت زندہ ذرات میں تبدیل ہوجاتے ہوں اور بعد میں زمین کے کامل ہوجانے پر وہ حالات نہ رہے ہوں۔پس متفرق حالات کا ایک دوسرے پر قیاس کرنا سائنس نہیں کہلا سکتا۔

مٹی سے یکدم انسان نہیں بنا یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ مٹی سے یکدم انسان بن گیا کیونکہ قرآن کریم خلق عالم کی تدریجی پیدائش پر بار بار زور دیتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ تناسل والی خلق میں بھی (قرآن میں اَللّٰہُ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ (یونس:۳۵) فرما کر دو حلقوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے) تدریج پائی جاتی ہے (یہ نہیں ہوتا کہ ادھر میاں بیوی ملیں تو ادھر بچہ پیدا ہوجائے) تو کیوں پہلی خلقت میں تدریج نہ ہوگی؟ پس اس آیت میں صرف اس ابتداء کی طرف اشارہ ہے جس وقت حیوانی قابلیتوں سے ترقی کر کے انسان میں اس کی امتیازی قابلیت پیدا ہوئی اور وہ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ کی صلصال والی حالت ہی تھی یعنی جس میں قبولیت الہام کا مادہ پیدا ہوا یا یہ سمجھیں کہ صرف اس کی اس ابتداء کی طرف اشارہ ہے کہ جہاں سے اس کی حیات محض شروع ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کیونکر تسلیم کیا جائے کہ اس سے انسانی یا حیوانی پیدائش کی ابتداء کی طرف اشارہ ہے اور کیوں نہ سمجھا جائے کہ قرآن کریم کے نزدیک انسان کی پیدائش کی ابتداء ہوئی ہی اسی طرح تھی کہ مٹی کا پتلا بنایا اور اس میں جان ڈال دی تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اس آیت میں ابتداء کا ذکر نہیں چنانچہ سورۂ روم ع ۳ میں آتا ہے اَنۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ تَنۡتَشِرُوۡنَ (الروم:۲۱) کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو خشک مٹی سے پیدا کیا ہے پھر تم بشر بن گئے اور دنیا بھر میں پھیل گئے۔اب یہ امر آیت زیر تفسیر کے خلاف ہے کیونکہ اس میں حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ سے پیدائش انسانی لکھی ہے اور اس آیت میں تراب یعنی خشک مٹی سے لکھی ہے۔

انسانی پیدائش کی مختلف کڑیوں کا ذکر پس معلوم ہوا کہ خشک مٹی ابتدائی کڑی ہے مگر سورہ حجر میں اس ابتدائی ذکر کو چھوڑ کر اس کے بعد کی حالت کو بیان کر دیا گیا ہے۔ سورۃ فاطر ع ۲ میں اور بھی فرق کر دیا گیا ہے وہاں فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ (فاطر:۱۲) یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو خشک مٹی سے پیدا کیا ہے پھر اس کے بعد نطفہ سے۔ اس آیت میں اول تو حماءٍ مسنون کو ترک کر دیا ہے۔ دوسرے تراب کے بعد پیدائش کی ایک اور کڑی بیان کی ہے جو نطفہ ہے۔ سورہ مومن میں اس سے بھی مختلف پیرایہ میں پیدائش کا طریق بتایا ہے۔ فرماتا ہے هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (المؤمن:۶۸) کہ نطفہ کے بعد بھی یکدم انسان نہیں بنا۔ بلکہ اس کے بعد ایک اور تغیر ہوا ہے اور وہ یہ کہ نطفہ علقہ بنا اور پھر اس سے انسان بنا۔

انسانی پیدائش مختلف حالات سے گزر کر ہوئی مگر سورۂ حج میں اس میں بھی زیادتی کر دی گئی ہے اور فرمایا ہے فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ (الحج:۶) کہ علقہ کے بعد بھی یکدم انسان نہیں بنا بلکہ اس کے بعد ایک اور درجہ ہے یعنی علقہ سے مضغہ بنتا ہے اور وہ مضغہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے کامل اور غیر کامل پھر اس سے انسان بنا۔ مگر اس پر بھی بس نہیں۔ سورۂ مومنون میں ان کڑیوں پر اور زیادتی کی گئی ہے فرماتا ہے وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔ (المؤمنون:۱۳ تا ۱۵) یہاں پر تین کڑیاں زائد بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ مضغہ کے بعد بھی یکدم انسان نہیں بنا بلکہ پہلے عظام بنتی ہیں پھر عظام پر گوشت چڑھایا جاتا ہے پھر ایک اور پیدائش ہوتی ہے کہ ان بظاہر بے جان مادوں سے ایک جاندار شے پیدا ہو جاتی ہے۔ ان آیات پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم بعض دفعہ درمیانی وسائط کو چھوڑ دیتا ہے پس حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک مٹی کا ایک بت بنا کر اس میں روح ڈال دی گئی تھی اور وہ چلتا پھرتا انسان بن گیا تھا بلکہ قرآن کریم کی تعلیم سے ظاہر ہے کہ انسانی پیدائش مختلف حالات سے گذر کر ہوئی اور مٹی کے الفاظ دیکھ کر یہ نتیجہ نہیں نکال لینا چاہیے کہ انسان فوراً مٹی سے گھڑ کر بنا دیا گیا تھا (جیسے کہ عوام کا خیال ہے) بلکہ صرف اتنا مطلب ہے کہ مٹی سے ابتدا ہوئی اور یہ امر یقینی طور پر ثابت ہے کیونکہ انسان اب بھی اپنی غذا مٹی سے ہی حاصل کرتا ہے اور کسی چیز کی غذا اسی سے لی جاتی ہے جس سے وہ چیز بنی ہو۔ ورنہ غذا غذا ہی نہیں بن سکتی۔ مثلاً لوہا اگر گھس جائے تو اس کی جگہ لوہا ہی لگایا جائے گا دوسری چیز اس کا کام نہیں دے سکتی۔ پس ہماری غذا چونکہ مٹی کے اجزاء سے بنتی ہے یہ

ظاہر ہے کہ ہماری پیدائش بھی اسی قسم کے اجزاء سے ہے جو مٹی کے تیار کرنے میں خرچ ہوئے ہیں اور انسان پیدائش عالم کی آخری ارتقائی کڑی ہے کوئی باہر سے آئی ہوئی شے نہیں۔ میں اس جگہ انسانی پیدائش پر تفصیلی بحث نہیں کرتا اس کا مناسب مقام سورۂ بقرہ یا سورۂ اعراف کی آیات ہیں۔

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۞ ۲۸

اور (اس سے) پہلے جنّوں کو یقیناً ہم نے سخت گرم ہوا کی (قسم کی) آگ سے پیدا کیا تھا۔

حلّ لُغَات۔ اَلْجَانَّ الجانّ جَنَّ یُجُنُّ جَنًّا وَ جُنُوْنًا کے معنے ہیں۔ سَتَرَہٗ وَاَظْلَمَ عَلَیْہِ پردہ ڈال دیا اور اندھیر کر دیا۔ جَنَّ اللَّیْلُ: اَظْلَمَ وَاخْتَلَطَتْ ظُلْمَتُہٗ۔ رات کی تاریکی چھا گئی۔ وَجَنَّ الْجَنِیْنُ فِی الرَّحِمِ اِسْتَتَرَ۔ جنین رحم میں پوشیدہ ہو گیا۔ وَالْجَانُّ اِسْمُ فَاعِلٍ اور جانّ اسم فاعل ہے یعنی اندھیرا کر دینے والا۔ یا پوشیدہ ہو جانے والا۔ وَاِسْمُ جَمْعٍ لِلْجِنِّ۔ اور یہ جنّ کی اسم جمع بھی ہے۔ حَیَّۃٌ بَیْضَاءُ کَحْلَاءُ الْعَیْنِ لَاتُؤْذِیْ۔ اور اس سفید سانپ کو بھی جو سرمگین آنکھوں والا ہو جانّ کہتے ہیں۔ ایسے سانپ میں زہر نہیں ہوتا اور وہ کاٹتا نہیں۔ (اقرب) وَالْجَانَّ اَبُوالْجِنِّ اور جنّوں کے مورث اعلیٰ کو بھی جانّ کہتے ہیں۔ (تاج)

السّموم اَلسَّمُوْمُ سَمَّ یَسُمُّ سَمًّا سے اسم ہے۔ سَمَّ الطَّعَامَ کے معنے ہیں۔ جَعَلَ فِیْہِ السَّمَّ کھانے میں زہر ڈال دیا۔ سَمَّ الْاَمْرَ کے معنے ہیں۔ سَبَرَہٗ وَنَظَرَ غَوْرَہٗ کہ معاملہ کی تحقیقات کی اور اس کی حقیقت معلوم کی۔ سَمَّتِ الرِّیْحُ سُمُوْمًا۔ اَحْرَقَتْ گرم ہوا نے چیزوں کو جھلس دیا۔ والسَّمُوْمُ: الرِّیْحُ الحارَّۃُ، سموم گرم ہوا کو بھی کہتے ہیں۔ اس کی جمع سَمَائِمُ ہے۔ وَقَالَ اَبُوْعَبِیْدَۃَ السَّمُوْمُ بِالنَّہَارِ وَقَدْ تَکُوْنُ بِاللَّیْلِ۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ سموم دن کو ہوتی ہے اور کبھی کبھی رات کو بھی۔ اَلْحَرُّ الشَّدِیْدُ النَّافِذُ فِی الْمَسَامِّ اور سموم اس شدت گرمی کو بھی کہتے ہیں جو مسامات میں گھس جانے والی ہو۔ (اقرب) محیط میں لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا ہے سموم اس شعلہ والی آگ کو کہتے ہیں۔ جس میں دھواں نہ ہو یعنی شعلہ والی آگ یا انگارہ والی (بحر محیط زیر آیت ولقد خلقنا الانسان من صلصال)۔ ان سارے معنوں کو مدنظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اَلسَّمُوْمُ اس چیز کو کہتے ہیں جو باریک طور پر اندر گھس جائے اور پھر اثر کرے۔ سمّ (زہر) کو بھی سمّ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی عروق کے ذریعہ جلد انسان کے جسم میں سرایت کر جاتا ہے اور فوراً انسانی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے چنانچہ بعض ایسے زہر بھی ہیں جو صرف سونگھنے

سے یا صرف جسم پر ملنے سے اثر کر جاتے ہیں۔

تفسیر ۔جانّ جیسا کہ لغت سے ظاہر ہے جنّ کا اسم جنس بھی ہے اور اس کے معنے پردہ ڈالنے والے یا اندھیرا کر دینے والے کے بھی ہیں۔ اور تاریک ہو جانے اور پوشیدہ ہونے کے بھی۔ پس وضع لغت کے لحاظ سے ہر وہ شے جو دوسری شے کو پوشیدہ کر دے۔ اس پر پردہ ڈال دے یا تاریک کر دے وہ جنّ ہے۔ یا ہر وہ شے جو خود تاریکی میں بڑھ جائے یا نظروں سے پوشیدہ ہو یا پوشیدہ ہو جائے جنّ ہے۔

جنوں کے متعلق عام لوگوں کا خیال عام خیال کے مطابق جنّ ایک ایسی مخلوق ہے جو انسانوں کو نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ وہ خود اپنے آپ کو ظاہر کرے۔ اس قسم کی مخلوق کے متعلق دنیا میں عام خیال پایا جاتا ہے بعض قومیں یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ فرشتے ہی اچھے اور بُرے ہو جاتے ہیں اور اس طرح وہ فرشتوں اور شیطانوں یا جنّوں کو فرشتوں کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں۔

جنوں کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ ہندوؤں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ گندھروا اور اپسرا دو قسم کی ارواح ہیں جو نظر نہیں آتیں۔ گندھروا خشکی کی روحیں ہیں اور اپسرا سمندری روحیں ہیں۔ دونوں کے ملنے سے نسل انسانی چلی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک گندھروا اور اپسرا سے یاما اور اس کی توام بہن یامی پیدا ہوئی اور یہ پہلا انسانی جوڑا تھا۔ گندھروا کے متعلق ان کا خیال ہے کہ ان کی الگ زمین ہے اور الگ گھوڑے ہیں او ردریائے سندھ کے اس پار رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک ٹکسلا کا شہر بھی گندھروا دیسا میں ہے (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ گندھروا اور جلد دوم زیر لفظ اپسرا Apsaras)

جنوں کے متعلق زردشتیوں کا عقیدہ زردشتیوں میں بھی یہ خیال پایا جاتا ہے مگر کسی قدر اختلاف کے ساتھ۔ ان کے نزدیک خدا دو ہیں ایک نیکی کا خدا اور اس کا نام اہرمزد ہے اور ایک بدی کا خدا اس کا نام اہرمن ہے۔ نیکی کے خدا کا بھی ایک لشکر ہے۔ جن کو فرشتے کہنا چاہیے۔ اسی اہرمن کا بھی ایک لشکر ہے جسے ہماری اصطلاح میں شیطانوں کی جماعت کہنا چاہیے۔

یونانیوں میں بھی بعض اچھی اور بری ارواح کا خیال پایا جاتا تھا۔ چنانچہ فیثا غورس اور افلاطون کے تابعین میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ انسانوں کے علاوہ بعض نہ نظر آنے والی ارواح ہیں جن میں سے کچھ بد اور کچھ نیک ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ ڈیمن Demons)

یہود میں فرشتوں اور شیطانوں کی صورت میں نہ نظر آنے والی ہستیوں کے وجود کا اقرار پایا جاتا ہے چنانچہ

صحف موسیٰ میں فرشتوں کا ذکر بھی موجود ہے اور شیطانوں کا بھی اور گندی ارواح کا بھی۔ چنانچہ فرشتوں کا ذکر حضرت یعقوب کی خواب میں ہے ’’اور خواب دیکھا اور کیا دیکھتا ہے کہ ایک سیڑھی زمین پر دھری ہے اور اس کا سرا آسمان کو پہنچا ہے اور دیکھو خدا کے فرشتے اس پر سے چڑھتے اُترتے ہیں۔‘‘ (پیدائش باب ۲۸ آیت ۱۲) شیطان کا ذکر حضرت آدم کے قصہ میں آتا ہے جب شیطان نے حضرت حوّا کو ورغلا کر ممنوع درخت کا پھل کھلایا (پیدائش باب ۳ آیت ۱ تا ۵)۔ اس جگہ اس کا نام سانپ رکھا ہے لیکن مراد شیطان ہی ہے اور سانپ سے جن یا بدروحوں کو مراد لینا قدیم محاورہ ہے۔ عربی زبان میں بھی سانپ کا ایک نام جانّ ہے اور ہندوؤں یونانیوں وغیرہ میں بھی یہ خیال پایا جاتا ہے کہ بعض سانپ جنات کی قسم سے ہیں۔

بدارواح کا ذکر بائیبل میں بدارواح کا ذکر استثناء باب ۳۲ آیت ۱۷ میں یوں آتا ہے ’’انہوں نے شیطان کے لئے قربانیاں گزرانیں نہ خدا کے لئے بلکہ ایسے معبودوں کے لئے جن کو آگے وے نہ پہچانتے تھے جو نئے تھے اور حال میں معلوم ہوئے اور ان سے تیرے باپ دادے نہ ڈرتے تھے۔‘‘ اس جگہ شیطانوں سے مراد بدارواح ہیں کیونکہ لکھا ہے کہ بنی اسرائیل انہیں پہلے نہ جانتے تھے۔ ورنہ شیطانوں کو تو وہ جانتے تھے۔

یہود کے لٹریچر میں جنات کا ذکر بائبل کے علاوہ یہود کے لٹریچر میں جنّات پر خاص زور ہے شرکی ربیّ الیعذر میں لکھا ہے کہ جنّ شمالی علاقوں میں رہتے ہیں اور میگاتی میں لکھا ہے وہ فرشتوں کی طرح اُڑتے ہیں۔ شبات طالمود میں لکھا ہے۔ انسان ان سے تعلق رکھ سکتے ہیں اور وہ آسمان کی خبریں سن لیتے ہیں (جیوئش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ ڈیمن Demon)

اناجیل میں جنوں کا ذکر مسیحیوں میں بدارواح کا ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اناجیل میں بدروحوں کے نکالنے کو یسوع کا خاص کام بتایا ہے بلکہ ان کے بعد ان کے حواری بھی بدروحوں کو نکالتے رہے۔ اناجیل کے بیان کے مطابق تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جنّات دیوانے ہو رہے تھے ہر شہر اور ہر قصبہ میں لوگوں پر آکر قبضہ کر لیتے تھے اور بعض دفعہ تو سینکڑوں آدمیوں پر یکدم قبضہ کر لیتے تھے (دیکھو متی باب ۸، ۲۶ و ۲۸ مرقس باب ۱، ۳۲ و ۳۴)

مسلمانوں کے نزدیک نظر نہ آنے والی ارواح کی تین اقسام مسلمانوں کا عام عقیدہ یہ ہے کہ نظر نہ آنے والی ارواح تین قسم کی ہیں (۱) فرشتے جو سب نیک ہیں بعض کے خیال میں ان میں سے بعض بد بھی ہو جاتے ہیں جیسے کہ شیطان کہ وہ پہلے فرشتہ تھا یا ہاروت ماروت (۲) شیطان کہ وہ سب برے ہوتے ہیں (۳) جنّ کہ وہ نیک بھی ہوتے ہیں اور بد بھی جو جنّ بد ہوتے ہیں وہ لوگوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور بعض تدابیر سے جنّوں پر قبضہ بھی کیا

جا سکتا ہے اور ان سے کام بھی لیا جا سکتا ہے (قرطبی سورۃ الحجر زیر آیت فسجد الملائکۃ)۔

قرآن مجید میں جنوں کا ذکر قرآن کریم میں جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے فرشتوں، شیطانوں اور جنوں تینوں کا ذکر ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن نیک بھی ہوتے ہیں اور بد بھی جیسا کہ سورۂ جنّ میں آتا ہے مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ (الجن: ۱۲) یعنی جنوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ ہم میں سے نیک بھی ہیں اور برے بھی اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن انسانوں کی تابع بھی ہو جاتے ہیں اور ان کے کام کرتے ہیں جیسے حضرت سلیمانؑ کے بارہ میں آتا ہے وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (سبا: ۱۳) یعنے جنوں میں سے بھی کچھ افراد حضرت سلیمانؑ کے حکم کے ماتحت اور اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ان کے کام کیا کرتے تھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنّ حضرت موسیٰ پر بھی ایمان لائے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے۔

احادیث میں جنوں کا ذکر احادیث میں بھی جنوں کا ذکر ہے لکھا ہے کہ جنوں کا ایک قافلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے آیا (مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الجهر بالقرأۃ ---) اور یہ بھی آتا ہے کہ ہڈی گوبر وغیرہ جنّوں کی غذا ہیں اس لئے ان سے استنجا نہیں کرنا چاہیے۔(ترمذی ابواب الطهارة باب كراهية ما يستنجى به وابو داؤد کتاب الطهارة باب ماينهى عنه ان يستنجى به)

علامہ سندھی مصنف مجمع البحار لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کا یہ مذہب تھا کہ نیک جنّات صرف عذاب سے نجات پائیں گے جنت میں نہیں جائیں گے۔لیکن امام مالکؒ اور امام بخاریؒ کا یہ مذہب تھا کہ وہ جنت میں بھی جائیں گے اور انہیں ثواب ملے گا۔مجمع البحار میں ہی ابن عربی کا قول نقل کیا ہے کہ سب مسلمانوں کا یہ مسلّمہ مسئلہ ہے کہ جنّ کھاتے پیتے اور نکاح کرتے ہیں۔(مجمع البحار زیر لفظ جن)

جن کے لفظ کا قرآن کریم اور احادیث میں کئی معنوں میں استعمال میرے نزدیک جنّ کا لفظ قرآن کریم اور احادیث میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔اور یہ مختلف استعمال جنّ کے مختلف معنوں پر مبنی ہیں یعنی ''مخفی ہونے والا'' یا ''مخفی کرنے والا'' ان معنوں کے رو سے مختلف اشیاء یا ارواح یا انسان جو عام طور پر نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔یا وہ اشیاء یا ارواح یا انسان جو دوسری اشیاء پر پردہ ڈالتے ہیں جنّ کہلاتے ہیں۔اور چونکہ یہ فعل مختلف وجودوں سے ظاہر ہوتا ہے۔اس لئے مختلف چیزوں یا ہستیوں کا نام اسلامی اصطلاح میں جنّ رکھا گیا ہے۔

قرآن کریم میں مختلف مقاموں میں جنات کا ذکر قرآن کریم میں جنات کا ذکر مندرجہ ذیل مقامات میں آتا ہے (۱) سورۂ حجر کی زیر تفسیر آیت کہ اس میں جنات کی پیدائش کا ذکر ہے کہ وہ نارِ سموم سے پیدا ہوئے

(۲) سورۂ رحمن آیت ۱۶ میں فرماتا ہے وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ جنوں کو ہم نے ایک لپٹیں مارنے والے آگ کے شعلے سے پیدا کیا ہے (۳) ابلیس کی نسبت بھی آتا ہے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ (الاعراف: ۱۳ و ص: ۷۷) تو نے مجھے تو آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو پانی ملی ہوئی مٹی سے (۴) پھر ابلیس کی نسبت یہ بھی آتا ہے کہ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (الکھف: ۵۱) وہ جنوں میں سے تھا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل گیا۔ معلوم ہوا کہ ابلیس کی ناری طینت اس کے جنوں میں سے ہونے کے سبب سے تھی۔ (۵) جنّ شہوانی قوتیں بھی رکھتے ہیں چنانچہ سورۂ رحمن میں جنت کی عورتوں کی نسبت فرماتا ہے کہ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ (الرحمن: ۵۷) ان کو نہ انسانوں، نہ جنوں نے اس سے پہلے کبھی چھوا ہوگا (یہ ذکر اس رکوع میں دو دفعہ آیا ہے) (۶) سورۂ رحمن میں ایک یوم حساب کا ذکر ہے اس کے ذکر میں فرماتا ہے فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ (الرحمن: ۴۰) اس دن انسانوں یا جنوں سے ان کے گناہوں کے بارہ میں پوچھا نہ جائے گا بلکہ ان کے گناہوں کی وجہ سے ایک عام تباہی ان پر لائی جائے گی۔ (۷) جنّ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات: ۵۷) (۸) مشرک لوگ اللہ تعالیٰ اور جنات کے درمیان رشتہ داری بتاتے ہیں۔ وَجَعَلُوْا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (الصافات: ۱۵۹) (۹) مشرک لوگ جنوں کو خدا تعالیٰ کا شریک بتاتے ہیں وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِیْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَیْرِ عِلْمٍ۔ (الانعام: ۱۰۱) انہوں نے جنوں میں سے اللہ تعالیٰ کے شریک تجویز کئے ہوئے ہیں حالانکہ اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے اور بغیر کسی علم کے انہوں نے اللہ کے لئے لڑکے اور لڑکیاں اپنے خیالوں میں بنا رکھی ہیں۔ اسی طرح آتا ہے۔ بَلْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ (سبا: ۴۲) قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا مشرک انسان تم کو پوجتے تھے تو وہ کہیں گے کہ نہیں بلکہ یہ جنوں کو پوجتے تھے (۱۰) جنوں میں سے ایک گروہ لوگوں کو گمراہ بھی کرتا ہے اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (الناس: ۶، ۷) نیز وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَاۤ اَرِنَا الَّذَیْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِیَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِیْنَ (حٰم السجدہ: ۳۰) اور کفار کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہمیں ذرا وہ جن اور انسان جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا دکھا تو سہی۔ کہ ہم انہیں اپنے قدموں تلے روندیں تا کہ وہ ذلیل ترین وجود ہو جائیں۔ نیز فرمایا۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (الانعام: ۱۱۳) اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے ہیں جنّ شیطان بھی۔ اور انسان شیطان بھی۔ وہ ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کے لئے جھوٹی باتیں سناتے رہتے ہیں۔ نیز فرمایا یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ

اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ (الانعام:۱۲۹) اے جنوں کی جماعت تم نے بہت سے انسانوں کو خراب کیا ہے (۱۱) جنّ دوزخ میں بھی جائیں گے فرماتا ہے۔ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِي النَّارِ (الاعراف:۳۹) یعنی جب فرشتے کفار کی جان نکالتے ہیں۔ تو ان سے کہتے ہیں کہ تم سے پہلے جو جنّ اور انسان فوت ہو چکے ہیں ان کے ساتھ تم بھی دوزخ میں داخل ہو جاؤ نیز فرمایا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ (الاحقاف:۱۹) یعنی یہ کفار بھی ان گروہوں میں جا شامل ہوں گے جو جنّوں اور انسانوں میں سے پہلے گذر چکے ہیں۔ اور جن پر اللہ تعالیٰ کی حجّت پوری ہو چکی ہے اور وہ عذاب کے مستحق قرار پا چکے ہیں یہ سب لوگ گھاٹا پانے والے ہو گئے یہی الفاظ حَقَّ سے لے کر خٰسِرِيْنَ تک سورۂ حٰم سجدہ آیت ۲۶ میں بھی مذکور ہیں۔ نیز فرماتا ہے۔ وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖٞ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ٞ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ٞ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (الاعراف:۱۸۰) اور ہم نے بہت سے جنّوں اور انسانوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ وہ ہیں کہ جن کو دل دیئے گئے مگر انہوں نے ان سے سمجھنے میں کام نہ لیا۔ انہیں آنکھیں دی گئیں مگر انہوں نے ان سے دیکھا نہیں۔ انہیں کان تو دیئے گئے لیکن انہوں نے ان سے سنا نہیں۔ (۱۲) بعض انسان بعض جنّات کی پناہ میں رہتے ہیں اور اس وجہ سے جنّ مغرور ہو جاتے ہیں وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (الجن:۷) یعنی حقیقت یہ ہے کہ کچھ مرد انسانوں میں سے جنّوں کے مردوں کی پناہ لیتے تھے اس طرح انہوں نے جنّوں کو اور بھی ظلم اور گناہ میں بڑھا دیا۔ (۱۳) جنّ انسانوں کا کام بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت سلیمان کے ماتحت وہ کام کرتے تھے۔ فرماتا ہے۔ وَ حُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ (النمل:۱۸) سلیمان کے حکم کو پورا کرنے کے لئے جنّوں اور انسانوں کے لشکر جمع کئے گئے۔ نیز فرماتا ہے۔ وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (سبا:۱۳) اور جنوں میں سے بھی ایک جماعت اِن کی نگرانی میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے کام میں لگی ہوئی تھی۔ نیز فرمایا۔ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ (النمل:۴۰) اور جنّوں میں سے ایک نہایت سمجھ دار کارگذار جنّ نے کہا کہ میں آپ کی مطلوبہ شے (ملکہ سباء کا ساتخت) آپ کے اس مقام سے کوچ کرنے سے پہلے حاضر کر سکتا ہوں (۱۴) جنّ قرآن کی مثال نہیں بنا سکتے فرماتا ہے۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل:۸۹) تو کہہ دے کہ اگر انسان اور جنّ مل کر بھی اس قرآن کی مثل بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے خواہ وہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی مدد ہی کیوں نہ کریں۔

جنوں کا آنحضرتؐ کی مجلس میں حاضر ہونا (۱۵)جنّ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئے اورقرآن سنا۔فرماتا ہے۔وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَ لَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (الاحقاف:۳۰) اورجبکہ ہم جنوں کی ایک جماعت کوتحریک کرکے تیرے پاس لائے تاکہ وہ قرآن سنیں پھر جب وہ قرآن سنانے کی مجلس میں حاضر ہوئے توانہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ خاموش(ہوکر قرآن سنو) پھر جب قرآن کی تلاوت ختم ہوئی تو وہ اپنی قوم کی طرف چلے گئے تاکہ وہ انہیں ہوشیار کریں۔سورۂ جنّ میں بھی بیان فرمایا ہے قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْۤا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (الجن:۲) میری طرف وحی کی گئی ہے کہ کچھ جنّوں نے قرآن سنا تو اپنی قوم کو جاکر کہا کہ ہم نے ایک عجیب (پُرلطف) تلاوت سنی ہے (۱۶)جنّات آپؐ پرایمان لائے۔چنانچہ اوپر کی آیت کے بعد ہی ان جنّوں کا قول بیان کیاہے کہ فَاٰمَنَّا بِهٖ ہم اس کلام پر ایمان لے آئے ہیں۔یہ وہ مضامین ہیں جو جنات کے متعلق آتے ہیں۔

قرآن کریم میں جن کا لفظ ارواح خبیثہ پراوران وجودوں پرجن کی کفار پوجا کرتے تھے بولا گیا ہے میرے نزدیک ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنّ قرآن کریم میں کئی چیزوں کا نام رکھا گیاہے اول جنّ بعض ارواح خبیثہ کا نام رکھا گیا ہے۔جوشیطانی خیالات کے لئے اسی طرح محرّک ہوتی ہیں۔جس طرح کہ ملائکہ نیک تحریکوں کےمحرّک ہوتے ہیں۔گویا وہ شیطان جو بدی کامحرّک ہے وہ اس کے اظلال اور مددگار ہیں۔یہ مضمون سورۃ الناس کی آیت سے نکلتا ہے جیسا کہ فرمایا اَلَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ۔(الناس:۶۔۷) دوم۔ان خیالی وجودوں کا نام جنّ رکھا گیاہے جن کی کافرلوگ پوجا کرتے تھے۔ان وجودوں کی تصدیق نہیں کی بلکہ صرف یہ بتایاہے کہ کفار بعض ایسے وجود فرض کرتے ہیں اوران کی پوجا کرتے ہیں اوران کی یہ غلطی ہے۔اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس عقیدہ کی کہ واقع میں ایسے جنّ ہوتے ہیں تصدیق کرتا ہے بلکہ صرف ان کا عقیدہ بیان کرتا ہے کہ وہ ایسے وجود مانتے ہیں اوران کی پوجا کرتے ہیں اس کا ثبوت سورۂ انعام کی آیت وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام:۱۰۱) یعنے مشرک لوگ جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے ہیں حالانکہ اس نے انہیں پیدا کیا ہے اوراللہ تعالیٰ کے بیٹے اور بیٹیاں بغیر علم کے تجویز کرتے ہیں۔اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ وَ خَلَقَهُمْ سے تومعلوم ہوتا ہے کہ ایسے جنوں کا وجود ہے اورانہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وَخَلَقَهُمْ حال جَعَلُوْا کی ضمیر کا ہے نہ کہ جنوں کا اور مراد یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو پیدا کیا ہے یہ کہتے ہیں کہ جن اللہ تعالیٰ کا شریک کار ہیں۔

جس قسم کے جن عوام مانتے ہیں ان کا وجود خیالی ہے اس کا ثبوت کہ لوگ جس قسم کے جن مانتے ہیں ان کا وجود خیالی ہے۔سورہ سباء کی آیت سے وضاحت سے ملتا ہے۔فرماتا ہے۔وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اَهٰۤؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ۔(سبا:۴۱۔۴۲) یعنی یاد کرو جب اللہ تعالیٰ سب انسانوں کو جمع کرے گا پھر ملائکہ سے کہے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ تُو پاک ہے اور تُو ہی ہمارا دوست ہے ان سے ہمارا کوئی بھی تعلق نہیں یہ بات غلط ہے کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنّوں کی پرستش کرتے تھے اور ان میں سے اکثر ان پر ایمان لاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ملائکہ کے معبود بنائے جانے کے متعلق ملائکہ سے سوال سوال یہ ہے کہ اگر انسان جنوں کی پرستش نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے پوچھا کیوں؟ اللہ تعالیٰ کی ہستی تو عالم الغیب ہے یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ کوئی مشرک بھی فرشتوں کی عبادت نہ کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھے کہ کیا یہ تمہاری پوجا کرتے تھے نیز اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ کسی جہت سے بھی نہیں کہا جاسکتا کہ لوگ فرشتوں کو اُلوہیت کا درجہ دیتے ہیں۔تو پھر اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے جواب طلب کرنا ظلم بن جاتا ہے۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود قرآن کریم فرماتا ہے فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ۔ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ۔(الصّٰفّٰت:۱۵۰،۱۵۱) یعنی ان سے پوچھ کہ تمہارے تو بیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔کیا اللہ تعالیٰ نے جب فرشتوں کو مؤنث بنا کر پیدا کیا تھا تو یہ لوگ اس وقت موجود تھے۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ فرشتوں کو مشرک اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بیٹی بھی خدا ہی قرار پائے گی اور قابل پرستش سمجھی جائے گی جیسے حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہا جاتا ہے۔ اور قابل پرستش سمجھا جاتا ہے۔چنانچہ سورۂ نحل آیت ۵۸ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے شرک کے ذکر میں بیان فرمایا ہے وَ یَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ اور یہ لوگ اس طرح بھی شرک کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ ایسے نقص سے پاک ہے۔

کفار ملائکہ کی پرستش نہ کرتے تھے بلکہ انہوں نے جنوں یعنی خیالی وجودوں کا نام ملائکہ رکھ لیا

خلاصہ یہ کہ اگر مشرک ملائکہ کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور اگر کسی کو خدا تعالیٰ کی بیٹی یا بیٹا قرار دینا شرک ہے تو پھر ملائکہ کس طرح کہتے ہیں کہ الٰہی یہ لوگ ہماری پوجا نہیں کرتے تھے۔ان حالات میں اللہ تعالیٰ پر سے اعتراض اٹھ کر فرشتوں پر اعتراض پڑ جاتا ہے۔مگر غور کیا جائے تو ان پر بھی اعتراض نہیں پڑتا۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا سوال ظاہر پر

تھا اور ملائکہ کا جواب باطن کو مدنظر رکھ کر ہے۔ مشرک ظاہر میں تو یہی کہتے ہیں کہ ملائکہ خدا تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اور ان کو خوش کرنا بھی ان کے لئے ضروری ہے لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ نہ وہ ملائکہ کو جانیں نہ ان کی طاقتوں کو یونہی ملائکہ کا ذکر بڑوں سے سن کر ایک خیالی وجود انہوں نے اپنے ذہن میں بنا لئے اور خیال کیا کہ یہ ملائکہ ہیں اور اللہ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ وہ وجود محض ذہنی تھے۔ نہ ملائکہ والے صفات ان میں تھے نہ کام تھے پس درحقیقت ان کی عبادت ملائکہ کے لئے نہ تھی بلکہ چند خیالی اور نظر نہ آنے والے وجودوں کے لئے تھی جنہیں عربی زبان میں جن کہہ سکتے ہیں۔

ملائکہ کا جواباً یہ کہنا کہ لوگ جنوں کی پوجا کرتے ہیں پس ملائکہ نے جو جواب دیا ہے وہ بھی درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ الٰہی ہماری انہوں نے کیا پوجا کرنی تھی ہم تو تیرے بندے اور تیری حفاظت میں ہیں۔ یہ تو چند ایسے وجودوں کی پرستش کرتے تھے جو محض خیالی اور غیر مرئی ہیں۔ اگر اس قسم کے جنوں کا وجود ہوتا جس قسم کا عوام کہتے ہیں تو پھر فرشتوں کا یہ قول کہ وہ جنوں کی پرستش کرتے تھے جھوٹ ہو جاتا ہے کیونکہ مشرک یقیناً ملائکہ کو بنات اللہ قرار دے کر ان کی پرستش کرتے تھے اور اسی صورت میں اس پرستش کو جنوں کی پرستش کہا جا سکتا ہے کہ جبکہ جنّ کے معنے خیالی اور بناوٹی وجود کے لئے جائیں۔ اگر کہا جائے کہ وہ جنوں کی بھی پرستش کرتے تھے تو گو یہ درست ہے کہ بعض وجودوں کی پرستش مشرک جنّ کے نام سے بھی کرتے تھے مگر یہاں وہ مراد نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جنوں کی پرستش سے ملائکہ کی پرستش کی نفی تو نہیں ہو جاتی۔ مشرک تو ہزاروں قسم کے بت بناتا ہے۔ انسانوں کو بھی خدا کہتا ہے۔ سورج چاند کو بھی۔ دریاؤں کو بھی۔ ملائکہ کو بھی اپنے مزعومہ جنوں کو بھی۔ پس جنوں کی پرستش کرنے کی وجہ سے ملائکہ کو یہ حق پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی پرستش کا انکار کریں۔ یہ حق انہیں تبھی پیدا ہوتا ہے جبکہ وہ پرستش جو اِن کے نام سے کی جاتی تھی کسی دلیل کی بناء پر کسی خیالی وجود کی طرف منسوب کی جا سکے اور یہی انہوں نے کہا ہے۔ پس جنّ سے مراد اس آیت میں خیالی اور ذہنی وجود کے ہیں جن کا نام کفار نے ملائکہ رکھ لیا تھا مگر فی الواقع وہ ملائکہ نہ تھے۔

جن کا لفظ ان اقوام کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو شمالی سرد علاقوں میں رہتی ہیں جن چونکہ مخفی وجود کو کہتے ہیں اس لئے جن کا لفظ قرآن کریم میں عربوں اور دوسری اقوام کے محاورہ کے مطابق ان اقوام کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو شمالی علاقوں میں اور سرد ممالک میں رہتی تھیں۔ چونکہ لوگ بوجہ شدت سردی کے ان کے ممالک کی طرف سفر نہیں کرتے تھے۔ اور وہ گرمی کی وجہ سے ادھر نہ آتے تھے۔ نیز چونکہ سرد علاقوں میں رہنے کے سبب سے وہ زیادہ سفید رنگ والے اور شراب کے استعمال کی وجہ سے زیادہ سرخ ہوتے تھے ایشیا کے لوگ انہیں کوئی الگ قسم کی

مخلوق سمجھتے تھے۔ اور انہیں جن اور پریاں کہتے تھے یہ ان کا عام نام تھا۔

یہود کا خیال کہ جن شمالی علاقہ میں رہتے ہیں چنانچہ جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں یہود کا یہ عقیدہ تھا کہ جنّ شمالی علاقہ میں رہتے ہیں۔ چنانچہ شرکی ربیّ الیعذر نے اپنی کتاب میں یہی لکھا ہے کہ جنّ زیادہ تر دنیا کے شمالی علاقوں میں رہتے ہیں۔

ہندوؤں نے بھی جنوں کا مقام شمال میں تجویز کیا ہے ہندو قوم نے بھی اپنے شمال میں ہی جنّوں کا مقام تجویز کیا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ حوالہ گذر چکا ہے ہندوؤں کے نزدیک گندھر والوگوں کا علاقہ ہندوستان کے شمال مغرب میں تھا اور ٹیکسلا شہر جو علاقہ ہزارہ میں تھا اسے وہ گندھروا کے علاقہ کا شہر کہتے تھے۔ اور دریائے سندھ کے شمال کے علاقہ کو ان کا مسکن قرار دیتے تھے۔ یعنی ہزارہ افغانستان وغیرہ کو۔ مسلمانوں میں جو قصے کہانیاں مشہور ہیں ان میں بھی جنّات کا مسکن کوہ قاف اور اس کے پار کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔

شمالی علاقہ کے لوگوں کو جن کہے جانے کی وجہ پس یہ بات ظاہر ہے کہ شمالی علاقوں کے سرخ وسفید لوگ جو تمدّنی حالات کے ماتحت قریباً ایشیا سے بالکل الگ ہوگئے تھے اور بہت کم ادھر آتے تھے اور مذہب اور طور طریق کے لحاظ سے بھی الگ تھے۔ ایشیا کے رہنے والوں کے نزدیک جو اس وقت تمدن کے حامل تھے جنّ تھے۔ کیا بلحاظ اپنی شکلوں کے اور کیا بلحاظ ایشیا سے دور رہنے کے (شائد ہندوؤں نے نہ صرف شمال مغربی علاقہ کے ساکنوں کی ظاہری شکل کی وجہ سے بلکہ ان کی قوت اور طاقت کی وجہ سے کہ وہ ہمیشہ ہندوستان پر حملہ کرتے رہتے تھے ان کو جنّ قرار دیا)۔

سورۃ رحمٰن میں شمالی لوگوں کو جن کہا گیا ہے اسی محاورہ کے مطابق قرآن کریم میں بھی سورۂ رحمن میں ان شمالی لوگوں کو یعنی یورپ کے باشندوں کو جنّ کہا ہے۔ اس سورۃ میں آخری زمانہ کے تغیرات کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس وقت دو مشرق اور دو مغرب ہو جائیں گے یعنی امریکہ کی دریافت سے دو علاقے مشرق اور دو مغرب کہلانے لگیں گے۔ اسی طرح نہر سویز کے ذریعہ دو سمندروں کے ملنے اور بڑے بڑے جہازوں کے چلنے کی خبر دی گئی ہے اسی طرح بتایا ہے کہ اس وقت سائینس کی ترقی کے ساتھ لوگ آسمانی بادشاہت کو فتح کرنے کے خیال میں مشغول ہوں گے اور سمجھیں گے کہ وہ جلد کائنات کا راز دریافت کرنے والے ہیں۔ اس وقت آسمان سے آگ گرے گی اور بم گریں گے اور سرخ روشنیاں آسمان پر چھوڑی جائیں گی اور آخر کفر اور شرک کو تباہ کر کے اسلام کو غلبہ دیا جائے گا۔ اس مضمون کے سلسلہ میں جنّ وانس کو بھی مخاطب کیا گیا ہے اور جنّ سے مراد وہی شمالی علاقوں کے لوگ یعنی یورپین

مراد ہیں اور بتایا ہے کہ اس زمانہ میں یورپ اور ایشیا کے لوگ باہم مل جائیں گے۔ اور سائنس کی بڑی ترقی ہوگی۔ مگر بے دینی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عذاب نازل کرے گا اور پھر اسلام کو قائم کرے گا۔

جن اور الناس سے مراد ڈیماکرسی اور ڈکٹیٹرشپ

ثقلان اور جنّ اور الناس سے مراد ڈیماکرسی اور ڈکٹیٹروں کی حکومت بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جنّ کے معنے عربی لغت میں اکثریت کے بھی ہیں اور الناس کے معنے خاص آدمیوں کے بھی ہو سکتے ہیں (اقرب)۔ پس جنّ سے مراد ڈیماکرسی ہے۔ اور الناس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو خاص قرار دے کر حکومت کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ ثقل کے معنے اعلیٰ اور محفوظ شے کے ہوتے ہیں۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم اور اپنی اولاد کو ثقلان قرار دیا ہے۔ پس الثقلان سے مراد یہ دونوں گروہ ہیں جو اس وقت ساری دنیا پر غالب ہوں گے بعض ڈیماکرسی کے نام پر دنیا کو مغلوب کریں گے اور بعض فاشزم اور نازم کے نام پر دنیا کو سمیٹنا چاہیں گے۔ اور اپنے آپ کو سب دنیا سے بہتر قرار دیں گے۔

قرآن مجید میں غیر قوموں اور غیر مذاہب کے لئے لوگوں کے جن کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں

اس کے علاوہ قرآن کریم میں غیر قوموں اور غیر مذاہب کے لوگوں کے لئے بھی جنّ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت سلیمان کے ذکر میں جہاں جنّوں کا ذکر ہے اس سے مراد غیر قوموں کے لوگ ہی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان جنوں کی نسبت فرماتا ہے کہ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (سبا: ۱۴) وہ جنّ حضرت سلیمانؑ کے لئے دربار کا کمرہ مسجد کا محراب اور محل بناتے تھے اور مجسمے اور بڑے بڑے حوض جو کنوؤں کی طرح تھے اور بہت بڑی بڑی دیگیں تیار کرتے تھے۔ اب ہم بائبل میں دیکھتے ہیں کہ یہ کام حضرت سلیمان کے لئے کس نے کئے ہیں۔ تو ہمیں ۲ تواریخ باب ۲۔ ۷ میں لکھا ملتا ہے کہ جب حضرت سلیمان نے بڑی عبادت گاہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ تو آپ نے صور کے بادشاہ کو خط لکھا کہ اپنے انجنیئروں میں سے میرے پاس ایک انجنیئر بھجواؤ ’’جو سونے اور روپے اور پیتل اور لوہے اور ارغوانی اور قرمزی اور آسمانی رنگوں کے کاموں میں ہوشیار اور نقاشی میں دانشمند ہو۔‘‘ اسی طرح لکھا کہ وہاں کی لکڑی بھجواؤ اور میں لکڑی کاٹنے والوں کو اس اس قدر مزدوری دوں گا۔ آیت ۱۰۔ پھر آیت ۱۴ میں صور کے بادشاہ کا جواب ہے کہ اس نے حضرت سلیمان کے کہنے پر ایک انجنیئر حورام ابی نامی بھجوایا اور کہا کہ یہ سب فنون کا ماہر ہے۔ اور لکھا کہ لکڑی کاٹنے پر میں نے آدمی لگا دیئے ہیں۔ ان کی مزدوری بھجوا دیں۔ آیت ۱۵۔ یہ تو غیر ملکی انجنیئر کا ذکر ہے۔ جو مزدور لگائے گئے ان کا یوں ذکر آتا ہے۔ ’’اور سلیمان نے اسرائیل کے ملک میں سارے پردیسیوں کو گنوایا بعد اس گننے کے جو اس کے باپ داؤد نے

گنوایا تھا اور وے ایک لاکھ ترپن ہزار چھ سوٹھہرے۔ اوراس نے ان میں سے ستر ہزار کو بار برداری پر اور اسی ہزار کو پہاڑ کے توڑنے پر مقرر کیا اوران پر تین ہزار اور سیر مقرر کئے۔ کہ ان لوگوں سے کام لیویں۔'' آیت ۱۷ و ۱۸۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ مزدوری پر بھی غیر قوموں کے لوگ مقرر کئے گئے تھے۔

اب جو کام اس صور کے انجینئر نے کیا۔ وہ بائبل میں یہ لکھا ہے کہ اس نے ایک بہت بڑا ہال عبادت کے لئے بنایا۔ (محاریب) اور بڑے ہال کے اندر فرشتوں کے مجسمے دیواروں کے اندر کھود کر بنائے اور اسی طرح بڑے ہال میں بھی دو فرشتوں کے مجسمے تراش کر بنائے۔ (تمثال) (۲ تواریخ باب ۳ آیت ۷ و ۱۰ تا ۱۳) اور پھر باب ۴ آیت ۲ و ۶ میں بتایا ہے کہ ایک بڑا حوض بنایا جو دھاتوں سے ڈھالا ہوا تھا۔ اوراس کے علاوہ دس چھوٹے حوض بنائے (جِفَانٍ كَالْجَوَابِ) پھر اسی باب ۴ کی آیت ۱۵۔۱۶ میں لکھا ہے کہ حورام انجینئر نے جو باہر سے آیا تھا'' اور ایک بحر (لفظی معنی سمندر مراد بڑا حوض) اوراس کے نیچے بارہ بیل اور دیگیں اور پھاوڑے اور کانٹے اور سب ظروف جو حورام ابی نے سلیمان بادشاہ کی خاطر خداوند کے گھر کے لئے بنائے صاف پھول دھات کے تھے۔'' اس ایک آیت میں دیگوں (قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ) حوضوں اور مجسموں کا ذکر اکٹھا آ گیا ہے۔

حضرت سلیمان کی خدمت کرنے والے غیر ملکی اور غیر قوم کے لوگ تھے جن کو جنّ کہا گیا ہے

غرض وہ سب اشیاء جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے حضرت سلیمان نے حورام ابی سے جو ایک غیر ملکی انجینئر تھا اور غیر ملکی مزدوروں سے بنوائی تھیں۔ پس جنّ سے مراد محض غیر ملکی اور غیر قوم کے لوگ ہیں۔ جن کو حضرت سلیمان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ صرف رُعب خداداد کی وجہ سے وہ آپ کے تصرف کے نیچے آئے ہوئے تھے اور آپ کا کام کرتے تھے جب آپ فوت ہو گئے۔ تو کچھ مدت تک تو آپ کی حکومت کا رعب ان لوگوں کے دلوں پر رہا۔ جب آپ کے لڑکے نے بعض نالائقیوں کی وجہ سے اس رعب کو ضائع کر دیا۔ تو وہ لوگ پچھتائے کہ خوامخواہ ان کے لئے لکڑیاں ڈھونے اور دوسرے ذلیل کاموں میں ہم کیوں لگے رہے؟ اور یہ ذلّت برداشت کی اگر یہ حکومت اتنی جلدی فنا ہو جانی تھی۔ تو ہم مقابلہ جاری رکھتے۔

حضرت آدمؑ کے زمانہ کے لوگوں کا نام قرآن کریم میں جن رکھا گیا ہے

چوتھا استعمال جنّ کے لفظ کا قرآن کریم میں ان لوگوں کے متعلق ہے۔ جو حضرت آدم کے زمانہ میں دنیا پر بستے تھے اور جن میں سے نکل کر حضرت آدم نے ایک نیا نظام قائم کیا تھا۔ چونکہ آدم نظام کا قائم کرنے والا پہلا شخص تھا۔ اس سے پہلے لوگ نظام کی قدر کو نہ جانتے تھے۔ اور جانوروں کی طرح الگ الگ درختوں کی جڑوں میں یا غاروں میں رہتے تھے۔ اور جنگلی

درندوں کی وجہ سے سطح زمین پر آسانی سے چل پھر نہیں سکتے تھے۔ان کا نام ان کی حالت کے مطابق جنّ رکھا گیا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو آجکل کے مؤرّخ Caveman کہتے ہیں۔یعنی کھوہوں اور غاروں میں رہنے والے لوگ جو سطح زمین پر بودو باش نہ کرتے تھے (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Cave)۔جب انسانی دماغ نے ترقی کی اور انسان الہام کی نعمت کے قبول کرنے کے قابل ہو گیا۔تو اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو جسے اس نے آدم کا خطاب دیا کیونکہ وہ سطح زمین پر رہنے کے قابل ہو گیا تھا اور انسان کا خطاب دیا۔کیونکہ وہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی محبت کے قابل ہو گیا تھا تو دوسری طرف بنی نوع کے ساتھ ہمدردی کرنے اور ان کے لئے قربانی کرنے کے قابل تھا۔اپنے الہام کے لئے چنا (دیکھو تفصیلی دلائل کے لئے میری کتاب سیر روحانی جلد اول) جنہوں نے اس کے نظام کو قبول کیا اور اس کے ساتھ مل گئے اور باہر نکل کر مکان وغیرہ بنانے لگے اور تمدّنی قوانین کی پابندی کو منظور کر لیا وہ آدمی کہلائے۔ لیکن جنہوں نے وحشت کی زندگی کو ترک کرنے سے انکار کر دیا۔اور غاروں کی زندگی کو حریّت قرار دیا۔ان کا نام ان کے طرز رہائش کی وجہ سے جنّ قرار پایا پس جنّ بشری ترقی کے دور کے اس حصہ کے افراد کا نام ہے۔جو تمدن سے عاری تھے۔اور نظام کو قبول کرنے کے ناقابل تھے۔اور آدمی بشری ترقی کے دور کے اس حصہ کا نام ہے جس میں ایک جماعت نے مل کر رہنے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے اور ایک نظام کی پابندی کا اقرار کیا۔ آئندہ کے لئے یہ دو نام ان دو صفات کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور جو لوگ نظام کے باغی ہوں۔ان کا نام جنوں کی ذریت رکھا گیا۔اور جو نظام کے تابع ہوں ان کا نام آدم کی ذریت رکھا گیا۔اب یہ دونوں نام صفاتی ہیں جس کی وجہ سے کبھی جنوں کی اولاد اصلاح کر کے آدمی ہو جاتی ہے اور کبھی آدمیوں یعنے پابندِ نظام لوگوں کی اولاد گندی اور نظام شکن ہو کر جنّ بن جاتی ہے۔

رسول کریم کے زمانہ میں ایمان لانے والے دراصل یہودی تھے اب رہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا سوال کہ اس وقت جو جنّ ایمان لائے تھے وہ کیسی مخلوق تھی۔سو اس کے متعلق قرآن کریم سے ثابت ہے کہ وہ یہودی تھے کیونکہ وہ موسیٰ کی کتاب کا اور اس پر ایمان لانے کا ذکر کرتے ہیں۔پس معلوم ہوا کہ وہ یہودی لوگ تھے (الاحقاف: ۳۰،۳۱)۔اللہ تعالیٰ نے ان کو جنّ اس لئے کہا ہے کہ وہ باہر کے لوگ تھے۔اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی ملے تھے۔

آنحضرتؐ پر ایمان لانے والے جن نصیبین کے رہنے والے تھے اور رات کو آپؐ سے ملے تھے بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نصیبین کے رہنے والے تھے اور رات کے وقت رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تھے (بخاری کتاب مناقب الانصار ذکر الجن و قولہ قل اوحی۔۔۔) واپس جا کر جو واقعہ ان کے اوران کی قوم کے درمیان گذرا۔اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر قرآن کریم میں فرمایا ہے۔معلوم ہوتا ہے عرب لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے انہوں نے چھپ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور آپؐ سے قرآن سنا۔جب واپس ہوئے۔تو دلوں نے گواہی دی کہ آپ سچے ہیں۔اوراپنی قوم میں تبلیغ شروع کردی۔

مومن جنّوں کے انسان ہونے کے سات ثبوت اس امر کا ثبوت کہ یہ جنّ انسان تھے مندرجہ ذیل ہے۔

اول یہ کہ وہ پوشیدہ ملے۔اگر وہ جنّ تھے۔تو ان کو پوشیدہ اور رات کو ملنے کیا ضرورت تھی علی الاعلان ملتے۔تو کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔اور جنّوں کی جو شان بیان کی جاتی ہے۔اس کے لحاظ سے انہیں دیکھ بھی کون سکتا تھا۔

دوسرا ثبوت دوم قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔لِّتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ تُعَزِّرُوۡہُ وَ تُوَقِّرُوۡہُ (الفتح:۱۰) یعنی مومنو! ہم نے یہ رسول اس لئے بھیجا ہے کہ تم اس کی مدد اور نصرت کرو۔اوراس کی عزت دنیا میں قائم کرو۔اگر جنات ایمان لائے تھے۔تو وہ کس رنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرتے تھے۔کہتے ہیں کہ جنّ لوگوں کے سروں پر چڑھ جاتے ہیں۔اور قسم قسم کے پھل لاکر دے دیتے ہیں۔

اگر جن کوئی مخفی مخلوق تھے انہوں نے آنحضرتؐ کی مدد کیوں نہ کی؟ یہ کیسے مومن تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم پر ظلم ٹوٹا۔لیکن کافر جنّوں نے تو حضرت سلیمان کے لئے قلعے تیار کئے اور ہر ذلیل سے ذلیل کام ان کی خاطر کیا۔یہ مومن ایسے طوطا چشم تھے کہ ابوجہل وغیرہ کسی کو انہوں نے سزا نہ دی۔اور پھر یہ جنّ لوگوں کو تو بے موسم کے پھل لاکر دے دیتے ہیں۔مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر انہیں یہ توفیق بھی نہ ملی جب غزوہ خندق کے موقعہ پر آپؐ پر اور دوسرے مسلمانوں پر فاقے پر فاقے آرہے تھے۔اور آپؐ اور آپؐ کے صحابہ گویا پیٹوں پر پتھر باندھے پھر رہے تھے (بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ خندق)۔یہ لوگ آپؐ کے لئے اور آپؐ کے صحابہ کے لئے جَو کی روٹیاں ہی لا دیتے۔یہ تو ایمان کی علامت نہیں بلکہ اول درجہ کی شقاوت کی علامت ہے۔ لیکن قرآن کریم تو فرماتا ہے کہ وہ ایماندار مخلص تھے۔پس ظاہر ہے کہ نہ ان جنّوں کو جن کا ذکر سورۂ جنّ میں ہے طاقت ہے کہ کسی کے سر پر چڑھیں اور انسانوں پر قبضہ کرسکیں یا انہیں ستا سکیں اور نہ ان میں کسی کو کچھ لاکر دینے کی طاقت ہے۔ایسے جنّ صرف وہمی لوگوں کے دماغ میں ہیں قرآن کریم ایسے جنّوں کو تسلیم نہیں کرتا۔اس نے تو جو جنّ پیش کئے ہیں انہی اقسام کے ہیں جو میں نے بیان کئے۔اوران اقسام میں سے جو جنّ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے وہ یہودی تھے جنہوں نے کلام سنا اپنے گھروں کو چلے گئے۔اور آخر ایمان لانے کا فیصلہ کیا اوراپنی

قوم کو پیغام پہنچا دیا۔عرب سے ہزاروں میل دور کے بسنے والے تھے۔ بعد میں نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی خبر ملی بھی یا نہیں ملی۔اس وجہ سے وہ اسلامی جنگوں میں عملاً کوئی حصہ نہ لے سکے۔

تیسرا ثبوت تیسرا ثبوت اس امر کا کہ یہ جنّ انسان تھے یہ ہے۔کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ مِنْ اَنْفُسِهِمْ اور مِنْهُمْ ہوتے ہیں یعنی جن کی طرف آتے ہیں انہی کی قوم کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ (النحل:۹۰) یعنی قیامت کے دن ہر امت کا رسول جو انہی میں سے ہوگا بطور گواہ لایا جائے گا۔اور محمدؐ رسول اللہ کو امت محمدیہؐ اور اس زمانہ کے لوگوں پر بطور گواہ بھیجا جائے گا۔ اگر جنّ بھی کوئی ایسی قوم ہے۔ جو ایمان لاتی ہے۔تو اس پر گواہی کون دے گا؟ موسیٰ تو جنّ نہیں کہ ان جنّوں کے متعلق ان سے پوچھا جائے گا جو ان پر ایمان لائے تھے۔اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انسان تھے۔ وہ جنّوں سے من انفسھم کی نسبت نہیں رکھتے۔پس آپ جنّوں کے متعلق شہید نہیں ہو سکتے۔ من انفسھم سے مراد پہلے انبیاء کی نسبت سے ان کی اقوام ہیں۔اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے آپ کے زمانہ کے بعد کے سب انسان۔پس جنّ اگر کوئی انسانوں جیسی مکلّف مخلوق ہے تو وہ یونہی رہ جاتے ہیں۔ نہ ثواب کے مستحق نہ عذاب کے۔

چوتھا ثبوت چوتھا ثبوت اس دعویٰ کی تائید میں یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (الانعام:۱۳۱) یعنے اے جنّوں اور انسانوں کی جماعتو! کیا تمہارے پاس تمہاری قوموں میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تم کو میرے نشانات پڑھ کر سناتے تھے۔اور آج کے دن کے دیکھنے سے تم کو ہوشیار کرتے تھے؟ اس آیت میں صاف لکھا ہے کہ جنوں کی طرف ان کی قوم کے نبی آئے اور انسانوں کی طرف انسان نبی۔ اب اگر جنّ کوئی دوسری مخلوق ہے تو اس آیت کے ماتحت نہ تو موسیٰ ان کے نبی ہو سکتے ہیں۔نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ کیونکہ جنوں کی طرف اس آیت کے ماتحت جنّ نبی ہی آئے تھے۔ہاں! اگر جنّوں سے انسانوں کا کوئی گروہ مراد ہو۔تو پھر بے شک وہ موسیٰؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مومن ہو سکتے ہیں۔

پانچواں ثبوت پانچواں ثبوت اس امر کا کہ عوام میں جو جنّ مشہور ہیں ان کا کوئی وجود نہیں۔ اور یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو جنّ ایمان لائے تھے وہ انسان ہی تھے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جہنم کی نسبت فرماتا ہے فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (البقرۃ:۲۵) دوزخ میں یا تو انسان ہوں گے یا پھر پتھر وغیرہ آگ کو بھڑکانے

والے سامان ہوں گے۔ اگر جنّ کوئی مکلّف مخلوق ہے تو یوں چاہیے تھا وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْجِنُّ وَالْحِجَارَةُ۔ پس جہاں قرآن کریم نے جنّ قوم کو دوزخی کہا بھی ہے۔ وہاں انسان جنّ مراد ہیں نہ کوئی غیر مخلوق۔

مومن جنوں کے انسان ہونے کی چھٹی دلیل چھٹا ثبوت ان مومن جنّوں کے انسان ہونے کا یہ ہے کہ مسند احمد بن حنبل میں آتا ہے کہ قَالَ (رَسُوْلُ اللهِ صَلعم) لَھُمْ لَقَدْ اُعْطِیْتُ اللَّیْلَةَ خَمْسًا مَا اُعْطِیَھُنَّ اَحَدٌ قَبْلِیْ اَمَّا اَنَا فَاُرْسِلْتُ اِلَی النَّاسِ كُلِّھِمْ عَامَّةً وَكَانَ مَنْ قَبْلِیْ اِنَّمَا یُرْسَلُ اِلٰی قَوْمِهٖ (مسند احمد بن حنبل مسند عبد اللہ بن عمرو بن العاص ؓ) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تہجد پڑھ کر جو پہرہ دار آپ کے پیچھے نماز میں شامل ہو گئے تھے ان سے فرمایا۔ کہ آج پانچ خصوصیتیں مجھے ایسی عطا کی گئی ہیں کہ اس سے پہلے کسی کو یہ خصوصیتیں نہیں ملیں۔ ایک تو یہ کہ میں سب اقوام کی طرف بلا استثنا مبعوث کیا گیا ہوں۔ اور جو مجھ سے پہلے نبی گذرے ہیں وہ صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے (آگے بقیہ چار خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس رات کو پانچ خصوصیتیں جمع کر کے آپ کو بتائی گئی تھیں۔ ورنہ بعض خصوصیات مثلاً یہی جو اوپر بیان ہوئی ہے شروع زمانہ اسلام سے ہی آپ کو مل چکی تھیں)۔

آنحضرت پر ایمان لانے والے جن موسیٰ علیہ السلام کے مومنوں میں سے تھے اس حدیث کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جنّ جو آنحضرت صلعم پر ایمان لائے کوئی اور مخلوق تھی۔ کیونکہ قرآن کریم صاف بتاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مومنوں میں سے تھے۔ اگر وہ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے تو ان کا موسیٰ پر ایمان لانا جائز ہی کس طرح ہو سکتا ہے؟ اگر اعتراض ہو کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل: ۱۶) موسیٰ فرعون کی طرف بھی مبعوث تھے حالانکہ فرعون بنی سرائیل میں سے نہ تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قوم سے مراد کبھی نسلی قوم ہوتی ہے اور کبھی ملکی۔ جیسے ہندوستان میں مختلف اقوام بستی تھیں۔ ان میں جو نبی آتا تھا۔ وہ ہندوستانی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا نہ کہ برہمن یا راجپوت کی طرف۔ کیونکہ ایک جگہ رہنے والی اقوام کو سہولت کے لئے ایک قوم شمار کر لیا جاتا ہے۔ پس فرعون کے ساتھ اور اس کی قوم کے ساتھ چونکہ حضرت موسیٰ حکومت اور سیاست اور قانون اور تمدن کے ذریعہ سے بندھے ہوئے تھے ان کو تو ایک قوم سمجھ لیا گیا مگر جنّوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا نسبت تھی حکومت کے لحاظ سے یا سیاست کے لحاظ سے یا قانون کے لحاظ سے یا تمدن کے لحاظ سے کہ ان کو بھی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا؟ اگر کہو کہ حضرت موسیٰ ؑ مبعوث تو بنی اسرائیل یا ان کے ساتھ رہنے والی قوم کی طرف ہی ہوئے تھے مگر جنّ اپنے طور پر ان پر ایمان لے آئے تھے تو یہ بھی درست

نہیں ہے حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک واقعہ انجیل میں بیان ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دوسری اقوام کو اپنی جماعت میں شامل ہونے کی اجازت تک نہ دی بلکہ جب ان سے ایک غیر قوم کے آدمی نے تبلیغ کرنے کے لئے کہا۔ تو آپ نے فرمایا ’’کہ لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینی اچھی نہیں‘‘ (متی باب ۱۵ آیت ۲۶) پس یہ بھی درست نہیں۔ کہ وہ اپنی مرضی سے ایمان لے آئے تھے۔ کیونکہ اگر جن کوئی مکلف قوم ہے۔ تو اس کے لئے صرف اس نبی پر ایمان لانا فرض ہے جو مِن انفسھم ہو۔ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا ان کے لئے جائز نہ تھا۔ غرض قرآن کریم کی آیات اور مذکورہ حدیث کے رُو سے کم سے کم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جنوں کے لئے الگ نبی مبعوث ہونے ضروری تھے۔ جو خود ان میں سے ہوتے۔ نیز جنوں کی مختلف قوموں کی طرف الگ الگ نبی مبعوث ہونے ضروری تھے۔

مومن جنات کے انسان ہونے کی ساتویں دلیل ساتواں ثبوت ان جنات کے انسان ہونے کا یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں یہ فرماتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ (الاعراف:۱۵۹)

آنحضرتؐ کا دعویٰ صرف انسانوں کی طرف مبعوث ہونے کا تھا اس جگہ جنوں کو رسالت میں شامل نہیں کیا۔ اگر جن بھی کوئی علیحدہ قوم ہے۔ اور اس کے لئے بھی آپ پر ایمان لانا ضروری تھا یا جائز ہی تھا۔ تو یوں فرمانا چاہیے تھا کہ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ وَالْجِنُّ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا مگر یہ تو قرآن کریم میں کہیں بھی نہیں آیا پس جو جن آپؐ پر ایمان لائے وہ قرآنی تشریح کے ماتحت انسانوں ہی میں سے تھے۔ اور اسی وجہ سے آپؐ پر ایمان لانے کے مکلف تھے۔

ایک اور آیت اس مضمون کے بارہ میں اس سے بھی واضح ہے۔ اور وہ سورۂ سبا کی آیت وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ ہے (سبا:۲۹) کَآفَّةً کَفَّ سے نکلا ہے جس کے اصل معنے جمع کرنے اور روکنے کے ہیں۔ پس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھے صرف اس لئے مبعوث کیا ہے۔ کہ تو انسانوں کو جمع کرے اور کسی انسان کو اپنی تبلیغ سے باہر نہ رہنے دے۔ اب دیکھو! اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ تجھے صرف انسانوں کو جمع کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ اور بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ انسانوں کے سوا کوئی اور مخلوق بھی ہے اور وہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی مکلف ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انسانوں میں سے کوئی آپ کی دعوت سے باہر نہیں انسانوں کے سوا کوئی مخلوق آپ پر ایمان لانے کے لئے مکلف بھی نہیں۔ اس وجہ سے جن مومن جنّوں کا ذکر

قرآن کریم میں کیا گیا ہے۔ وہ انسان ہی تھے کوئی اور مخلوق نہ تھے۔

قرآن کریم میں لفظ جن کا استعمال خلاصہ کلام یہ کہ قرآن کریم میں جنّ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

جنّ کے لفظ کا استعمال مخفی اور غیر مرئی مخلوق کے لئے (۱) جنّ وہ تمام مخفی مخلوق جو غیر مرئی شیطان کی قسم سے ہے یہ مخلوق اسی طرح بدی کی تحریک کرتی ہے جس طرح ملائکہ نیک تحریکات کرتے ہیں۔ ہاں یہ فرق ہے۔ کہ ملائکہ کی تحریک وسیع ہوتی ہے اور ان کی تحریک محدود ہوتی ہے۔ یعنی ان کو زور انہی پر حاصل ہوتا ہے جو خود اپنی مرضی سے بدخیالات کی طرف جھک جائیں۔ انہیں شیاطین بھی کہتے ہیں۔

جنّ سے مراد زیر زمین رہنے والے (۲) جنّ سے مراد قرآن کریم میں Cavemen بھی ہے۔ یعنے انسان کے قابل الہام ہونے سے پہلے جو بشر زیر زمین رہا کرتے تھے۔ اور کسی نظام کے پابند نہ تھے۔ ہاں آئندہ کے لئے قرآن کریم نے یہ اصطلاح قرار دے لی۔ جو لوگ اطاعت کا مادہ رکھتے ہیں۔ ان کا نام انسان رکھا۔ اور جو لوگ ناری طبیعت کے ہیں اور اطاعت سے گریز کرتے ہیں ان کا نام جنّ رکھا۔

جنّ سے مراد شمالی علاقہ کے لوگ (۳) شمالی علاقوں کے وہ لوگ یعنے یورپ وغیرہ کے جو ایشیا کے لوگوں سے میل ملاپ نہ رکھتے تھے۔ اور جن کے لئے آخر زمانہ میں حیرت انگیز دنیوی ترقی اور مذہب سے بغاوت مقدر تھی۔ ان کا ذکر سورۂ رحمٰن میں کیا ہے۔

غیر مذاہب کے لوگوں اور اجنبیوں کے لئے لفظ جن کا استعمال (۴) غیر مذہب کے لوگوں کو اور اجنبیوں کو جنہیں بعض اقوام جیسے ہندو اور یہود کوئی نئی مخلوق سمجھتے تھے۔ ان کو عام محاورہ کے مطابق پر جنّ کے نام سے موسوم کیا ہے جیسے حضرت سلیمان کے جنّ یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے لوگ۔

میرے نزدیک دوزخ میں جانے والے جن جنّات کا ذکر آتا ہے ان سے مراد یا تو وہی ناری طبیعت والے لوگ ہیں جو اطاعت سے باہر رہتے ہیں۔ اور کسی مذہب یا تعلیم کو قبول نہیں کرتے۔ اور انسان دوزخیوں سے مراد وہ کفار ہیں جو کسی نہ کسی مذہب سے اپنے آپ کو وابستہ کرتے ہیں۔ یا پھر اقوام شمال مغرب کو جنّ قرار دیا ہے اور جنوبی دنیا اور مشرق کے لوگوں کو اِنس قرار دیا ہے۔ جیسا کہ عرف عام میں یہ لوگ ان ناموں سے مشہور تھے۔

یہ جو فرمایا کہ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جن کو ہم جنّ کہتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں ناری مادہ تھا یعنے جلد اشتعال میں آجاتے تھے اور اطاعت برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ حضرت آدم سے پہلے بشر کی حالت یہی تھی۔ حضرت آدم پہلے انسان تھے۔ جنہوں نے اخلاقی اور تمدنی کمال حاصل کیا۔ اس وجہ

سے الہام جس کا تعلق تمدن اور اخلاق سے ہے سب سے پہلے آپ ہی پر نازل ہوا۔پس جو لوگ اس تمدن اور نظام میں شامل ہوئے انہوں نے گویا اپنے نفسوں کو مار دیا۔اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا نقش اپنے دلوں پر کندہ کروالیا۔پس وہ طینی کہلائے۔کیونکہ طین نقش قبول کرتی ہے۔اور جن لوگوں نے نظام میں آنے کی نسبت انفرادی آزادی کو مقدم رکھا اور کسی کی اطاعت کا جوا گردن پر رکھنے سے انکار کیا وہ ناری کہلائے۔یعنی جس طرح آگ کا شعلہ قابو میں نہیں آتا۔اسی طرح وہ بے قابو ہو گئے۔اور بوجہ زمین کے اندر رہنے کے وہ جنّ بھی کہلائے۔

جنوں کے آگ سے پیدا ہونے سے مراد ناری طبیعت اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۔جنوں کو آگ سے بنایا۔پھر تم کس طرح کہتے ہو کہ اس سے مراد ناری طبیعت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے۔خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء:۳۸) جس کے لفظی معنے ہیں انسان کو (اللہ تعالیٰ نے) جلدی سے پیدا کیا۔محقق مفسرین لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں عجلت اور جلد بازی ہے یہ نہیں کہ جلدی نام کسی مادہ کا ہے جس سے انسان کو بنایا گیا ہے۔اور وہ لکھتے ہیں کہ یہ عربی کا عام محاورہ ہے کہ جو شے کسی کی طبیعت میں داخل ہو۔اس کے بارہ میں کہتے ہیں کہ وہ اس سے پیدا کیا گیا ہے۔ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ (الروم:۵۵) یعنے خدا تعالیٰ وہ ہے جس نے تم کو اس حالت میں پیدا کیا ہے کہ تمہاری طبیعت میں کمزوری ہوتی ہے۔یعنی پیدائش کے وقت بچہ کمزور ہوتا ہے اور دوسرے کی امداد کا محتاج ہوتا ہے۔اس آیت کے بھی یہ معنی نہیں کہ ضعف کوئی مٹی یا لکڑی کی قسم کی شے ہے جس سے خدا تعالیٰ نے انسان کو بنایا ہے۔

جنات کا انسانوں پر غلبہ پانا غلط ہے یہ تعلیق ختم کرنے سے پہلے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ کئی پرانے بزرگ کم سے کم اس خیال میں میرے ساتھ شریک ہیں۔کہ وہ جنّ کوئی نہیں ہوتے جو انسانوں سے آ کر ملیں اور اس پر سوار ہو جائیں اور ان سے مختلف کام لیں۔چنانچہ علامہ ابن حیّان اپنی تفسیر بحر محیط کی جلد پانچ ص ۴۵۴ پر لکھتے ہیں۔کہ جبائی کا قول ہے۔کہ یہ آیت (اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ جو آیت زیر تفسیر کے چند آیات بعد ہی ہے) ان لوگوں کے دعووں کو رد کر دیتی ہے۔جن کا یہ خیال ہے کہ شیطان اور جنّوں کے لئے ممکن ہے کہ انسانوں پر غلبہ پالیں۔اور ان کی عقلوں کو خراب کر دیں۔جیسا کہ عام لوگوں کا عقیدہ ہے۔اور بعض دفعہ عوام ان امور کو جادوگروں کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں۔اور یہ سب دعوے اللہ تعالیٰ کی نص صریح کے خلاف ہیں۔

اگر کہا جائے کہ بعض بزرگوں نے جنات کا ذکر کیا ہے۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روحانی نظارے ہیں

اور عالمِ مثال میں ایسی باتیں نظر آ جاتی ہیں۔انہوں نے کشف سے بعض امور دیکھے۔اور چونکہ عوام میں جنّات کا عقیدہ تھا اور قرآن کریم میں بھی لفظ جنّ کا استعمال ہوا ہے انہوں نے ان مثالی وجودوں کو اصلی وجود سمجھ لیا۔

جنات کے متعلق اپنا ذاتی تجربہ میرا اپنا ذاتی تجربہ اس بارہ میں یہ ہے کہ کئی مختلف وقتوں میں لوگوں نے مجھے ایسے خطوط لکھے ہیں۔کہ جنّات ان کے گھر میں آتے اور فساد کرتے ہیں۔میں نے ہمیشہ اپنے خرچ پر اس مکان کا تجربہ کرنا چاہا۔لیکن ہمیشہ ہی یا تو یہ جواب ملا کہ اب ان کی آمد بند ہوگئی ہے۔یا یہ کہ آپ کے خط آنے یا آپ کا آدمی آنے کی برکت سے وہ بھاگ گئے ہیں۔میرا اپنا خیال ہے کہ جو کچھ ان لوگوں نے دیکھا ایک اعصابی کرشمہ تھا۔میرے خط یا پیغامبر سے چونکہ انہیں تسلی ہوئی وہ حالت بدل گئی۔

اگر اس تفسیر کے پڑھنے والوں میں سے کسی صاحب کو اس مخلوق کا تجربہ ہو۔اور وہ مجھے لکھیں۔تو میں اپنے خرچ پر اب بھی تجربہ کرانے کو تیار ہوں۔ورنہ جو کچھ میں متعدد قرآنی دلائل سے سمجھا ہوں یہی ہے کہ عوام الناس میں جو جنّ مشہور ہیں اور جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ انسانوں سے تعلق رکھتے اور ان کو چیزیں لا کر دیتے ہیں۔یہ محض خیال اور وہم ہے۔یا مداریوں کے تماشے ہیں جن کے اندرونی بھید کے نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں نے ان کو جنّات کی طرف منسوب کر دیا ہے۔اس علم کا بھی میں نے مطالعہ کیا ہے۔اور بہت سی باتیں ان ہتھکنڈے کرنے والوں کی جانتا ہوں۔ہاں! یہ میں مانتا ہوں۔کہ ممکن ہے پہلے انسان ناری وجود ہو۔اور زمانہ کے تغیرات سے بدلتے بدلتے ارتقاء کے ماتحت طینی وجود ہو گیا ہو۔یعنی اس کی بناوٹ کی بنیاد زمینی پیداوار پر آ گئی ہو۔اور ایسے وجود جو سب سے پہلے تیار ہوئے۔ان کا سردار آدم ہو یہ کوئی بعید بات نہیں۔علم جیالوجی سے یہ امر ثابت ہے کہ دنیا میں مٹی کا چھلکا بعد میں بنا ہے پہلے دنیا ایک گرم آگ کا کرّہ تھی۔سو ارتقاء کے لحاظ سے اگر طینی ابتدا سے پہلے انسان کی ابتدا ناری وجود سے تسلیم کی جائے تو مستبعد نہیں۔مگر یہ امور تخمینی ہیں۔ان کو یقین سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔اس لئے میں نے اس کے متعلق زیادہ نہیں لکھا۔

اس مضمون کا کچھ حصہ قصہ آدم اور شیطان سے بھی حل ہوگا۔اس کے لئے سورہ بقرہ میں قصہ آدم کا موقعہ دیکھنا چاہیے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ

اور (اے مخاطب اس وقت کو یاد کر) جب تیرے رب نے فرشتوں کو فرمایا تھا (کہ) میں یقیناً آواز دینے والی مٹی

مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ

یعنی سیاہ گارے سے جس کی ہیئت تبدیل ہو چکی ہو ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ پس جب میں اسے مکمل کر دوں

رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴿۳۰﴾

اور اس (کے دل) میں اپنا کچھ کلام ڈال دوں۔ تو تم سب اس کے ساتھ سجدہ کرتے ہوئے (اللہ کے حضور) گر جانا۔

حلّ لُغات۔ سَوَّیْتُهٗ سَوَّیْتُهٗ سَوّٰی سے متکلم کا صیغہ ہے اور سَوَّى الشَّیْءَ کے معنی ہیں۔ جَعَلَهٗ سَوِیًّا اس کو سوی یعنی بے عیب و بے نقص بنا دیا۔ غُلَامٌ سَوِیٌّ۔ اَیْ لَا دَاءَ بِهٖ وَلَا عَیْبَ۔ جب یہ لفظ انسان کے لئے بولا جائے۔ تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ جسمانی طور پر بھی اس میں کوئی نقص نہیں ہے اور اخلاقی لحاظ سے بھی اس میں نقص نہیں ہے۔ چنانچہ غلامٌ سویٌّ ایسے لڑکے پر بولتے ہیں جس میں اخلاق اور جسمانی کوئی نقص اور عیب نہ ہو۔ وَمِنْهُ رَزَقَكَ اللّٰهُ وَلَدًا سَوِیًّا۔ اور انہی معنوں میں یہ فقرہ بطور دعا کے کہا جاتا ہے۔ کہ تمہیں اللہ تعالیٰ بے عیب لڑکا عطا فرماوے (اقرب)

نَفَخْتُ نفخت نَفَخَ سے متکلم کا صیغہ ہے۔ اور نفخ (یَنْفُخُ نَفْخًا و نَفِیْخًا) بِفَمِهٖ کے معنے ہیں۔ اَخْرَجَ مِنْهُ الرِّیْحَ یعنے منہ سے ہوا نکالی۔ وَ نَفَخَ فِي النَّارِ و نَفَخَهَا آگ میں پھونک ماری یعنی لفظ نفخ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ نَفَخَ شِدْقَیْهِ تَکَبَّرَ۔ تکبر کیا (ہمارے ہاں بھی اردو میں کہتے ہیں کہ منہ پھلا لیا) اور جب نَفَخَ الشَّیْطَانُ فِیْ اَنْفِهٖ بولا جائے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ تَطَاوَلَ اِلٰى مَا لَیْسَ لَهٗ کہ وہ ایسی امید لگا بیٹھا جو پوری نہ ہوگی۔ یعنی ان چیزوں کے پیچھے پڑ گیا جو اس کو نہیں مل سکتیں۔ (اقرب)

الرُّوْحُ مَا بِهٖ حَیَاةُ الْاَنْفُس۔ وہ چیز جس کے ذریعہ نفوس زندہ رہتے ہیں۔ یعنی جس کو زندگی کہتے ہیں۔ الوحی الہام۔ جِبْرِیْل، جبرائیل۔ اَلنَّفْخُ پھونک۔ اَمْرُ النُّبُوَّةِ، امر نبوت۔ وَحُکْمُ اللّٰهِ وَاَمْرُهٗ۔ خدا تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کا حکم۔ تُطْلَقُ الْاَرْوَاحُ عَلٰى مَا یُقَابِلُ الْاَجْسَادَ جسم کے مقابل چیز کو بھی روح کہتے ہیں۔ (جو انسان میں جسم کے علاوہ موجود ہے) وَعِنْدَ اَصْحَابِ الْکِیْمِیَا عَلَى الْمِیَاهِ الْمُقَطَّرَةِ مِنَ الْاَدْوِیَةِ۔ کیمیا والوں

کے نزدیک دوائیوں کے عرق کو بھی روح کہتے ہیں۔(لیکن یہ فن کی ناواقفی کی وجہ سے لکھا ہے کیمسٹری والے عرق کو روح نہیں کہتے۔ بلکہ یا تو تیل والی ادویہ کا وہ حصہ جو عرق پر آجاتا ہے اسے روح کہتے ہیں جیسے روح گلاب یا پھر عرق کو بار بار کشید کر کے اس کی تیز خوشبو کو عرق سے الگ کر لینے پر اسے روح کہتے ہیں جیسے روح کیوڑہ) (اقرب)جبرائیل کو جو صاحب اقرب الموارد نے روح لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جبرائیل کو روح کہا گیا ہے اس لئے انہوں نے روح کے معنے جبرائیل قرار دے دیئے۔

جبرائیل کو روح کے نام سے پکارے جانے کی وجہ حالانکہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ بعض دفعہ مسبب کا نام سبب کو دے دیا جاتا ہے اور اسی لحاظ سے جبرائیل کو روح کہا گیا ہے۔کیونکہ وہ روح یعنی کلام الٰہی کو لاتا ہے۔غرض روح کے معنے جبریل نہیں بلکہ استعارۃً وحی لانے والے فرشتے کو کہتے ہیں۔اصل میں روح وہ چیز ہے جس کے ذریعہ کسی کو حیات ممتاز ملے۔پس وہ روح جو حیوان کو باقی چیزوں سے ممتاز کر رہی ہے۔اور وہ روح جس کے ساتھ انسان باقی حیوانوں سے ممتاز ہوتا ہے ان دونوں پر لفظ روح کا اطلاق ہوتا ہے۔یا وہ روح جو انسان کو باخدا بنا دیتی ہے پس کلام الٰہی بھی ایک روح ہے جو انسان کو نئی زندگی بخشتا ہے۔

سٰجِدِیْنَ اَلسُّجُوْدُ۔اَلتَّذَلُّلُ۔ سجود کے معنی تذلل اور ماتحتی کے ہیں۔(مفردات)وَقَوْلُهٗ اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ قِيْلَ اُمِرُوْا بِالتَّذَلُّلِ لَهٗ وَالْقِيَامِ بِمَصَالِحِهٖ وَمَصَالِحِ اَوْلَادِهٖ۔آیت اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ آدم کے ماتحت چلیں۔اور اس کی مدد کریں اور اس کی اولاد کے لئے ممدّ و معاون بنیں۔وَقَوْلُهٗ اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا اَیْ مُتَذَلِّلِیْنَ مُنْقَادِیْنَ۔اور قرآن کریم میں جو یہ آیا ہے کہ تم اس دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ۔اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ تم فرمانبرداری کرتے ہوئے جاؤ۔(مفردات)

تفسیر۔اس آیت میں ابتداء نسل انسان میں مکمل وجود کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے اس آیت میں ابتدائے نسل انسانی میں جو مکمل وجود پیدا ہوا تھا۔اس کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے کہ دیکھو! اسے بھی الہام ہوا۔اور اللہ تعالیٰ نے اس کے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے فرشتوں کو لگا دیا۔پس یہ سلسلہ الہام اور اس کی حفاظت کا ابتداء عالم سے چل رہا ہے۔

فرشتوں کو آدمؑ کی فرمانبرداری کے حکم سے مراد سب مخلوق کی فرمانبرداری ہے اس آیت میں ملائکہ کو سجدہ یعنی آدم کی فرمانبرداری کا جو حکم دیا گیا ہے۔اس سے مراد سب مخلوق ہے کیونکہ تمام اسباب کی علّت اولیٰ ملائکہ ہی ہیں۔ان کے حکم میں سب کو حکم مل گیا۔اس حکم کا یہ بھی مطلب ہے کہ اس دنیا میں آدم کو قدرت دی گئی ہے۔

اورسب مخلوق اس کے تابع کی گئی ہے۔پس فرشتوں کو جو علّتِ اولیٰ ہیں۔ چاہیے کہ انسان جو کام کرے اس کے مطابق نتائج نکالتے جائیں۔ گویا قانون قدرت کے ماتحت ہر انسانی فعل کا خواہ وہ برا ہی ہو۔نتیجہ نکالنے کا فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے اوراس حصہ میں سب انسانوں کے انہیں تابع کیا گیا ہے یہ تو عام قانون ہے۔لیکن جب انبیاء کے زمانہ میں تقدیر خاص جاری ہوتی ہے۔تو فرشتوں کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے آدم یعنی نبی وقت کی تائید کریں۔اوراس کے دشمنوں کو ناکام بنائیں۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۙ﴿۳۱﴾

جس پر سب کے سب فرشتوں نے (اس کی) کامل فرمانبرداری اختیار کرلی۔

اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾

سوائے ابلیس کے (کہ) اس نے (اس کی) کامل فرمانبرداری اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہونے سے انکار کردیا۔

حلّ لُغات ۔اِبْلِيْسَ ابلیس اَبْلَسَ مِنْ رَحْمَةِ اللهِ کے معنے ہیں ۔يَئِسَ۔ناامید ہوگیا ۔ اوراَبْلَسَ فِي أَمْرِهٖ کے معنی ہیں۔تَحَيَّرَ۔حیران ہوگیا۔وَقِيْلَ اِبْلِيْسُ مِنْ اَبْلَسَ بِمَعْنٰى يَئِسَ وَتَحَيَّرَ۔یعنی اَبْلَسَ کے معنی ناامیداورحیران ہونے کے ہیں۔اوراِبلیس اسی سے بنا ہے۔یعنی ناامیداورحیران۔اس نام سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ خداتعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہوگیا ہے۔اورحیران رہ گیا ہے۔جَمْعُهٗ اَبَالِيْسُ وَ اَبَالِسَةٌ۔اس کی جمع اَبَالِيْسُ اوراَبَالِسَةٌ آتی ہے۔(اقرب)

تفسیر ۔**اگر ملائکہ کوسجدہ کرنے کا حکم تھا تو ابلیس سے کیوں باز پرس کی گئی** یہاں سوال ہوتا ہے کہ فرمانبرداری کا حکم اگرصرف فرشتوں کو ہی تھا تو ابلیس سے سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے کیوں باز پرس کی گئی ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کسی بڑے افسر کوحکم ملا کرتا ہے تواس کا ماتحت بھی اس میں شامل ہوتا ہے یہاں پرفرشتوں کوطبعی نتائج نکالنے کا حکم دیا گیا ہے یا آدم کے مشن کوکامیاب کرنے کا۔اس لئے جوان سے ادنیٰ مخلوق ہے وہ خود بخود اس حکم میں آجاتی ہے۔جیسے بادشاہ ایک جرنیل کوحکم دیتا ہے کہ فلاں جگہ جاؤ۔تو سپاہی بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔سپاہی یہ کہہ کرانکارنہیں کرسکتے کہ ہمیں حکم نہیں دیا گیا۔

فرشتوں کے حکم میں ابلیس کا حکم بھی شامل ہے پھر دوسری جگہ صاف فرمادیا ہے کہ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ

اِذْ اَمَرْتُكَ (الاعراف:۱۳) تجھے باوجود میرے حکم کے آدم کو سجدہ کرنے سے کس بات نے روکا ہے۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ فرشتوں کے حکم میں ابلیس کا حکم بھی شامل تھا۔کیونکہ وہ بھی دوسری مخلوق کی طرح فرشتوں کے تابع ہے۔

آدم اور ابلیس کے واقعہ کا اصل مقام تو سورۂ بقرہ ہے اسے دیکھنا چاہیے۔مگر میں مختصراً ایک بات یہاں بھی بیان کر دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ یہ گفتگو جو اس جگہ بیان کی گئی ہے ضروری نہیں کہ اسی طرح ہوئی ہو۔

آدم اور ابلیس کے واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے مکالمہ کا رنگ دیا گیا ہے مذہبی محاورہ میں خصوصاً اور عربی زبان میں عموماً یہ طریق استعمال کیا جاتا ہے کہ کسی واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے اسے مکالمہ کا رنگ دے دیا جاتا ہے۔حالانکہ مکالمہ فی الحقیقت کوئی نہیں ہوا ہوتا۔

قال کے استعمال کی وسعت چنانچہ عربی زبان میں قال کا لفظ عام طور پر اس طرح استعمال ہوتا ہے مثلاً عرب کہتے ہیں۔اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ فَقَالَ قَطْنِيْ کہ جب حوض پانی سے بھر گیا۔تو اس نے کہا۔کہ بس بس اب زیادہ پانی نہ ڈالو۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ حوض زبان سے بولا۔بلکہ یہ کہ حوض نے زبانِ حال سے بتایا کہ میں بھر گیا ہوں (لسان العرب)۔قال کے سواء اور الفاظ بھی عربی میں استعمال ہوتے ہیں جن میں بظاہر ایک ارادی فعل کا اشارہ ہوتا ہے۔مگر مراد صرف صورت حال کا بیان کرنا ہوتا ہے۔مثلاً سورۂ کہف میں آتا ہے۔کہ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھی ایک گاؤں میں گئے۔فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ (الکہف:۷۸) انہوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔اب یہ امر ظاہر ہے کہ دیوار میں دماغ نہیں کہ وہ ارادہ کرے۔اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ دیوار کی حالت بتاتی تھی کہ وہ گر جائے۔امام ابو منصور ثعالبی جو لغت عرب کے امام ہیں۔اپنی کتاب فقه اللغة میں لکھتے ہیں کہ ابو فراس مشہور ادیب دل سے اسلام کا منکر تھا۔اور اس کا مشغلہ یہی تھا کہ قرآن کریم پر اعتراض کرتا رہے۔ایک دفعہ ابو العباس احمد بن حسین (جو خاندان عباسیہ کا ایک وزیر تھا) کے دربار میں ہم بیٹھے تھے اور وزیر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔اسی دوران میں ابو فراس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا کسی عرب نے کسی عقل نہ رکھنے والی چیز کے بارہ میں کبھی کہا ہے کہ اس نے ارادہ کیا۔میں نے کہا عرب بعض دفعہ غیر ذی روح کے متعلق کہتے ہیں۔اس نے یوں کہا جیسے مثال ہے۔اِمْتَلَأَ الحوضُ فقال قَطْنِي۔حالانکہ حوض تو بولتا ہی نہیں اس نے کہا۔میں قول کا ذکر نہیں کرتا۔وہ تو بیشک درست ہے۔مگر یہ بتاؤ عقل نہ رکھنے والی اشیاء کی نسبت کبھی ارادہ کا لفظ آتا ہے۔اس کی غرض یہ تھی کہ آیت يُرِيْدُ اَنْ يَنْقَضَّ غلط ثابت ہو۔اللہ تعالیٰ نے اس وقت میری مدد کی اور عرب کے شاعر الرّاعی کا شعر میرے ذہن میں آ گیا جو میں نے اس کے سامنے پڑھا۔اور وہ شعر یہ ہے۔

فِیْ مَھْمَهٍ فُلِقَتْ بِهٖ ھَامَاتُھَا
فَلْقَ الْفُئُوْسِ اِذَا اَرَدْنَ نُصُوْلًا

یعنے ایک جنگل میں جہاں اس قوم کی کھوپڑیاں توڑی گئیں جس طرح کلہاڑا جب چلنے کا ارادہ کرتا ہے۔ تو (لکڑیوں کو) کاٹتا جاتا ہے۔میں نے کہا۔اس جگہ کلہاڑے کی طرف چلنے کے ارادہ کو منسوب کیا گیا ہے۔کیا اس میں ارادہ ہوتا ہے۔یہ شعر پڑھنا تھا کہ ابی فراس کے منہ کو تالے لگ گئے اور خدا تعالیٰ نے اسے ذلیل کیا۔اسی طرح وہ ابومحمد یزیدی کا واقعہ لکھتے ہیں۔کہ میں اور مشہور نحوی کسائی عباس بن حسن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ان کا ایک نوکر آیا اور کہنے لگا۔کہ حضور فلاں شخص کے پاس سے آیا ہوں۔ھُوَیُرِیْدُ اَنْ یَمُوْتَ۔وہ مرنے کا ارادہ کررہا ہے اس پر ہم سب ہنس پڑے۔عباس بن حسن نے کہا کس بات پر ہنستے ہو۔ہم نے کہا کبھی کوئی انسان اپنی موت کا آپ بھی ارادہ کیا کرتا ہے۔انہوں نے کہا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔فَوَجَدَا فِیْھَا جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ۔ اس پر ہم سب شرمندہ ہوئے اور سمجھ گئے کہ اس غلام کی بات درست تھی۔

کسی امر کے اندازہ سے ظاہر ہونے کے لئے بھی قول کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے غرض کسی امر کا اندازہ سے ظاہر ہونا بھی قول اور ارادہ کہلاتا ہے۔اور واقعہ آدم اور ابلیس بھی اسی قسم کا ہے۔ان کی عملی حالتوں کو مکالمہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔اور ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ پرانے زمانہ کا ہے اور پرانے زمانہ میں مجاز و تشبیہ کو کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔اور تمثیل میں بات کرنا سمجھانے کے لئے زیادہ مؤثر سمجھا جاتا تھا۔چنانچہ آدم کا واقعہ مختلف کتب سابقہ میں اسی رنگ میں بیان ہوا ہے۔پس ان کو سمجھانے کے لئے قرآن کریم نے بھی عربی محاورہ کے مطابق اسی رنگ میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے تا کہ انہیں سمجھنے میں آسانی ہو۔تمثیلی کلام پہلی کتب میں اس قدر استعمال ہوا ہے کہ صفات الٰہیہ کو بھی تمثیلی رنگ میں ہی بیان کیا جاتا تھا۔مثلاً کہا جاتا تھا خدا تعالیٰ بڑا تیر انداز ہے۔وہ تیز رتھ میں بیٹھ کر ہر جگہ جا پہنچتا ہے۔وہ لوگوں کو سزا دے کر بڑا پچھتاتا ہے۔اس کے ہاتھ بھی ہیں اور پاؤں بھی (زبور باب آیت ۱۴۔باب ۱۸ آیت ۹،۱۰۔باب ۱۶ آیت ۱۱۔پیدائش باب ۹ آیت ۱۰،۱۱)۔یہ تمثیلات خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے تھیں۔مگر حقیقت کا اظہار ان سے مقصود نہ تھا بلکہ انسان چونکہ ابتدائی حالت میں تھا۔ان مثالوں سے حقیقت کو اس کے قریب کیا جاتا تھا۔قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس میں اس طریق کو بدلا گیا ہے۔اس میں بھی مجاز اور استعارہ اور تمثیل ہے۔لیکن کہیں کہیں صرف ایک ذوق پیدا کرنے کے لئے۔ورنہ اہم امور کو صاف اور واضح زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔اور اگر کوئی تمثیل ہے تو اسکے مضمون کو دوسری جگہ صاف عبارت میں بیان کر دیا جاتا ہے۔

تا لوگ دھوکہ نہ کھائیں۔

آدم کے واقعہ میں مکالمہ زبان حال میں بیان ہوا ہے نہ کہ فی الحقیقت غرض آدم کے واقعہ میں جو مکالمہ ہے وہ زبان حال میں بیان ہوا ہے۔نہ کہ فی الحقیقت کوئی گفتگو اللہ تعالیٰ اور ابلیس میں ہوئی۔

تورات اور ہندو لٹریچر میں خیر و شر کی قوتوں کا ذکر مکالمہ کے رنگ تورات اور ہندو لٹریچر میں بھی خیر اور شرّ کی قوتوں کا ذکر مکالمہ کی صورت میں کیا گیا ہے۔ہندوؤں میں ہریشچندر کا مشہور قصہ ہے۔اس میں بھی مکالمہ کی صورت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔تورات میں بھی خیر اور شرّ کی قوتوں کا مقابلہ مکالمہ کی صورت میں ایوب کی کتاب میں کیا گیا ہے۔چنانچہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں فرشتے اور شیطان حاضر ہوئے اور ایوب کی نیکی کا ذکر چل پڑا۔شیطان نے کہا کہ ایوب اس لئے نیک ہے کہ اسے سب کچھ ملا ہوا ہے۔اس پر اللہ تعالیٰ نے ایوب کی آزمائش کرنے کی اسے اجازت دی۔وغیرہ وغیرہ (ایوب باب ۱ آیت ۶ تا ۱۲) یہی وجہ ہے۔کہ تورات والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔کیونکہ آپؐ کے کلام میں تمثیلیں کم تھیں۔اور واضح عبارتوں میں مضمون بیان ہوئے تھے۔وہ غلطی سے اپنی کتب میں بیان شدہ مضامین کو حقیقت سمجھ رہے تھے۔جب اسلام نے اللہ تعالیٰ کی صفات اور ملائکہ کے وجود اور وحی اور نبوت کو صاف اور واضح عبارت میں بیان کیا۔تو وہ حیران ہو گئے اور سمجھے کہ یہ باتیں تورات کے خلاف ہیں اور سچائی سے دور ہیں۔

قرآن مجید نے باوجود تصویری زبان کے استعمال کرنے کے بہت سی غلط فہمیاں دور کر دی ہیں

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ باوجود اس کے کہ قرآن کریم نے اس موقعہ پر تصویری زبان کو استعمال کیا ہے۔پھر بھی اس نے بہت سی غلط فہمیاں جو پہلی کتب سے پیدا ہوتی تھیں مٹا دی ہیں۔اور جو دھوکہ تصویری زبان سے لگ سکتا تھا اس کا ازالہ کر دیا ہے۔مثلاً بائیبل میں تو یہ کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اصلی جنت میں رکھا اور اصل جنت کی علامت یہ ہے۔کہ اس میں گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا (پیدائش باب ۲ آیت ۱۵)۔لیکن باوجود اس کے بائبل کہتی ہے آدم نے گناہ کیا (پیدائش باب ۳ آیت ۱۷)۔لیکن قرآن کریم نے گو آدم کے مقام کا نام بعض جگہ جنت رکھا ہے۔مگر دوسری جگہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔(البقرة:۳۱) کہہ کر اس مجاز کی حقیقت بھی بیان کر دی ہے۔اسی طرح اور بہت سے مسائل آدم کے متعلق جو قصہ آدم میں بیان ہوئے ہیں وہ دوسری آیات کے ذریعہ سے یا انہی آیات کے بعض حصوں سے حل کر دیئے گئے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جب انسان کو خیر اور شر کی طاقت دی گئی۔تو دونوں قسم کے محرکات اس کے لئے ضروری

تھے اس لئے انسان کے پیدا ہونے سے پہلے یہ دونوں پیدا کئے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے ملائکہ کو حکم دیا۔ کہ جس قسم کے یہ کام کرے۔ اس کے نتائج پیدا ہوتے چلے جائیں۔ لیکن آدم اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ بھی دنیا میں مخلوق تھی۔ جو آدم کے نظام کے تابع نہ ہوئی تھی۔ ان کے سردار کو اللہ تعالیٰ نے حقیقی شیطان کا ظلّ ہونے کی وجہ سے شیطان اور ابلیس کے ناموں سے پکارا ہے۔ اور جو کچھ آدم اور اس کے درمیان ایک لمبے عرصہ میں گذرا اسے ایک مختصر مکالمہ کی صورت میں بیان کر دیا ہے۔

شیطان مجسم ہو کر لوگوں سے باتیں نہیں کرتا یاد رہے کہ وہ شیطان جو بطور محرک بدی کے پیدا کیا گیا ہے اور ایک غیر مرئی وجود ہے جس طرح ملائکہ ہیں وہ خود آ کر لوگوں سے باتیں نہیں کیا کرتا۔ نہ مجسم ہو کر انسانوں کو تکلیف دیتا ہے۔ جو لوگ شامت اعمال سے نیکی کا مقام کھو بیٹھتے ہیں وہ اس کے ظل ہو جاتے ہیں اور انہی کے کاموں کو شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

محرکات بدی شیطان کہلاتے ہیں ان کے علاوہ جو دوسرے محرکات بدی کے ہوتے ہیں۔ وہ بھی شیطان کہلاتے ہیں۔ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ میرا شیطان مسلمان ہو چکا ہے (مسند احمد جلد اول بروایت ابن عباس ص ۲۵۷) اس لئے وہ مجھے ہمیشہ نیکی کا حکم دیتا ہے۔

آنحضرتؐ کے شیطان کے مسلمان ہونے کا مطلب اس ارشاد سے مراد آپ کی یہی ہے۔ کہ جو اسباب لوگوں کو بدی کی تحریک کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔ وہ میرے کامل تقویٰ کی وجہ سے میرے لئے نیکی میں ترقی کرنے کا موجب ہو جاتے ہیں۔ ورنہ یہ مراد نہیں۔ کہ ہر آدمی کے لئے الگ الگ شیطان ہوتا ہے۔ اور آپ کا شیطان مسلمان ہو گیا تھا اگر ایسا تھا تو پھر آپ استعاذہ وغیرہ کیوں کرتے تھے؟ وہ اصلی شیطان تو اسی پہلی حالت میں موجود تھا۔ مگر خیالات اور جذبات میں جو حالات اس کی نیابت کرتے ہیں وہ آپؐ کے لئے مسلمان ہو گئے تھے۔ مگر انسانوں میں سے جو اس کی نیابت کرتے تھے وہ اپنی شیطنت پر قائم تھے۔ اور مسلمان نہ ہوئے تھے جیسے ابوجہل وغیرہ۔

فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ میں ہ کی ضمیر تمام انسانوں کی طرف جاتی ہے فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ۔ لَهٗ میں ہٗ کی ضمیر تمام انسانوں کی طرف جاتی ہے کیونکہ نفخ روح ہر انسان میں ہوتی ہے اور ملائکہ بھی ہر ایک کی مدد کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ صرف مدارج کے لحاظ سے نفخ روح کی قسم مختلف انسانوں کے لئے بدل جاتی ہے۔ پس مجملاً یہ حکم سب انسانوں کے لئے ہے اور خصوصاً اور تفصیلاً انبیاء علیہم السلام کے بارہ میں۔ چنانچہ اس کا ثبوت کہ یہ حکم سب

انسانوں کے لئے ہے یہ ہے۔ کہ سورہ جاثیہ ع ۲ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (جاثیہ: ۱۴) کہ اے انسانو! تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمت میں لگادی ہیں۔ قرآن مجید سے پتہ چلتاہے کہ کہ ہرشے کے لئے ملائکہ سبب اول ہیں۔ پس جب فرمایا کہ تمام چیزیں انسانوں کے فائدہ کے لئے مسخر کردی گئی ہیں۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ فرشتے تمام بنی نوع انسان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ہاں! بعض اشیاء انسان کی غلطی سے اس کے قبضہ سے نکل کر اس کو نقصان پہنچانے لگ جاتی ہیں۔ اور وہ گویا شیطان کی اظلال ہوتی ہیں اور فرشتوں کے حکم سے باہر ہوجاتی ہیں۔

اگر شیطان کوئی مرئی وجود تھا تو اب کیوں نظر نہیں آتا یہ خیال کہ اس غیر مرئی شیطان نے ظاہر ہوکر آدم کا مقابلہ کیا بالبداہت غلط ہے اور تجربہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا کہ وہ آدم اور اس کی بیوی کے پاس آیا۔ اور ان سے اس نے باتیں کیں (الاعراف: ۲۱۔ ۲۲)۔ اب اگر یہ وہی شیطان تھا۔ جو محرّک بدی ہے۔ تو جن آنکھوں سے اُسے آدم نے دیکھا تھا۔ اور جس زبان سے آدم نے اس سے باتیں کی تھیں۔ انہی آنکھوں اور اسی زبان سے اب آدم کی اولاد کیوں اسے نہیں دیکھتی۔ اور کیوں اس سے باتیں نہیں کرسکتی۔ اور کیوں وہ اب بھی لوگوں کے پاس آکر انہیں ورغلاتا نہیں؟ قرآن کریم سے ہرگز ثابت نہیں کہ آدم کا جسم اور قسم کا تھا۔ اور اس کی اولاد کا اور قسم کا ہے۔ کہ یہ سمجھا جائے کہ آدم تو اسے دیکھ سکتا تھا۔ اور باتیں کرسکتا تھا۔ مگر اس کی اولاد ایسا نہیں کرسکتی۔ اور جب ابناء آدم ویسی ہی طاقتیں رکھتے ہیں جس قسم کی آدم رکھتے تھے۔ اور شیطان بھی وہی ہے بدلا نہیں۔ تو یقیناً آج بھی ہزاروں آدمیوں کو وہ نظر آنا چاہیے تھا۔ اور ہر اک نیک آدمی کو اسے ظاہری جسم کے ساتھ ملنا چاہیے تھا۔ تاکہ آدم کی طرح اسے بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرے۔ مگر لاکھوں چھوڑ ہزاروں بھی آدمی نہیں ملتے جو اس امر کی گواہی دیں۔ بلکہ سینکڑوں بھی نہیں۔ بلکہ دسوں بھی نہیں بلکہ ایک بھی نہیں جو یہ کہتا ہو کہ کشف یا خواب کے سوا اس نے شیطان سے مل کر باتیں کی ہوں۔ سوائے قصے اور کہانیوں کے جو بے ثبوت ہیں۔

لیکن وہ شیطان جس کا میں نے ذکر کیا ہے اسی طرح ہر نبی کے راستہ میں مشکلات پیدا کرتا ہے۔ جس طرح اس نے آدم کے وقت میں کیا تھا۔ اور اسی طرح اباء اور استکبار کرتا ہے جس طرح آدم کے وقت میں اباء و استکبار کیا تھا۔ بلکہ ہر راستباز سے اس کا ویسا ہی سلوک ہوتا ہے۔

قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝۳۳

(اس پر خدا تعالیٰ نے) فرمایا (کہ) اے ابلیس تجھے کیا ہوا ہے کہ تو (اس کی) کامل فرمانبرداری اختیار کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝۳۴

اس نے کہا (کہ) میں ایسا نہیں کہ ایک ایسے بشر کی کامل فرمانبرداری اختیار کروں جسے تو نے آواز دینے والی مٹی سے یعنی ایسے سیاہ گارے سے جس کی ہیئت تبدیل ہو چکی تھی پیدا کیا ہے۔

تفسیر۔لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ بھی تمثیلی زبان میں کلام ہے مخالفین آدم کے سردار نے کہا کہ یہ تو ذلیل وجود ہے کہ اطاعت کو اچھا قرار دیتا ہے۔یہ اور اس کے اتباع تو نقال ہیں اور دوسروں کے پیچھے چلنے میں فخر محسوس کرتے ہیں لیکن میری طبیعت میں تو نے آزادی اور حریّت رکھی ہے۔میں اس کی بات کس طرح مان سکتا ہوں یہ بھی تمثیلی زبان میں کلام ہے۔مطلب یہ کہ آدم کے نظام کو اس کے بڑے دشمن اور اس کے اَتباع نے حریت ضمیر کے خلاف سمجھا۔اور اپنی ہتک قرار دیا۔اور اس کے ماننے سے انکار کیا۔اور اپنے رویہ کو آدم کے طریق سے بہتر قرار دیا۔اسی مضمون کو طینی اور ناری طبیعت کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝۳۵

فرمایا (اگر تیرا یہ خیال ہے) تو تُو اس (مقام) سے نکل جا۔کیونکہ تو یقیناً دھتکارا ہوا ہے۔

حل لغات۔رَجِيْم کے لئے دیکھو سورۂ حجر آیت نمبر ۱۸۔

تفسیر۔ فَاخْرُجْ مِنْهَا میں مِنْهَا سے مراد جنت نہیں مِنْهَا سے مراد مفسرین جنت لیتے ہیں (تفسیر البغوی و القرطبی، سورۃ الحجر زیر آیت ھذا) لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ جنت اس سے مراد ہے جو مرنے کے بعد ملنی ہے تو وہ ایسا مقام ہے کہ یہ اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔اور جو اس میں داخل ہو۔اس سے نکالا نہیں جاتا۔پھر شیطان کو کیونکر اس میں داخل ہونے دیا گیا۔اور آدم کو اس سے کیونکر نکالا گیا؟ اور اگر وہ جنت مراد نہیں۔

بلکہ کوئی ارضی جنت مراد ہے۔ تو پھر بھی یہ سوال ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے اسے وہاں سے نکال دیا تھا۔ تو وہ پھر واپس آدم کو ورغلانے کے لئے وہاں کس طرح آسکا۔

مِنۡهَا سے مراد رضاء الٰہی کا مقام ہے پس میرے نزدیک نہ صرف اُخروی جنت بلکہ کوئی دنیوی مقام بھی جو جنت کہلا سکے یہاں مراد نہیں۔ بلکہ جنت سے مراد وہ رضائے الٰہی کا مقام ہے۔ جو نبی کی بعثت سے پہلے لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ گو وہ غلطی پر ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ ان پر نبی کے ذریعہ سے حجت نہیں ہوئی ہوتی۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے وہ محروم نہیں ہوتے۔ مگر جب نبی مبعوث ہو جاتا ہے اور اس کا وہ انکار کر دیتے ہیں تو پھر افضال الٰہی کی جنت سے وہ محروم ہو جاتے ہیں۔

اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ سورۂ بقرہ اور بعض دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کو دھوکہ دینے کے بعد ابلیس اور اس کی ذریت کو آدم اور اس کی ذریت کے ساتھ ہی جنت سے نکالا گیا۔ پس معلوم ہوا کہ سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے شیطان کا جنت سے نکالا جانا کچھ اور معنے رکھتا ہے۔

وَّ اِنَّ عَلَيۡكَ اللَّعۡنَةَ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ ﴿۳۶﴾

اور جزا (وسزا) کے دن تک یقیناً تجھ پر (میری) لعنت رہے گی

حلّ لُغات۔ اللعنة اَللَّعۡنَةُ کے لئے دیکھو سورۂ رعد آیت نمبر ۲۶۔

یوم کے لئے دیکھو سورۃ یونس آیت نمبر ۴۔

ایّامٌ اَیَّامٌ یَوۡمٌ کی جمع ہے۔ اَلۡیَوۡمُ مِنۡ طُلُوۡعِ الۡفَجۡرِ اِلَی غُرُوۡبِ الشَّمۡسِ۔ دن کا وقت الوقت مطلقا۔ مطلق وقت جو بھی اور جتنا بھی ہو۔ (اقرب)

الدِّیۡنُ کے لئے دیکھو سورۃ یونس آیت نمبر ۲۳۔

الدِّیۡنُ اَلۡجَزَاءُ وَالۡمُکَافَاۃُ۔ بدلہ اَلطَّاعَۃُ اطاعت۔ اَلذُّلُّ۔ ذلت ماتحتی۔ اَلۡحِسَابُ۔ محاسبہ۔ اَلۡقَھۡرُ وَالۡغَلَبَۃُ وَالۡاِسۡتِعۡلَاءُ۔ کامل غلبہ۔ وَالسُّلۡطَانُ وَالۡمُلۡكُ وَالۡحُکۡمُ بادشاہت اور حکومت۔ اَلتَّدۡبِیۡرُ تدبیر۔ انتظام وَاِسۡمٌ لِجَمِیۡعِ مَا یُعۡبَدُ بِہِ اللّٰہُ۔ تمام وہ طریق جن سے کوئی قوم خدا تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے۔ اَلۡمِلَّۃُ مذہب و کیش۔ یعنی شریعت۔ اَلۡوَرَعُ۔ نیکی۔ اَلۡقَضَاءُ فیصلہ (اقرب) اس لفظ کے بعض معانی جو یہاں چسپاں نہ

ہوتے تھے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

تفسیر۔ لعنت سے مراد لعنت کے معنی دوری کے ہوتے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے مخالفوں کے سردار ہوتے ہیں۔ ان کے نام کو مٹا دیا جاتا ہے۔ اور انبیاء کے ذکر کو اجمالاً یا تفصیلاً قائم رکھا جاتا ہے اور چونکہ نبوت ایک زنجیر ہے ہر اگلا نبی اور اس کی جماعت پہلے نبی اور اس کی جماعت کے ساتھ ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ ہی انبیاء کے مخالفین کا ذکر بُرے طور پر ہوتا رہتا ہے اور گو نام لے کر ان پر لعنت نہ بھیجیں۔ مگر دل ان کے افعال سے اظہار نفرت کرتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ نبوت کا سلسلہ قیامت تک چلے گا۔ اس لئے فرمایا کہ یوم الدین تک تم پر لعنت ہوگی۔

آیت اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ میں عذاب الٰہی کا ذکر نہیں ورنہ عذاب الٰہی کا اس آیت میں ذکر نہیں۔ کیونکہ وہ تو پوری شدت سے یوم الدین کے بعد شروع ہوگا۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۷﴾

اس نے کہا (کہ) اے میرے رب (پھر) تو مجھے ان کے (دوبارہ) اُٹھائے جانے کے دن تک مہلت دے

حلّ لُغَات۔ اَنْظِرْنِيْ اَنْظِرْنِيْ اَنْظَرَ سے ہے اور اَنْظَرَهُ الدَّيْنَ کے معنے ہیں۔ اَخَّرَهٗ۔ قرضدار کو قرضہ ادا کرنے میں مہلت دی۔ (اقرب) پس اَنْظِرْنِيْ کے معنے ہوں گے مجھے مہلت دیجئے۔

يُبْعَثُوْنَ يُبْعَثُوْنَ بَعَثَ سے جمع مذکر غائب مجہول کا صیغہ ہے۔ اور بَعَثَهٗ (يَبْعَثُ بَعْثًا) کے معنے ہیں اَرْسَلَهٗ اس کو بھیجا۔ بَعَثَهٗ بَعْثًا اَثَارَهٗ وَهَيَّجَهٗ۔ اس کو اُٹھایا اور جوش دلایا۔ بَعَثَ اللّٰهُ الْمَوْتٰى۔ اَحْيَاهُمُ اللّٰہ نے مردوں کو زندہ کیا۔ بَعَثَهٗ عَلَى الشَّيْءِ حَمَلَهٗ عَلٰى فِعْلِهٖ۔ اس کو کسی کام کے کرنے پر اُکسایا۔ اَلْبَعْثُ۔ النَّشْرُ اُٹھانا۔ (اقرب)

تفسیر۔ آدم میں نفخ روح سے مراد نزول الہام ہے جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ان آیات میں آدم اور دوسرے انبیاء کا ذکر خصوصاً اور ابناء آدم کا عموماً ہے۔ اور آدم اور دوسرے انبیاء کے نفخ روح سے مراد نزول الہام ہے۔ اور بنو آدم کے نفخ روح سے مراد نفس ناطقہ کی تکمیل ہے۔ پس اس آیت میں جو يَوْمُ يُبْعَثُوْنَ آیا ہے اس کے معنے بھی دونوں گروہوں کو مدنظر رکھ کر مختلف ہیں۔ بنو آدم کو مدنظر رکھ کر تو اس کے معنے یہ ہیں کہ جب تک ان کی

بعثت روحانی نہ ہو۔اس وقت تک مجھے مہلت دے۔یعنے جب تک انسان اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں میں شامل ہوکر شیطانی حملوں سے محفوظ نہ ہوجائے اس وقت تک شیطان اوراس کی ذریت کوان کے ورغلانے کا موقعہ ملتا رہے یہ کلام بھی زبانِ حال کی قبیل سے ہے۔ورنہ یہ نہیں کہ شیطان نے یا اس کے اظلال نے واقع میں اللہ تعالیٰ سے لفظوں میں اس طرح کی مہلت طلب کی ہو۔

یوم بعث سے مراد روحانی بعث ہے اس امر کا ثبوت کہ یوم بعث سے مراد روحانی بعث ہے نہ کہ حشر اجساد یہ ہے کہ اس جگہ موت تک نہیں فرمایا۔ بلکہ یوم بعث تک فرمایا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حقیقی یوم البعث تک موقع ملنے کے کوئی معنے ہی نہیں۔کیونکہ مرنے کے بعد تو عالم امتحان ختم ہوجاتا ہے۔یہ تو کسی مذہب کا بھی عقیدہ نہیں کہ مرنے کے بعد بھی شیطان اور ملائکہ لوگوں کو نیکی کی طرف لاتے یا بدی کی تحریک کرتے ہیں۔پس اگر یوم بعث سے یہاں حشر اجساد مراد لیا جائے تو یہ آیت قرآنی تعلیم اور عقل سلیم کے مخالف ہوجاتی ہے۔پس ہر عقلمند یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ یہاں یوم بعث سے مراد روحانی بعث ہے اور مطلب یہ ہے کہ اسی وقت تک شیطان یا شیطانی لوگ کسی کو گمراہی کا سبق دے سکتے ہیں جب تک اس کا روحانی بعث نہ ہو یا دوسرے لفظوں میں نفس مطمئنہ نہ ملا ہو۔

روحانی بعث کے بعد شیطان مایوس ہوجاتا ہے جب نفس مطمئنہ مل جائے تو پھر شیطان اوراس کی ذریت اس بندے سے مایوس ہوجاتی ہے اور ورغلانے کے طریقہ کو چھوڑ کر اسے جسمانی دکھ دینا شروع کردیتی ہے۔

یوم بعث سے مراد انبیاء کی کامیابی کا زمانہ دوسرے معنوں کے رو سے یعنے آدم اوران کے حقیقی جانشین یعنے انبیاء کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ شیطان اوراس کے اَتباع کو اس وقت تک ان کے کاموں پر نکتہ چینی کا موقع ملتا ہے اوران کے کاموں میں روک پیدا کرنے کی طاقت ہوتی ہے جب تک ان کا یوم بعث نہیں آتا۔یعنی ان کی کامیابی کے لئے جو زمانہ مقدر ہے وہ نہیں آجاتا۔کامیابی کے زمانہ کے آنے تک شیطانی لوگ خوب ان پر حملے کرتے ہیں اورانہیں دکھ دیتے ہیں اور ان کے خلاف جھوٹے الزامات لگاتے ہیں یعنے استراق سمع اور مَنۡ خَطِفَ الۡخَطۡفَةَ کی بتائی ہوئی ڈھیل کے ماتحت ان کی تعلیم پر اعتراض کرتے اور جھوٹ بولتے ہیں۔لیکن جب ان کا یوم بعث آتا ہے یعنی انہیں غلبہ اوراقتدار ملنا شروع ہوجاتا ہے تو پھر شیطان جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔آدم کے زمانہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی حکمت شیاطین کو خوب شور مچانے اور طرح طرح کے مکر اور حیلے کرنے کی مہلت دیتی رہی ہے لیکن جب بھی یوم بعث آیا اور خدا تعالیٰ کی آواز نے اپنے نبیوں اوران کی جماعت کو آواز دی۔کہ اب تمہارا امتحان ختم ہوا اب

اُٹھو اور دنیا پر چھا جاؤ۔ اس وقت ان کے مخالف زبد یعنے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ بلکہ ان میں سے بہت ایمان لا کر ان کے حلقہ بگوش ہو گئے ان معنوں کے رو سے بھی شیطان کا مکالمہ مہلت کے متعلق ایک تصویری نقشہ ہے اور اس کے یہ معنے نہیں کہ نبیوں کے زمانے میں شیطان مہلت مانگتے ہیں اور ان کو خدا تعالیٰ مہلت دیتا ہے۔ بلکہ یہ معنے ہیں کہ شیطان دل سے خواہش کرتے ہیں کہ نبیوں پر حملہ کریں اور انہیں کچل دیں اور اللہ تعالیٰ ان کی اس خواہش کو پورا ہونے دیتا ہے۔ مگر یہ مہلت یوم بعث تک ملتی ہے۔ جب یوم بعث آتا ہے تو مہلت ختم ہو جاتی ہے اور سب اوندھے منہ گر جاتے ہیں۔ اور اپنی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۸﴾ اِلٰى يَوْمِ

فرمایا تو مہلت پانے والوں میں سے ہے (ہی)

الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۹﴾

معین وقت (کے آنے) کے دن تک

تفسیر ۔ یعنی بے شک تم کو مہلت ملے گی۔ مگر وقتِ معلوم تک۔ یعنی اس وقت تک کہ خدا تعالیٰ کی تقدیر نے نبیوں کی ترقی کو روکا ہوا ہوگا۔ جب ان کی ترقی کا زمانہ آئے گا تو یہ مہلت ختم ہو جائے گی اور اے شیطانو! (یعنی نبی کے بڑے دشمنو) خدا تعالیٰ کے قہری نشان تم کو بھسم کر دیں گے۔ یہ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ وہی ہے۔ جس کی نسبت اس سورۃ کے شروع میں آچکا ہے وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (الحجر: ۵) یعنی ہر بستی جس نے نبیوں کا مقابلہ کیا اور ہم نے اسے ہلاک کیا اسے پہلے ہی دن ہلاک نہیں بلکہ ہر نبی کے کام کے مطابق اس کی قوم کو ایک وقت تک مہلت دی۔ کسی کو تھوڑی کسی کو لمبی۔ کسی کو اس نبی کی حین حیات میں تباہ کیا جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور موسیٰ علیہ السلام سے ہوا۔ اور کسی دشمن قوم کو نبی کی وفات کے بعد ہلاک کیا۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں ہوا۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغۡوَيۡتَنِىۡ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَ

اس نے کہا (کہ) اے میرے رب چونکہ تو نے مجھے گمراہی والا ٹھہرایا ہے میں ضرور ہی ان کے لئے (تیری) ساری

لَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۴۰﴾

زمین میں (گمراہی کو) خوبصورت کر کے دکھاؤں گا اور ضرور ہی ان سب کو گمراہ کر دوں گا۔

حلّ لُغات۔ اَغۡوَيۡتَنِىۡ اَغۡوَيۡتَنِىۡ اَغۡوٰى سے مخاطب کا صیغہ ہے۔ اَغۡوَاہُ کے معنے ہیں اَضَلَّهٗ اُسے گمراہ قرار دیا یا گمراہ کیا۔ وَغَوٰى وَغَوِىَ الرَّجُلُ ضَلَّ گمراہ ہو گیا (اقرب) پس اَغۡوَيۡتَنِىۡ کے معنے ہوں گے تو نے مجھے گمراہ قرار دیا۔

تفسیر۔ یہ بھی زبانِ حال کا کلام ہے یعنی وہ لوگ جو ابتداء میں ایمان نہیں لاتے بعد میں اس غصہ سے کہ ہمیں شروع میں ایمان لانے کا موقع نہیں ملا۔ انبیاء کی جماعتوں کو تباہ کرنا چاہتے ہیں اور انہیں تکالیف دے کر مرتد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے کہ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ تِلۡكَ الۡقُرٰى نَقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا بِمَا كَذَّبُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِ الۡكٰفِرِيۡنَ (الاعراف:۱۰۲) یعنے اے محمدؐ! یہ وہ بستیاں ہیں جن کا حال ہم نے تجھے سنایا ہے۔ ان کے پاس ہمارے رسول دلائل لے کر آئے۔ مگر وہ ایمان لانے سے محروم رہے۔ صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے شروع میں ان کے دعویٰ کا انکار کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ جو انبیاء کا انکار کر دیتے ہیں۔

آئمۃ الکفر کے ایمان نہ لانے کی وجہ اس آیت میں بتایا ہے ائمۃ الکفر اس وجہ سے ایمان سے محروم رہ جاتے ہیں کہ شروع میں انکار کر بیٹھتے ہیں۔ پھر ایمان لانے میں اپنی ذلت محسوس کرتے ہیں اور مخالفت میں بڑھ جاتے ہیں اور اپنا غصہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر کے نکالتے ہیں۔

قرآن مجید کا انبیاء کے دشمنوں کی کوششوں کی طرف اشارہ اور اسی مضمون کی طرف اس سورۃ کے شروع میں بھی اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے۔ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡ كَانُوۡا مُسۡلِمِيۡنَ (الحجر:۳) یعنے بہت دفعہ کفار کے دل میں حسرت پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہم شروع میں ایمان لے آتے۔ اور ہماری عزت قائم رہتی مگر چونکہ انکار کر کے عزت کے مقام کو کھو چکے ہوتے ہیں۔ باوجود اس حسرت کے ایمان لانے سے گریز کرتے ہیں۔ اور ضد میں بڑھتے جاتے ہیں۔

لَاُغْوِيَنَّهُمْ میں وہی کوشش مراد ہے جو انبیاء کے دشمن کرتے چلے آئے ہیں اور یہ جو فرمایا لَاُغْوِيَنَّهُمْ میں ضرور انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ وہی کوشش ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں حضرت شعیب کے ذکر میں آیا ہے کہ ان کے دشمنوں نے کہا کہ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (الاعراف:۸۹) یعنی اے شعیب ہم تجھے بھی اور تیرے ساتھ ایمان لانے والوں کو بھی اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تم کو واپس ہمارے دین میں آنا پڑے گا۔ اور سورۂ ابراہیم میں فرمایا۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (ابراھیم:۱۴) گویا ہر ایک رسول کے دشمن یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ ہم کو ایمان نہیں ملا تو مومنوں کو بھی گمراہ کر کے چھوڑیں گے اور یہی وہ حالت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کی تھی۔ جس کی نسبت فرماتا ہے وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ (النساء:۴۵) یعنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن یہود چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو بھی مرتد کر دیں۔ اسی طرح کفار کی نسبت آتا ہے وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (البقرۃ:۲۱۸) یعنے کفار کا اگر بس چلے تو یہ اس وقت تک تم سے لڑتے رہیں گے کہ تم کو مرتد کر لیں۔ یعنے یہ تو تم کو اپنے جیسا بنانے کے لئے پورا زور لگائیں گے مگر ایک دن اللہ تعالیٰ ہی ان کے زور کو توڑ دے گا۔ اور یہ مغلوب ہو جائیں گے۔

لَاُغْوِيَنَّهُمْ کے ماتحت احمدیوں کی مخالفت یہی نظارہ آج کل احمدیوں کو دیکھنا پڑ رہا ہے۔ سب دنیا انہیں مرتد کرنا چاہتی ہے مگر جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ کفر بھی کیسا اندھا ہوتا ہے۔ بجائے اپنے پر ناراض ہونے کے کہ دین الٰہی کو کیوں چھوڑا۔ کافر خدا تعالیٰ پر ناراض ہوتا ہے کہ اس نے مجھے کیوں ایمان نہ بخشا۔ اس لئے میں اس کے مومن بندوں کو بھی مرتد کر کے چھوڑوں گا۔ العیاذ باللہ۔

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۱﴾

سوائے ان میں سے تیرے برگزیدہ بندوں کے (جو میرے فریب میں نہیں آسکتے)

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۲﴾

فرمایا (کہ) یہ (حفاظت الٰہی) میری طرف (آنے کی) سیدھی راہ ہے۔

تفسیر۔ آیت هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ کے دو معنی پہلے کہا تھا کہ جو بندے چنے ہوئے ہوتے

ہیں۔وہ شیطانی تصرف سے بچ جاتے ہیں۔اب اس کی تشریح کی کہ مخلص بندے کس طرح بنتے ہیں ۔اوراس کا طریق یہ بتایا کہ ھٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ یعنے اس راستہ کا بتانا میرے ذمہ ہے۔

ھٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ سے مراد الہام سے راستہ بتانا ہے میں الہام سے انہیں اپناراستہ بتاؤں گااور جب الہام سے میں انہیں اپناراستہ بتاؤں گااوروہ سیدھے میری طرف آئیں گےتو شیطان کی طرف جو خدا تعالیٰ سے دور پھینکا ہوا ہے وہ جا ہی نہیں سکتے۔ان معنوں کے رو سے صِرَاطٌ عَلَیَّ کے معنے ہوتے ہیں۔صَرَاطٌ بَیَانُہٗ عَلَیَّ یہ وہ راستہ ہے جس کا بیان کرنا میرا کام ہے۔یعنے مخلص بندے وہ نہیں جو اپنی عقلوں سے خدا کا رستہ دریافت کرنے کی کوشش کریں۔جو عقل پر انحصار کرتا ہے شیطان کے قبضہ میں جا تا ہے۔لیکن جسے میں خودراستہ بتاؤں وہ کسی صورت میں شیطان کے اثر کے نیچے نہیں آسکتا۔کیونکہ اس کا محافظ اورنگران میں ہوتا ہوں ۔اوروہ سیدھا بغیر ادھر ادھر بھٹکنے کے میری طرف آجا تا ہے۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ جو مخلص ہوں یعنے چنے ہوئے ہوں وہ تو فوراً ہی مجھ کو پا لیتے ہیں اوران کی بعد کی زندگی میری تلاش میں نہیں گزرتی اوروہ اس راستہ پر نہیں چل رہے ہوتے جو میری طرف آتا ہے کہ گمراہی کا خطرہ ہو۔اورشیطان انہیں میرے تک پہنچنے سے پہلے ہی اُچک لے جب وہ میرے الہام سے مجھ کو پالیتے ہیں تو ان کی بعد کی زندگی اس راستہ پر چلنے پر گزرتی ہے جو میرے اوپر سے گذرتا ہے یعنے میرا وصال تو وہ پہلے ہی پالیتے ہیں ان کی بقیہ زندگی ایک کے بعد دوسری صفات الٰہی کو حاصل کرنے میں لگی ہوئی ہوتی ہے۔ایسے اشخاص کے متعلق شیطان کی کیا مجال کہ ان کے قریب بھی آسکے۔اس میں یہ نکتہ بتایا کہ گمراہی کا خطرہ اسے ہوتا ہے جو ابھی تلاش میں ہو۔جسے خدامل گیا اور جو خدا کے ملنے کے بعد صرف زائد قرب کی تلاش میں لگا ہوا ہوتا ہے اسے گمراہ کرنا کسی شیطان کی طاقت میں نہیں ۔آنکھوں دیکھی بات اور تجربہ کردہ طریق کے بعد کوئی شخص منکر ہو ہی کس طرح سکتا ہے؟

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ

جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا ہرگز کوئی تسلط نہیں ہوگا۔سوائے ایسے افراد کے جو تیرے

مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۴۳﴾

پیچھے چلیں یعنی گمراہ ہوں۔

حل لغات ۔سُلْطٰن سُلْطٰنٌ کے معنی ہیں دلیل۔قبضہ ۔طاقت۔مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۂ ابراہیم آیت نمبر ۱۱۔

تفسیر ۔اس آیت میں دوسرے محفوظ گروہ کا ذکر کیا ہے۔جو نبوت کے مقام پر تو نہیں ہوتا۔یا براہ راست ایمان تو حاصل نہیں کرتا۔لیکن نبیوں کے طفیل یا دوسرے خدا رسیدوں کے طفیل صداقت کو پالیتا ہے ان کے متعلق فرمایا کہ ان کو بھی اس قدر حفاظت حاصل ہوتی ہے کہ شیطان کو ان پر تسلط حاصل نہیں ہوتا۔بیشک شیطان ان پر حملہ کرتا ہے لیکن اس کا حملہ بہت کمزور ہوتا ہے اور ان کو اس کے مقابلہ کی طاقت ہوتی ہے۔اس لئے وہ بھی بالعموم بچ جاتے ہیں۔ہاں!ان میں سے بعض جو ایمان کو پوری طرح حاصل نہیں کرتے اور ان کے ایمان کی بنیاد کامل یقین پر نہیں ہوتی بلکہ ابھی کمزوری ان میں باقی ہوتی ہے اور وہ کبھی کبھی شیطان کی پیروی کر لیتے ہیں۔یعنی گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں ان کے لئے خطرہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے حملہ کا شکار ہو جائیں اور شیطان کو ان پر تسلط حاصل ہو جائے مگر یہ تسلط بھی ان کی اپنی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے اور گناہوں کے ارتکاب کے بعد ہوتا ہے۔ورنہ شروع میں وہ بھی حفاظت الٰہی میں ہوتے ہیں۔

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسانی فطرت پاک ہے اور وہی گمراہ ہوتا ہے جو خود اس فطرت کو خراب کر کے شیطان کے پیچھے چل پڑے اسی کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں کہ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس:۱۱) وہی ہلاک ہوتا ہے جو اپنے نفس کو خراب کر دیتا ہے اور گناہ کی مٹی میں دفن کر دیتا ہے۔

وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۴﴾

اور یقیناً جہنم ان سب کے (لئے) وعدہ کی جگہ ہے۔

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۵﴾ ع ۳ / ۲

اس کے سات دروازے ہیں (اور اس کے) ہر دروازہ کے لئے ان میں سے ایک مقرر حصہ ہوگا۔

حل لغات ۔**جَهَنَّمَ** جَهَنَّمَ کے لئے دیکھو سورۂ رعد آیت نمبر ۱۹۔ دَارُ الْعِقَابِ بَعْدَ الْمَوْتِ (اقرب)

موعد مَوْعِدٌ کے معنی ہیں وعدہ۔ اقرار۔ وعدے کی جگہ (اقرب)

تفسیر ۔**دوزخ کے نگرانوں کی تعداد انیس بیان کرنے کا مطلب** قرآن کریم میں دوزخ کے نگرانوں کی تعداد انیس بیان فرمائی ہے (المدثر: ۳۱)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے نو حواس ہیں (گو عام طور پر پانچ مشہور ہیں لیکن درحقیقت سردی گرمی اور وقت اور وزن کا اندازہ کرنے والے حواس کو ملایا جائے تو نو حواس ہوتے ہیں) پس یہ تعداد ان حواس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہے۔ یعنی نو ظاہری حواس اور نو باطنی حواس اور ایک ان پر داروغہ۔ یہ کل انیس ہوئے۔ جب انسان اٹھارہ حواس اور ان کی نگران قوت ارادی سے کام نہیں لیتا۔ تو وہ گمراہ ہوجاتا ہے۔ پس اس نسبت سے اس پر دوزخ میں انیس پہرہ دار مقرر کئے جائیں گے۔ یہ بتانے کے لئے کہ تو نے انیس طاقتوں کو غلط استعمال کیا۔

دوزخ کے سات دروازے کہنے سے مراد اور یہ جو سات دروازے بتائے ہیں۔ ان سے مراد ضروری نہیں سات ہی دروازے ہوں۔ کیونکہ سات اور ستر کا ہندسہ عربوں میں تکمیل یا کثرت کے اظہار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے (مفردات امام راغب زیر مادہ سبح)۔ اس محاورہ کے رو سے دوزخ کے سات دروازے ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس کے کثرت سے دروازے ہوں گے اور تمام گناہوں کا خیال رکھا جائے گا۔

جہنم کے مختلف دروازے مختلف رنگوں کے لحاظ سے ہیں اور لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ جو فرمایا تو اس کے یہ معنے ہیں کہ جس قسم کے گناہ ہوں گے ویسے ہی دروازہ سے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ جنت کے متعلق بھی احادیث میں آتا ہے کہ مختلف نیکیوں کے الگ الگ دروازے ہوں گے اور ہر شخص اپنی مناسب حال نیکی کے راستہ

سے جنت میں داخل ہوگا (ترمذی ابواب المناقب باب مناقب ابو بکر صدیق ؓ)۔

آیت لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ سے سورۃ بقرۃ کی ایک آیت کا حل اس جگہ جُزْءٌ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس کے معنے انسانی جسم کے ٹکڑے کے نہیں بلکہ دوزخیوں کی جماعت کے مختلف گروہ مراد ہیں۔ اس آیت سے سورۂ بقرہ کی اس آیت کا حل ہوجاتا ہے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ چار پرندے لے لے اور پھر فرمایا کہ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا (البقرۃ:۲۶۱) پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک جزو کو رکھ دے اس جگہ مفسرین نے غلطی سے یہ معنے کئے ہیں کہ ان کو ٹکڑے کر کے ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دے (تفسیر بغوی زیر آیت رب ارنی کیف تحی الموتی)۔ حالانکہ چار پرندوں کے اجزاء سے وہی مراد ہے جو اس جگہ مراد ہے یعنے ان میں سے ایک ایک پرندہ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ؕ﴿۴۶﴾

متقی (لوگ) یقیناً باغوں اور چشموں (والے مقام) میں ہوں گے۔

حل لغات۔ اَلْجَنَّةُ الجنۃ کے لئے دیکھو سورۂ رعد آیت نمبر ۲۴۔

تفسیر۔ متقیوں کے جنات اور عیون میں ہونے کا مطلب عَیْن کے معنے چشمہ کے ہیں اور عُیُوْن میں ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ چشموں کے اندر پڑے ہوں گے بلکہ جنّٰت اور عیون کے اکٹھے ذکر سے یہ بتایا ہے کہ متقی ایسی جنت میں ہوں گے جو چشموں والی ہوگی۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ جہاں شیاطین کو کفر کرنے کی وجہ سے جہنم نصیب ہوگی۔ اس دنیا میں جلن حسرت اور پھر عذاب کی صورت میں اور آخرت میں عذاب النار کی صورت میں وہاں مومن خدا تعالیٰ کے سایہ کے نیچے ہوں گے اور علوم کے چشمے ان کے دلوں سے پھوٹ رہے ہوں گے جن کی وجہ سے فضل کا سایہ اور بڑھے گا۔ جس طرح درخت کو پانی ملتا رہے تو وہ بڑھتا رہتا ہے اور آخرت میں وہ جنّات وعیون نصیب ہوں گے جن کا وعدہ قرآن کی متعدد آیات میں دیا گیا ہے۔

اُدۡخُلُوۡهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیۡنَ ﴿۴۷﴾

(انہیں کہا جائے گا کہ) تم سلامتی کے ساتھ بے خوف (وخطر) ان میں داخل ہو جاؤ۔

حل لغات۔ بِسَلٰمٍ بِسَلٰمٍ کے لئے دیکھو سورۂ یونس آیت نمبر ۱۱ و ۲۶۔

سلام۔ سَلَامٌ سلام کے کئی معنی ہیں۔ اِسْمٌ مِنَ التَّسْلِیْمِ۔ باب تفعیل سے اسم مصدر ہے اور اس کے معنی سلامتی دینے کے ہیں۔ انقیاد یعنی فرمانبرداری۔ سلام خدا کا نام بھی ہے۔ کیونکہ وہ تمام عیبوں اور نقصوں سے پاک ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ **دارالسلام جنت کو بھی کہتے ہیں**۔ **اُدۡخُلُوۡهَا بِسَلٰمٍ ملائکہ کا قول معلوم ہوتا ہے** یہ ملائکہ کا قوم معلوم ہوتا ہے یعنی ملائکہ ان سے اس دنیا میں بھی کہتے ہیں اور اگلے جہان میں بھی کہیں گے کہ سلامتی اور امن سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ چونکہ یہ لوگ ملائکہ کی نیکی کی تحریکات کو قبول کرتے ہیں اس لئے ملائکہ کو ان سے محبت اور انس ہو جاتا ہے۔ اور وہ الٰہی فیصلوں کو جو مومنوں کے بارہ میں ہوتے ہیں۔ دوڑ دوڑ کر انہیں سناتے ہیں اور یہ جو فرمایا سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ اس میں دو سلامتیوں کو ذکر ہے۔ اندرونی اور بیرونی۔ کشمکش اور اضطراب سے نجات کی طرف سلام سے اشارہ کیا گیا ہے اور بیرونی تکالیف اور عذابوں سے نجات کی طرف آمنین سے اشارہ کیا گیا ہے۔

سَلَام کے لفظ سے اللہ کے ایک وعدے کی طرف اشارہ نیز سلام کے لفظ سے اللہ تعالیٰ کے ایک وعدہ کی طرف بھی اشارہ ہے جو ان الفاظ میں ہے۔ سَلٰمٌ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ (یٰس: ۵۹) یعنی خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لئے خاص سلام مقدر ہے۔ اس کی ہم تم کو خبر دیتے ہیں یہ فرشتوں کا کہنا ان کے مومنوں سے شدید تعلق پر دلالت کرتا ہے گویا وہ الٰہی فیصلوں کو ان تک جلد سے جلد پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی کا حکم نازل نہ ہو۔ انسان کو امن نصیب نہیں ہوتا۔ اور اس شیطانی قول کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہم مومنوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ سو فرمایا باوجود ان کی کوششوں کے تم میرے برکتوں والے گھر میں آ ہی پہنچے۔

وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ

اوران کے سینوں میں جو کینہ (وغیرہ) بھی ہوگا اسے ہم نکال دیں گے (وہ) بھائی بھائی بن کر (جنت میں رہیں گے

مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝۴۸

اور) تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے (بیٹھے) ہوں گے۔

حلّ لُغات۔ غِلٌّ غِلٌّ غَلَّ کا مصدر ہے اور غَلَّ صَدْرُهٗ غِلًّا کے معنے ہیں۔ کَانَ ذَاغِشٍّ اَوْ حِقْدٍ وَضِغْنٍ۔ سینہ میں کینہ حقد اور غصہ بھر گیا۔ اور اَلْغِلُّ کے معنے ہیں الغِشُّ وَالْحِقْدُ کینہ اور حقد (اقرب) پس نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ کے معنے ہوں گے کہ ہم ان کے دلوں سے کینہ وغیرہ نکال دیں گے۔

سُرُرٌ سُرُرٌ سَرِيْرٌ کی جمع ہے اور السَّرِيْرُ کے معنے ہیں التَّخْتُ تخت۔ وَيَغْلِبُ عَلٰى تَخْتِ الْمَلِكِ اور اکثر بادشاہ کے تخت پر بولا جاتا ہے یقَالُ ''زَالَ عَنْ سَرِيْرِهٖ اَیْ ذَهَبَ عِزُّهٗ وَنِعْمَتُهٗ'' اور جب زَالَ عَنْ سَرِيْرِهٖ کا محاورہ بولیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس کی عزت جاتی رہی۔ اَلْمُلْكُ بادشاہت اَلنِّعْمَةُ نعمت۔ خَفْضُ الْعَيْشِ۔ خوب مزے کی زندگی۔ (اقرب)

تفسیر۔ **دنیا میں جو مومن بھائی کا بغض دل سے نکال دے وہی جنتی بن سکتا ہے** ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن:۴۷) کہ مومن کو دو جنتیں ملتی ہیں ایک اسی دنیا میں اور دوسری اگلے جہان میں۔ اس جگہ پر جنت کی شرط یہ بتائی کہ وہاں دلوں میں غل نہ ہوگا۔ پس اس دنیا میں جو مومن بھائی کا بغض دل سے نکال دے وہی جنتی بن سکتا ہے۔

احمدیہ جماعت اور تمام مسلمانوں کو نصیحت اس سے ہماری جماعت اور تمام مسلمانوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے کہ کسی کا کینہ دل میں نہ رکھیں۔

عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ کہہ کر بھی ان کی باہمی محبت کا اظہار کیا ہے کیونکہ جب محبت ہوتی ہے تبھی ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھتے ہیں۔

عَلٰى سُرُرٍ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر شخص ہی وہاں بادشاہ ہوگا سُرُرٌ پر قرآن مجید نے بہت زور دیا ہے اور مختلف مواقع پر مختلف الفاظ میں یہ مضمون بیان ہوا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر شخص ہی وہاں بادشاہ ہو

گا۔دوسروں کی محکومی سے نجات مل جائے گی اور صرف خدا تعالیٰ کی بادشاہت ہوگی۔جس کا حکم بوجھ نہیں ہوتا بلکہ اس کی اطاعت قوت وشان کو بڑھانے والی اور حقیقی آزادی دینے والی ہوتی ہے۔قرآن مجید میں آتا ہے لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۤءُوْنَ (النحل:۳۲) جنت میں ان کی ہر ایک خواہش پوری کی جائے گی گویا اپنے اپنے دائرہ میں ہر اک کا قانون نافذ ہوگا۔اور یہی مفہوم بادشاہت کا ہے۔

لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۹﴾

نہ انہیں ان میں کوئی تکان ہوگی اور نہ انہیں ان سے کبھی نکالا جائے گا۔

حلّ لُغَات ۔نَصَبٌ نَصَبٌ نَصِبَ(يَنْصَبُ) کا مصدر ہے۔اورنَصِبَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں اَعْيَا۔تھک گیا (لازم) نَصِبَ فِي الْاَمْرِ۔جَدَّ وَاجْتَهَدَ۔کسی کام میں کوشش اور محنت کی (اقرب) پس النَّصَبُ کے معنے ہوں گے تکان۔

تفسیر ۔لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ سے یہ بتایا ہے کہ جنت میں بھی انسان کام کریں گے فرمایا ان کو جنت میں نہ کسی قسم کی تکان پہنچے گی اور نہ وہ اس سے نکالے جائیں گے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں بھی انسان کام کریں گے۔لیکن فرق یہ ہوگا کہ وہاں فنا نہ ہوگی۔کیونکہ تکان فنا کی علامت ہوتی ہے تکان کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ انسان کے جسم سے کچھ ذرات چربی یا اور کسی مفید جزو کے نکل گئے ہیں۔اور تکان کام چھوڑنے اور آرام کرنے کے لئے طبیعت کا اعلام ہوتا ہے یا غذا کھانے کے لئے۔میں نے ایک طب کی کتاب میں پڑھا ہے کہ ہاتھ کی ایک حرکت میں انسانی جسم کے کئی ملین سیل ضائع ہوجاتے ہیں۔پس کچھ مدت کام کرنے کے بعد جب تکان محسوس ہوتی ہے وہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ جسم سے کافی طاقت ضائع ہوچکی ہے اب اس نقصان کا ازالہ کرو۔

تھکان تحلیل جسم کا نتیجہ ہے جنت میں تحلیل جسم نہ ہوگی پس تکان فنا کی علامت ہے اور یہ کہہ کر کہ وہاں تکان نہ ہوگی یہ بتایا ہے کہ وہاں تحلیل جسم نہ ہوگی۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غذا جو بدل ما یتحلل کے طور پر ہوتی ہے وہاں اس کا کام یہ نہ ہوگا کہ فنا شدہ کو پھر قائم کرے بلکہ مزید طاقت دینا کام ہوگا گویا اس زندگی میں قدم پیچھے کسی طرح نہ ہٹے گا صرف آگے ہی بڑھنا ہوگا۔

چونکہ اس عارضی فنا کے نتیجہ میں جو تکان کی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہے انسان کو موت آتی ہے۔ کیونکہ آہستہ آہستہ جسم کی قوتیں ضائع ہوجاتی ہیں اور جنت میں اس قسم کے نقصان کی نفی فرمائی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ وہ وہاں سے نکالے نہ جائیں گے یعنی اب ان کے لئے کوئی موت نہیں۔

جنت کی نعماء انسانی دماغ نہیں سمجھ سکتا یاد رہے کہ جنت ایک روحانی مقام ہے اور گو تمثیلی زبان میں اس نعماء کو دنیا کی نعماء سے مشابہت دی گئی ہے۔ لیکن درحقیقت اس کی نعمتیں ایسی ہیں کہ انسانی دماغ انہیں سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اس آیت میں درحقیقت اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں تو انہیں شیطانوں سے جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ وہاں وہ اس جدوجہد سے بالکل بچ جائیں گے۔ اور ان کے دل ہر کوفت سے محفوظ ہوجائیں گے اور نہ عارضی طور پر شیطان ان کو نقصان پہنچا سکے گا نہ مستقل طور پر۔

جنت کام کرنے کی جگہ ہے نہ کہ عیش کا مقام اس آیت سے یہ بھی استدلال ہوتا ہے کہ جنت سست الوجودوں کی سرائے نہیں۔ بلکہ اس میں رہنے والے بھی کام کریں گے کیونکہ اگر کام نہ کرنا ہوتا تو تکان کی نفی کی کیا ضرورت تھی؟ پس جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جنت ایک کھانے پینے اور عیش کرنے کا مقام ہے وہ غلطی کرتے ہیں۔ جنت تو عبودیت کا اصل مقام ہے۔ جیسے فرمایا فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (الفجر: ۳۰، ۳۱) یعنے کامل عبودیت کا مقام جنت میں داخلہ کے وقت حاصل ہوگا اور عبد کام کیا کرتا ہے نہ کہ سست بیٹھتا ہے۔ پس اصل کام کا مقام تو جنت ہی ہے جہاں انسان کامل عبد ہوجائے گا۔ جنت کا سارا مزہ اس میں ہے کہ جذبات کی کشمکش سے آزاد ہو کر انسان اپنی عبادات میں لذت ہی لذت محسوس کرے گا اور جس کام میں لذت حاصل ہو اس میں تکان محسوس نہیں ہوتی۔

عام طور پر مسلمان جنت کا نقشہ پُور ہاؤس (مسکینوں کے رکھنے کی جگہ) کا سمجھتے ہیں۔ کہ کام کچھ نہ کریں گے کھانا مفت ملتا رہے گا اور کوئی وہاں سے باہر بھی نہ نکالے گا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۰﴾

(اے پیغمبر) میرے بندوں کو آگاہ کردے کہ میں بہت ہی بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہوں۔

تفسیر۔ غفور کے بعد صفت رحیم لانے کی وجہ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔ اس جگہ عِبَادِیْ کا لفظ عام معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور نیک اور بد سب بندے اس میں شامل ہیں۔ فرمایا ہے کہ میرے بندے نیک

ہوں یا بدان سب کو اطلاع دے دو کہ میں غفور ہوں۔ اور رحیم ہوں یعنی گناہ گاروں کو تسلی دو۔ گھبرائیں نہیں۔ اور اس خیال سے مایوس نہ ہوں۔ کہ بہت گناہ ہوئے اب کیا ہوسکتا ہے۔ میں غفور ہوں ان کے سب گناہ بخش سکتا ہوں۔ اور مومنوں سے کہہ دو کہ وہ نیکی کر کے بس نہ کر دیں۔ اور یہ خیال نہ کریں کہ جو کمال ہم نے حاصل کرنا تھا کرلیا۔ کیونکہ میں رحیم ہوں میں بار بار رحم کرنے والا ہوں۔ وہ جس قدر بھی نیکی میں ترقی کرتے جائیں گے میرا رحم اور بڑھتا جائے گا پس انہیں نیکیوں میں ترقی کرتے رہنا چاہیے۔

وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ﴿۵۱﴾

اور (یہ) کہ میرا عذاب ہی (حقیقتاً) دردناک عذاب (ہوتا) ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلْعَذَابُ العَذَابُ كُلُّ مَاشَقَّ عَلَى الْاِنْسَانِ وَمَنَعَهٗ عَنْ مُرَادِهٖ۔ عذاب کے معنی ہیں جو انسان پر شاق گذرے اور حصول مراد سے اسے روک دے وَفِي الْكُلِّيَّاتِ كُلُّ عَذَابٍ فِي الْقُرْآنِ فَهُوَ التَّعْذِيْبِ اِلَّا وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ فَاِنَّ الْمُرَادَ الضَّرْبُ۔ اور کلیات میں لکھا ہے کہ عذاب سے مراد قرآن مجید میں عذاب دینا ہوتا ہے سوائے آیت وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا کے۔ وہاں سزا مراد ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرمایا میرے عذاب کے مقابلہ میں کسی دوسرے کا عذاب۔ عذاب کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ کیونکہ اول تو وہ عارضی ہوتا ہے دوسرے اس سے بچنے کا ایک ذریعہ یعنے اللہ تعالیٰ کی ذات موجود ہے۔ لیکن جب عذاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے تو پھر کوئی پناہ باقی نہیں رہتی۔ اس صورت میں تو لَا مَلْجَاءَ وَلَا مَنْجَاَ مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ ہی کہنا پڑتا ہے۔

وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۲﴾

اور انہیں ابراہیم کے مہمانوں کے متعلق (بھی) آگاہ کر۔

تفسیر۔ حضرت لوطؑ کا ذکر حضرت ابراہیمؑ کے ذکر سے شروع کیا جاتا ہے اس جگہ دراصل حضرت لوطؑ کا ذکر شروع کرنا تھا۔ مگر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ہمیشہ حضرت ابراہیم کے ذکر سے ہی حضرت لوطؑ کا ذکر شروع کیا جاتا ہے۔ اتفاقی طور سے نہیں بلکہ یہ ذکر عمداً کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں تفصیلی طور پر

حضرت لوطؑ کا واقعہ آیا ہے وہاں حضرت ابرہیم کے ذکر سے ہی ان کا ذکر شروع کیا گیا ہے۔اور اس سے یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے ماتحت رسول تھے۔

حضرت لوط اور ابراہیمؑ کے واقعات کو بیان کرنے کا مقصد اس واقعہ کو آدم علیہ السلام کے واقعہ کے بعد اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ اہل مکہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی ذریت میں سے سمجھتے تھے۔اور حضرت لوط ان کے رشتہ دار تھے پس ایک طرف تو یہ بتایا کہ الہام الٰہی حضرت ابراہیم اور حضرت لوطؑ پر بھی نازل ہوا تھا۔اور تم ان کے حالات سے واقف ہو۔پھر آج الہام کے متعلق شبہات کیوں پیدا کرتے ہوں؟ دوسرے انہیں اپنے باپ دادوں کے واقعات سے یہ بتایا گیا کہ وحی الٰہی کا انکار انسان کو سزا کا مستحق بنا دیتا ہے۔اس طرز بیان سے ان لوگوں کا بھی رد ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں کوئی ترتیب نہیں۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ

جب وہ اس کے پاس آئے اور کہا (کہ ہم تمہارے لئے) سلامتی (کا پیغام لائے ہیں) اس نے کہا (کہ) ہم

وَجِلُوْنَ ﴿۵۳﴾

(تو) یقیناً تم سے ڈر رہے ہیں۔

حلّ لُغَات۔وَجِلُوْن وجلون وَجِلَ (یَوْجَلُ وَجَلًا) کے معنی ہیں۔خَافَ۔ڈر گیا۔وَفِیْ مُفْرَدَاتِ الرَّاغِبِ اِسْتَشْعَرَ الْخَوْفَ اور مفردات میں وَجِلَ کے معنی یہ کئے گئے ہیں کہ خوف کو محسوس کیا۔اس سے صفت مشبّہ الوَجِلُ ہے جس کے معنے ہیں اَلْخَائِفُ ڈرنے والا۔(اقرب) وَجِلُوْن اس کی جمع ہے۔

تفسیر۔**حضرت ابراہیمؑ کے مہمانوں کے چہروں پر رنج وغم کے آثار کی وجہ** معلوم ہوتا ہے ان کے چہروں پر رنج اور غم کے آثار تھے کیونکہ وہ ایک عذاب کی خبر لے کر آئے تھے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذہانت سے ان کے قلب کی حالت کو تاڑ لیا۔یا یہ کہ جیسا سورۂ ہود میں ذکر آچکا ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے لئے کھانا لائے انہوں نے کھانے سے انکار کیا۔اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اندازہ کیا کہ یہ لوگ کسی تکلیف دہ بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور شائد سمجھا کہ جو یہ خبر لائے ہیں۔وہ ان کے (یعنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے) لئے بھی تکلیف دہ ہوگی اس وجہ سے انہوں نے کہا کہ آپ لوگوں کا کھانا نہ کھانا تو دل میں ڈر

پیدا کرتا ہے کہ آپ لوگوں کا سفر کوئی خیر کا سفر نہیں۔اس سورۃ میں کھانا لانے اور ان کے انکار کرنے کے حصہ کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

مہمانوں کے کھانا نہ کھانے سے حضرت ابراہیمؑ کو ڈر محسوس ہوا یہ بھی معنے ہوسکتے ہیں چونکہ انہوں نے کھانا نہ کھایا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیال ہوا کہ شاید مہمانی میں کوتاہی ہوئی ہے اور فرمایا کہ میں تو آپ لوگوں سے ڈرتا ہوں کہ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔

قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۴﴾

انہوں نے کہا (کہ) تو خوف نہ کر ہم تجھے یقیناً ایک بہت علم (پانے) والے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں۔

تفسیر۔ حضرت ابراہیمؑ کو غلام علیم کی بشارت جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فکر انہوں نے دیکھی تو ایک خبر جو وہ حضرت ابراہیم کے بارہ میں لائے تھے۔انہیں سنائی اور کہا کہ ہمارے سفر کا تکلیف دہ حصہ آپ کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا بلکہ آپ کے لئے تو ہمیں ایک بشارت معلوم ہوئی ہے کہ آپ کے ہاں اولاد ہوگی اور ایک بیٹا پیدا ہوگا جو بہت علم والا ہوگا۔ یہ امر قابل تعجب نہیں کہ حضرت لوطؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی نسبت ان لوگوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو الہام ہوا ہو۔ کیونکہ کبھی مومن کے لئے دوسرے کو خبر دی جاتی ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ يَرَاهَا الْمُؤْمِنُ اَوْ تُرٰى لَهٗ (ترمذی ابواب الرؤیا، باب قولہ ولھم البشری فی الحیوۃ الدنیا) مومن کبھی خود بشارت پاتا ہے کبھی اس کے لئے دوسرے کو الہاماً خبر بتادی جاتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے مہمان اس ملک کے تھے جہاں انہوں نے ہجرت کی تھی میرے نزدیک چونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط ان علاقوں میں مہاجر تھے اور عراق کے علاقہ سے ہجرت کر کے آئے تھے چنانچہ بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم اُور جو کسدی قوم کے علاقہ میں تھا باشندے تھے (پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۷و۲۸ نیز باب ۱۲ آیت ۴) اور جیسا کہ قرآن کریم میں بھی لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم کو ان کی قوم نے دکھ دیا تو انہوں نے کہا اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّىْ (العنکبوت: ۲۷) میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرجاؤں گا چنانچہ وہ وہاں سے ہجرت کر کے کنعان کے ملک میں آبسے تھے۔جیسا کہ سورۂ انبیاء میں ہے کہ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء: ۷۲) یعنی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مخالفت ترقی کرگئی اور آگ تک میں ان کو ڈالا گیا

جسے اللہ تعالیٰ نے ٹھنڈا کر دیا تو ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور لوط کو اس ملک سے نجات دے کر اس زمین میں پہنچا دیا جو برکت والی ہے۔ اور قوموں کو اس جگہ برکت ملتی رہی ہے۔ یعنے کنعان کا علاقہ جسے اب فلسطین کہتے ہیں اور جس میں یوروشلم وغیرہ یہود کے مقدس مقامات ہیں (نیز دیکھو پیدائش باب ۱۲ آیت ۵) غرض حضرت لوط چونکہ اس علاقہ میں نئے تھے اللہ تعالیٰ نے یہ دیکھ کر کہ حضرت لوط کو اپنا گاؤں چھوڑنے پر تکلیف ہوگی۔ ان لوگوں کو جو معلوم ہوتا ہے اسی ملک کے تھے الہام کر کے روانہ کیا تا وہ آئندہ قیام کے متعلق انہیں مشورہ دیں اور تسلی دیں۔

حضرت لوط کی قوم کی تباہی کے ساتھ حضرت ابراہیم کو لڑکے کی بشارت دیئے جانے کی حکمت

یہ جو فرمایا کہ آپ کو غلامٌ علیم کی بشارت دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تسلی کے لئے خبر دی۔ کیونکہ وہ بہت نرم دل تھے۔ فرماتا ہے اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (التوبۃ: ۱۱۴) یعنے حضرت ابراہیم دوسروں کے دکھ کو بہت محسوس کرتے تھے۔

پس اللہ تعالیٰ نے ان کے نازک دل کی تسلی کے لئے ان لوگوں کو حکم دیا کہ ابراہیم کو ساتھ ہی لڑکے کی بشارت دیتے جانا جو علیم ہوگا۔ تا اس کے دل کو تسلی ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ ایک قوم کو تباہ کر رہا ہے تو ایک اور نیک قوم کی بنیاد بھی رکھ رہا ہے چونکہ سچا علم نبوت سے حاصل ہوتا ہے اس لئے علیم میں حضرت اسحاق کی نبوت کی بشارت بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اِنَّا نُبَشِّرُكَ کے الفاظ اس قدر زوردار ہیں کہ ان سے معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہدایت ملی تھی کہ چونکہ اس ہلاکت و تباہی کی خبر سے حضرت ابراہیم کو صدمہ ہوگا۔ اس لئے تم اس کے ساتھ ہی اس کو یہ بشارت بھی دینا۔

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ

اس نے کہا (کہ) کیا تم نے مجھے (اب فی الواقع) بشارت دی ہے باوجود اس کے کہ مجھ پر بڑھاپا آ چکا ہے پس

تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۵﴾

بتاؤ کہ کس بنا پر تم مجھے (یہ) بشارت دیتے ہو۔

تفسیر۔ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ میں خبر کی بناء کے متعلق سوال ہے حضرت ابراہیم نے کہا میں تو اب بہت بوڑھا ہو چکا ہوں پس یہ تمہاری خبر ضرور الہامی ہے اگر ایسا ہے تو مجھے بھی بتاؤ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ کے اس جگہ یہ معنی نہیں کہ تم مجھے کس امر کی بشارت دیتے ہو۔ بلکہ یہ ہیں کہ تم کس حق کی بناء پر یہ بشارت دیتے ہو۔ تمہاری اس خبر

کی بنیاد کیا ہے۔

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۶﴾

انہوں نے کہا (کہ) ہم نے تجھے سچی بشارت دی ہے پس تو ناامید مت ہو۔

حل لغات۔قَنَطَ قَنَطَ (يَقْنُطُ قُنُوْطًا) کے معنے ہیں۔يَئِسَ۔ناامید ہوگیا۔اس سے اسم فاعل قَانِطٌ آتا ہے یعنی ناامید ہونے والا۔(اقرب)

تفسیر۔انہوں نے کہا ہم نے بلاوجہ بشارت نہیں دی ہم انسان ہیں انسان ہونے کے لحاظ سے ہمارا کوئی حق نہیں کہ کوئی بشارت دے سکیں مگر یہ بشارت خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ہم اس کے دیئے ہوئے حق یا اسی کے مناسب موقعہ ارشاد کے ماتحت بشارت دیتے ہیں۔پس تو ناامید نہ ہو۔

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے مہمان بشر تھے نہ کہ فرشتے فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ بشر تھے۔اگر فرشتے ہوتے تو حضرت ابراہیم کو ان الفاظ میں خطاب نہ کرتے۔کیونکہ فرشتے تو حضرت ابراہیم کے مقام کو خوب جانتے تھے۔ہاں بشر کے لئے ممکن ہے کہ وہ ناواقفیت کی وجہ سے ایسا کہہ دے۔

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۷﴾

اس نے کہا (کہ میں کیونکر ناامید ہوسکتا ہوں) اور گمراہوں کے سوا اپنے رب کی رحمت سے کون ناامید ہوتا ہے

تفسیر۔حضرت ابراہیمؑ نے ان کا یہ فقرہ سن کر کہ تو ناامید مت ہو۔نہایت زوردار الفاظ میں کہا کہ کیا تم مجھے ایسا کمزور ایمان والا سمجھتے ہو خدا کی رحمت سے سوائے گمراہوں کے اور کون ناامید ہوسکتا ہے؟ مگر میں تو اللہ تعالیٰ پر ایمان کامل رکھتا ہوں میرے سوال کی غرض تو یہ تھی کہ تمہارا مجھے یہ بشارت دینا صرف ایک انسان ڈھکونسلا (جیسے بعض نجومی وغیرہ کہہ دیتے ہیں) یا خدا تعالیٰ کی طرف سے تم کو خبر ملی ہے۔جب تم نے یہ بتا دیا کہ تم خدا تعالیٰ کی طرف سے خبر پا کر ایسا کہہ رہے ہو تو مجھے تمہاری بشارت میں کوئی شک نہیں رہا۔

لَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ کی غیرت ایمانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

غیرت ایمانی کو دیکھو کہ مایوسی کا لفظ سن کر فوراً جواب دینے کو تیار ہو گئے اور برداشت نہ کر سکے۔ایک طرف ان کی مہمان نوازی اور مہمانوں کی خاطر داری کو دیکھو کہ فوراً گائے ذبح کر کے ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔اور جب وہ نہیں کھاتے تو ان کے دل میں گھبراہٹ پیدا ہو جاتی ہے کہ مبادا وہ ناراض ہی نہ ہو گئے ہوں۔اور مجھ سے کوئی کوتاہی ان کی خدمت میں نہ ہوگئی ہو۔لیکن دوسری طرف جب وہی معزز مہمان فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ کہتے ہیں تو نہایت جوش اور غیرت سے بول اٹھتے ہیں کہ مومن کبھی خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتا۔یہ انبیاء کی غیرت ایمانی کا مقام ہے ہر مومن کو دین کے معاملہ میں ایسی ہی غیرت اپنے دل میں پیدا کرنی چاہیے۔حضرت ابراہیمؑ کی جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو کہتا کہ کیا کروں بوڑھا ہوں میرے قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں۔اس لئے یقین نہیں آتا مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ جب تک بندوں کی طرف سے خبر ہو میں اسے قابل تحقیق سمجھتا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہو تو باوجود مضمحل قویٰ کے میں اس پر پورا یقین رکھتا ہوں۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۸﴾

(پھر) کہا (کہ اچھا) تو اے (خدا کے) فرستادو (وہ) تمہارا اہم کام کیا ہے (جو تمہارا اصل مقصد ہے)۔

حلّ لُغَات۔اَلخَطْبُ اَلْخَطْبُ الشَّانُ۔شان۔وَالْاَمْرُ صَغُرَ اَوْ عَظُمَ۔ہر اہم امر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔وَمِنْهُ هٰذَا خَطْبٌ يَسِيْرٌ وَخَطْبٌ جَلِيْلٌ اور خَطْبٌ يَسِيْرٌ اور خَطْبٌ جَلِيْلٌ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے یہ اصلی کام چھوٹا ہے اور یہ بڑا۔سَبَبُ الْاَمْرِ۔کسی امر کا سبب وَقِيْلَ الْخَطْبُ اِسْمٌ لِلْاَمْرِ الْمَكْرُوْهِ دُوْنَ الْمَحْبُوْبِ اور بعض محققین لغت کہتے ہیں کہ ناپسندیدہ امر کے لئے بطور اسم کے بولا جاتا ہے۔وَقِيْلَ هُوَ الْمَكْرُوْهُ وَالْمَحْبُوْبُ جَمِيْعًا اور بعض کہتے ہیں کہ ناپسندیدہ امر اور پسندیدہ دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔(اقرب)

تفسیر۔جب یہ معاملہ صاف ہو گیا کہ انہیں نہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمانی میں کوئی کمی نظر آئی تھی اور نہ کوئی بری خبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے لائے تھے۔تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً سمجھ لیا کہ ان کے آنے کی اصل غرض کچھ اور ہے۔کیونکہ مجھے بیٹے کی بشارت دینے کے لئے آتے تو ایسے غمزدہ کیوں ہوتے؟ پس معلوم ہوتا ہے ان کا پیغام کسی اور شخص کے لئے بھی ہے اور وہی اصل پیغام ہے اور ہے بھی غم کا۔تبھی یہ کھانا نہیں کھا سکے۔

حضرت ابراہیم کا مہمانوں کے کھانا نہ کھانے سے استدلال پس وہ ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہارا خطب کیا ہے۔ یعنی وہ امر مہم کیا ہے (خطب بڑے اہم امر کو بھی کہتے ہیں اور جو اصلی کام ہو بڑا ہو یا چھوٹا اسے بھی۔ اس جگہ اصل اور اہم کام مراد ہے) جس کے لئے تم آئے ہو تمہارے دل پر جو بوجھ ہے اس سے ظاہر ہے کہ اصل کام مجھے بیٹے کی بشارت دینا نہیں اصل کام کوئی اور ہے۔ جو غم پیدا کرنے والا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ استدلال صاف بتاتا ہے کہ وہ انہیں انسان سمجھتے تھے تبھی تو باوجود ان کے بشارت دے دینے کے انہوں نے ان کے کھانا نہ کھانے کے فعل کو بلاوجہ قرار نہیں دیا۔ اور استدلال کیا کہ یہ ضرور کسی اور تکلیف دہ امر کے لئے سفر کر رہے ہیں اگر وہ اس بشارت کی وجہ سے ان کو فرشتہ خیال کر لیتے تو کھانا نہ کھانے کا سوال بھی ان کے لئے حل ہو جاتا۔ وہ اگلا سوال ان سے کیونکر کر سکتے تھے۔ کہ پھر تمہارا اصل مشن کیا ہے؟ یہ امر کہ ان کا کوئی اور مشن بھی ہے صرف کھانا نہ کھانے سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اسی وقت سمجھا جا سکتا تھا جبکہ انہیں انسان سمجھا جاتا۔ ابراہیم نے کہا کہ تمہارے دل پر کسی امر کا بوجھ ہے جس کی وجہ سے تم کھانا وغیرہ نہیں کھا سکتے۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۙ﴿۵۹﴾

انہوں نے کہا (کہ) ہمیں یقیناً ایک مجرم قوم کی طرف (ان کی ہلاکت کے لئے) بھیجا گیا ہے۔

تفسیر۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تا کہ ان کے عذاب کی خبر دیں اس لئے ہمارے دل پر بوجھ ہے۔

اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ﴿۶۰﴾

سوائے لوط کے پیرؤوں کے (کہ) ان سب کو ہم یقیناً بچا لیں گے۔

تفسیر۔ **لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ کے ساتھ نجات پانے والی ایک جماعت تھی** ہاں لوط کا خاندان مستثنیٰ ہے اس فقرہ سے انہوں نے قوم بھی ظاہر کر دی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پھر تسلی دے دی تا حضرت لوط کی وجہ سے غمگین نہ ہوں اور یہ جو فرمایا ہم ان سب کو نجات دیں گے یہ میرے نزدیک اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت لوط کی آئندہ رہائش کے انتظام کے لئے

بھیجا تھا۔

بائبل اور قرآن مجید میں اختلاف لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت لوط کے ساتھ نجات پانے والے لوگ قرآن مجید کے نزدیک ایک جماعت تھے بائبل نے صرف ان کی دو لڑکیوں کے بچنے کا ذکر کیا ہے (پیدائش باب ۱۹ آیت ۳۰) حالانکہ آل لوط اگر دو لڑکیوں پر مشتمل تھے تو اجمعین کا لفظ ان کے لئے نہیں بولا جا سکتا۔

اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ؏ ۶۱

ع ۴

اس کی بیوی کے سوا (کہ) ہمارا اندازہ ہے کہ وہ یقیناً پیچھے رہنے (اور ہلاک ہونے) والوں میں سے ہوگی۔

حلّ لُغات۔ قَدَّرْنَا قدرنا قَدَّرَ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنے فیصلہ کرنے کے ہوتے ہیں اور جب کسی انسان کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی اندازہ اور قیاس کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ مفردات میں لکھا ہے اَلتَّقْدِيْرُ تَبْيِيْنُ كَمِيَّةِ الشَّيْءِ۔ تقدیر کے معنی ہیں کسی چیز کی کمیت کو واضح کرنا اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہوں گے تَقْدِيْرُ اللّٰهِ بِالْحُكْمِ مِنْهُ اَنْ يَّكُوْنَ كَذَا اَوْلَا يَكُوْنَ كَذَا کہ اللہ تعالیٰ کا کسی معاملہ کے متعلق فیصلہ کرنا کہ وہ اس طرح ہو یا اس طرح نہ ہو اور جب کسی انسان کے لئے یہ لفظ استعمال ہو تو معنے ہوں گے اَلتَّفَكُّرُ فِي الْاَمْرِ بِحَسَبِ نَظَرِ الْعَقْلِ وَبِنَاءُ الْاَمْرِ عَلَيْهِ کہ کسی معاملہ میں عقل کے ساتھ غور و فکر کر کے اس کا اندازہ لگایا جائے اور اس پر کسی کام کی بناء رکھی جاوے۔ (مفردات)

الغَابِرُ الغَابِرُ الْبَاقِيْ۔ غابر کے معنی ہیں باقی رہنے والا۔ اس کی جمع غُبَّرٌ اور غَابِرُوْنَ آتی ہے۔ وَمِنْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ۔ اَیْ مِنَ الَّذِيْنَ بَقَوْا فِيْ دِيَارِهِمْ فَهَلَكُوْا اور آیت اِمْرَاَتُهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ۔ میں لفظ غابر باقی رہنے والے کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔ یعنی ان کی بیوی ان لوگوں میں سے تھی جو شہر میں پیچھے رہ گئے تھے۔ (اقرب)

تفسیر۔ **قَدَّرْنَا کے الفاظ کہنے سے مراد ''اندازہ'' کرنا ہے** یعنے آل لوط میں سے ان کی بیوی چونکہ خود پیچھے رہ جائے گی اس لئے وہ نہ بچائی جائے گی یہ لوگ قَدَّرْنَآ کا لفظ استعمال کرتے ہیں جس کے معنے مقرر کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے بعض لوگوں نے اس سے استدلال کیا ہے۔ کہ وہ فرشتے تھے ورنہ قَدَّرْنَا کیونکر کہتے؟ لیکن یہ درست نہیں۔ کیونکہ اگر وہ فرشتے بھی ہوتے تو بھی قدرنا کیونکر کہہ سکتے تھے۔ تقدیر تو

اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے نہ کہ فرشتوں کے۔ پس قدّرنا کے اس جگہ یہ معنے نہیں کہ ہم نے ایسا فیصلہ کیا ہے بلکہ اس کے معنی اس جگہ اندازہ لگانے کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یا ان میں سے کسی ایک کو خواب یا الہام میں جو خبر دی گئی تھی اس میں بیوی کے متعلق گو وضاحت نہ تھی مگر استدلال یہی ہوتا تھا کہ وہ نہ بچے گی۔ پس انہوں نے اللہ تعالیٰ کے الہام کا ادب کرتے ہوئے اس پر زیادہ زور نہ دیا اور اسی قدر کہا کہ ہمارا اندازہ الہام الٰہی سے یہی ہے کہ وہ نہ بچے گی۔ یا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تسلی کے لئے اس مضمون پر زیادہ زور نہ دیا اور یہ جھوٹ نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے مقرر کردہ عذابوں کو بدل بھی دیتا ہے۔ ممکن ہے ان کے دل میں خیال ہو کہ شائد حضرت لوط کی دعا سے بیوی کا یہ عذاب ٹل جائے۔ پس انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہی الفاظ میں خبر دینی مناسب سمجھی کہ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ وہ حضرت لوط کے ساتھ نہ جائے گی۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اپنی طرف بھی منسوب فرمایا ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ۔ (النمل:۵۸) اب یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ ادھر خدا تعالیٰ کہے کہ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا اور ادھر وہ رسول یا فرشتے جو کچھ بھی چاہو انہیں کہہ لو۔ وہ کہیں کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اور انسان کے لئے قدّر کے لفظ کے استعمال میں فرق پس حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ لغت میں ہے۔ جب خدا تعالیٰ کی نسبت یہ لفظ آتا ہے وہاں فیصلہ کرنے کے معنے ہوتے ہیں اور جب انسانوں کی نسبت آتا ہے وہاں اندازہ یا قیاس کرنے کے معنے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے قول میں اس کے معنے اندازہ یا تخمین سے بات کرنے کے ہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کو بچانے کے متعلق قرآن مجید اور بائیبل کا اختلاف بائبل کے بیان اور قرآن کریم کے بیان میں یہاں بھی اختلاف ہے بائبل میں لکھا ہے ’’جب صبح ہوئی فرشتوں نے لوط سے تاکید کر کے کہا کہ اُٹھ اپنی جورو اور اپنی دو بیٹیاں جو یہاں موجود ہیں لے‘‘ (پیدائش باب ۱۹ آیت ۱۵) اور پھر آیت ۱۶ میں بیان ہے کہ حضرت لوط نے کچھ دیر کی تو انہوں نے ’’اس کا اور اس کی جورو کا اور اس کی دونوں بیٹیوں کا ہاتھ پکڑا کیونکہ خداوند کی مہربانی اس پر ہوئی۔ اور اسے نکال کر شہر سے باہر پہنچا دیا۔‘‘ لیکن قرآن کریم فرماتا ہے کہ حضرت لوط کو پہلے ہی خبر دے دی گئی تھی کہ وہ ساتھ نہ جائے گی بلکہ پیچھے رہ جائے گی۔

قرآن مجید میں حضرت لوط کی بیوی کے پیچھے رہنے کا ذکر چنانچہ فرماتا ہے جب رسول حضرت لوط کے پاس آئے تو انہوں نے حضرت لوط سے کہا۔ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَ اَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ (العنکبوت:۳۴) یعنے ہم تجھے اور تیرے اہل کو تو یہاں سے بچا کر لے جائیں گے مگر تیری بیوی کو نہیں وہ پیچھے رہنے والے گروہ میں ہوگی۔

اب ہر عقل مند خود سمجھ سکتا ہے کہ کون سا بیان عقل کے مطابق ہے۔ کیا قرآن کریم کا جو کہتا ہے کہ وہ پیچھے ہی رہ گئی تھی یا بائبل کا جو کہتی ہے کہ فرشتوں نے پکڑ کر ان کی بیوی کو شہر سے باہر نکالا؟ سوال یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اس عورت نے تباہ ہونا ہے تو اسے پکڑ کر باہر نکالنے کے معنے کیا تھے؟ جس کے متعلق تباہی کا فیصلہ تھا اسے فرشتوں نے نکالا کیوں۔ کوئی آدمی باہر نکالتا تو کہہ سکتے تھے کہ اسے علم نہ تھا۔ لیکن فرشتے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے خبر لے کر آئے تھے باوجود اس علم کے کہ اس عورت نے تباہ ہونا ہے اسے کیوں باہر نکالنے لگے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِ الْمُرْسَلُوْنَ ۙ﴿۶۲﴾

پھر جب وہ (ہمارے) بھیجے ہوئے (لوگ) لوط (اور اس) کے اتباع کے پاس آئے

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۳﴾

تو اس نے (انہیں) کہا (کہ) آپ (اس علاقہ میں) اجنبی (معلوم ہوتے) ہیں۔

حلّ لُغَات۔ مُنْكَرُوْن مُنْكَرُوْنَ اَنْكَرَ سے اسم مفعول مُنْكَرٌ بنتا ہے اور مُنْكَرُوْنَ اس کی جمع ہے۔ اَنْكَرَهُ کے معنی ہیں جَهِلَهٗ اس کو نہ پہچانا۔ اَنْكَرَ حَقَّهٗ کے معنی ہیں۔ جَحَدَهٗ اس کے حق کا جان بوجھ کر انکار کر دیا۔ اَنْكَرَ عَلَيْهِ فِعْلَهٗ: عَابَهٗ وَنَهَاهُ اس کے فعل کو معیوب قرار دیا اور اس سے اُسے روکا۔ الْمُنْكَرُ کے معنی ہیں مَا لَيْسَ فِيْهِ رِضَى اللّٰهِ مِنْ قَوْلٍ اَوْ فِعْلٍ وَالْمَعْرُوْفُ ضِدُّهٗ۔ منکر وہ فعل یا قول ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو اور لفظ معروف (پسندیدہ) اس کے مخالف معنے ادا کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ (اقرب) پس اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ کے ایک معنی ہوئے کہ آپ اس علاقہ میں انجان یا اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

تفسیر۔ مرسلون کے لفظ سے بھیجے ہوؤں کا انسان ہونا ثابت ہوتا ہے قرآن کریم انہیں پھر مُرْسَلُوْن کہہ کر ان کے انسان ہونے کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔ بائبل کا عجیب حال ہے کہ کبھی انہیں مرد کہا ہے (پیدائش باب ۱۸ آیت ۲، ۱۶) اور کبھی فرشتے (پیدائش باب ۱۹ آیت ۱) اور باوجود فرشتہ کہنے کے لکھا ہے کہ حضرت لوط نے ان کے لئے فطیری روٹی پکائی اور انہوں نے کھائی (پیدائش باب ۱۹ آیت ۳) فرشتوں کا فطیری روٹی کھانا ایک عجوبہ ہے اور اس پر دلالت کرتا ہے کہ تورات میں بعد میں بہت کچھ رطب و یابس شامل کر دیا گیا ہے۔

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۴﴾

انہوں نے کہا (کہ ایسا) نہیں بلکہ ہم (تو) تمہارے پاس (ہی) آئے ہیں (اور) وہ چیز لے کر (آئے ہیں) جسکے متعلق یہ (لوگ) شک کرتے رہے ہیں۔

حلّ لُغات۔ یَمْتَرُوْنَ یَمْتَرُوْنَ اِمْتَرٰی سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے اور اِمْتَرٰی فِی الشَّیْءِ کے معنے ہیں شَكَّ فِیْهِ: کسی چیز میں شک کیا (اقرب) پس بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ کے معنے ہوں گے کہ تمہارے پاس وہ چیز لے کر آئے ہیں جس کے متعلق یہ لوگ شک کرتے رہے ہیں۔

تفسیر۔ حضرت لوطؑ نے جب کہا کہ آپ تو مسافر اور راہگیر معلوم ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا ہم راہگیر نہیں ہیں بلکہ ایک غرض کے لئے تیرے پاس آئے ہیں۔ اور اس چیز کی خبر لے کر آئے ہیں جس کے بارے میں یہ لوگ شک کرتے رہے ہیں یعنی عذاب کی خبر لے کر آئے ہیں۔

حضرت لوطؑ کی قوم کو عذاب کی خبر مرسلوں کے آنے سے پہلے مل چکی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کی خبر لوط کی قوم کو حضرت لوط کے ذریعہ سے مل چکی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہ بتانے کے لئے آئے ہیں کہ اب عنقریب ان پر وہ عذاب آنے والا ہے جس میں یہ لوگ شک کرتے رہے ہیں۔ گویا عذاب کی خبر تو پہلے ہی اس قوم کو دی جا چکی تھی۔ اب یہ لوگ حضرت لوط کو صرف یہ بتانے کے لئے آئے تھے کہ اب اس موعود عذاب کا وقت آ گیا ہے۔ آپ یہاں سے ہمارے ساتھ چل پڑیں۔

وَ اَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۵﴾

اور ہم تمہارے پاس یقینی خبر لائے ہیں اور ہم یقیناً سچے ہیں۔

حلّ لُغات۔ بِالْحَقِّ بِالْحَقِّ الحق کے معنی ہیں یقینی خبر۔ مزید تشریح کے لئے دیکھو سورۃ رعد آیت نمبر ۱۵ جلد ھذا۔

تفسیر۔ مرسلوں کا الحق کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ چونکہ حضرت ابراہیم نے سوال کیا تھا کہ تم مجھے کس بناء پر بشارت دیتے ہو وہ خود ہی اندازہ لگاتے ہیں کہ حضرت لوط کو بھی شک ہوگا۔ کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیوں آئے ہیں؟ اس لئے انہوں نے آپ ہی بتا دیا۔ کہ ہم الحق کے ساتھ آئے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی وحی کے

ساتھ اور پھر اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ کہہ کر زور دیا کہ ہم پر بدگمانی نہ کریں۔ہم اس دعویٰ میں سچے ہیں۔

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَ

سو تم رات کے آخری حصہ میں (کسی وقت) اپنے گھر والوں کو لے کر (یہاں سے) چلے جاؤ۔اور (خود) ان کے

لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٦﴾

پیچھے (پیچھے) رہو اور تم میں سے کوئی (ان کی طرف) التفات (ظاہر) نہ کرے اور جہاں (جانے) کا حکم تمہیں دیا جاتا ہے (سب وہاں) چلے جاؤ۔

حلّ لغات۔اَسْرِ بِاَهْلِكَ اَسْرِ سَرٰی سے باب افعال کا صیغہ امر ہے اور سَرَی الرَّجُلُ کے معنی ہیں سَارَ عَامَّةَ اللَّيْلِ رات کا اکثر حصہ چلا۔اَسْرَی الرَّجُلُ اِسْرَاءً مِثْلُ سَرَی۔اور اَسْرَی (باب افعال ثلاثی مزید) کے معنے سَرَی (ثلاثی مجرّد) کے ہی ہیں۔وَقِيْلَ اَسْرَی لِاَوَّلِ اللَّيْلِ وَسَرَی لِاٰخِرِ اللَّيْلِ۔اور بعض محققین لغت کہتے ہیں کہ اَسْرَی کا فعل رات کے ابتدائی حصہ میں چلنے کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔اور سَرَی کا فعل رات کے آخری حصہ میں چلنے پر۔اَسْرَاہُ وَاَسْرَی بِہٖ (متعدی) کے معنی ہیں۔سَيَّرَهٗ بِاللَّيْلِ اَیْ سَيَّرَهٗ لَيْلًا یعنے اسے رات کو روانہ کیا۔(اقرب)

قِطْعٌ مِّنَ اللَّيْلِ قِطْعٌ کے معنی ہیں ظُلْمَةُ اٰخِرِ اللَّيْلِ رات کے آخری حصہ کی تاریکی۔وَقِيْلَ مِنْ اَوَّلِهٖ اِلٰی ثُلُثِهٖ اور بعض کے نزدیک رات کے ابتدا سے لے کر رات کے تیسرے پہر کی تاریکی کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔(اقرب) اس اختلاف کے لحاظ سے اَسْرِ بِاَهْلِكَ کے معنے ہوں گے کہ رات کے کسی حصہ میں یا ابتدائی یا آخری حصہ میں اپنے گھر والوں کو لے کر چلو۔لیکن رات کے آخری حصہ میں جانا زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ اگلی آیت میں مُصْبِحِيْنَ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اس لحاظ سے معنے یہ ہوں گے کہ رات کے آخری حصہ میں کسی وقت اپنے گھر والوں کو لے کر چلو۔اگر اَسْرِ سے رات کے آخری حصہ میں چلنا مراد لیں۔تو بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ اس کی تشریح ہوگی۔

تفسیر۔ان مرسلوں نے حضرت لوطؑ کو ان کے نکلنے کے متعلق تفصیلات سے اطلاع دی۔اور بتایا کہ رات کے آخری حصہ میں یہاں سے نکلیں۔گو وضع لغت کے لحاظ سے اِسراء رات کے کسی حصہ میں جانے کے متعلق

بولا جاتا ہے۔لیکن بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط کورات کے آخری حصہ میں نکلنے کو کہا گیا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں جب رات کا ایک حصہ باقی رہ گیا ہوتب نکلو۔اس احتیاط میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ تا دشمن پیچھا نہ کرسکیں۔کیونکہ جس وقت انہیں نکلنے کو کہا گیا ہے۔اس کے معاًبعد عذاب آنے والا تھا۔پس اگران لوگوں کو حضرت لوط کے نکلنے کے کچھ دیر بعد پتہ بھی لگ جاتا۔تو وہ پیچھا نہیں کرسکتے تھے۔

حضرت لوطؑ کو قافلہ کے پیچھے رہنے کے حکم کا مطلب یہ جوکہا کہ توان سب کے پیچھے رہیو۔اس میں رحم کا پہلو ہے کیونکہ عذاب سے اصلی حفاظت نبی کو حاصل ہوتی ہے جب تک حضرت لوط عذاب سے محفوظ نہ ہوتے عذاب نہیں آسکتا تھا۔پس انہوں نے ہدایت کی کہ قافلہ کی کامل حفاظت اسی میں ہے کہ آپ سب کے پیچھے رہیں تا سارا قافلہ عذاب سے کلی طور پر محفوظ ہوجائے۔

حضرت لوطؑ کے ساتھ نکلنے والوں کے متعلق بائیبل اور قرآن مجید میں اختلاف اس آیت سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ پر کچھ لوگ ایمان ضرور لائے تھے۔گو بائبل صرف یہ کہتی ہے کہ ان کی دولڑکیاں ان کے ساتھ نکلی تھیں اور کوئی نہیں (پیدائش باب ۱۹ آیت ۱۶) مگر قرآن کریم اس کے خلاف کہتا ہے۔کیونکہ اس آیت میں فرماتا ہے۔وَاتَّبِعۡ اَدۡبَارَھُمۡ نکلنے والے قافلہ کے پیچھے رہو۔

اَدۡبَارَھُمۡ میں ھم کی ضمیر بتاتی ہے کہ حضرت لوط کے ساتھ ایک جماعت تھی اور ھُمۡ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔جو تین یا تین سے زیادہ مردوں کے لئے ستعمال ہوتا ہے۔یا مردوں اورعورتوں کی مخلوط جماعت کے لئے استعمال ہوسکتا ہے کیونکہ جب مرد اورعورت اکٹھے ہوں۔تو مذکر کی ضمیر استعمال کی جاتی ہے لیکن اگرمرد تھے ہی نہیں جیسا کہ بائبل کہتی ہے تو وَاتَّبِعۡ اَدۡبَارَھُمَا چاہیے تھا یا اگر دو سے زیادہ عورتیں تھیں تو اَدۡبَارَھُنَّ کہنا چاہیے تھا۔لیکن صرف دولڑکیوں کے لئے اَدۡبَارَھُمۡ کسی صورت میں استعمال نہیں ہوسکتا۔پس اس آیت سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت لوط کے ساتھ نکلنے والے کچھ اور مرد تھے اس وجہ سے عورتوں اور مردوں کے مخلوط قافلہ کو ھُمۡ کی ضمیر سے یاد کیا گیا۔

بائیبل میں حضرت لوط کے ساتھ نکلنے والی صرف ان کی دولڑکیاں بتائی گئی ہیں گو بائبل میں نکلنے کا واقعہ جہاں بیان ہوا ہے وہاں صرف دولڑکیوں کا ذکر ہے لیکن ایک اور جگہ سے بائبل سے بھی استدلال ہوتا ہے۔ کہ بائبل کا یہ بیان غلط ہے اور وہ اس طرح کہ بائبل میں جہاں ان مرسلوں کے آنے کا ذکر ہے وہاں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے ان کے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ کیا اگر پچاس راستباز وہاں ہوں تو اس قوم کو ان کی

خاطر نہ بچائے گا اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ اگر پچاس صادق ہوں تو میں ان کی خاطر سارے شہر کو چھوڑ دوں گا اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام تعداد کم کرتے گئے حتیٰ کہ آخر میں دس صادقوں کے ہونے پر بھی شہر کو بچا لینے کی درخواست کی اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر دس صادق بھی ہوں تب بھی میں شہر کو بچا لوں گا۔ تب حضرت ابراہیم خاموش ہو گئے اور سمجھ لیا کہ دس صادق بھی اس شہر میں نہیں ہیں۔ (پیدائش باب ۱۸ آیت ۲۲ تا ۳۲)

حضرت لوطؑ پر ایمان لانے والی ایک جماعت تھی اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ معلوم تھا کہ کچھ لوگ حضرت لوط پر ایمان لائے ہیں ورنہ وہ یہ دعا کیوں کرتے۔ حضرت لوطؑ تھوڑے ہی فاصلہ پر رہتے تھے اور یقیناً ان کی خبریں حضرت ابراہیمؑ کو ملتی رہتی ہوں گی۔ پس یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ اگر ان کے علم میں کوئی بھی مومن نہ تھا تو وہ ایسی دعا کرتے۔ ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اتنا معلوم تھا کہ مومنوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اسی لئے انہوں نے پچاس کے عدد سے دعا شروع کی اور دس پر آ کر چھوڑ دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سے کم مومن تھے۔ اور چونکہ تین یا تین سے زیادہ پر ھُمۡ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے تین یا دو چار زیادہ مومن ہوں۔

لَا یَلۡتَفِتۡ کہنے سے مراد کفار کی طرف توجہ نہ کرنا ہے اور یہ جو فرمایا کہ لَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡکُمۡ اَحَدٌ اس سے مراد پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں بلکہ یہ ہے کہ کفار کی طرف توجہ نہ کرو۔ اور انہیں ہلاک ہونے دو۔ ورنہ پیچھے مڑ کر دیکھنے میں کوئی خاص بات نہ تھی۔

حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق بائبل کا ایک عجیب بیان بائبل میں لکھا ہے کہ ان کی بیوی نے مڑ کر دیکھا اور وہ نمک کا کھمبا بن گئی (پیدائش باب ۱۹ آیت ۲۶)۔ یہ کہ وہ نمک کا کھمبا بن گئی۔ اسے تو میں یہود اور مسیحیوں کی عقل پر چھوڑتا ہوں مگر یہ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کے رو سے ان کی بیوی ساتھ آئی ہی نہ تھی۔ کیونکہ فرماتا ہے۔ کَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ وہ پیچھے ہی رہ گئی تھی۔ پس قرآن کریم کے بیان کے رو سے اس کے نمک کا کھمبا بن جانے یا کچھ اور بن جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی قسم کی لغویت سے قرآنی بیان کا پاک ہونا ثابت کرتا ہے کہ وہ خدائی کلام ہے۔ ورنہ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ تورات جو قریب کے زمانہ میں لکھی گئی وہ تو ایسے لغو قصہ کو بیان کرتی ہے مگر قرآن کریم اسے چھوڑ دیتا ہے۔

وَامۡضُوۡا حَیۡثُ تُؤۡمَرُوۡنَ سے میرے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت لوط کو وہ لوگ یہ بتانے کے لئے آئے تھے کہ وہاں سے نکل کر وہ کہاں جائیں اور اس کام میں مدد دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں الہام کر کے

بھیجا تھا۔ ان کو سب نشان پتہ بتا کر معلوم ہوتا ہے وہ لوگ چلے گئے اور کہہ گئے کہ ہماری بتائی ہوئی جگہ پر آ جانا کیونکہ وہیں آپ کا آنا اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے مقدر کیا ہے۔

وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ

اور یہ بات ہم نے اسے یقینی طور پر بتادی ہے کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے (ہی)

مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۷﴾

کاٹ دی جائے گی۔

حلّ لُغات۔ قَضَيْنَا قَضَيْنَا قَضٰی سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور قَضٰی بَيْنَ الْخَصْمَيْنِ کے معنی ہیں حَكَمَ وَفَصَلَ۔ مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان جھگڑے کا فیصلہ کر دیا۔ قَضَی الشَّيْءَ قَضَاءً۔ صَنَعَهٗ بِإِحْكَامٍ وَقَدَّرَهٗ۔ کسی چیز کو عمدہ طور پر بنایا۔ اور اس کا صحیح اندازہ لگایا۔ قَضَی الْاَمْرَ عَلَيْهِ۔ خَتَمَهٗ وَاَوْجَبَهٗ وَاَلْزَمَهٗ بِهٖ۔ اس کے خلاف بات کو ختم کر دیا اور اس پر اس کو واجب کر دیا اور اس کا پورا کرنا اس کا فرض قرار دیا۔ اَلشَّيْءَ۔ اَعْلَمَهٗ و بَيَّنَهٗ کسی معاملہ کا اعلان کیا اور اس کو کھول کر بیان کیا۔ قَضٰی لَكَ الْاَمْرَ اَیْ حَكَمَ لَكَ کسی معاملہ کا تیرے حق میں فیصلہ کر دیا (اقرب) پس قَضَيْنَآ اِلَيْهِ کے معنے ہوں گے کہ ہم نے یہ بات کھلے طور پر بتادی۔

اَلدَّابِرُ اَلدَّابِرُ کے معنی ہیں اَلتَّابِعُ۔ تابع۔ آخِرُ كُلِّ شَيْءٍ ہر چیز کا آخری حصہ۔ يُقَالُ قَطَعَ اللّٰهُ دَابِرَهُمْ اَیْ آخِرَ مَنْ تَبَقّٰى مِنْهُمْ اور قَطَعَ اللّٰهُ دَابِرَهُمْ میں دابر آخر کے معنوں میں ستعمال ہوا ہے۔ یعنی اللہ نے ان میں سے سب سے پیچھے رہنے والے کو بھی تباہ کر دیا۔ اَلْاَصْلُ جڑھ (اقرب) الغرض دابر سے مراد کبھی جڑھ ہوتی ہے یعنی بڑے لوگ۔ کیونکہ وہ بطور جڑھ کے ہوتے ہیں اور باقی لوگ بطور فرع کے۔ اور کبھی دابر سے مراد ساری قوم ہوتی ہے اور یہاں پر سب قوم ہی مراد ہے کیونکہ صرف آل لوط کے بچائے جانے کی خبر ہے۔

تفسیر۔ یہ آیت خدا تعالیٰ کا کلام معلوم ہوتی ہے ان مرسلوں کا قول نہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ گذشتہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کا کلام ہو۔ مگر یہ آیت ضرور اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو معلوم ہوتا ہے۔ ان مرسلوں کی صداقت پر گواہی دینے کے لئے حضرت لوطؑ پر نازل ہوا۔ اور انہیں بتایا گیا کہ ان لوگوں نے جو تم کو بتایا ہے کہ آج رات کے آخر پر عذاب آئے گا۔ یہ درست ہے۔ ہماری ہی بتائی ہوئی یہ خبر ہے۔ اور صبح کے وقت ضرور یہ قوم تباہ ہو جائے

گی۔دَابِر ھٰٓؤُلَآءِ سے یہ مراد ہے ان کا آگا پیچھا کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور (ادھر) اس شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے (اس کے پاس) آئے۔

حلّ لُغات۔ الْمَدِينة اَلْمَدِیْنَۃُ مَدَنَ سے اسم ہے اور مَدَنَ بِالْمَکَانِ کے معنی ہیں اَقَامَ ۔کسی جگہ ٹھہرا۔اور اَلْمَدِیْنَۃُ کے معنی ہیں اَلْمِصْرُ الْجَامِعُ بڑا شہر۔وَقِیْلَ الْحِصْنُ یُبْنٰی فِیْ اُصْطُمَّۃِ الْاَرْضِ۔وہ قلعہ جو کھلی فراخ زمین میں بنایا جاوے۔(گویا اردگرد کے لئے مرکز کا کام دے)۔(اقرب)

تفسیر۔ حضرت لوط کی بستی کو مدینہ کہے جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہم بستی تھی اس بستی کو مدینہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔معلوم ہوتا ہے اہم بستی تھی۔چنانچہ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر چند بستیوں کا مرکز تھا (پیدائش باب ۱۹ آیت ۱۸۔۳۱)۔ یَسْتَبْشِرُوْنَ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ وہ لوگ خوش ہوئے کہ اب حضرت لوط کو ملزم بنا سکیں گے اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ ان مردوں سے بدکاری کرنے کی خواہش کی وجہ سے وہ خوش تھے۔جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے۔کیا اس بستی میں مرد نہ ہوتے تھے کہ باہر سے آنے والوں کی خبر سن کر وہ خوش ہو گئے (تفسیر بغوی زیر آیت ھذا)۔

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۹﴾ۙ

(جس پر) اس نے (ان سے) کہا (کہ) یہ لوگ یقیناً میرے مہمان ہیں۔اس لئے تم (انہیں تکلیف دے کر) مجھے رسوا نہ کرو۔

حلّ لُغات۔ تَفْضَحُوْنِ تَفْضَحُوْنَ فَضَحَ سے جمع مخاطب کے مضارع کا صیغہ ہے اور فَضَحَ کے معنے ہیں۔ کَشَفَ مَسَاوِئَہٗ۔اس کے عیوب کو ظاہر کیا ۔وَفِی الدُّعَاءِ لَاتَفْضَحْنَا بَیْنَ خَلْقِکَ اَیْ اُسْتُرْ عُیُوْبَنَا وَلَا تَکْشِفْھَا عَنَّا (اقرب) اور دعائے مسنونہ میں جو فَضَحَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کے معنی ہیں کہ اے خدا! ہمارے عیوب پر پردہ پوشی کر اور ان کو ظاہر نہ کر (اقرب) پس فَلَا تَفْضَحُوْنِ کے معنے ہوں گے تم میری کمزوریوں کو ظاہر کر کے مجھے رسوا نہ کرو۔

تفسیر ۔جب شہر کے لوگ حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے تو حضرت لوطؑ جن کو وہ لوگ باہر کے آدمی لاکر مہمان رکھنے سے منع کیا کرتے تھے سمجھ گئے کہ اب یہ قوم مجھے ملزم قرار دے گی۔اور انہوں نے الگ ہو کر ان سے کہا۔کہ اب تو میں مہمان لے آیا ہوں۔اب تم مجھے مہمانوں کے سامنے ان کی ضیافت پر زجر کر کے نادم نہ کرو۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۷۰﴾

اور اللہ (تعالیٰ) کا تقویٰ اختیار کرو اور مجھے ذلیل نہ کرو۔

حلّ لُغَات۔ تُخْزُوْنِ تُخْزُوْنِ اَخْزَی سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَخْزَاہُ اِخْزَاءً کے معنے ہیں اَوْقَعَہٗ فِی الْخِزْیِ اَوِالْخَزَایَۃِ وَاَھَانَہٗ۔ کہ اس کو ایسے معاملہ میں پھنسایا جس سے اُسے ندامت ہو اور اسے رسوا و ذلیل کیا۔(اقرب) فَلَا تُخْزُوْنِ کے معنے ہوں گے کہ تم مجھے ذلیل نہ کرو۔

تفسیر ۔اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔یعنے مہمان نوازی ایک نیک فعل ہے۔اس پر اعتراض نہ کرو اور مہمانوں کے سامنے مجھے ذلیل نہ کرو۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾

انہوں نے کہا اور کیا ہم نے تمہیں (بیرونی) لوگوں (کو اپنے پاس ٹھہرانے) سے روکا نہ تھا۔

تفسیر ۔ حضرت لوطؑ کی قوم کا ان کو کسی مہمان کے پاس لانے سے روکنے کی وجہ اس زمانہ میں ان بستیوں اور دوسری بستیوں میں کچھ جھگڑے تھے۔اور وہ ڈرتے تھے کہ باہر سے آدمی آکر شہر پر حملہ نہ کروا دیں۔اس لئے وہ لوگ حضرت لوطؑ کو اجنبی مہمان لانے سے روکتے رہتے تھے (پیدائش باب ۱۴ آیت ۱۱)۔ مگر چونکہ علاقہ خطرناک تھا۔حضرت لوطؑ کو جب اجنبی ملتے وہ انہیں اپنے گھر لے آتے تا رات کو وہ راستہ پر لٹ نہ جائیں۔اس دفعہ جو وہ مہمان لائے اس شہر والوں نے فیصلہ کیا کہ اب کے ضرور لوط (علیہ السلام) کی اچھی طرح خبر لینی چاہیے اور چونکہ حضرت لوط کو کسی بہانہ سے بستی سے نکالنا چاہتے تھے وہ خوش بھی ہوئے کہ اب یہ قابو آگئے ہیں اب ہم ان کو یہاں سے چلے جانے پر مجبور کرسکیں گے ان کا یہ تردّد اس لئے تھا کہ حضرت لوط کی بیٹیاں وہاں بیاہی ہوئی تھیں اور اس وجہ سے وہ شہر کے ساکن تھے اور انہیں بلا وجہ نہیں نکالا جاسکتا تھا۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ وہ

لوگ ان مردوں سے بدکاری کرنے کی نیت سے نہیں آئے تھے۔ اگر وہ اجنبیوں سے ایسے فعل کیا کرتے تھے تو وہ یہ نہ کہتے کہ جب ہم نے منع کیا ہوا ہے کہ اجنبی آدمی نہ لایا کرو۔ پھر تُو کیوں اجنبیوں کو لایا؟ تب تو انہیں حضرت لوط کے مہمان بلانے پر خوش ہونا چاہیے تھا۔ نیز یہ کیسی عقل کے خلاف بات ہے کہ پہلے تو کبھی انہوں نے مہمانوں سے ایسا فعل نہ کیا۔ بلکہ صرف مہمان لانے سے روکتے رہے لیکن اس دن بدکاری پر تیار ہو گئے اصل بات یہ ہے کہ یہ خیال بالکل خلاف عقل ہے۔ کہ وہ بدکاری کرنا چاہتے تھے اور بائبل سے لے کر بعض مفسرین نے نقل کر دیا ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ شہر کے لوگ ان فرشتوں سے بدکاری کرنا چاہتے تھے (پیدائش باب ۱۹ آیت ۵) حالانکہ بائبل میں ایسی رطب و یابس باتیں بہت سی درج ہیں اور اس کے بہت سے مضامین متضاد ہیں۔ اس کے بیان کی جب تک قرآن کریم یا صحیح تعریف یا عقل سے تائید نہ ہوتی ہو۔ اعتبار کرنا سخت خطرناک ہے۔

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِیْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ؕ﴿۷۲﴾

اس نے کہا (کہ) اگر تم نے (میرے خلاف) کچھ کرنا (ہی) ہو تو یہ میری بیٹیاں (تم میں موجود ہی) ہیں۔

تفسیر ۔ اس آیت کو اوپر کے لغو خیال کی تائید میں دلیل سمجھا جاتا ہے لیکن یہ دلیل دعویٰ سے بھی لچر ہے۔ ایک طرف تو ان لوگوں کو مردوں سے بدکاری کا شائق قرار دیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہ ان مردوں سے بدکاری کرنے کے شوق میں آئے تھے اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت لوط نے کہا کہ اگر بدکاری کا شوق ہے تو میری بیٹیاں حاضر ہیں۔ اگر ان لوگوں کو عورتوں سے مباشرت کا شوق ہوتا۔ تو کیا ان کے گھر میں بیویاں نہ تھیں وہ اس طرح ان کے پاس کیوں دوڑے آتے اور اگر وہ مردوں سے بدکاری کی نیت سے آئے تھے تو پھر حضرت لوطؑ کے اس قول کے کیا معنے ہوئے کہ کچھ کرنا ہی ہے تو لڑکیوں سے بدکاری کر لو۔ کیا ایسے موقع پر کوئی معقول آدمی یہ بات کہہ سکتا ہے؟ حضرت لوطؑ کا نبی کا مقام نظر انداز کر دو۔ مگر ایک معقول آدمی کے مقام سے تو ایک کافر بھی انہیں نہیں گرائے گا۔

پھر یہ کیسے تعجب کی بات ہے کہ حضرت لوطؑ جو خدا کے نبی تھے خود ان لوگوں کو ایک اور بدکاری کی جو پہلی سے کم نہیں تعلیم دیتے ہیں کیا کوئی عقل مند آدمی بھی اس بات کو باور کر سکتا ہے کہ عین اس وقت جب بدکاریوں کی وجہ سے اس قوم پر عذاب آنے لگا تھا حضرت لوطؑ ان کو ایک اور بدکاری کا مشورہ دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ

ایسے ہی کاموں کی وجہ سے عذاب آرہا ہے۔

آیت ھٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِیْٓ کے متعلق عام لوگوں کے خیال کا رد حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کے فقط یہ معنے ہیں کہ میری بیٹیاں تم میں بیاہی ہوئی ہیں اگر تم سمجھتے ہو کہ میں باہر سے آدمی تم کو نقصان پہنچانے کے لئے لایا ہوں تو تم میں میری بیٹیاں موجود ہیں اگر میں کوئی شرارت کروں اور تم کو نقصان پہنچا کر یہاں سے بھاگ جاؤں تو تم انہیں دکھ دے سکے ہو۔ آخر میں باپ ہوں اس صورت کے ہوتے ہوئے میں تمہارے خلاف کس طرح کوئی قدم اٹھا سکتا ہوں؟ (دیکھو اس آیت کی مزید تشریح کے لئے سورۃ ہود ع ۷ زیر آیت ۸۰) بعض کہتے ہیں کہ بَنٰتِیْ سے مراد حضرت لوط کے قول میں ان لوگوں کی بیویاں تھیں جو بوجہ نبی ہونے کے اور بڑی عمر والا ہونے کے وہ ان کی بیویوں کو بیٹیاں کہتے ہیں (تفسیر کبیر امام رازی سورۃ حجر زیر آیت ھذا) اور کہتے ہیں اگر کچھ کرنا ہے تو اپنی بیویوں سے جو چاہو کرو۔ یہ معنے اس غلط خیال سے اچھے ہیں مگر ان معنوں سے اس طرف ضرور اشارہ نکلتا ہے کہ وہ لوگ ان مردوں سے بدکاری کرنا چاہتے تھے اور میں جیسا کہ ثابت کر چکا ہوں یہ قرآن کریم سے اور عقل سے ہرگز ثابت نہیں۔ پس یہ معنے گو نسبتاً اچھے ہیں لیکن قرآن کریم کے کامل مفہوم کو ظاہر نہیں کرتے۔ اس جگہ ایک لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جو یہ ہے کہ اردو دان لوگ اس آیت سے بہت دھوکہ کھاتے ہیں کیونکہ اوباشوں کی زبان میں فاعل کا لفظ مباشرت کرنے والے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور فاعلین کے لفظ سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مطلب تو واضح ہے حالانکہ قرآن کریم عربی میں ہے نہ کہ اردو میں۔ عربی میں ایسا کوئی محاورہ نہیں۔ دوسرے حضرت لوطؑ تو نبی تھے وہ اوباشوں کی زبان کیوں بولنے لگے۔ یہ مضمون کسی قدر رکیک ہے۔ مگر چونکہ مجھے اردو دان طبقہ کو اس آیت کا مضمون سمجھانے میں مشکلات پیش آئی ہیں اور اس محاورہ کو انہیں پیش کرتے ہوئے دیکھا ہے اس لئے میں نے باوجود حیاء کے اس کا بھی رد کر دیا ہے۔

آیت ھٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِیْٓ کا مطلب غرض اس آیت کے معنے صرف اتنے ہیں کہ حضرت لوط نے اپنی بیاہی ہوئی بیٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ یہ تمہارے قبضہ میں ہیں پھر تم کو کیوں شک ہے۔ کہ میں تم سے غداری کروں گا۔ پس اگر تم آج ضرور میرے خلاف کسی اقدام پر تلے ہوئے ہو تو میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں جو تمہاری تجویز سے (یعنے حضرت لوطؑ کے مہمانوں کو ذلیل کر کے وہاں سے نکال دینے سے) بہت بہتر ہے اور اس میں مہمانوں کی تذلیل کا گناہ بھی نہیں ہوتا۔ اور وہ یہ کہ میری بیٹیوں کی نگرانی رکھو اور اگر میں تم کو نقصان پہنچاؤں تو ان کو تکلیف دے کر تم مجھے دکھ دے سکتے ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ لڑکیوں کو دکھ دینے کی تجویز ایک نبی کس طرح

کرسکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو ان لوگوں کی تسلی کے لئے تھا۔ ورنہ حضرت لوط جانتے تھے کہ نہ میں ان سے غداری کروں گا اور نہ لڑکیوں کو دکھ دینے کا سوال پیدا ہوگا۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۳﴾

(اے ہمارے نبی) تیری زندگی کی قسم (کہ) یہ (تیرے مخالفین بھی) یقیناً (انہی کی طرح) اپنی بدمستی میں بہک رہے ہیں۔

حلّ لُغَات۔ لَعَمْرُكَ لَعَمْرُكَ اَلْعَمْرُ کے معنے ہیں۔ الحیاۃ، زندگی۔ وَقِيْلَ الْعَمْرُ دُوْنَ الْبَقَاءِ لِاَنَّهٗ اِسْمٌ لِمُدَّةِ عِمَارَةِ الْبَدَنِ بِالْحَيَاةِ وَالْبَقَاءُ ضِدُّ الْفَنَاءِ وَلِهٰذَا يُوْصَفُ الْبَارِئُ بِالْبَقَاءِ وَقَلَّمَا يُوْصَفُ بِالْعَمْرِ۔ بعض نے کہا ہے کہ عَمْرٌ کا لفظ بَقَاءٌ کی نسبت کم زمانے کے لئے بولا جاتا ہے کیونکہ عَمْرٌ اس عرصے کو کہتے ہیں جب تک کہ انسانی جسم میں زندگی رہے اور بقاء کا لفظ فناء کے مقابل پر استعمال ہوتا ہے اسی اختلاف کی بناء پر خدا تعالیٰ کے لئے لفظ بقاء تو استعمال کیا جاتا ہے لیکن عمرٌ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے شاذ ہی ہوتا ہے اَلْعَمْرُ اَيْضًا الدِّيْنُ۔ دین۔ وَمِنْهُ لَعَمْرِيْ فِي الْقَسَمِ اَيْ لَدِيْنِيْ اور لَعَمْرِيْ کا لفظ جو قسم کے طور پر استعمال ہوتا ہے وہ انہی معنوں میں ہے یعنی مجھے اپنے دین کی قسم (اقرب) پس لَعَمْرُكَ کے معنی ہوں گے (۱) تیری زندگی کی قسم (۲) تیرے دین کی قسم۔

تفسیر۔ **اللہ تعالیٰ کا مختلف اشیاء کی قسم کھانے کا مطلب** بعض نے کہا ہے کہ زندگی کی قسم کھانا درست نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں کیوں قسم کھائی؟ (قرطبی زیر آیت ھذا)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بھی قسم کھانا درست نہیں۔ لیکن یہ تو اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور اللہ تعالیٰ نے تو دن کی اور رات کی اور صبح کی اور دوپہر کی اور ہواؤں کی بھی قسم قرآن میں کھائی ہے۔ پھر زندگی کی قسم اس کے لئے کس طرح معیوب ہوگئی؟ اصل بات یہ ہے کہ بندہ جس کی قسم کھاتا ہے اس کی عظمت کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جہاں قسم کھاتا ہے اس سے اس وجود کو جس کی قسم کھائی ہو بطور شہادت پیش کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے لئے کسی شے کی قسم کھانا معیوب نہیں۔ اس قسم کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ میں اس شے کو بطور دلیل پیش کرتا ہوں اور یہ قسم شہادت کی قسم ہوتی ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کی جاسکتی ہے کیونکہ اسی کو طاقت حاصل ہے کہ

کائنات میں سے کسی جزو کو بطور شہادت کے پیش کر سکے کہ ہر شے اس کے اختیار میں ہے۔ انسان میں کہاں طاقت ہے کہ وہ ایسا دعویٰ کر سکے۔

لَعَمْرُكَ میں آنحضرتؐ کی عمر کی قسم کھائی گئی ہے دوسرا سوال اس آیت کے بارہ میں یہ ہے کہ یہ قسم کس کی عمر کی کھائی گئی ہے۔ آیا حضرت لوط کی عمر کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت لوطؑ کی عمر کی قسم کھائی گئی ہے۔ اور ملائکہ نے کھائی ہے (کشاف زیر آیت ھذا) اور حضرت ابن عباس کا قول ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ یہ قسم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی کھائی گئی ہے اور یہ فضیلت سوائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کو حاصل نہیں (ابن کثیر زیر آیت ھذا) اسی آیت کی تفسیر کے نیچے۔ میرے نزدیک قرآن کریم کی عبارت سے حضرت ابن عباس کے معنے زیادہ درست معلوم ہوتے ہیں کیونکہ کشاف کے معنوں کے رو سے ایک قالوا محذوف ماننا پڑتا ہے اور محذوف اسی جگہ نکالا جاتا ہے جہاں سیاق وسباق دلالت کرتے ہوں اور دوسرے معنے نہ ہو سکتے ہوں۔ لیکن نہ تو یہاں سیاق وسباق مجبور کرتے ہیں کہ اس قسم کو حضرت لوط کی نسبت مانا جائے اور نہ یہ ہی درست ہے کہ اس جگہ دوسرے معنے نہیں ہو سکتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب واضح ہے اور اس پر کوئی اعتراض معناً یا لفظاً نہیں ہو سکتا۔ پس یہی درست ہے کہ اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی قسم کھائی گئی ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ آپؐ کی عمر کے واقعات کو اوپر کے واقعہ کے لئے بطور شہادت پیش کیا گیا۔

حضرت لوطؑ کے ذکر کے بعد آنحضرتؐ کی عمر کی قسم کھانے کا مطلب اصل بات یہ ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام کا یہ قول بیان کیا گیا کہ دیکھو یہ میری لڑکیاں تم میں موجود ہیں اگر میں تم سے کوئی دھوکہ کروں تو تم ان کے ذریعہ سے مجھے سزا دے سکتے ہو۔ تو اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے ایک مشابہت بیان کی گئی تھی اور وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تین بیٹیاں کفار میں بیاہی ہوئی تھیں۔ آپ کے دعویٰ کی وجہ سے انہیں تکلیف دی گئی (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام سعی قریش فی تطلیق بنات الرسول من ازواجھن)۔

آنحضرتؐ کی صاحبزادیوں کو حضرت لوط کی بیٹیوں سے مشابہت اللہ تعالیٰ نے اس مشابہت کی طرف اس واقعہ کو بیان کر کے اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح حضرت لوطؑ کی دو بیٹیاں کفار میں بیاہی ہوئی تھیں۔ وہی حال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اور چونکہ اس مشابہت کے ذکر سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو صدمہ پہنچنا لازمی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس بے انتہا محبت کی وجہ سے جو اسے اپنے رسول سے تھی۔ آپؐ کے دل کو تسلی دی اور آپ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور فرمایا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اس واقعہ کو معلوم کر کے

جو تیرے دل کو صدمہ پہنچا ہے اسے ہم جانتے ہیں اور اس میں تجھ سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ خصوصاً اس لئے کہ لوط کے مخالف باوجود اس قدر گندا ہونے کے ان کی بیٹیوں کے ذریعے سے انہیں دکھ نہ دیتے تھے۔ جیسا کہ سورۂ ہود میں ہے کہ جب حضرت لوطؑ نے کہا کہ میری بیٹیاں تم میں موجود ہیں اگر میں غداری کروں تو تم ان کے ذریعہ سے مجھے دکھ دے سکتے ہو۔ اور چونکہ کوئی باپ اپنی بیٹیوں کا دکھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے سمجھ لو کہ کم سے کم ان کے خیال سے ہی میں تم کو دھوکہ نہ دوں گا۔ تو اس پر ان لوگوں نے یہ جواب دیا کہ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ (ھود: ۸۰) تجھ کو معلوم ہے کہ تیری لڑکیوں کو دکھ دینے کا ہمیں حق حاصل نہیں ہمارے لئے خطرہ تو پیدا کرے اور دکھ ہم تیری لڑکیوں کو دیں۔ یہ نہیں ہو سکتا لیکن جہاں لوط کے دشمنوں کا یہ حال تھا تیرے دشمن اپنی شرارت کے جوش میں اس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ تجھ کو تیری لڑکیوں کے ذریعہ سے دکھ دیتے ہیں۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ و اسد الغابۃ ام کلثوم) جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اس ظالم نے اپنے لڑکوں کو عاق کرنے کی دھمکی دے کر انہیں طلاق دلوادی۔

آنحضرتؐ کی صاحبزادی حضرت زینب کو تکلیف دیئے جانے کا واقعہ اس طرح آپؐ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینب ابوالعاص سے بیاہی ہوئی تھیں۔ جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ جانے لگیں تو ظالموں نے ان کی سواری کو پیٹا اور انہیں سواری سے گرا دیا۔ جس کے نتیجہ میں ان کا حمل ضائع ہو گیا۔ اور دیر تک بیمار رہیں (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب کتاب النساء باب الزاء) سو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ تجھے تیری لڑکیوں کے ذریعہ سے دکھ دے چکے ہیں۔ اور پھر بھی دیں گے۔ (حضرت زینبؓ کا واقعہ بعد میں ہوا) ان لوگوں نے لوطؑ کے دشمنوں جتنی بھی شرافت نہیں دکھائی مگر ہمیں تیری جان ہی کی قسم یہ اپنی شرارت میں اندھے ہو رہے ہیں اور اس دعویٰ کی تائید میں ہم تیری زندگی کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ یعنے تو نے ان کو کوئی دکھ نہیں دیا۔ بلکہ ہمیشہ ان کی خیر خواہی کی۔ مگر یہ بلا وجہ اور بغیر قصور کے تجھے دکھ دیتے ہیں۔ پس یہی ثبوت ہے کہ یہ جوش مخالفت سے اندھے ہو رہے ہیں۔ اور ہرگز خدا تعالیٰ کا تقویٰ ان کو حاصل نہیں۔ پس جب ان کی یہ حالت ہے کہ تجھ پر بلا وجہ اس قدر ظلم کر رہے ہیں۔ تو ہم نے لوط کے دشمنوں کو جب اس سے کم جرم پر تباہ کیا۔ تو کیا اس سے بڑے ظلم پر انہیں سزا نہ دیں گے؟ اس آیت کا تعلق سورۃ کے اصل مضمون سے یہ ہے۔ کہ یہ لوگ تجھ پر نازل ہونے والے کلام کو مشتبہ کرنے کے لئے ایسی گندی حرکات کرتے ہیں۔ گویا اپنے خیال میں یہ سمجھتے ہیں۔ کہ تیری لڑکیوں کو دکھ دیا تو تیرا جھوٹا ہونا ثابت

ہو گیا۔ حالانکہ اصل میں انجام دیکھا جاتا ہے۔ ہم اپنے کلام کی عظمت دکھانے کے لئے اور اسے اعتراضوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک دن ان کو تباہ و برباد کر دیں گے اور تیرا بدلہ لے کر تیری عزت کو قائم کر دیں گے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ۔ فَدَتْ نَفْسِیْ وَرُوْحِیْ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدُ قَدْ اُوْذِيْتَ كَثِيْرًا فِیْ اَعْلَاءِ كَلِمَةِ اللّٰهِ رَفَعَ اللّٰهُ شَأْنَكَ وَاَحْيَا ذِكْرَكَ اِلٰی اَبَدِ الْآبَادِ۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۴﴾

اس پر اس (موعود) عذاب نے دن چڑھتے (ہی) انہیں پکڑ لیا۔

حلّ لُغَات۔ **الصَّيْحَةُ** الصَّيْحَةُ اَلْعَذَابُ صیحۃٌ کے معنی عذاب کے ہیں۔ اَلْغَارَةُ اِذَا فُوْجِیءَ الْحَیُّ بِهَا (اقرب)۔ ایسی غارت جو قبیلہ پر اچانک آ جائے۔

مُشْرِقِيْنَ مُشْرِقِيْنَ اَشْرَقَ سے اسم فاعل کا صیغہ مُشْرِقٌ آتا ہے اور مُشْرِقُوْنَ اس کی جمع ہے اور اَشْرَقَتِ الشَّمْسُ کے معنے ہیں طَلَعَتْ۔ سورج نکل آیا۔ اَضَاءَتْ سورج کی روشنی پھیل گئی۔ وَقِيْلَ شَرَقَتِ الشَّمْسُ طَلَعَتْ وَاَشْرَقَتِ الشَّمْسُ اَضَاءَتْ وَصَفَا شُعَاعُهَا۔ اور جب سورج کے لئے شَرَقَتْ (ثلاثی مجرد) کہیں۔ تو اس کے معنے ہوں گے کہ سورج نکل آیا۔ اور جب اَشْرَقَتْ (ثلاثی مزید) استعمال کریں۔ تو اس کے معنی ہوں گے کہ سورج کی روشنی خوب پھیل گئی۔ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ ۔ اَنَارَتْ بِاِشْرَاقِ الشَّمْسِ۔ سورج کے طلوع ہونے سے زمین پر روشنی پھیل گئی۔ اَشْرَقَ الرَّجُلُ۔ دَخَلَ فِیْ شُرُوْقِ الشَّمْسِ۔ اس پر طلوع آفتاب کا وقت آ گیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلے مُصْبِحِيْنَ فرمایا اور اس آیت میں مُشْرِقِيْنَ پہلے مُصْبِحِيْنَ فرمایا تھا۔ اب یہاں مُشْرِقِيْنَ فرمایا ہے۔ بظاہر یہ اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مُشْرِقٌ کے معنے ہیں جس پر سورج نکل آئے اور مُصْبِحٌ کے معنے بظاہر طلوع آفتاب کے وقت میں داخل ہونے والے کے ہیں۔

مُصْبِحِيْنَ اور مُشْرِقِيْنَ میں کوئی اختلاف نہیں لیکن حقیقتاً کوئی اختلاف نہیں کیونکہ صبح پو پھٹنے سے لے کر طلوع آفتاب تک کو بھی کہتے ہیں۔ اور اول النہار یعنے دن کے پہلے حصہ کو بھی کہتے ہیں۔ پس دونوں لفظ درست ہیں۔ چونکہ سورج نکلتے وقت یہ واقعہ ہوا تھا (پیدائش باب ۱۹ آیت ۲۳) اس لئے مُصْبِحِيْنَ کہنا بھی درست ہے

اور مشرقین کہنا بھی۔

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ

جس پر ہم نے اس (بستی) کی اوپر والی سطح کو اس کی نچلی سطح کر دیا اور ان پر سنگریزوں سے بنے ہوئے پتھروں کی

سِجِّيْلٍ ﴿۷۵﴾

بارش برسائی۔

حلّ لُغَات۔ اَمْطَرَ اَمْطَرَ مَطَرَ سے ثلاثی مزید ہے۔ اور اَمْطَرَتِ السَّمَآءُ کے معنے ہیں۔ مَطَرَتْ أَيْ اَصَابَتْهُمْ بِالْمَطَرِ مینہ برسا وَ قِيْلَ مَطَرَ فِي الْخَيْرِ وَالرَّحْمَةِ وَاَمْطَرَ فِي الشَّرِّ وَالْعَذَابِ اور بعض کہتے ہیں کہ مَطَرَ (ثلاثی مجرد) خیر اور رحمت میں استعمال ہوتا ہے اور اَمْطَرَ (ثلاثی مزید) شرّ اور عذاب میں (اقرب)

سِجِّيْل سِجِّيْلٌ سَجَلَ سے ہے۔ اور سَجَلَ بِهٖ سَجْلًا کے معنے ہیں رَمٰى بِهٖ مِنْ فَوْقَ۔ اس کو اوپر سے پھینکا۔ سَجَلَ الْمَآءَ: صَبَّهٗ پانی کو گرایا۔ اور السِّجِّيْلُ کے معنی ہیں حِجَارَةٌ كَالْمَدَرِ سنگریزے۔ وَقِيْلَ مُعَرَّبَةٌ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لفظ معرّب ہے (اقرب) (یعنی غیر زبان کا ہے۔ لیکن جیسا کہ رعد حل لغات آیت نمبر ۱۹ زیر لفظ جہنم اور ابراہیم آیت نمبر ۳۶ زیر لفظ صنم بتایا گیا ہے کہ جن الفاظ کا مادہ عربی میں استعمال ہوتا ہے ان کو معرّب کہنا درست نہیں۔ پس یہ بھی معرّب نہیں)

تفسیر۔ لوطؑ کی قوم پر سخت عذاب آنے کی وجہ لوطؑ کی قوم نے چونکہ اعلیٰ اخلاق چھوڑ کر ادنیٰ اخلاق اختیار کئے تھے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے بھی ان کے شہر کے اوپر کے حصہ کو نیچے کر دیا اور کہا کہ جاؤ۔ پھر نیچے ہی رہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ پتھر کیونکر گرے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ شدید زلزلہ سے بعض دفعہ زمین کا ٹکڑا اوپر اٹھ کر پھر نیچے گرتا ہے۔ ایسا ہی اس وقت ہوا۔ زمین جو پتھریلی تھی۔ اوپر اُٹھی اور پھر دھنس گئی اور اس طرح وہ پتھروں کے نیچے آ گئے۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ ان کے گھروں کی دیواریں ان پر آ پڑیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ لوگ پتھروں سے مکان بنایا کرتے تھے۔ سجیل کہتے بھی ہیں اس پتھر کو جو گارہ سے ملا ہوا ہو۔ پس یہ ایسی دیواروں پر خوب چسپاں ہوتا ہے جن میں پتھر گارہ سے لگائے گئے ہوں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۶﴾

اس (ذکر) میں فراست سے کام لینے والوں کے لئے یقیناً کئی نشان (موجود) ہیں۔

حلّ لُغات ۔متوسمین مُتَوَسِّمِيْنَ تَوَسَّمَ سے اسم فاعل کا صیغہ مُتَوَسِّمٌ آتا ہے اور مُتَوَسِّمُوْنَ اس کی جمع ہے اور تَوَسَّمَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں تَخَيَّلَهٗ وَ تَفَرَّسَهٗ۔اس پر غور کیا سوچ کر اس کی حقیقت کو معلوم کیا۔طَلَبَ وَسْمَهٗ۔اَیْ عَلَامَتَهٗ۔کسی چیز کی علامت دریافت کی ۔تَعَرَّفَهٗ۔کسی چیز کو پہچاننے کی کوشش کی۔ يُقَالُ تَوَسَّمْتُ فِيْهِ الْخَيْرَ - اَیْ تَبَيَّنْتُ فِيْهِ اَثَرَهٗ۔جب تَوَسَّمْتُ فِيْهِ الْخَيْرَ۔کا محاورہ استعمال کریں تو معنے یہ ہوں گے کہ میں نے خیر کے نشان اس میں پائے (اقرب) پس اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ کے معنے ہوں گے کہ اس میں غور کرنے والوں کے لئے کئی نشان ہیں۔

تفسیر ۔حضرت لوطؑ کے واقعہ سے آنحضرتؐ کے منکرین کو انتباہ یعنی جو لوگ فراست سے کام لیتے ہیں ان کے لئے اس واقعہ میں نشانات ہیں۔یعنے وہ دیکھ سکتے ہیں کہ لوط کے واقعہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات سے مشابہت ہے۔پس آپ کے دشمنوں کو بھی اسی طرح تباہ کیا جائے گا۔جس طرح حضرت لوط کے دشمنوں کو تباہ کیا گیا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو زلزلہ کا نشانہ تو نہ بننا پڑا۔مگر بدر کی جنگ میں ان پر پتھر پڑے یعنی آندھی چلی اور کنکر اُڑ اُڑ کر کفار کی آنکھوں میں گھس گئے۔جن کی وجہ سے وہ نشانہ درست نہ لگا سکتے تھے۔

(دلائل النبوۃ للبیہقی باب التقاء الجمعین و نزول الملائکۃ وما ظھر فی رمی النبی بالقبضۃ)

نیز معنوی طور پر بھی یہ سلوک ان سے ہوا۔کہ بڑے چھوٹے کر دیئے گئے اور چھوٹے بڑے۔گویا اوپر کا طبقہ نیچے آ گیا اور نیچے کا اوپر چنانچہ ابوجہل۔عتبہ۔شیبہ وغیرہ اور ان کے خاندان تباہ ہو گئے۔اور ابوبکرؓ عمرؓ وغیرہ جوان سے چھوٹے سمجھے جاتے تھے بادشاہ بن گئے۔حضرت عمرؓ کی خلافت میں اس قسم کا عجیب نظارہ نظر آتا ہے۔آپ حج کے لئے تشریف لے گئے۔تو عمائدین مکہ ملنے آئے۔آپؓ نے غلام صحابہؓ کو صدر کے قریب جگہ دی اور ان کو پیچھے بٹھایا۔انہوں نے باہر نکل کر شکایت کی کہ آج ہمیں ذلیل کیا گیا ہے۔تو خود ان میں سے بعض نے کہا کہ یہ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔جب ہمارے باپ دادے محمد رسول اللہ کی مخالفت کر رہے تھے تو یہ لوگ آپؐ پر ایمان لا کر قربانیاں کر رہے تھے۔اب تو یہی عزت کے مستحق ہیں۔(مناقب امیر المومنین عمر بن الخطابؓ از ابی الفرج

عبد الرحمن بن علی بن محمد ابن الجوزی باب الثامن و الثلاثون فی ذکر عدلہ فی رعیتہ)

وَ اِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۷﴾

اور وہ (کوئی گمنام جگہ نہیں بلکہ) ایک بڑے مستقل راستے پر (واقع) ہے۔

حلّ لُغَات۔ سبیل مقیم سَبِيْلٌ مُقِيْمٌ اَیْ بَيِّنٌ وَاضِحٌ (تاج) یعنی واضح بیّن راستہ۔

تفسیر۔ یعنی ان کی بستیاں ایک ایسے راستہ پر واقع ہیں جو اب تک چلتا ہے مٹا نہیں۔ اس وجہ سے اے کفار! تمہارے قافلے شام کو آتے جاتے عین اس کے پاس سے گذرتے ہیں۔ پھر تم عبرت نہیں حاصل کرتے۔ حضرت لوطؑ کی بستیاں عین اس راستہ پر واقع ہیں جو عرب سے شام کو جاتا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

اس (واقعہ) میں مومنوں (کے فائدہ) کے لئے یقیناً ایک نشان (موجود) ہے۔

تفسیر۔ آنحضرتؐ کے زمانہ کے عذاب کو لوطؑ کے زمانہ کے عذاب سے مشابہت اس آیت میں مومنوں کے لئے اسے نشان قرار دیا ہے۔ جب کہ پہلی آیت کو متوسّمین کے لئے نشان قرار دیا تھا۔ یہ فرق اس لئے ہے کہ پہلی آیت میں یہ ذکر تھا۔ کہ اس واقعہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ سے مشابہت ہے چونکہ اس مشابہت کو ہر شخص نہیں معلوم کر سکتا۔ بلکہ خاص فراست والے معلوم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ باریک مضمون ہے اس لئے متوسّمین کا لفظ استعمال کیا۔ لیکن اس آیت میں یہ ذکر ہے کہ وہ بستیاں ایک چلتے ہوئے راستہ پر ہیں۔ اور ایک تباہ شدہ بستی سے عبرت حاصل کرنا کوئی باریک مضمون نہیں بلکہ صرف دل کی خشیت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اس لئے فرمایا کہ اس سے مومن فائدہ اٹھا سکے۔

وَ اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۹﴾

اور اَیکہ والے (بھی) یقیناً ظالم تھے۔

حلّ لُغَات۔ اَلْاَيْكَةُ اَلْاَيْكُ الشَّجَرُ الْكَثِيْرُ الْمُلْتَفُّ وَقِيْلَ الْغَيْضَةُ تُنْبِتُ السِّدْرَ

وَالْاَرَاكَ وَنَحْوُهُمَا۔ اَلْوَاحِدُ اَيْكَةٌ۔ ایکۃ ایك کی مفرد ہے اوراس کے معنے گھنے درخت کے ہوتے ہیں اور نیز ایسے جنگل کے جس میں بیری اور پیلو کے درخت بکثرت ہوں۔(اقرب)

تفسیر۔ اصحاب الایکہ حضرت شعیبؑ کی قوم کا نام ہے اصحاب الایکہ حضرت شعیب کی قوم کا دوسرا نام ہے۔ایکہ گھنے درخت کو بھی کہتے ہیں۔اور ایسے جنگل کو بھی جس میں بیری اور پیلو کے درخت بکثرت ہوں معلوم ہوتا ہے کہ مدین کے پاس کوئی گھنا جنگل تھا۔جس میں ان دونوں قسموں کے درخت بکثرت پائے جاتے تھے۔

مدین کے باشندوں کو اصحاب الایکہ کہے جانے کی وجہ اس وجہ سے مدین کے باشندے اصحاب الایکہ کہلاتے تھے اور غالباً یہ نام عربوں نے رکھا تھا۔جن کے قافلے مصر اور شام کو جاتے ہوئے مدین کے پاس سے گذرتے تھے اور اسی جنگل میں سے ان کا راستہ گزرتا تھا۔اس لئے عربوں پر اتمام حجت کے لئے اسی نام کو جو ان میں زیادہ معروف تھا استعمال کیا۔

حضرت شعیب کی قوم کے اصحاب الایکہ ہونے کا قرآن مجید سے ثبوت قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اصحاب ایکہ حضرت شعیب کی قوم تھی چنانچہ سورۂ شعراء میں فرماتا ہے كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ (الشعراء:۱۷۷،۱۷۹) یعنے اصحاب ایکہ نے بھی رسولوں کا انکار کیا جبکہ ان سے شعیب نے کہا کہ کیا تم تقویٰ نہیں کرتے۔میں تمہاری طرف رسول ہوکر آیا ہوں۔اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب الایکہ حضرت شعیب کی قوم تھی۔لیکن دوسری جگہ حضرت شعیب کو مدین کی طرف رسول بتایا گیا ہے۔جیسا کہ فرمایا وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا (ھود:۸۵نیز الاعراف ۸۶و العنکبوت ۳۷) ہم نے مدین قوم کی طرف ان کے بھائی شعیب کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔اب سوال یہ ہے کہ کیا شعیب نام کے دو نبی تھے یا حضرت شعیب دو قوموں کی طرف مبعوث ہوئے تھے مدین والوں کی طرف بھی اور اصحاب ایکہ کی طرف بھی؟

مدین والے اور اصحاب الایکہ ایک ہی نسل کے دو حصے تھے میری تحقیق یہ ہے کہ ایک ہی نسل کے دو حصے تھے کچھ لوگوں کا گذارہ شہری تجارت پر تھا۔اور کچھ لوگوں کا دودھ گھی اون فروخت کرنے پر گذارہ تھا۔ اور ایسے شہروں میں جو جنگل کے سروں پر ہوتے ہیں یہ بات کثرت سے دیکھی جاتی ہے۔

مدین کے پاس جنگل کے ہونے کا ثبوت جغرافیہ سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا واقع میں مدین کے پاس کوئی ایسا جنگل تھا جس میں بیری اور پیلو کے درخت پائے جاتے تھے۔کیونکہ ایسی بات قیاس سے نہیں بتائی

جاسکتی۔اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں! جغرافیوں سے اس کا پتہ ملتا ہے۔چنانچہ مولوی سلیمان صاحب ندوی اپنی کتاب ارض القرآن میں برٹن کی کتاب گولڈ مائنز آف مدین کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔کہ ایک یونانی جغرافیہ نویس لکھتا ہے ’’خلیج عیلانہ (عقبہ) کے پیچھے جس کے چاروں طرف نبطی عرب رہتے ہیں۔(ارض مدین یہ ہے) یوتیانوس (بنوتیمن) کا ملک ہے جو وسیع اور مسطح ہے۔اور سیراب اور عمیق ہے۔وہاں نباتات اور اشجار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔جوتا بقد آدم ہوتے ہیں۔اور جن کی وجہ سے جنگلی اونٹ ہرنوں کے گلے اور بارہ سنگے رہتے ہیں۔اور نیز مویشی اور بھیڑ کے گلے۔مگر ان مواہب قسمت کے ساتھ شیر اور بھیڑیوں کا وجود بھی ہے۔جن سے یہاں کے باشندوں کی خوش قسمتی مبدل بہ بدقسمتی ہے‘‘ (جلد ۲ صفحہ ۲۴)۔اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ مدین کے پاس (مدین خلیج عقبہ کے سر پر واقع ہے) ایک جنگل تھا جس میں (۱) قد آدم درخت تھے اور پیلو اور جنگلی بیر قد آدم ہی ہوتے ہیں۔(۲) وہاں جنگلی اونٹ رہتے تھے۔یہ بھی پیلو اور بیر کے درختوں کی تصدیق کرتا ہے کیونکہ اونٹ اسی قسم کے درختوں پر گذران کرتے ہیں (۳) اس میں مواشی اور بھیڑوں کے گلے رہتے تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدین کی قوم جانور بھی پالتی تھی اور اسی جنگل میں انہیں چرایا کرتے تھے۔

مدین قوم کا نام بھی تھا اور شہر بھی مدین نام اس شہر کا جو ایکہ کے سر پر تھا مدین قوم کی وجہ سے پڑا تھا۔پس شہر کا نام بھی مدین تھا اور قوم کا نام بھی مدین تھا۔چنانچہ قرآن کریم نے دونوں معنوں میں اس لفظ کو استعمال فرمایا ہے۔قوم کے معنے میں سورۂ ہود میں ہے۔وہاں فرماتا ہے وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا (ہود:۸۵ نیز الاعراف:۸۶ و العنکبوت:۳۷) اور شہر کے معنوں میں توبہ میں فرماتا ہے وَ اَصْحٰبِ مَدْیَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ (التوبۃ:۷۰) یعنی کیا ان کو مدین شہر کے رہنے والوں اور ان بستیوں کی خبر نہیں پہنچی جن کو اُلٹا دیا گیا تھا (یعنی قوم لوط کی بستیاں)

مدین قوم حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تھی یہ مدین قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھی بائبل میں لکھا ہے۔’’اور ابراہیم نے ایک اور جورو کی۔جس کا نام قتورہ تھا۔اور اس سے زمران اور یقسان اور مدان اور مدیان اور اسباق اور سوخ پیدا ہوئے۔اور یقسان سے صباء اور ددان پیدا ہوئے۔اور ددان کے فرزند اسوری اور لطوسی اور لومی تھے۔اور مدیان کے فرزند عیفہ اور غفر اور حنوک اور ابیداع اور الدوعا تھے۔اور یہ سب بنو قتورہ تھے۔(پیدائش باب ۲۵ آیت ۱ تا ۴)

اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔اور ان کی بیوی قتورہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔چونکہ اس جگہ صرف یقسان اور مدیان کی اولاد گنائی گئی ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لڑکوں

کی اولاد نہیں ہوئی یا ان کی اولاد زیادہ نہیں پھیلی اور بھائیوں کی اولاد کے ساتھ مل جل گئی۔ یقسان جو بڑے لڑکے تھے ان کی نسل میں سے ان کے لڑکے ددان کی نسل بھی ایک قبیلہ کی صورت میں مشہور ہے۔ اور یہ لوگ مدین یعنی چچا کی اولاد کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ چنانچہ مصنف ارض القرآن کا خیال ہے۔ کہ اصحاب الایکہ ددان قوم ہی کے لوگ تھے جو مدین کے ساتھ ہی ایکہ میں رہتے تھے (جلد ۲ صفحہ ۲۱، ۲۲)۔ اور گویا بمنزلہ ایک ہی قوم کے تھے میرے نزدیک یہ رائے معقول ہے۔ بشرطیکہ یہ سمجھا جائے کہ دونوں قومیں مل کر رہتی تھیں۔ اور ان کا ایک ہی قسم کا تمدن تھا۔ تجارت پیشہ بھی تھے اور جانوروں کے گلے بھی پالتے تھے۔ یہ نہیں کہ ایک حصہ تجارت پیشہ تھا۔ جو مدین تھے اور ایک حصہ جانور پالنے والا تھا۔ جو ددان تھے اور جنگل میں رہتے تھے۔ کیونکہ یہ قرآن کریم کے بیان کے خلاف ہے۔ بہرحال اصل قوم بنو قتورہ تھی۔ جو ایک ماں اور باپ سے تھے۔ باقی تو اندرونی تقسیمیں تھیں۔

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر یہ قوم بنو اسماعیل کے اندر جذب ہوگئی تھی کیونکہ پیدائش باب ۳۷۔ آیت ۳۶ میں پہلے تو لکھا ہے کہ حضرت یوسف کو مدیانیوں نے فوطیمار کے پاس مصر میں فروخت کر دیا۔ اور پھر باب ۳۹ میں لکھا ہے کہ فوطیفار مصری نے یوسف کو اسماعیلیوں کے ہاتھ سے خریدا (آیت ۱)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے یہ قوم بنو اسماعیل میں جذب ہوگئی تھی۔ اور وہی قوم کبھی مدیانی کہلاتی تھی۔ اور کبھی اسماعیلی۔

مدین قوم کا زمانہ باقی رہے یہ سوال کہ یہ قوم کب ہوئی۔ اور شعیب کون تھے؟ ان سوالات کے جواب مفسرین اور مؤرخین نے مختلف دیئے ہیں ان کے لئے دیکھو سورہ اعراف ع ۱۸۶/۱۱۔

اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کے ایک ہونے کا ثبوت قرآن سے یہ امر کہ اصحاب مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی جماعت یا قوم تھے۔ اس امر سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے ان دونوں کے عیوب ایک ہی قسم کے گنائے ہیں۔ سورۂ اعراف میں مدین قوم کی نسبت آتا ہے۔ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف: ۸۶) ماپ اور تول پورے دیا کرو اور لوگوں کو چیزیں تول کر دیتے وقت کمی نہ کیا کرو۔ اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ بعینہٖ یہی الفاظ اصحاب ایکہ کی نسبت ہیں۔ جن کا ذکر سورہ شعراء میں آتا ہے انہیں مخاطب کر کے بھی حضرت شعیب فرماتے ہیں اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ۔ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ۔ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (الشعراء: ۱۸۲، ۱۸۴) یعنی وزن پورا دیا کرو۔ اور لوگوں کو گھاٹا نہ دیا کرو۔ اور سیدھی ڈنڈی سے تولا کرو اور لوگوں کی

چیزیں کم تول کر نہ دیا کرو۔ اور زمین میں فساد نہ کیا کرو۔ ان دونوں حوالوں سے ظاہر ہے کہ اصحاب مدین یا اصحاب ایکہ میں ایک ہی قسم کی بدیاں تھیں اور ان کا بڑا گذارہ تجارت پر تھا اور اس میں وہ دھوکے فریب سے بہت کام لیتے تھے۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ مدین شہر میں تو مدین قوم رہتی تھی۔ اور دوان جنگل میں رہتے تھے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مدین قوم کا گذارہ تجارت پر تھا۔ اور اصحاب ایکہ کا گلہ پالنے پر۔ تو اس صورت میں قرآن کریم نے جو اصحاب ایکہ کے کام بھی تجارت میں دھوکہ دینا اور باٹوں اور پیمانوں میں شرارت کرنا بتایا ہے وہ غلط ہو جاتا ہے۔ پس اصل بات یہ ہے کہ دونوں نام ایک ہی قوم اور ایک ہی تمدن رکھنے والی قوم کے ہیں۔ صرف دو صفات کی وجہ سے دو ناموں سے بنو قتورہ کو پکارا گیا ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۰﴾ ع ۵ ۱۴

اس لئے ہم نے انہیں (بھی اسی طرح سخت) سزا دی تھی۔ اور یہ دونوں (جگہیں) ایک (صاف اور) واضح راستے پر (واقع) ہیں۔

حلّ لُغات۔ امام مبین لَبِاِمَامٍ مُّبِين: اَلْاِمَامُ الطَّرِيْقُ الْوَاسِعُ۔ امام کے معنے کھلے راستہ کے ہیں وَبِهٖ فُسِّرَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ اَیْ بِطَرِيْقٍ يُؤَمُّ اَیْ يُقْصَدُ: یعنے آیت اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ میں امام کے معنے کھلے راستہ کے کئے جاتے ہیں یعنی ایسا راستہ جس کا قصد کیا جاتا ہے وَقَالَ فَرَّاءُ اَیْ فِیْ طَرِيْقٍ لَهُمْ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا فِیْ اَسْفَارِهِمْ فَجَعَلَ الطَّرِيْقَ اِمَامًا لِاَنَّهٗ يُتَّبَعُ اور فرّاء نے اِمَامٍ مُّبِيْنٍ کے معنے کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ راستہ جس پر وہ اکثر اپنے سفروں میں گذرتے ہیں اور راستے کو امام اس لئے کہا کہ اس کے پیچھے چلا جاتا ہے یعنی جدھر وہ جاتا ہے ادھر ہی جانا پڑتا ہے۔ (تاج)

تفسیر۔ اصحاب الایکہ اصحاب مدین کے مقام کا محل وقوع اصحاب ایکہ یا اصحاب مدین کا مقام ایسا تھا کہ شام اور مصر کو جانے والے قافلے ان کے پاس سے گذرتے تھے۔ اور مبین اس لئے فرمایا۔ کہ وہ راستہ بہت چلتا تھا۔ اور جو راستے بہت چلتے ہوں ان کے نشان واضح ہوتے ہیں۔ اس قوم کے ذکر سے اس امر کی ایک اور مثال پیش کی ہے کہ استراق سمع کرنے والے لوگ آخر تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔

قوم لوط کے متعلق سبیل مقیم اور اصحاب الایکہ کے متعلق امام مبین کہنے کا مطلب قوم لوط کے

متعلق فرمایا تھا۔ وہ ایک سَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ پر واقع ہیں۔ اور اس جگہ فرمایا ہے اصحاب ایکہ کا مقام ایک اِمَامٍ مُّبِيْنٍ پر واقع ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ لوط کی بستیوں کے پاس سے گذرنے والا راستہ ہمیشہ قائم رہے گا لیکن ایکہ والے راستہ کے نشانات تو باقی رہیں گے۔ لیکن اس راستہ پر قافلوں کا گذر بند ہو جائے گا۔ چنانچہ واقعات نے اس کی تصدیق کر دی۔ پہلا راستہ تو اب تک جاری ہے دوسرے پر قافلے جانے بند ہو چکے ہیں۔

وَ لَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۱﴾

حجر والوں نے (بھی) یقیناً (ہمارے) پیغمبروں کو جھٹلایا تھا۔

حلّ لُغَات۔ اَلْحِجر اَلْحِجْرُ اَلْحِصْنُ حجر کے معنے ہیں۔ قلعہ۔ نیز دیار ثمود کو بھی حجر کہتے ہیں (اقرب) اَلْحِجْرُ وَالتَّحْجِيْرُ اَنْ يُّجْعَلَ حَوْلَ الْمَكَانِ حِجَارَةٌ۔ حجر اور تحجیر کے معنے مکان اور ارد گرد پتھروں کی دیوار بنانے کے ہیں۔ وَسُمِّيَ مَا اُحِيْطَ بِهِ الْحِجَارَةُ حِجْرًا۔ اور جس جگہ کے گرد پتھروں کی دیوار ہو اسے بھی حجر کہتے ہیں۔ (مفردات)

تفسیر۔ یہ رکوع اور اگلی سورۃ النحل کا پہلا رکوع بہت سے اہم مطالب اور پیشگوئیوں پر مشتمل ہیں۔

اصحاب الحجر سے مراد حجر سے مراد وہ احاطہ یا قلعہ یا شہر ہوتا ہے جس کے گرد پتھروں کی دیوار ہو۔ اصحاب الحجر سے مراد ثمود وقوم صالح کا شہر ہے۔ اسے حجر اس لئے کہتے تھے کہ مضبوط فصیلوں کا شہر تھا۔ اور جیسا کہ اگلی آیات سے ظاہر ہے پتھروں سے اس کی تعمیر میں بہت کام لیا گیا تھا۔

آنحضرتؐ کا غزوہ تبوک کو جاتے ہوئے حجر کے مقام سے گزرنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوہ تبوک کو جاتے ہوئے اس مقام کے پاس سے گذرے تھے۔ آپ نے صحابہ کو وہاں کا پانی استعمال کرنے سے منع فرمایا کہ یہ بستی الٰہی عذاب کا مقام ہے (بخاری کتاب الانبیاء باب قولہ تعالی و کذب اصحاب الحجر)

ایک رسول کے انکار سے سب رسولوں کا انکار آیت زیر تفسیر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اصحاب الحجر نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔ حالانکہ انہوں نے صرف حضرت صالح کا انکار کیا تھا۔ اس طرز کلام کو سورۂ شعراء میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ وہاں فرماتا ہے کہ نوحؑ کی قوم نے رسولوں کا انکار کیا (الشعراء:۱۰۶) قوم عاد نے رسولوں کا انکار کیا (الشعراء:۱۲۴) قوم ثمود نے رسولوں کا انکار کیا (الشعراء:۱۴۲) قوم لوط نے رسولوں کا انکار کیا (الشعراء:۱۶۱)

حالانکہ ان سب مقامات پر صرف ایک رسول کے انکار کا ذکر ہے اور حضرت نوحؑ سے پہلے تو کوئی بہت سے رسول گزرے بھی نہ تھے کہ ان کے انکار کا ذکر ہوتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نوحؑ اول الرسل تھے۔ (بخاری کتاب الانبیاء باب قولہ تعالیٰ ولقد ارسلنا الٰی قَوْمِہٖ)

ایک رسول کے انکار سے سب رسولوں کے انکار کا الزام لگائے جانے کی وجہ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک رسول کے انکار پر کیوں سب رسولوں کے انکار کا الزام لگا گیا ہے؟ اس کے متعلق علامہ ابوحیان مصنف تفسیر بحر محیط نے نہایت لطیف بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ ایک رسول کے انکار کرنے والوں نے گویا سارے رسولوں کا انکار کیا (البحر المحیط زیر آیت ھذا)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان وہی نفع دیتا ہے جو سمجھ کر لایا گیا ہو۔ پس جو شخص کسی ایک رسول کو پہچان کر اور سمجھ کر مانے گا وہ سب کو مان لے گا (جیسے وہ شخص جس نے خربوزہ یا آم کھایا ہو وہ جب کبھی خربوزہ یا آم دیکھے گا فوراً پہچان لے گا کہ یہ خربوزہ یا آم ہے ایسا ہی جس شخص نے ایک نبی کو سمجھ کر مان لیا وہ یقیناً دوسرے نبیوں کو پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہ کرے گا) مگر جس نے کسی ایک رسول کا بھی انکار کیا۔ اس کے متعلق ہم نتیجہ نکال لیں گے کہ وہ خواہ کسی رسول کے وقت میں ہوتا اس کا بھی انکار کرتا۔ کیونکہ سب نبیوں کے حالات ایک سے ہوتے ہیں۔ یہ نکتہ نہایت لطیف ہے اور زبردست سچائی پر مشتمل ہے اور وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ فلاں قوم نے اگر فلاں مدعی کا انکار کیا ہے۔ تو کیا ہوا؟ وہ پہلے بہت سے رسولوں کو مان رہے ہیں۔ کیا ان پر ایمان لانا انہیں نفع نہ دے گا؟ وہ حقیقت ایمان سے ناواقف ہیں کیونکہ ایسے لوگوں کا پہلے نبیوں پر ایمان محض رسمی ہوتا ہے۔ اگر وہ سمجھ کر پہلے رسولوں کو مان رہے ہوں تو جو شخص انہی کے نقش قدم پر آیا ہوا اور انہی کے حالات میں سے گزر رہا ہو اس کا انکار کیوں کریں؟ پس ان کا ماننا ایمان کی وجہ سے نہیں بلکہ رسماً اور عادتاً ہے اور ایسے ایمان کو ایمان کہنا ظلم صریح ہے۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۙ﴿۸۲﴾

اور انہیں (بھی) ہم نے اپنے (ہر قسم کے) نشان دیئے تھے جس کا نتیجہ (اُلٹا) یہ ہوا کہ وہ ان سے روگردان ہو گئے تھے۔

حلّ لُغَات۔ مُعْرِضِيْنَ مُعْرِضِيْنَ اَعْرَضَ سے اسم فاعل مُعْرِضٌ بنتا ہے اور مُعْرِضُوْنَ اس کی جمع ہے۔ اَعْرَضَ کے معنے ایک طرف ہونے کے ہیں۔ کیونکہ اَعْرَضَ عَرَضَ سے نکلا ہے جس کے معنی پہلو کے

ہیں۔ پس اعراض کے معنے پہلو تہی کے ہوئے۔ یہ دستور ہے کہ جس سے اعراض مقصود ہو انسان اس سے منہ پھیر لیتا ہے اور یہ ناراضگی کی علامت ہوتی ہے پس مُعْرِضِیْن کے معنے ہوئے کہ انہوں نے اس سے انکار کیا۔ انہوں نے منہ پھیر لیا اور توجہ نہ کی۔ (المفردات)

تفسیر ۔ یعنے انہیں آیات الٰہی دکھائی گئیں۔ مگر انہوں نے اعراض کیا۔ پس کیونکر مانا جائے۔ کہ ویسی ہی آیات دیکھ کر دوسرے نبیوں کو وہ مان رہے ہیں یا مان سکتے ہیں۔

گزشتہ تین آیات میں تین قوموں کا ذکر گزشتہ آیات میں تین قوموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ قوم لوط۔ قوم شعیب اور قوم صالح۔ ان میں سے قوم صالح پہلے تھی۔ پھر قوم لوط۔ پھر قوم شعیب۔

قوم لوط، شعیب، صالح کی قوم کا ذکر کرتے ہوئے ان کے زمانے کی ترتیب کو بدلنے کی وجہ

اب سوال یہ ہے کہ زمانہ کی ترتیب کو کیوں بدلا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ مکہ والوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ پہلے انبیاء جن کو تم جانتے ہو۔ ان پر نازل ہونے والے کلام کے منکر بھی ایک حد تک شرارتیں کرنے کے بعد ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار پر تم خوش نہ ہو۔ اور یہ نہ خیال کرو کہ ہم غالب ہیں۔ اور اب تک ہماری شرارتوں کی سزا نہیں ملی اپنے وقت پر تم کو بھی سزا ملے گی جس طرح ان کو ملی اس حجت کو پیش کرنے کا ایک طریق یہ بھی ہو سکتا تھا کہ زمانہ کے لحاظ سے واقعات کو پیش کیا جاتا۔ لیکن دوسرا طریق یہ بھی ہو سکتا تھا۔ کہ اس فاصلہ کے لحاظ سے ان کا ذکر کیا جاتا جس پر یہ قومیں عربوں سے دور یا نزدیک واقع تھیں۔ اور اس موقع پر یہی طریق اختیار کیا گیا ہے اور پہلے زیادہ دور فاصلہ والی قوم یعنی قوم لوط کا ذکر کیا گیا ہے پھر کہا گیا ہے کہ لو ان سے بھی قریب تر ایک قوم گزری ہے۔ یعنی قوم شعیب۔ ان کا بھی حال سن لو پھر اس کے بعد ثمود کی تباہی کا بیان کیا۔ کہ لو یہ قوم قوم شعیب سے بھی تمہارے قریب تر ہے۔ اور خود عرب کے علاقہ میں واقع ہے۔ ان کے حالات سے ہی عبرت حاصل کرو۔

اس سورۃ میں ان قوموں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں تحریر کا رواج کم تھا۔ اور جن کو عرب مانتے تھے۔ حضرت آدم تو سب کے ساجھے ہیں۔ حضرت لوط حضرت ابراہیم کے رشتہ دار تھے۔ اور اس طرح عربوں کے اجداد میں سے تھے۔ حضرت شعیب مدین میں سے تھے جو بنو اسماعیل کے بنو العَم تھے۔ اور بنو اسماعیل سے گہرا تعلق رکھتے تھے اور انہی میں جذب ہو گئے تھے۔ ثمود خالص عرب تھے۔ (مروج الذہب للمسعودی الجزء الثانی ذکر مکۃ وأخبارھا)

وَ كَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور وہ پہاڑوں کے بعض حصوں کو کاٹ کر امن سے مکان بناتے تھے۔

حلّ لُغات۔ يَنْحِتُوْنَ يَنْحِتُوْنَ نَحَتَ سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے اور نَحَتَ الْحَجَرَ کے معنے ہیں۔ سَوَّاهُ وَ اَصْلَحَهٗ۔ پتھر کو کاٹ کر درست کیا اور ٹھیک کیا۔ وَفِي الْقُرْآنِ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اَيْ تَتَّخِذُوْنَ۔ اور قرآن مجید میں جو آیت يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ آئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم پہاڑوں میں گھر بناتے ہو اور نحت الجبل کے معنے ہیں حَفَرَهٗ اس کو کھودا۔ (اقرب)

البیت اَلْبُيُوْتُ اس کا مفرد اَلْبَيْتُ ہے جس کے معنے ہیں۔ اَلْمَسْكَنُ سَوَاءٌ كَانَ مِنْ شَعَرٍ اَوْ مَدَرٍ یعنی بیت مسکن کو کہتے ہیں خواہ وہ بالوں سے یعنی اون کا بنا ہوا ہو جیسے خیمے وغیرہ ہوتے ہیں۔ یا کچی مٹی گارے وغیرہ کا بنا ہوا ہو۔ یعنی کچا و پکا مکان۔ اَلشَّرَفُ اور بَيْتُ شَرَفٍ یعنی بلندی اور عزت کو بھی کہتے ہیں۔ الشَّرِيْفُ اور شریف یعنی سردار قوم کو بھی بیت کہتے ہیں کیونکہ قوم اس کے سایہ تلے رہتی ہے اور وہ قوم کے لئے بطور حفاظت کے ہوتا ہے۔ (اقرب)

سردار قوم کو بیت کہے جانے کے متعلق چند لطیف اشعار اس محاورہ کے استعمال کے متعلق چند نہایت لطیف اشعار ایک مجذوب کے میں نے تاریخ میں پڑھے ہیں کہتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی فوت ہوئے تو ایک مجذوب جو بغداد کے شہر میں رہتا تھا۔ ان کے جنازہ کے موقعہ پر دیکھا گیا اس نے بلند آواز سے ان کی نعش کی طرف اشارہ کر کے یہ شعر پڑھے

وَاأَسَفَا عَلٰى فِرَاقِ قَوْمٍ هُمُ الْمَصَابِيْحُ وَالْحُصُوْنُ
وَالْمُدْنُ وَالْمُزْنُ وَالرَّوَاسِيْ وَالْخَيْرُ وَالْاَمْنُ وَالسُّكُوْنُ
لَمْ تَتَغَيَّرْ لَنَا اللَّيَالِيْ حَتّٰى تَوَفَّتْهُمُ الْمَنُوْنُ
فَكُلُّ جَمْرٍ لَنَا قُلُوْبٌ وَكُلُّ مَاءٍ لَنَا عُيُوْنُ

(تاریخ بغداد لامام ابی بکر حمد بن علی البغدادی جلد ۷ ص ۲۵۶)

یعنی ہائے افسوس ان لوگوں کی جدائی پر روشن چراغ تھے اور قلعے تھے اور شہر تھے اور بادل تھے اور پہاڑ تھے اور امن تھے اور سکون تھے ہمارے لئے۔ زمانہ اس وقت تک نہیں بدلا جب تک موت نے ان کو وفات نہیں دی۔

مگراب تو یہ حال ہے کہ دل انگارا ہے تو آنکھیں پانی بہارہی ہیں۔اس آگ کے سوا ہمارے پاس کوئی آگ نہیں۔ اوراس پانی کے سوا کوئی پانی نہیں ۔ان اشعار میں نہایت لطیف طور پر بتایا گیا ہے کہ روحانی سردار قلعوں اور شہروں اور بادلوں اور پہاڑوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور دنیا گویا ان میں بستی ہے اور ان کے ذریعہ سے ان کی حفاظت ہوتی ہے۔

تفسیر۔اصحاب الحجر متمدن اور متمول قوم تھی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ پہاڑوں کو کھود کھود کر مکانات بنایا کرتے تھے اور بڑے طاقتور تھے کوئی ان پر حملہ کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم بڑی متمدن اور متمول تھی کہ کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی ۔کیونکہ یہ قوم دونوں علاقوں خشکی اور پہاڑی علاقوں میں رہتی تھی ۔اٰمِنِیۡنَ کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ قوم ایسی طاقتور تھی کہ کچھ حصہ سال کا پہاڑوں پر سیر وتفریح کے لئے گزارتی تھی ۔مگر باوجود اس کے کسی کو ان کے ملک پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی اوران کے پیچھے ملک میں امن رہتا تھا۔ یا یہ کہ وہ امن کی حالت میں پہاڑ پر جاتے تھے۔کسی گھبراہٹ اور ڈر کی وجہ سے اور دشمن سے پناہ لینے کی غرض سے نہیں۔

اصحاب الحجر کے پہاڑوں کو کھودنے سے مراد پہاڑ کھود کر مکان بنانے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے سوا اور قسم کے ان کے مکان نہ ہوتے تھے بلکہ اس سے خاص عمارتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ان کے تمدن کی ترقی ظاہر ہوتی ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ فن تعمیر میں ان کو خاص مہارت تھی اور انہوں نے بعض اپنی قومی عمارات پہاڑ کھود کر بنائی تھیں جیسے الیفنٹا کیوز بمبئی میں ہیں وہ بھی پہاڑ کھود کر بنائی گئی ہیں اور ہندو فن تعمیر کی مشہور یادگار ہیں باہر سے آنے والے سیاح ان کو دیکھنے جاتے ہیں ۔اسی قسم کی بعض عمارتیں فن تعمیر کے اظہار کے لئے معلوم ہوتا ہے اس قوم نے بھی بنائی تھیں۔

فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُصۡبِحِيۡنَ ۙ﴿۸۴﴾

پھر (وعید کے مطابق) صبح ہوتے (ہی) اس (موعود) عذاب نے انہیں پکڑ لیا۔

حلّ لُغَات۔مُصۡبِحِيۡنَ مُصۡبِحِيۡنَ اَصۡبَحَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں دَخَلَ فِی الصَّبَاحِ وہ صبح میں داخل ہوا یعنی اس پر صبح کا وقت آیا۔فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُصۡبِحِيۡنَ اَیۡ وَهُمۡ دَاخِلُوۡنَ فِی الصَّبَاحِ یعنی ان کو

زلزلہ نے صبح ہوتے ہی آ پکڑا۔(اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے انہیں صبح کے وقت عذاب نے آدبایا۔دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب زلزلہ کا تھا جیسے کہ سورۂ اعراف میں بیان فرمایا ہے فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ (الاعراف:۷۹) ان کے انکار کی وجہ سے انہیں زلزلہ نے آ پکڑا۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے گھروں میں زمین پر گرے کے گرے رہ گئے۔ یعنی مکانوں کے ملبہ کے نیچے دب گئے۔اور کوئی ایسا بھی نہ رہا جو ان کی لاشوں کو اندر سے نکالتا۔

فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ؕ﴿۸۵﴾

اور جو (مال) وہ جمع کیا کرتے تھے اس نے انہیں (اس وقت کچھ بھی) فائدہ نہ دیا۔

حلّ لُغات ۔اَغۡنٰى عَنۡهُ تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ ابراہیم آیت نمبر ۲۲ جلد ھذا۔

يَكۡسِبُوۡنَ یکسبون کَسَبَ سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے۔تفصیل کے لئے دیکھو سورہ رعد آیت نمبر ۴۳ جلد ھذا۔

تفسیر ۔اصحاب الحجر کے اپنے بنائے ہوئے سامانوں سے تباہ کئے جانے کے ذکر کا مطلب یعنے وہ تو بڑے بڑے مکان اپنی حفاظت کے لئے بناتے تھے مگر ان کی یہ صفت ان کے لئے اس وقت الٹی پڑی۔کیونکہ جتنے بڑے مکان ہوں اتنا ہی زیادہ وہ زلزلہ میں نقصان پہنچاتے ہیں۔کیونکہ ان کے نیچے دب جانے والے انسان کی نجات کی کوئی امید نہیں رہتی۔اس میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اے اہل مکہ تم سامان سامان کا شور مچا رہے ہو۔یاد رکھو کہ جب ہمارا عذاب آتا ہے تو معذب قوم کے سامان ان کو فائدہ نہیں پہنچاتے بلکہ ان کی ہلاکت کو اور زیادہ خطرناک بنا دیتے ہیں۔

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَـقِّ ؕ

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو حق (وحکمت) کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے

وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِيۡلَ ﴿۸۶﴾

اور وہ (موعودہ) گھڑی یقیناً آنے والی ہے اس لئے تو (ان کی زیادتیوں پر) مناسب درگذر سے کام لے۔

حل لغات ۔بِالۡحَقِّ الحقّ کے لئے دیکھو سورہ رعد آیت نمبر ۱۵ جلد ھذا۔

اصفح اِصْفَحْ صَفَحَ سے امر کا صیغہ ہے اور صَفَحَ عَنْهُ صَفْحًا کے معنے ہیں اَعْرَضَ عَنْهُ وَتَرَكَهُ وَحَقِيْقَتُهُ وَلَّاهُ صَفْحَةَ وَجْهِهٖ۔ اس سے اعراض کیا اور اس کو چھوڑ دیا۔ اور صَفَحَ کے اصل معنے یہ ہیں۔ کہ اس سے اپنے منہ کو ایک طرف کر لیا۔ یعنی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ صَدَّ عَنْهُ اس سے رک گیا۔ اَعْرَضَ عَنْ ذَنْبِهٖ اس کے گناہوں سے درگذر کیا اور اسے معاف کیا۔ صَفَحَ النَّاسَ۔ نَظَرَ فِیْ اَحْوَالِهِمْ۔ لوگوں کے حالات کو بغور دیکھا۔ صَفَحَ فِي الْاَمْرِ نَظَرَ فِيْهِ۔ کسی معاملہ میں غور وفکر کیا۔ اَلصَّفْحُ۔ صَفَحَ کا مصدر ہے نیز اس کے معنے ہیں اَلْجَانِبُ۔ طرف۔ صَفْحٌ من الْاِنْسَانِ۔ جَنْبُهٗ انسان کا پہلو۔ (اقرب) پس فَاصْفَحِ الصَّفْحَ کے معنے یہ ہوئے کہ (۱) ان سے منہ پھیر لے۔ یعنی اب اتمام حجت ہو چکی ہے اس لئے اب منکروں سے بحث ومباحثہ بند کر دو (۲) ان لوگوں سے زیادہ تعلق نہ رکھو۔ (۳) ان کے گناہوں سے اعراض کرو۔ یہ معنے یہاں مراد نہیں (۴) ان کی حالت پر اچھی طرح غور کرو۔ اور حالات کا بغور مطالعہ کرو۔ اور دیکھو کہ کیا سے کیا ہو رہا ہے؟ (۵) ان کے امور اور حالات کی طرف دیکھو کہ کس طرح گمراہی کی طرف جا رہے ہیں۔

الجمیل اَلْجَمِيْلُ جَمُلَ سے صفت مشبّہ ہے اور جَمُلَ الرَّجُلُ۔ يَجْمُلُ جَمَالًا کے معنے ہیں۔ حَسُنَ خَلْقًا وخُلُقًا کہ ظاہر و باطن کے لحاظ سے اچھا ہو گیا (اقرب) پس فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلُ کے معنے ہوں گے کہ ایسا درگذر کرو جو ہر رنگ میں اچھا ہو۔

تفسیر۔ لفظ ساعة اور اس کا استعمال

یعنے آسمان وزمین کی پیدائش پر غور تو کرو کیا وہ بلا مقصد نظر آتی ہے اس کارخانہ پر نظر ڈالنے سے ہر اک عقل مند سمجھ سکتا ہے کہ اس قدر بڑا انظام کس غرض سے ہے۔ اور اس سے نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ساعة ضرور آنے والی ہے۔ اور ساعة کا لفظ قیامت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اس موعود گھڑی کے لئے بھی جو انبیاء کے دشمنوں کی تباہی اور ان کے ماننے والوں کی ترقی کے لئے مقرر ہوتی ہے۔ آیت کا پہلا حصہ دونوں ساعتوں کے لئے بطور دلیل ہے۔ زمین وآسمان کی پیدائش قیامت کی بھی دلیل ہے اور نبیوں کی کامیابی اور ان کے دشمنوں کی تباہی کی بھی۔

پیدائش دنیا کی غرض

قیامت کی اس طرح کہ اگر انسان کی زندگی صرف اس دنیا تک ختم ہو جاتی ہے۔ تو گویا اس قدر بڑی دنیا اللہ تعالیٰ نے صرف اس لئے پیدا کی ہے کہ انسان اس میں پیدا ہو کچھ دن کھائے پیئے اور پھر مر جائے۔ اور یہ خیال بالکل خلافِ عقل ہے۔ اس قدر بڑے نظام کا پیدا کرنا ایک بہت بڑی غرض کے لئے ہی ہو سکتا ہے۔ اور وہ غرض پوری ہوتی اس دنیا میں نظر نہیں آتی۔ پس ضرور ہے کہ انسان کی زندگی اسی دنیوی حیات تک

ختم نہ ہو۔ بلکہ اس نظام کی عظمت کے مطابق ایک بڑے زمانہ تک چلی جائے جس میں وہ ایک ایسے اعلیٰ مقام کو پالے جواس نظام کی عظمت کے مطابق ہو۔

پیدائش دنیا قیامت کی دلیل ہے اگرغور کیا جائے تو سارا نظام تو الگ رہا۔اللہ تعالیٰ نے چھوٹی سے چھوٹی چیز میں ہی ایسے اسرار رکھے ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔انسانی جسم کو ہی لے لو اس کا نظام کیسا پیچیدہ ہے۔ ہزاروں لاکھوں اطباء اورعلم تشریح کے ماہراس کی حقیقت کومعلوم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔لیکن اب تک ان امور کا احاطہ نہیں کر سکے جوجسم انسانی سے تعلق رکھتے ہیں۔قرآن کریم کے نزول کے زمانہ کے بعد تو یورپ نے سائنس میں بے انتہا کمال حاصل کیا ہے۔مگر اب تک انسانی جسم کے متعلق پورا احاطہ نہیں کرسکا۔پھراس قدر وسیع قوانین پر جس وجود کی بنیاد رکھی گئی ہے اس کی پیدائش کے مقصد کواس قدر حقیر بتانا جیسا کہ قیامت کے منکر بتاتے ہیں کس طرح معقول سمجھا جاسکتا ہے۔

اسی طرح یہ نظام انبیاء کی کامیابی اوران کے دشمنوں کی تباہی پربھی دلالت کرتا ہے۔زمین کوآسمان سے جدا کردو۔پھراس کی کیاحالت ہوجاتی ہے۔ایک دن بھی نہیں ٹھہرسکتی۔پس جولوگ یہ خیال کرتے ہیں۔کہ روحانی آسمان سے قطع تعلق کرکے بچ رہیں گے کیسے اندھے ہیں۔جس طرح اس نظام کامل کا جزو رہتے ہوئے ہی زمین محفوظ رہ سکتی ہے اسی طرح روحانی نظام کا جزو بننے سے ہی انسان ہلاکت سے بچ سکتا ہے ورنہ اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔خصوصاً جبکہ وہ اس نظام پرحملہ آور ہو۔تواس کی نجات قطعاً ناممکن ہے۔پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منکروں کو بتایا گیا ہے کہ آسمان روحانی سے قطع تعلق کرلینے کی وجہ سے ان کے سامان کسی کام بھی نہ آئیں گے بلکہ اب ان کی تباہی اورمسلمانوں کی ترقی کا وقت آن پہنچا ہے۔

اس آیت میں کس زورشور سے کفار کی تباہی کی خبر دی گئی ہے اورساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ اب وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے۔اس کے بعد جس طرح جلد جلد حالات بدلے اور کفار مکہ کی تباہی کے سامان پیدا ہوئے۔وہ ایک ایسا نشان ہے کہ کسی الٰہی سلسلہ میں بھی اس سے پہلے اس کی نظیر نہیں ملتی۔کیونکہ یہ تباہی آسمانِ روحانی کے سب سے بڑے ستارے بلکہ سورج کی مخالفت اوراس سے قطع تعلق کے نتیجہ میں ظاہر ہوئی۔

اس سورۃ کا مکی ہونا زیادہ درست ہے اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سورۃ مکی زندگی کے آخر میں نازل ہوئی زیادہ درست ہے۔کم سے کم یہ آیات تومعلوم ہوتا ہے ضرور مکی زندگی کے آخری ایام میں نازل ہوئی ہیں کیونکہ ان میں مکہ والوں کی تباہی پرخاص زور ہے اوراسے بہت قریب بتایا گیا ہے۔سورہ نحل

کا پہلا رکوع بھی اسی پر دلالت کرتا ہے

اِصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِیۡلَ کا مطلب آیت کے آخر میں یہ جو فرمایا ہے کہ فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِیۡلَ اس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اب ان کی تباہی کا وقت قریب آ گیا ہے اس لئے اب ان سے بحث مباحثہ بند کرو اوران کی طرف توجہ ہی نہ کرو۔ کیونکہ اب بحث مباحثہ کا وقت گذر گیا۔ اب ان کی تباہی کا فیصلہ آسمان سے اُتر چکا ہے اب تو یہ عذاب کے بعد ہی مانیں گے تو مانیں گے۔

صفح کے ساتھ جمیل کا لفظ لگانے کی وجہ جمیل کے لفظ سے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ان سے اعراض کرنے کے یہ معنے نہیں۔ کہ جو کوئی توجہ کرے اس کی طرف بھی توجہ نہ کرو۔ بلکہ یہ معنے ہیں کہ اگر لوگ خود توجہ کریں تو بے شک انہیں سمجھاؤ لیکن عام بحث مباحثہ اب بند کر دو کیونکہ حجت تمام ہو چکی اور انہوں نے آسمانی دلائل سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ بے شک صفح کے معنے معاف کرنے کے بھی ہوتے ہیں مگر اس جگہ وہ معنے مراد نہیں۔ بلکہ صَفَحَ النَّاسَ: نَظَرَ فِیۡ اَحۡوَالِھِمۡ والے معنے مراد ہیں۔ یعنے اب ان کا حال دیکھتے جاؤ اور دیکھو کہ کچھ دن میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں صفح سے ترک مباحثات کی طرف اشارہ ہے نیز صفح کے معنے رک جانے کے بھی ہیں۔ یہ معنے بھی اس جگہ چسپاں ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب وہی ہے جو میں اوپر بتا آیا ہوں کہ اب ان سے عام بحث مباحثہ ترک کر دو۔ یہ صورت ہر نبی کے وقت میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک وقت تک اسے بحث مباحثہ کی اجازت ہوتی ہے مگر حجت تمام ہو چکنے کے بعد اسے بحث مباحثہ سے روک دیا جاتا ہے۔ اور ائمۃ الکفر کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کا ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۸۷﴾

یقیناً تیرا رب ہی بہت پیدا کرنے والا (اور) خوب جاننے والا ہے۔

حلّ لُغات۔ اَلۡخَلَّاقُ الخَلَّاقُ کے معنی ہیں بہت پیدا کرنے والا (اقرب)۔ یہ لفظ خالق کا مبالغہ ہے۔

العلیم اَلۡعَلِیۡمُ بہت جاننے والا۔

تفسیر۔ لفظ خَلَّاقٌ اور عَلِیۡمٌ سے کفار کی تباہی اور مسلمانوں کی حکومت کا ذکر خلّاق

کے لفظ سے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم کسی قوم کو تباہ کرتے وقت ڈرا نہیں کرتے ۔ کیونکہ ہم خلّاق ہیں یعنی بہت پیدا کرنے والے ہیں تباہ کرنے سے ڈر تو اس کو ہو جو پھر پیدا نہ کر سکے مگر ہم تو خلاق ہیں ۔ ہر مفسد قوم کو ہلاک کر کے اس کی جگہ دوسری قوم کو کھڑا کر دیتے ہیں ۔اور ہماری بادشاہت میں کوئی کمی نہیں آتی اس جگہ اس قسم کا مضمون بیان کیا گیا ہے ۔ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے متعلق سورۂ زمر میں بیان کیا گیا ہے وہاں فرعونیوں کی تباہی بیان کر کے فرماتا ہے کہ كَذٰلِكَ ۖ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۔ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۔(الدخان : ۲۹، ۳۰) یعنے اے موسیٰ! دیکھ ہم نے کس طرح اس قوم کو تباہ کر دیا ۔اور ان کی جگہ وہی عزت ایک اور قوم کو (یعنی خود موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو) دے دی اور ان کی تباہی پر آسمان نہ رویا اور نہ زمین روئی یعنے نہ خدا تعالیٰ کی بادشاہی میں کوئی کمی آئی کہ اہل آسمان کو اس پر رنج ہوتا ۔اور نہ اہل زمین کو ان کی تباہی سے کوئی نقصان پہنچا نہ انہوں نے ان کی تباہی پر افسوس کیا کیونکہ انبیاء کے مخالف ہمیشہ ظالم ہوتے ہیں ۔ان کی تباہی کے بعد باقی دنیا افسوس نہیں کرتی بلکہ امن کا سانس لیتی ہے ۔

اور علیم کا لفظ جو آخر میں رکھا ہے ۔اس میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کی تباہی کے بعد دنیا میں جو ایک نیا نظام قائم ہوگا اسے ہم جانتے ہیں ۔وہ ایسا اعلیٰ درجہ کا نظام ہے کہ اسے دیکھتے ہوئے ان لوگوں کی تباہی اور دوسری قوم کے پیدا کرنے پر رنج نہیں خوشی ہونی چاہیے ۔

قرآن کریم کا کتنا کمال ہے ۔ایک مختصر لفظ سے کس قدر وسیع مطالب بیان کر دیئے ہیں اور مسلمانوں کی حکومت کے اعلیٰ نظام کی طرف کس خوبی سے اشارہ کیا ہے قرآنی مطالب کی ترتیب بھی کیسی اعلیٰ ہے ۔شروع سورۃ میں فرمایا تھا ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (الحجر : ۴) ان کو چھوڑ دے کہ کھائیں ۔ دنیوی فائدے اٹھائیں ۔اور لمبی لمبی امیدوں میں پڑے رہیں یہ عنقریب جان لیں گے کہ ان کا کیا انجام ہوتا ہے ۔ اب آ کر فرمایا ۔لو اب وہ گھڑی آ ہی پہنچی ۔اور ان کے کھانے پینے اور بڑی بڑی امیدیں رکھنے کا زمانہ ختم ہو گیا ۔یہ مضمون کا زور ایسا ہی ہے جیسے کہ آبشار کا پانی جب گرنے کے مقام پر آتا ہے تو یکدم اس میں زور پیدا ہو جاتا ہے ۔

ایک اعتراض کا جواب اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۔میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ترقی کے ظاہری سامان کہاں سے پیدا ہوں گے ۔ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ خلّاق ہے ۔جب وہ وقت آجائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ان لوگوں کی تباہی اور مسلمانوں کی ترقی کا فیصلہ کرلے گی ۔تو اللہ تعالیٰ جو خلاق ہے خود ہی سب سامان پیدا کر دے گا ۔

آنحضرتؐ کی ترقی کی ابتدا و انتہاء چنانچہ اس پیشگوئی کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے چند لوگوں کے دلوں میں حج کی رغبت پیدا کی۔ جب وہ حج کے لئے آئے تو انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سنا اور آپ سے ملے پھر جا کر اپنی قوم کو سارا حال سنایا۔ اور وہاں سے ایک وفد آ گیا۔ جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے درخواست کی۔ کہ آپ مکہ چھوڑ کر ہمارے شہر میں چلے آئیں۔ اور آپ نے خدا تعالیٰ کے اذن سے ان کی اس درخواست کو قبول کر لیا (سیرۃ النبی لابن هشام امر العقبۃ الثانیۃ)۔ اور چند دن کے اندر اندر وہ جو مکہ میں کوئی سر چھپانے کی جگہ نہ پاتے تھے۔ ایک زبردست حکومت کے بانی ہو گئے اور وہ دنیوی سامان بھی پیدا ہو گئے۔ جن کے نہ ہونے کی وجہ سے اہل مکہ اپنی فتح یقینی سمجھتے تھے۔ اور وہ اس تغیر عظیم کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۸﴾

اور ہم نے یقیناً تجھے دہرائی جانے والی سات (آیات) اور (بہت بڑی) عظمت والا قرآن دیا ہے۔

حلّ لُغَات ۔ اَلْمَثَانِي اَلْمَثَانِيْ کے معنے ہیں آیَاتُ الْقُرْاٰنِ ۔ قرآن مجید کی آیات۔ مِنَ الْوَادِيْ مَعَاطِفُهٗ یعنی مَثَانِي الْوَادِيْ ۔ وادی کے موڑوں کو کہتے ہیں ۔ مَثْنَى الْاَيَادِيْ کے معنے ہیں ۔ اِعَادَةُ الْمَعْرُوْفِ مَرَّتَيْنِ فَاَكْثَرَ یعنی بار بار احسان کرنے کو مَثْنَى الْاَيَادِيْ کہتے ہیں۔ اس میں دو کی شرط نہیں۔ بلکہ دو یا دو سے زیادہ مرتبہ احسان ہو۔ مَثَانِي الشَّيْءِ ۔ قُوَاهُ وَطَاقَاتُهٗ ۔ مَثَانِي الشَّيْءِ سے مراد اس کی قوتیں ہیں۔ (اقرب)

سبع مثانی کے متعلق مختلف صحابہ اور علماء کا خیال حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ اور علماء کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ سَبْعَ مَثَانِيْ سے مراد اس جگہ سورہ فاتحہ ہے۔ اور ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهَا (ای الْفَاتِحَةُ) اَلسَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَاُمُّ الْقُرْاٰنِ وَفَاتِحَةُ الْكِتَابِ وَسُمِّيَتْ بِذٰلِكَ لِاَنَّهَا تُثَنّٰى فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ ۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ سبع مثانی ہے اور امّ القرآن اور فاتحۃ الکتاب بھی اسے اس لئے مثانی کہتے ہیں کہ یہ ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے قِيْلَ لِاَنَّهَا يُثْنٰى بِهَا عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى ۔ کہ اس کو مثانی اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے خدا کی ثنا کی جاتی ہے۔ ان معنوں کو زجاج نحوی نے جائز قرار دیا ہے لیکن ابن عطیہ نے قواعد صرف کے خلاف قرار دیا ہے۔ علامہ ابوحیان لکھتے ہیں

کہ یہ اعتراض درست نہیں۔ کیونکہ مثانی مُثْنٰی کی بھی جمع ہے جو اثنی رباعی سے مُفْعَل کے وزن پر ہے اور اس کے معنے ثناء کے ہیں۔ یعنے جس میں اللہ تعالیٰ کی ثنا کا مضمون اچھی طرح بیان کیا گیا ہے (بحر محیط زیر آیت ھذا)۔ ان معنوں کے رو سے آیت کے معنے ہوئے ہم نے تجھ کو سات آیتوں والی وہ سورۃ دی ہے کہ جو بار بار دہرائی جاتی ہے یا جس میں سات آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی ثنا کامل طور پر بیان کی گئی ہے۔

تفسیر۔ مثانی کے اصل معنی جب یہ فرمایا کہ یہ لوگ اب تباہ ہونے کو ہیں اور ان کی جگہ مسلمانوں کو برتری ملنے والی ہے۔ تو ساتھ ہی فرمایا کہ ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر اب تم مسلمانوں میں قرآن کی ترویج اور تعلیم پر زیادہ زور دو تا کہ کامیابی کے دنوں کے آنے سے پہلے یہ اس کام کے لئے جو ان کے ذمہ لگنے والا ہے تیار ہو جائیں چنانچہ فرمایا ہم نے تم کو سورہ فاتحہ جیسی نعمت دی ہے جو صرف سات آیات ہیں۔ اور مثانی ہیں مثانی کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتائے جا چکے ہیں۔ کسی شے کی قوت اور طاقت کے بھی ہوتے ہیں۔ اور سورہ فاتحہ کو مثانی کہہ کر یہ بتایا ہے کہ اس میں قرآن کریم کی قوتوں اور طاقتوں کا نچوڑ ہے یعنے ہیں تو سات مختصر آیات لیکن سارے قرآن کے مطالب اجمالاً اس میں آ گئے ہیں۔

قرآن عظیم سے مراد بقیہ قرآن بھی ہوسکتا ہے قرآن عظیم سے مراد بقیہ قرآن بھی ہوسکتا ہے اور مراد یہ ہوگی کہ سورۂ فاتحہ بھی دی جو اجمالی قرآن ہے اور تفصیلی قرآن بھی دیا۔ اور اس سے مراد خود سورہ فاتحہ بھی ہوسکتی ہے۔ اس صورت میں اس سے یہ مطلب ہوگا کہ سورۂ فاتحہ قرآن کریم کا ایک بڑا مہتم بہ حصہ ہے۔ اور قرآن سے سارا قرآن نہیں بلکہ حصہ قرآن مراد لیا جائے گا اور یہ عام محاورہ ہے کہ کبھی جزو کے لئے کل کا لفظ بول دیا جاتا ہے جیسے عام طور پر لوگ کہتے ہیں۔ قرآن سناؤ اور اس سے مراد سارا قرآن سنانا نہیں ہوتا بلکہ اس کا کچھ حصہ سنانا مطلوب ہوتا ہے۔ پس القرآن العظیم کا لفظ سورۂ فاتحہ کے متعلق اس اظہار کے لئے ہے کہ وہ قرآن عظیم کا حصہ ہے اس سے باہر نہیں۔ ان معنوں سے ان لوگوں کے خیالات کی تردید ہوتی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ قرآن کا حصہ نہیں۔

حدیث میں سورہ فاتحہ کا نام سبع مثانی رکھا گیا ہے احادیث میں بھی سورۃ فاتحہ کا نام قرآن عظیم بتایا گیا ہے۔ چنانچہ مسند احمد حنبل میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ھِیَ اُمُّ الْقُرْاٰنِ وَھِیَ السَّبْعُ الْمَثَانِیْ وَھِیَ الْقُرْاٰنُ الْعَظِیْمُ (مسند احمد بن حنبل مسند أبی ہریرۃؓ) یعنی سورۂ فاتحہ ام القرآن بھی ہے اور سبع المثانی بھی ہے اور قرآن عظیم بھی ہے۔

مثانی اور قرآن عظیم سورہ فاتحہ کو کہا گیا ہے اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن عظیم سارے قرآن کا نام نہیں۔ دونوں ہی معنے ایک وقت میں کئے جا سکتے ہیں کیونکہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں۔ یہ بھی کہ سورۃ فاتحہ قرآن عظیم ہے اور یہ بھی کہ سارا قرآن قرآن عظیم ہے۔ کیونکہ یہ دونوں معنے مختلف نقطہ نگاہ کی وجہ سے ہیں۔ اور اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔

اگر قرآن عظیم کے معنے سارے قرآن کے کئے جائیں تو یہ مطلب ہوگا کہ ہم نے تم کو اجمالی قرآن یعنے سورۃ فاتحہ بھی دی ہے اور اس کے علاوہ ایک تفصیلی قرآن بھی دیا ہے۔ پس اس کی تعلیم کی طرف توجہ کرو۔ اور ان لوگوں سے بحث مباحثہ کا خیال جانے دو اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمانوں کو مطالب قرآن خوب زور سے سکھائے جائیں تا کہ وہ نئے نظام کے سنبھالنے کے اہل ہو جائیں۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَ

اور وہ جو ہم نے ان میں سے کئی گروہوں کو عارضی نفع کا سامان دیا ہے اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھ اور ان

لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٩﴾

(کی تباہی) پر غم نہ کھا۔ اور مومنوں پر اپنا (شفقت کا) بازو جھکائے رکھ۔

حل لغات۔ تَمُدَّنَّ۔ تَمُدَّنَّ مَدَّ سے مضارع کا صیغہ ہے اور مَدَّ نَظَرَهٗ إِلَيْهِ کے معنے ہیں طَمَحَ بِبَصَرِهٖ إِلَيْهِ کہ اس کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا (اقرب) پس لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ کے معنے یہ ہوں گے کہ تو ان کی ترقیات کی طرف ٹکٹکی لگا کر نہ دیکھ۔

تفسیر۔ آیت لَا تَمُدَّنَّ کے غلط معنوں کی تردید بعض لوگوں نے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ بصریٰ اور اوزعات سے بنو قریظہ اور بنو نظیر کے سات قافلے آئے تھے وہ کپڑوں اور عطروں اور جواہرات پر مشتمل تھے انہیں دیکھ کر صحابہؓ نے کہا کہ کاش یہ مال ہمارے پاس ہوتا تو ہم کو اس سے طاقت حاصل ہوتی۔ اور ہم اسے خدا کی راہ میں خرچ کرتے (تفسیر القرطبی زیر آیت ھذا)۔ یہ معنے میرے نزدیک درست نہیں۔ اور ان کے غلط ہونے کا یقینی ثبوت یہ ہے کہ سب مفسرین متفق ہیں کہ یہ سورۃ ساری کی ساری مکی ہے (تفسیر القرآن از ویری اور ترجمہ القرآن راڈویل) حتیٰ کہ عیسائی مستشرقین تک یہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ یہ سورہ سب کی سب مکی ہے۔ پھر جب

یہ سورہ مکی ہے تو بنو قریظہ اور بنو نظیر کے قافلوں کو دیکھ کر مسلمانوں کا ایسی خواہش کرنا کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ بنو قریظہ اور بنو نظیر کی حالت تو مسلمانوں نے ہجرت کے بعد دیکھی تھی۔ مکہ میں نازل ہونے والی سورۃ میں اس کا ذکر کیونکر آ گیا؟ نیز سوچنا چاہیے کہ اس آیت میں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مخاطب ہیں۔ صحابہ تو مخاطب نہیں۔ اور آپؐ کی طرف ایسی خواہش منسوب کرنا میرے نزدیک تو کسی صورت میں جائز نہیں بلکہ سوء ادب ہے۔ نیز جبکہ اس سورۃ میں زور ہی اس امر پر ہے کہ ہم مسلمانوں کی ترقی کے سامان خود پیدا کریں گے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دل میں ایسا خیال پیدا ہی کس طرح ہوسکتا تھا کہ خدا تعالیٰ تو کہے کہ اس بارہ میں تو ہم پر توکل رکھ اور رسول لوگوں کے اموال کو دیکھ کر کہے کہ یہ مال ہمارے پاس ہوتا تو خوب ترقی کرتے۔ اسے کونسی عقل تسلیم کرسکتی ہے۔

آیت لَا تَمُدَّنَّ کا مطلب اصل بات یہ ہے کہ اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ میں کفار کے نظام کے ٹوٹنے کا اشارہ تھا۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دل کو جو نہایت حساس تھا اور جس میں اپنی قوم کی خیر خواہی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ لازماً یہ صدمہ ہونا تھا کہ اب میری قوم یا اس کے عمائد ایمان سے محروم رہ جائیں گے اور تباہ کردیئے جائیں گے چنانچہ آپؐ ان صنادید کی حالت کو دیکھ کر جن پر مکہ کے نظام کا مدار تھا۔ سخت افسوس کرتے ہوں گے کہ کاش یہ لوگ تباہ نہ ہوتے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بڑا بنایا ہے اللہ تعالیٰ ان کو دین میں بھی بڑا بناتا تو اچھا ہوتا اور یہ خواہش نہایت پاکیزہ ہے۔ نبی کبھی کسی کی تباہی پر خوش نہیں ہوتا۔ بلکہ چاہتا ہے کہ سب ہی ایمان لے آئیں۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو اس خواہش میں اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ آپ کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعراء:۴) اے محمد! (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) تُو تو شائد اپنے آپ کو اس غم میں ہلاک کرلے گا۔ کہ یہ لوگ سب کے سب مسلمان کیوں نہیں ہوجاتے۔ پس آپؐ کے ان شریف جذبات کو اس خبر سے ٹھیس لگی ہوگی۔

لَا تَمُدَّنَّ کے الفاظ کفار کی تباہی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرتؐ کے لئے بطور تسلی ہیں پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی کے لئے یہ الفاظ بیان فرمائے۔ اور کہا کہ تجھے اپنی قوم کے اکابر کی تباہی کی خبر سن کر افسوس ہوگا۔ کیونکہ تُو ان کی ہدایت کی زبردست خواہش رکھتا ہے مگر اب ہم ان کی تباہی کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ پس اب ان لوگوں کے لئے افسوس کرنا چھوڑ دے۔ اور ان کی ظاہری بڑائیوں کا خیال نہ کر۔ اب تو تیرے رب نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ان کو چھوٹا کردے اور تباہ کردے۔ پس اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا کہ ان کے اموال کو لالچ کی نگاہ سے نہ دیکھ۔ بلکہ یہ فرماتا ہے کہ ان کی ظاہری شان وشوکت دیکھ کر یہ افسوس نہ کر کہ اب عذاب الٰہی ان کو کنگال اور تباہ کر

دے گا۔اوران کی حشمت جاتی رہے گی۔ چنانچہ آیت کا آخری حصہ بھی انہی معنوں کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ یعنے ان کی تباہی پر غم نہ کر۔

لَا تَمُدَّنَّ کے معنی کفار کے اموال کی لالچ کی نگاہ سے دیکھنے کے نہیں

اس جملہ کے ہوتے ہوئے وہ معنے جو بعض لوگوں نے کئے ہیں کس قدر خلاف عقل ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ معنے صحیح ہیں۔تو آیت کا مضمون یہ بن جائے گا کہ اے محمد رسول اللہ! تو ان کے مالوں کو دیکھ کر لالچ نہ کر اور یہ خواہش نہ کر کہ وہ اموال تجھ کو مل جائیں۔ اور تو ان کی تباہی پر غم نہ کھا۔ یہ معنے کیسے لغو ہیں۔اور کس طرح ان کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو رد کرتا ہے۔لیکن جو معنے میں نے کئے ہیں وہ ساری آیت کے مضمون کو ایک دوسرے کا مؤید بنا دیتے ہیں۔

جو شخص دوسرے کے مال کو لینا چاہتا ہے وہ اس کی تباہی پر غمگین کیونکر ہوسکتا ہے وہ تو اپنی خواہش سے عملاً اس کی تباہی کی دعا کرتا ہے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ کے الفاظ بھی میرے کئے ہوئے معنوں کی تائید کرتے ہیں کیونکہ اگر وہ معنے مراد ہوں جن کو میں نے رد کیا ہے۔تو اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ کفار کے متعلق یہ خواہش نہ کر کہ ان کا مال تجھ کو مل جائے اور ان کی تباہی پر افسوس نہ کر۔اور مومنوں کی تربیت کی طرف پوری توجہ کر۔ اگر یہ معنے ہوں تو آیت کے سب ٹکڑے بے ربط ہوجاتے ہیں۔لیکن میرے کئے ہوئے معنوں کی صورت میں یہ الفاظ بھی آیت کے دوسرے حصوں سے کامل طور پر مربوط معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے کفار کی تباہی کا ہم فیصلہ کر چکے ہیں۔ پس اب ان کی جاتی ہوئی شان کو دیکھ کر تو غم نہ کر بلکہ جو لوگ ان کی جگہ لینے والے ہیں یعنے مومن ان کی تربیت کی طرف متوجہ ہو جا کہ اب دنیا کی ترقی پرانے سرداروں کے بچانے سے ممکن نہیں۔ بلکہ اس کا مدار ان لوگوں کی صحیح تربیت پر ہے۔

آیت وَاخْفِضْ سے ہجرت کی طرف اشارہ

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ سے ایک باریک اشارہ ہجرت کی طرف بھی کیا گیا ہے۔ کیونکہ مومنوں کی کامل تربیت ایک نظام کو چاہتی ہے قرآن کریم کے وہ احکام جو نظام کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ان کا عملی اجراء مکہ میں نہیں ہوسکتا تھا۔ پس یہ کہہ کر کہ اب تو مومنوں کی ایسی تربیت کی طرف توجہ کر کہ آگے چل کر یہ دنیا کا نظام سنبھال لیں۔اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اب ہم تجھے اس جگہ لے جانے والے ہیں جہاں تجھے اس تربیت کا موقعہ پوری طرح مل جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ آنکھیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے سے اس لئے منع نہیں کیا گیا۔ کہ نعوذ باللہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کو ان کے مالوں کی لالچ تھی۔ بلکہ اس حسرت سے دیکھنے سے منع کیا گیا ہے کہ اب سرداران عرب کی حشمت جاتی رہے گی اور وہ ایمان سے محروم رہ جائیں گے۔اوران کے اموال ان کو تقویٰ میں بڑھانے کی بجائے ان کی ہلاکت کا موجب ہو جائیں گے۔

وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ۚ۝۹۰

اور (لوگوں سے) کہہ (کہ) میں ہی کھول (کھول) کر بیان کرنے والا کامل نذیر ہوں۔

تفسیر ۔یعنے اب تو بانگ بلند سے ان کو یہ سنا دے کہ میں ہاں میں ہی کھلا کھلا نذیر ہوں۔یعنی اس وقت خدا تعالیٰ نے انذار کا کام میرے ہی سپرد کیا ہوا ہے اس لئے میں الٰہی منشاء کے ماتحت اعلان کرتا ہوں کہ تمہاری تباہی کا وقت آ گیا ہے۔

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ۙ۝۹۱

اس لئے کہ ہم نے باہم بانٹ لینے والوں کے متعلق (اپنا انذاری کلام) نازل کیا ہے۔

حلّ لُغات ۔**المقتسمین** اَلْمُقْتَسِمِيْنَ اِقْتَسَمَ سے اس کا فاعل مُقْتَسِمٌ آتا ہے اور مُقْتَسِمُوْن اس کی جمع ہے۔اِقْتَسَمُوا المالَ بَيْنَهُمْ کے معنی ہیں۔اَخَذَ کُلٌّ قِسْمَہٗ۔انہوں نے مال تقسیم کرلیا اور ہر ایک نے اپنا اپنا حصہ لے لیا۔(اقرب) تَقَاسَمَا الْمَالَ۔اِقْتَسَمَاہُ بَيْنَهُمَا۔انہوں نے آپس میں مال تقسیم کرلیا ۔ فَالْاِقْتِسَامُ وَالتَّقَاسُمُ بِمَعْنًى وَاحِدٍ۔یعنی ان معنوں کے رو سے اقتسام اور تقاسم ہم معنی ہیں (تاج) پس مُقْتَسِمُوْنَ کے معنی ہوں گے تقسیم کرنے والے۔مراد آنحضرت کی دشمنی کے فرائض باہم تقسیم کرنے والوں سے ہے۔

تفسیر ۔عام طور پر اس آیت کے یہ معنی کئے جاتے ہیں ''جس طرح ہم نے مُقْتَسِمِيْنَ پر نازل کیا ہے۔'' (تفسیر لامام رازی زیر آیت ھذا)

كَمَآ اَنْزَلْنَا الخ میں ك کے معنی تعلیل کے ہیں مگر میرے نزدیک اس جگہ ك کے معنی تعلیل کے ہیں اور کاف کا یہ استعمال لغت عربی سے ثابت ہے (اقرب) خود قرآن کریم میں بھی ان معنوں میں ك متعدد جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً فرماتا ہے وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ (البقرۃ:۱۹۹) اللہ تعالیٰ کو یاد کرو کیونکہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے۔ پس

ك کے ان معنوں کے رو سے آیت کے معنے یہ ہوں گے کیونکہ ہم نے (عذاب) مُقْتَسِمِيْنَ پر اُتارا ہے۔

آیت كَمَآ اَنْزَلْنَا الخ پہلی آیت سے متعلق ہے اور یہ آیت پہلی آیت سے متعلق سمجھی جائے گی۔ اور دونوں آیتوں کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو ان لوگوں سے کہہ دے کہ میں نذیر عریان ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مقتسمین کے لئے یہ عذاب اُتارنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ ان معنوں سے مفہوم بہت صاف ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر ک کے معنے ''جس طرح'' کئے جائیں تو مطلب واضح نہیں رہتا۔ کیونکہ اس صورت میں عبارت یہ بنتی ہے کہ ان سے کہہ دے میں نذیر عریان ہوں۔ جس طرح ہم نے مقتسمین پر اتارا ہے۔ یہ معنے جیسا کہ ظاہر ہے کوئی صحیح مفہوم پیدا نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے مفسرین کو اس آیت کے معنے کرنے میں سخت دقت ہوئی ہے اور لمبی لمبی توجیہیں کر کے انہیں کوئی معنے نکالنے پڑے ہیں۔

مفسرین کو اس آیت کے معنوں میں دقت مُقْتَسِمِيْنَ کے معنوں کے بارہ میں بھی مفسرین کو بڑی دقت پیش آئی ہے۔ انہوں نے اس آیت کے معنے یہ کئے ہیں۔ کہ جس طرح ہم نے ان پر عذاب اتارا ہے۔ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھ دینے کی قسمیں کھائی ہوئی ہیں (الکشاف القرطبی زیر آیت کما انزلنا علی المقتسمین)۔ بخاری میں بھی یہ معنی بیان کئے گئے ہیں (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الحجر باب قولہ الذین جعلوا القرآن عضین) مگر میرے نزدیک عربی زبان کی رو سے یہ معنے درست نہیں۔ کیونکہ اِقْتَسَمَ کے معنے قسمیں کھانے کے نہیں ہیں۔ بلکہ تقسیم کرنے کے ہیں۔ چنانچہ اقرب میں ہے اِقْتَسَمُوا الْمَالَ بَيْنَهُمْ ای اَخَذَ كُلٌّ قِسْمَهٗ یعنے جب اِقْتَسَمَ الْمَالَ کا لفظ بولیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے تقسیم کر لیا اور ہر اک نے اپنا اپنا حصہ لے لیا۔ تاج العروس میں ہے تَقَاسَمَا الْمَالَ ۔اِقْتَسَمَاهُ بَيْنَهُمَا یعنے تَقَاسَمَا الْمَالَ کہیں تو اس کے معنے اقْتَسَمَا کے یعنے آپس میں تقسیم کر لینے کے ہوتے ہیں۔ غرض اِقْتَسَمَ کے معنے تاج العروس میں تقسیم کرنے کے لکھے ہیں۔

اقتسم کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں اب سوال یہ ہے کہ پھر لوگوں کو یہ دھوکا کیونکر لگا کہ اس کے معنے باہم قسمیں کھانے کے ہوتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ تَقَاسَمَا کے ایک معنے قسمیں کھانے کے ہیں اور دوسرے معنی تقسیم کرنے ہیں۔ ان معنوں کو بتانے کے لئے اہل لغت لکھتے ہیں کہ تَقَاسَمَا اور اِقْتَسَمَا ہم معنے الفاظ ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ تَقَاسَمَا۔ اقْتَسَمَا کی طرح تقسیم کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نہ یہ کہ اِقْتَسَمَ بھی تَقَاسَمَا کی طرح قسمیں کھانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مفسّرین نے اس مشابہت سے دھوکا کھایا ہے حتّٰی کہ زمخشری جیسے ادیب نے بھی دھوکا کھایا ہے میرے دعویٰ کی تصدیق تاج العروس کے ان الفاظ سے ہوتی ہے

تَقَاسَمَا الْمَالَ۔اِقْتَسَمَاهُ بَیْنَهُمَا فَالْاِقتسامُ وَالتَّقَاسُمُ بمعنًی وَاحِدٍ یعنے ’’تَقَاسَمَا الْمَالَ کے معنے اِقْتَسَمَا الْمَالَ کے ہیں یعنے آپس میں مال تقسیم کرلیا۔پس اِقْتِسَامٌ اور تَقَاسُمٌ ایک ہی معنے رکھتے ہیں‘‘۔اس عبارت سے ظاہر ہے کہ تاج العروس والے کے نزدیک دونوں کا اشتراک تقسیم کرنے کے معنوں میں ہے نہ کہ قسموں کے کھانے کے متعلق۔چنانچہ آگے تاج العروس والے نے اس آیت کو بطور شہادت پیش کیا ہے گو آگے ابن عرفہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ مُقْتَسِمِیْنَ کے معنے تَقَاسَمُوا کے ہیں۔لیکن اوپر کی تشریح کے ماتحت صاف ظاہر ہے کہ تاج والا ان معنوں کو لغت کے معنی نہیں قرار دیتا بلکہ تفسیری معنے قرار دیتا ہے۔

مقتسمین سے مراد آنحضرتؐ کے خلاف تدابیر کرنے والے ہیں اس تمہید کے بعد میں یہ بتاتا ہوں کہ مقتسمین سے کیا مراد ہے۔میرے نزدیک تقسیم کرنے والوں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی کے کام تقسیم کرنے والے مراد ہیں اور مطلب یہ ہے۔کہ جن لوگوں نے تیرے خلاف تدابیر کرنے کے کاموں کو تقسیم کرلیا ہے۔کسی نے یہ ڈیوٹی اپنے ذمہ لے لی ہے کہ مکہ کے باہر کھڑا ہو کر لوگوں کو ورغلائے۔کسی نے یہ ڈیوٹی لے لی ہے کہ یہ شور مچاتا پھرے کہ اگر سچا ہوتا تو ہم جو رشتہ دار ہیں کیوں نہ مانتے۔کسی نے مسلمانوں کو دکھ دینے کی ڈیوٹی اپنے ذمہ لے رکھی ہے کسی نے دوسری اقوام میں پر پیگنڈا کرنے کی ڈیوٹی۔سو ان سب لوگوں کے لئے ہم نے عذاب کا فیصلہ کرلیا ہے بعض لوگوں نے یہ معنے کئے ہیں کہ قرآن کو انہوں نے تقسیم کرلیا ہے کہ بعض حصہ کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں (فتح البیان وقرطبی)۔مگر یہ معنے بھی درست نہیں معلوم ہوتے۔

آیت کا اصل مطلب کیونکہ مُقْتَسِمٌ کے معنے تو باہم تقسیم کرلینے کے ہیں۔اور کسی حصہ پر ایمان لانا اور کسی کو رد کردینا ’’باہم تقسیم‘‘ کا مفہوم ادا نہیں کرتا۔پس کسی جزو پر ایمان لانا اور کسی پر نہ لانا گو بعض کفار کا شیوہ ہے اور قرآن کریم میں مذکور ہے۔مگر اس آیت میں اس مفہوم کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۲﴾

جنہوں نے قرآن کو جھوٹی باتوں کا مجموعہ قرار دیا۔

تفسیر۔عِضِیْنَ کے معنے جھوٹوں کا مجموعہ عِضِیْنٌ اور عِضُوْنَ عِضَةٌ کی جمع ہیں اور عِضَةٌ کا لفظ عَضٰی یَعْضُوْ اعَضْوًا سے بھی نکلا ہے جس کے معنے ٹکڑے کرنے کے ہوتے ہیں اور عَضَهَ یَعْضَهُ عَضْهًا سے بھی

نکلا ہے جس کے معنے جھوٹ بولنے کے ہوتے ہیں۔پس عِضَۃٌ کے معنے جھوٹ کے بھی ہیں اور ٹکڑے کے بھی اور عِضِیْنَ کے معنے بہت سے جھوٹوں کے بھی ہیں اور ٹکڑوں کے بھی۔اگر عِضَۃٌ۔عَضٰی یَعْضُوْا کے مادہ سے مشتق سمجھا جائے تب بھی اہل لغت کے نزدیک اس کے معنے ''ٹکڑہ'' کے علاوہ 'جھوٹ' کے بھی ہوتے ہیں۔(اقرب) غرض ایک مادہ کے رو سے عضین کے معنے 'ٹکڑوں' کے ہیں۔اور دونوں مادوں کے رو سے اس کے معنے 'جھوٹوں' کے ہیں۔ اور میرے نزدیک دوسرے معنے اس آیت میں زیادہ درست معلوم ہوتے ہیں۔مگر ان معنوں کے سمجھنے کے لئے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جَعَلَ کے ایک معنی ظَنَّ کے بھی ہوتے ہیں یعنی ایسا سمجھا۔چنانچہ عربی کا محاورہ ہے جَعَلَ الْحَقَّ بَاطِلًا یعنے سچ کو جھوٹ سمجھا۔(اقرب)

اس آیت کا پہلی آیت سے تعلق اور عضین کے معنے جھوٹ کرنے کی صورت میں جَعَلَ اس آیت میں انہی معنوں میں مستعمل ماننا پڑے گا۔اور ترجمہ یہ ہوگا۔کہ ''وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو جھوٹوں کا مجموعہ سمجھ رکھا ہے'' اور گزشتہ آیتوں سے مل کر مفہوم یہ بنے گا کہ اس موعود عذاب کی خبر ان کو دے دے جنہوں نے تیری مخالفت کی ڈیوٹیاں تقسیم کر رکھی ہیں۔اور قرآن کریم کو جھوٹوں کا مجموعہ سمجھ رکھا ہے اور بتادے کہ اب ان لوگوں کی تباہی کا وقت آ پہنچا ہے۔یہ معنے ایسے واضح ہیں کہ ان سے تمام وہ مشکلات دور ہو جاتی ہیں جو دوسرے مفسرین کو پیش آئی ہیں۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾

سو تیرے رب کی قسم ہم ان سب سے باز پرس کریں گے ان کاموں کے متعلق جو وہ کیا کرتے تھے۔

تفسیر۔لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ سے مراد محاسبہ اور سزا ہے فرماتا ہے کہ تیرے رب ہی کی قسم! اب ایسے سب لوگ سزا پائیں گے۔اور ہم ان سب سے پوچھیں گے پوچھنے کا مطلب اس جگہ وہی ہے جو پنجابی میں پوچھوں گا کا ہوتا ہے۔یعنی ان کی شرارتوں کا اب حساب لیں گے اور ان کو سخت سزا دیں گے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾

سو جس بات (کے پہنچانے) کا تجھے حکم دیا جاتا ہے وہ کھول کر (لوگوں کو) بتادے اور ان مشرکوں (کی بات) سے اعراض کر۔

حلّ لُغات۔ اِصْدَعْ اِصْدَعْ صَدَعَ سے امر کا صیغہ ہے۔ اور صَدَعَهٗ صَدْعًا کے معنے ہیں۔ شَقَّهٗ۔ کسی چیز کو پھاڑ دیا۔ وَقِيْلَ شَقَّهٗ بِنِصْفَيْنِ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ وَقِيْلَ شَقَّهٗ وَلَمْ يَفْتَرِقْ اور بعض کہتے ہیں کہ کسی چیز کو پھاڑ دیا لیکن وہ دوٹکڑے نہ ہوئی۔ صَدَعَ الْاَمْرَ۔ كَشَفَهٗ وَبَيَّنَهٗ: بات کو کھول دیا اور واضح کر دیا۔ صَدَعَ بِالْحَقِّ وَبِالْحُجَّةِ: تَكَلَّمَ بِهَا جِهَارًا۔ حق اور حجت کا علی الاعلان اظہار کیا۔ صَدَعَ بِالْاَمْرِ اَصَابَ بِهٖ مَوْضِعَهٗ وَجَاهَرَ بِهٖ مُصَرِّحًا کہ کسی کام کو برمحل کیا۔ اور اس کی بآواز بلند تصریح کی صَدَعَ الْاَمْرَ بِالْحَقِّ۔ فَصَلَهٗ۔ کسی معاملہ کا درست فیصلہ کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ فَاصْدَعْ میں اسلامی حکومت اور شریعت کے عملی اجراء کی خبر دی گئی ہے

صَدَعَ بِالْحَقِّ کے معنے حق کے ساتھ فیصلہ کرنے بھی ہوتے ہیں۔ اور صَدَعَ کے معنے کھول کر بیان کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ دونوں معنے یہاں چسپاں ہوتے ہیں۔ اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب خدائی فیصلہ ان کی ہلاکت اور مسلمانوں کی ترقی کی نسبت جاری ہو چکا ہے تو اس امر کو خوب کھول کھول کر انہیں سنادے اور مشرکوں سے بحث مباحثہ چھوڑ دے۔ اسی طرح اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے (اور یہی ان معنوں کے ساتھ زیادہ چسپاں ہوتا ہے جو میں اوپر کی آیات کے بیان کر چکا ہوں) کہ اب تُو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلے کرنے شروع کر۔ یعنے تجھے اب ہم اس امر کا موقع دینے والے ہیں کہ شریعت کے تمام احکام کا اجراء عملاً شروع ہو جائے۔ پس تو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق فیصلوں کو جاری کر دے اور مشرکوں کی پرواہ نہ کر اس آیت میں بھی گویا مدینہ کی ہجرت اور اسلامی حکومت کی خبر دی گئی ہے۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۶﴾

ہم یقیناً تجھے ان تمسخر کرنے والوں (کے شر) سے محفوظ رکھیں گے

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾

جو اللہ (تعالیٰ) کے ساتھ کوئی (نہ کوئی) اور معبود بنا رہے ہیں۔ سو وہ عنقریب (اس کا نتیجہ) معلوم کر لیں گے۔

تفسیر۔ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ کا حکم دینے کی وجہ یعنی اب تجھے ان لوگوں کی طرف توجہ کی اس لئے ضرورت نہیں کہ اب بحث مباحثہ والے جوابوں کی جگہ ہم ان کو آسمانی نشانوں کے ساتھ جواب دینا چاہتے ہیں اور تجھ پر ہنسی کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دینا چاہتے ہیں۔ ان کو سوچنا چاہیے تھا کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کے شریک بنا رہے ہیں اور اس کی ہتک کر رہے ہیں تو وہ کب تک ان کی اس حرکت کو برداشت کرتا چلا جائے گا۔

سَوْفَ يَعْلَمُوْنَ کی پیشگوئی کا قومی اور فردی ظہور قومی طور پر تو یہ پیشگوئی بعد ہجرت کفار کی شکست اور ذلت سے پوری ہوئی۔ فردی طور پر بھی اس کا عجیب شاندار طور پر ظہور ہوا۔ عروہ بن زبیر کی روایت ابن اسحاق نے لکھی ہے (تفسیر ابن کثیر زیر آیت ھذا)

آنحضرتؐ پر ہنسی اڑانے والوں کا انجام کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہنسی اُڑانے والے پانچ رؤساء تھے ولید بن مغیرہ۔ عاص بن وائل۔ اسود بن عبد یغوث اور اسود بن المطلب اور حرث بن طلاطلہ۔ ان کے بارہ حضرت جبریل کشف میں رسول کریم صلعم کو نظر آئے اور اسود بن عبد یغوث کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا اسے استسقاء ہو گیا اور وہ اس سے مر گیا۔ ولید بن مغیرہ کے پیر کی طرف اشارہ کیا اسے ایک پرانا زخم تھا جو مندمل ہو چکا تھا اس کے بعد وہ زخم پھٹ گیا اور وہ اس سے مر گیا۔ اور عاص بن وائل کے پاؤں کے تلوں کی طرف اشارہ کیا وہ چند دن بعد گدھے پر سوار طائف کو جا رہا تھا کہ تلے میں کوئی چیز کھُب گئی اور وہ اس سے مر گیا۔ اور حرث بن طلاطلہ کے سر کی طرف اشارہ کیا وہ سر کے زخم سے ہلاک ہو گیا۔ اور اسود بن مطلب کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ اندھا ہو کر مر گیا۔ یہ روایت سعید بن جبیر اور عکرمہ سے بھی مروی ہے۔ سعید حرث بن غیطلہ نام بتاتے ہیں اور عکرمہ حرث بن قیس۔ مگر یہ اختلاف نہیں کیونکہ زہری کے نزدیک غیطلہ اس کی ماں کا نام تھا اور قیس باپ کا نام تھا۔

وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ﴿۹۸﴾

اور ہم یقینا جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس سے تیرا دل تنگ پڑتا ہے۔

تفسیر ۔ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ میں کفار کے مشرکانہ دعاوی کی طرف اشارہ ہے بے شک ہم جانتے ہیں کہ ان باتوں کے باعث تیرا سینہ تنگ ہوتا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ لوگ جو تیرے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ ان سے تیرے دل میں انقباض پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کا اشارہ اوپر کی آیت وَ یَجۡعَلُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا کی طرف ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اے محمد! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم جانتے ہیں کہ ان کے مشرکانہ دعاوی پر ہماری محبت کی وجہ سے تجھے سخت تکلیف ہوتی رہی ہے۔لیکن اب تو خوش ہوجا۔ کہ شرک مٹادیا جائے گا اور توحید قائم کردی جائے گی۔

فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ کُنۡ مِّنَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿۹۹﴾

پس تو اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے (اس کی) تسبیح کر اور (اس کے) کامل فرمانبرداروں میں سے بن۔

تفسیر ۔ تسبیح سے مراد مومنوں کی تربیت ۔ یعنے چونکہ ہم اب توحید کو پھر قائم کرنے لگے ہیں۔ جو تیری آمد کا اصلی مقصد ہے۔ تو اس خوشی میں اپنے رب کی تسبیح کر اور سجداتِ شکر بجالا۔ یا یہ کہ مومنوں کی تربیت کر کے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کا عملی ثبوت دنیا کے لئے مہیا کر۔ کیا ہی لطیف رنگ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے دل پر سے اس غم کا بوجھ ہلکا کیا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

وَ اعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ ﴿۱۰۰﴾ ع

اور اپنے رب کی عبادت کرتا رہ یہاں تک کہ تجھ پر موت (کی گھڑی) آجائے۔

حل لغات ۔ اَلۡیَقِیۡنُ اَلۡیَقِیۡنُ اِزَاحَۃُ الشَّکِّ وَ تَحۡقِیۡقُ الۡاَمۡرِ ۔ یقین کے معنی ہیں شک کو دور کرنا۔ اور کسی معاملہ کی اصلیت تک پہنچنا ۔ اَلۡعِلۡمُ الۡحَاصِلُ عَنۡ نَظَرٍ وَ اسۡتِدۡلَالٍ وَلِھٰذَا لَایُسَمّٰی عِلۡمَ اللّٰہِ یَقِیۡنًا ۔ وہ علم جو غور وفکر اور استدلال سے حاصل ہو۔ اسی وجہ سے خدا کے علم کو یقین نہیں کہتے ۔ کیونکہ اس کا علم کسبی نہیں بلکہ ازلی ہے۔ اَلۡیَقِیۡنُ ۔ اَلۡمَوۡتُ ۔ یقین موت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (اقرب) اس آیت میں

یہی آخری معنے ہیں۔

تفسیر ۔یقین کے معنے اس جگہ پر موت کے ہیں ۔فرماتا ہے کہ اب تو موت تک ہماری عبادت میں لگا رہ یعنے اسلام کو جو ترقی ملے گی ۔ اس میں اب کوئی رخنہ نہیں پڑے گا۔اور تو بافراغت اپنی موت تک کھلے بندوں اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکے گا اور یہ لوگ اس وقت جو تیری عبادات میں روکیں ڈالتے ہیں۔ان کو خدا تعالیٰ اس طرح مٹادے گا کہ تیری ساری زندگی عبادت کی آزادی کے لحاظ سے راحت میں گذرے گی۔

یقین کے معروف معنے بھی اس جگہ ہو سکتے ہیں اور اس صورت میں یہ معنے ہوں گے کہ جس ساعت کا وعدہ ہے اس کے آنے تک خاص طور پر عبادت میں مشغول رہو گویا عذاب یا ساعة کے آثار ظاہر ہونے کا نام یقین رکھا کیونکہ جب تک وعدہ پورا نہ ہو اس کی پوری حقیقت ظاہر نہیں ہوتی۔پس فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہو تو خاص طور پر دعا اور عبادت میں لگ جانا چاہئے تا کہ وہ وعدہ ہر قسم کی خیر کے ساتھ پورا ہو۔

اس کے یہ معنے نہیں کہ دوسرے دنوں میں عبادت چھوڑ سکتا ہے۔کیونکہ جب یہ آیت نازل ہوئی اس وقت بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کرتے تھے پس اس کے معنے معمول سے زیادہ عبادت اور توجہ کے ہیں۔

بعض نادان بدعتی اس آیت کے یہ معنے کرتے ہیں کہ جب تک یقین حاصل نہ ہو عبادت فرض ہے جب یقین حاصل ہو جائے تو پھر نہیں۔کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ’’یقین کے حاصل ہونے تک عبادت کر‘‘ یہ نادان نہیں جانتے کہ اس طرح وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرتے ہیں۔اور گویا یہ کہتے ہیں کہ اس سورۃ کے اُترنے تک آپ کو یقین کامل حاصل نہ ہوا تھا۔اگر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نبوت کے بعد یقین حاصل نہ ہوا تھا تو ان ذلیل لوگوں کو یقین کس طرح حاصل ہو سکتا ہے نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ هٰذِهِ الْخُرَافَاتِ۔ایک دفعہ میرے پاس ایک ایسا ہی شخص آیا اور سوال کیا کہ کشتی کا سوار جب کنارہ پر پہنچے تو کشتی ہی میں بیٹھا رہے یا اُتر آئے۔میں نے کہا۔کہ اگر دریا محدود ہے اور اس کا کنارہ ہے تو کنارہ پر اُتر آئے لیکن اگر دریا بے کنار ہے تو جس کو وہ کنارہ سمجھتا ہے وہ اس کی عقل کا دھوکہ ہے اس لئے وہ جہاں اُترے گا وہیں ڈوبے گا۔اس پر وہ سخت شرمندہ ہوا۔

انڈیکس

جلد پنجم

اشاریہ مضامین	۱
کلید مضامین	۸
اسماء	۵۳
مقامات	٦٦
حلّ اللّغات	۷۰
کتابیات	۷۷

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

اشاریہ کلید مضامین

آ

آخرت ۸
آدمی
آریہ مذہب
آزادی
آسمان
آسیب
آیت؍آیات

ا

ابلیس ۹
اجرام فلکی
احسان
احیاء موتٰی
اخبار غیبیہ
اخلاص
اخلاق؍خلق
ادب؍ادبیات
ارتقاء
اردو زبان ۱۰
ارہاص
استغفار
استہزاء
اسلام
اصحاب الایکہ ۱۱
اصحاب الحجر
اصحاب مدین
اصلاح
اطاعت
اطمینان
اعتزال
افتراء
اقامت الصلوٰۃ
اللہ جل جلالہ
الہام ۱۲
ام الالسنہ ۱۳
ام القریٰ
امت
امن
املاء ما من بہ الرحمن
انجیل
انسان ۱۴
انس ۱۵
انصار
انفاق
اولاد
اہل قرآن
ائمۃ الکفر
ایام اللہ

ایثار
ایفائے عہد
ایمان

ب

بادشاہت ۱۵
باطل
بائیبل
بحث و مباحثہ ۱۶
بجلی
بحرمحیط
بخاری جامع صحیح
بدی
برکت
بعث بعد الموت
بہائیت

پ

پاکیزگی ۱۶
پانی
پہاڑ ۱۷
پیدائش
پیشگوئی

ت

تابع ۱۷
تبلیغ
تبیین ۱۸
تثلیث
تربیت
ترتیل
تمثل
تدبیر
ترقی
تعبیر الرویا
تعلیم
تفسیر
تقدیر ۱۹
تمثیل
تمدن
تمسخر
توحید
تورات
توکل

ث

ثقلان ۲۰
ثمود
ثواب

ج

جبر ۲۰
جذبات
جرم
جزا
جزیہ
جماعت احمدیہ
جمعۃ المبارک ۲۱
جمہوریت
جن

جنت ۲۲
جہنم
جھاگ
جیالوجی

چ

چکڑالوی ۲۳

ح

حجت ۲۳
حدیث
حس/حواس
حساب
حسد
حشر
حفاظت ۲۴
حفظ
حق
حکمت
حکومت

خ

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ۲۴
خشیت
خلافت
خلق
خواب ۲۵
خودغرضی
خوف

د

دابۃ الارض ۲۵
دارالجزاء
دعا
دماغ
دنیا
دل
دین
دوا
دوزخ

ڈ

ڈکٹیٹرشپ ۲۶
ڈھیل
ڈیماکرسی

ذ

ذکر ۲۶
ذہن

ر

رزق ۲۶
رسوم ورواج
رسول
رمل
روح
روزجزا ۲۷
رؤیا
روح المعانی

ز

زکوٰۃ ۲۷
زمین
زندگی
زوج

ژ

ژنداوستا ۲۷

س

سات ۲۷
سادگی ۲۸
ساعت
سائیکوانیلسس
سائنس
سائیکالوجی
سبت
سبع مثانی
سپرچولسٹس
سپرچولازم
ستارہ
ستر
سجع
سزا
سماء
سلام
سوسائٹی ۲۹
سورج
سورۃ
سیاست

ش

شادی ۲۹
شراب
شرک ۳۰
شریعت
شفقت
شکر
شہاب ثاقب
شہادت ۳۱
شیطان

ص

صبر ۳۲
صحابہ رضی اللہ عنہم
صدیق
صداقت
صلح حدیبیہ
صلصال

ط

طب ۳۲
طبیعت
طلاق
طول عمل ۳۳
طہارت

ظ

ظل ۳۳

ظلی نبوت
ظلمت

ع

عبد ۳۳
عبرت
عدد
عدل
عذاب
عرب (قوم) ۳۴
عربی زبان
عرش ۳۵
عرفہ
عصمت
عفت
عقل
علاج
علم
عمل ۳۶
عورت
عید
عیسائیت

غ

غذا ۳۶
غزوہ
غفران ۳۷
غلبہ
غیب
غیرت
غیر مبایعین

ف

فاشزم ۳۷
فترۃ
فرشتہ
فطرت
فضل ۳۸
فلسفہ

ق

قانون ۳۸
قرآن کریم
قربانی ۴۲
قسم
قلب
قوم/اقوام
قیامت ۴۳

ک

کافر/کفار ۴۳
کامیابی
کتاب
کثرت
کشف
کشاف
کشش ثقل
کفر ۴۴
کلام الٰہی
کلمہ

کھجور
کینہ

گ

گمراہ ۴۵
گناہ

ل

لعنت

م

مادہ
مامور
مایوسی
مٹی
مثال ۴۶
مثل
مجدد
مجنون
محبت
مدیانی
مذہب
مردہ
مس شیطان
مستشرق
مسلم / مسلمان
مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ۴۷
مشرک
معرفت
ملائکہ
منہاج نبوت
موت
مومن
مہلت
مہمان نوازی

ن

نبی / نبوت ۴۸
نسخ ۴۹
نشان
نصیحت
نظام
نظام کائنات
نفخ
نماز ۵۰
نور
نہر
نیکی

و

وحدت ۵۱
وحی
وعدہ
وعظ
وید

ہ

ہجرت
ہدایت
ہندو مذہب

ی

یقین
یوم البعث ۵۲
یہودیت

اسماء

آ۔ا ۵۳
ب ۵۵
پ۔ث۔ج ۵۶
چ۔ح۔خ۔د۔ڈ۔ر۔ز ۵۷
س۔ش۔ص۔ط۔ع ۵۸
غ۔ف۔ق۔ک ۶۰
گ۔ل۔م ۶۱
ن۔و۔ہ ۶۴
ی ۶۵

مقامات

ا۔ب۔ت۔ٹ۔چ۔ح ۶۶
خ۔د۔ر۔س۔ش۔ط۔ع۔ف ۶۷
ق۔ک۔گ۔م۔ن ۶۸
ہ۔ی ۶۹

حل الغات

ا ۷۰
ب۔ت۔ث۔ج۔ح ۷۱
خ۔د۔ذ۔ر۔ز۔س ۷۲
ش۔ص۔ض۔ط۔ظ۔ع۔غ ۷۳
ف۔ق۔ک۔ل۔م ۷۴
ن۔ہ۔و ۷۵
ی ۷۶

☆☆☆☆☆

کلیدِ مضامین

مرتبہ: سید عبدالحئی ایم۔اے

آ

آخرت
اگلے جہان کی زندگی اس جہان کی ظل ہوگی ۱۸۹
اگلے جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے بالکل مختلف ہیں ۱۸۹

آدمی نیز دیکھئے انسان بشر
آدمی بشری ترقی کے اس حصہ کا نام ہے جس میں ایک جماعت نے ملکر رہنے اور ایک دوسرے سے تعاون کرنے اور ایک نظام کی پابندی کا اقرار کیا ۲۹۲

آریہ مذہب
آریہ مصنفین کے اعتراض کا جواب کہ قرآن کریم کی تعلیمات دوسری الہامی کتب سے چرا لئے گئے ہیں ۲۴۳
عقائد میں تضاد ۱۵۲
آریوں کے عقیدہ الہام کا رد ۱۱۰
آریوں کے اس اعتراض کا جواب کہ محدود عمل کا غیر محدود ثواب کیونکر مل سکتا ہے ۶۲

آزادی
کوئی شخص علی الاطلاق آزاد نہیں ہوتا ۲۲۶
خدا تعالیٰ کی اطاعت میں حقیقی آزادی رہنے والی ہوتی ہے ۳۲۱

آسمان
آسمان ایسے ستونوں پر کھڑے ہیں جو نظر نہیں آتے ۸
آسمان کی قوت مؤثرہ اور زمین کی قوت متأثرہ ۱۵، ۲۴
روحانی آسمان سے مراد ۱۵
انسانی طبائع روحانی سماء (آسمان) کے لئے بمنزلہ زمین کے ہوتی ہیں ۱۵
الہامی کتب میں آسمان استعارۃً اللہ تعالیٰ کے قرب کا مقام قرار دیا گیا ہے ۱۴۶
قرآن کریم میں مختلف مواقع پر آسمانوں کی حفاظت اور شہب گرنے کا ذکر ۲۵۰
سماء دنیا سے مراد نبی کی مجلس ہے ۲۵۵
روحانی ستاروں کے قیام سے روحانی آسمان کا قیام ہے ۲۳۸
روحانی آسمان کی حفاظت کا مفہوم ۲۳۸
روحانی آسمان سے قطع تعلق کے نتائج ۳۶۰
آسمان کے دروازے کھلنے کا مطلب ۲۳۲
آسمانی نعمتیں ۲۴۱

آسیب نیز دیکھئے جادو سحر
یہود حضرت مسیح کو آسیب زدہ کہتے تھے ۲۱۱

آیت/آیات
آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کے متعلق ایک یہودی کا کہنا کہ اگر یہ ہماری کتاب میں اترتی تو ہم عید مناتے ۲۰۱
آیت بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے متعلق اس اعتراض کا جواب کہ یہ آیت زردشتی کتب سے سرقہ ہے ۲۴۳
حضرت مصلح موعود کے دل میں ڈالا جانا کہ بسم اللہ ہر ایک سورۃ کی کنجی ہے ۲۷۶

آیت یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیۡهِمۡ کے متعلق
حضرت مصلح موعود کو القاء ۲۷۵
آیت اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ اکیلی
ہی قرآن مجید کی صداقت کا بیّن ثبوت ہے ۲۱۴
آیت اُدۡخُلُوۡهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیۡنَ ملائکہ کا قول معلوم
ہوتا ہے ۳۱۹
آیت القی الشیطن فی امنیته کے معنی ۲۴۴
حتی تاتیک الیقین کے غلط معنوں کا رد ۳۷۵
آیت مثل کلمة طیبة کی تفسیر از حضرت مسیح موعود
علیہ السلام ۱۴۳

ا

ابلیس
آدم کے نظام کے تابع نہ ہونے والے انسانوں
کے سردار کو ابلیس اور شیطان کے ناموں سے پکارا
گیا ہے ۳۰۶
ابلیس سے سجدہ نہ کرنے کی باز پرس کیوں کی گئی
جبکہ وہ فرشتہ نہ تھا ۳۰۲
ابلیس کی ناری طینت اس کے جنوں میں سے ہونے
کے سبب سے تھی ۲۸۴
مفسرین کی طرف سے ابلیس کی طرف منسوب بعض
غیر معقول باتیں ۲۵۲

اجرام فلکی
اجرام فلکی کامل اطاعت سے انسان کی خدمت میں
لگے ہوئے ہیں ۱۳
دواؤں کا اثر اجرام فلکیہ کے تابع ہے ۷۹

احسان
انسان اللہ تعالیٰ کے احسانات کی گنتی نہیں کر سکتا ۱۶۸

احیاء موتی
(جسمانی) مُردوں کا زندہ ہونا قرآنی تعلیم کے
خلاف ہے ۷۴

اخبار غیبیہ (نیز دیکھئے پیشگوئی غیب اور الہام)
اس بات کی تردید کہ شیاطین اور جن اخبار غیبیہ کو
اُچک لیتے ہیں ۳۷

اخلاص
اخروی ثواب عمل کا نہیں ہوتا بلکہ عمل کے ساتھ
اخلاص باللہ کا نتیجہ ہوتا ہے ۱۳۴

اخلاق/خلق
الہام کا تعلق تمدن اور اخلاق سے ہے ۲۹۸
اخلاق کامل اللہ تعالیٰ کی صفات کی کامل اتباع اور
پوری نقل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے ۹۲
اخلاق حسنہ اگلے جہان میں جنت کے دروازوں کی
شکل میں متمثل ہوں گے ۶۲
اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی تعلیم اعلیٰ اخلاق
پر مبنی ہوتی ہے ۱۴۶
قرآن کریم کی اخلاقی تعلیم ۱۵۴، ۱۵۵
قرن اول کے مسلمانوں کے اخلاق کا نمونہ ۱۰۳، ۱۰۴
آنحضرتؐ کے اخلاق کو دیکھنا ہو تو قرآن کریم
کو دیکھ لو ۱۵۷
با اخلاق بننے کے لئے اہم اصول ۹۲

ادب/ادبیات
قرآن مجید کو ادب میں بہترین مجموعہ قرار دیا گیا ہے ۲۲۱

ارتقاء
قرآن کریم خلق عالم کی تدریجی پیدائش پر بار بار زور
دیتا ہے ۲۷۸
قرآن کریم انسانی پیدائش میں ارتقاء کا تو قائل
ہے مگر ایسے ارتقاء کا نہیں جو اتفاقاً ہو گیا ہو ۲۷۳

ایسا ممکن ہے کہ انسان پہلے ناری وجود ہوا اور زمانہ کے تغیرات سے بدلتے بدلتے ارتقاء کے ماتحت طینی وجود ہو گیا ہو ۲۹۹
انسانی ارتقاء کسی دار الجزاء کا تقاضا کرتا ہے ۲۷۶

اردو زبان

ہندوستان کی آئندہ زبان اردو ہوگی اور کوئی زبان اس کے مقابل پر نہیں ٹھہر سکے گی ۱۱۰
مسیح موعود علیہ السلام پر اردو زبان میں الہامات کا نزول ۱۱۰

ارہاص

دوسرے انبیاء کی نبوتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بطور ارہاص تھیں ۲۳۹

استغفار

انبیاء کے استغفار کی حقیقت ۱۷۹

استہزاء

سب نبیوں کے دشمنوں نے ان سے استہزاء کیا ۲۳۱
کفار کے استہزاء کے نتیجہ میں گناہ ان کی غذا بن گیا اور انہیں اس میں لذت آنے لگی ۲۳۱
آنحضرت پر استہزاء کرنے والے پانچ روساء مکہ اور ان کا انجام ۳۷۳

اسلام

صداقت

اسلام کی سچائی کے زبردست ثبوت ۲۱۵
ایک یہودی کا اسلامی شریعت کے اعلیٰ ہونے کا اعتراف کرنا ۲۰۱
اسلامی تعلیمات کی خوبیوں کو دیکھ کر بارہا کافر کہہ اٹھتے ہیں کہ کاش وہ بھی مسلمان ہوتے ۲۰۱
یورپ کے لوگ اسلامی مسائل کی برتری کو مانتے ہیں ۲۰۳
اہل یورپ کے اسلام قبول کرنے میں روک ان کی سوسائٹی ہے ۲۰۳

غلبہ کی پیشگوئیاں

اسلامی حکومت کا قیام محض اتفاق نہیں تھا ۲۲۳
قرآن کریم میں جہاں کہیں اسلام کی آئندہ ترقی اور عالمگیر تبلیغ کا ذکر ہے وہاں حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر ضرور آتا ہے ۲۷۵
قرآن کریم میں پیشگوئیاں ہیں کہ مسلمان جب بھی اسلام سے غافل ہوں گے اللہ تعالیٰ مامور بھیجتا رہے گا ۲۲۵
غلبہ اسلام کی پیشگوئی ۷۶

ترقی

آنحضرتؐ کے زمانہ میں اسلام کی ترقی ۹۵
صلح حدیبیہ اسلام کی آزادی اور ترقی کی بنیاد تھی ۴۲
پہلی صدی میں اسلام کی فتوحات ۱۰۱

تنزل

موجودہ زمانہ میں اسلام کے تنزل کی وجہ ۱۱۵

احیاء

اسلام کے دوبارہ احیاء کا ذریعہ پیش لفظ
اس زمانہ میں اسلام کی ترقی کی مہم کو سر کرنے کا طریق ۹۸،۹۷
کاش جماعت احمدیہ اپنی ذمہ داری کو سمجھے اور اسلام کے کھوئے ہوئے متاع کو واپس لے آئے ۱۰۴

تعلیم اور عقائد

اسلامی تعلیمات کی حفاظت ۱۹۸
اسلامی علوم کی بنیاد قرآن مجید پر قائم ہوئی ۲۲۰
آج اسلام کے سوا کوئی مذہب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پیرووں میں سے کوئی خدا تعالیٰ سے زندہ تعلق قائم کر سکتا ہے ۲۲۵

اسلامی حکومت کی صفات ۲۲۳

شریعت اسلامیہ میں زکوٰۃ مقرر کئے جانے کی وجہ ۶۱

خدا تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں تمام مخلوق حصہ دار ہے ۱۶۶

ظاہری اور باطنی پاکیزگی پر زور ۱۴۹، ۱۵۰

اسلامی تعلیمات کے ذریعہ انسان کو ہر قسم کی ترقیات ملیں گی ۵۲

مخالفت

کیا دوسرے مذاہب میں نیک اور پارسا لوگ ہوسکتے ہیں ۱۰۵

اسم/اسماء

اسم سے مراد اسم ذات کی بجائے صفاتی نام ۷۹

اشاعت

اشاعت اسلام کے لئے صحابہ کی قربانیاں ۷۵

اشاعت تعلیم انسانی ظرف کے مطابق ہوتی ہے ۵۰

اصحاب الایکہ

وجہ تسمیہ ۳۴۹

خالص عرب تھے ۱۹۷

حضرت شعیب کی قوم تھی ۳۴۹

اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی قوم تھے ۳۴۹

عرب سے شام اور مصر کو جانے والا راستہ اصحاب الایکہ کے مقام سے گزرتا تھا ۳۴۹

اصحاب الحجر

ثمود اور صالح کی قوم ۳۵۳

بہت طاقتور اور متمدن قوم تھی ۳۵۷

اصحاب مدین

عرب سے شام اور مصر کو جانے والا راستہ اصحاب مدین کے مقام سے گذرتا تھا ۳۵۲

اصلاح

سزا کا اصول اصلاح اور انصاف ہے ۹۳

اطاعت

خدا تعالیٰ کی اطاعت ہی قوت وشان کو بڑھانے والی اور حقیقی آزادی دینے والی ہوتی ہے ۳۲۱

اطمینان

دنیوی ترقی کے باوجود اطمینان کیوں نہیں ہوتا ۶۸

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اطمینان وسرور ۶۸

اعتزال

علامہ زمخشری صاحب کشاف پر اعتزال کا داغ ہے پیش لفظ

افتراء

خدا تعالیٰ پر افتراء کرنے والا بچ نہیں سکتا ۱۹۳

اقامت صلوۃ

دعائیں انہی کی قبول ہوں گی جو اقامت صلوۃ کرنے والے ہوں گے ۱۶۸

اقامت صلوۃ شرک کے مخالف ہے ۱۶۶

اللہ جل جلالہ

ہستی باری تعالیٰ

خدا تعالیٰ کی ہستی کا ایک ثبوت کروڑوں جانداروں کے لئے رزق کا انتظام ۲۶۵

جماعت احمدیہ سے اللہ تعالیٰ کا خاص سلوک ۱۵۸

اللہ تعالیٰ کے لئے جمع صیغہ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں قبضہ اور تصرف کا اظہار مقصود ہو ۱۲۷

اللہ تعالیٰ کی طاقتوں کا انکار اور نعمتوں کا انکار بھی اللہ کا انکار ہے ۱۳۳

صفات باری تعالیٰ

غفور اور رحیم کی صفات ۲۲۲، ۲۲۳

صفات خلاق اور علیم ۳۶۲
قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی صفات کو بیان کرنے میں بے مثل ہے ۱۵۰
صفات الٰہیہ کا کامل ظہور ۱۱
تمام احکام شریعت صفات الٰہیہ پر مبنی ہیں ۹۱
اللہ تعالیٰ کی صفات کی کامل اتباع اور پوری نقل کئے بغیر اخلاق کامل حاصل نہیں ہو سکتے ۹۲
استوی علی العرش سے مراد ۱۱
اللہ تعالیٰ کی صفات تنزیہیہ کو عرش کہا گیا ہے ۱۳
اللہ تعالیٰ کی صفات تشبیہیہ صفات تنزیہیہ کے ماتحت ہوتی ہیں ۱۳
صفت واحد کو خالق کل شیء کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے ۴۶
اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ظاہر کرنے والے دو ناموں واحد اور احد میں فرق ۴۶
اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کا ثبوت ۷۰
اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر انسان کی حفاظت کا بے نظیر نظام ۳۱
خدا تعالیٰ کے والی (محافظ) ہونے کا ثبوت ۳۲
ازلی ابدی ماخذ علوم پیش لفظ
اللہ تعالیٰ کی رویت سے مراد ۵
تصرفات الٰہیہ کا طریق ۴۲
وعند اللہ مکرھم کی وضاحت ۱۸۷
شدید العقاب ہونے کی حقیقت ۲۱
اللہ تعالیٰ زبردستی کسی کو گمراہ نہیں کرتا ۶۶
اللہ تعالیٰ کی شان ایزدی ۸۹،۸۸
حَمِیْد ۱۰۰
عَالِمُ الْغَیْبِ ۲۶
عَزِیْز ۱۰۰
غَنِیّ ۱۱۵
کَبِیْر ۲۵
اَلْمُتَعَال ۲۵
وَاحِدٌ ۴۶

متفرق

قرآن کریم کی حفاظت اللہ تعالیٰ بذات خود کرتا ہے ۲۱۴
قرآن مجید کی معنوی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام سے اس کو ظاہر فرمانے کا ذمہ لیا ہے ۲۲۲
اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کی قسم کھاتا ہے تو اس کا مقصد اس چیز کو بطور شہادت پیش کرنا ہوتا ہے ۳۴۲
قَدَر کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہوتے ہیں ۳۳۱
ہر چیز کے خزانے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھے ہیں اور ضرورت کے مطابق وہ انسانی ذہن کو ادھر منتقل کر دیتا ہے ۲۲۶
خدا تعالیٰ پر افتراء کرنے والا بچ نہیں سکتا ۱۹۳
اللہ تعالیٰ کی مشیت نے جائز رکھا ہے کہ انبیاء کے دشمن اپنے مشغلوں کو جاری رکھیں ۲۶۰
اللہ تعالیٰ کسی کو گنہگار نہیں بناتا بلکہ گناہ کے طبعی نتائج نکالتا ہے ۲۲۹
الہام نیز دیکھئے وحی و رؤیا
الہام الٰہی کو عجیب سمجھنے والوں کو جواب ۲۷۴
انسان کی پیدائش کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ کامل ہو کر الہام الٰہی کو حاصل کر سکے ۲۷۴
انسان میں جبلّی طور پر الہام قبول کرنے کی قابلیت ۲۷۴
صلصال سے مراد انسان میں قبولیت الہام کی قابلیت کا پیدا ہونا ۲۷۸
الہام انسان کی اپنی فطرت کے مطابق ہوتا ہے ۲۱۳
آدم پہلے بشر تھے جن پر الہام نازل ہوا ۲۹۸،۲۹۷

آدم اور انبیاء کے نفخ روح سے مراد نزول الہام ہے ۳۱۰
صرف قرآن کریم کے ماننے والے ہر زمانہ میں خدا تعالیٰ سے براہ راست الہام پانے کے مدعی ہوتے چلے آئے ہیں ۲۲۲
جب عقل صحیح اور آسمانی الہام مل جائیں تو انہیں باردار ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا ۱۶
قول ثابت کی تائید کے لئے اللہ تعالیٰ الہام نازل کرتا ہے ۱۶۲، ۱۶۳
مسیح موعود علیہ السلام پر غیر زبانوں میں الہامات بطور نشان اور معجزات کے ہیں ۱۰۷
مسیح موعود علیہ السلام کا ایک الہام مَا اَنَا اِلَّا کَالْقُرْاٰنِ سَیَظْهَرُ عَلٰی یَدِی مَا ظَهَرَ مِنَ الْفُرْقَانِ ۱۵۷
نبی پر غیر زبانوں میں الہام ۱۰۶
آریوں کا الہام کے متعلق عقیدہ اور اس کا رد ۱۱۰

ضرورت

قرآن کریم کی موجودگی میں الہام کی ضرورت ۲۶۸

علم کا ذریعہ

اصل حقیقت معلوم کرنے کا ذریعہ الہام ہے ۲۴۷
قرآن کریم کے علوم کے متعلق الہام کے ذریعہ رہنمائی ۲۷۵
خدا تعالیٰ کے الہام کے نتیجہ میں انسان اللہ تعالیٰ کا مخلص بندہ بنتا ہے ۳۱۵
الہام کا تعلق تمدن اور اخلاق سے ہے ۲۹۸

الہام کی حفاظت

الہام اور اس کی حفاظت کا سلسلہ ابتدائے عالم سے چل رہا ہے ۳۰۱
کسی الہام کی حفاظت کب تک کی جاتی ہے ۲۲۵
تازہ بتازہ الہامات کے ذریعہ سے قرآن مجید کی حفاظت ۲۲۱
الہامی کتابوں میں صرف قرآن کریم ہی حفظ کیا جاتا ہے ۱۹۵

متفرق

آنحضرت سے پہلے کے انبیاء اور ان کے تابع الہامات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا کرتے تھے ۲۴۸
ایک ان پڑھ مزدور کے مناسب حال الہام ۲۱۳
الہام کی پانی سے مشابہت ۲۳۷
الہامی زبان میں خاندانی یا مذہبی نظام کو نظام شمسی سے مشابہت دی جاتی ہے ۲۴۰

ام الالسنہ

عربی زبان ام الالسنہ ہے ۱۰۹، ۱۱۰

ام القریٰ

نبی کی بستی کو ام القریٰ قرار دیا جاتا ہے ۲۰۴

امت

ایک نبی کی امت میں تابع نبی کی بعثت ۲۴۴
امت محمدیہ میں تابع نبی کی ضرورت ۲۴۶

امن

مسلم کے معنی امن دینے والا ۲۰۲

املاء ما منّ بہ الرحمٰن

علامہ ابوالبقاء کی تصنیف ہے جو اعراب قرآن کے متعلق ہے حضرت مصلح موعودؓ نے اس کی تعریف فرمائی ہے پیش لفظ

انجیل نیز دیکھئے عیسائیت بائیبل

سب کی سب کلام الٰہی پر مشتمل نہیں ۲۴۸
علمی قوم میں آنے کے باوجود محفوظ نہیں رہی ۲۱۸
انجیل کو زبانی یاد کرنے والا کوئی نہیں ۱۹۵

انجیل میں لکھا ہے کہ یہودی حضرت مسیحؑ کو کہتے تھے کہ اس پر جن سوار ہے ۲۱۰
اناجیل میں بدارواح کا ذکر ۲۰۲
مسیح کی آمد ثانی کی علامات ۲۵۰
انجیل کی تعلیم میں تضاد ۱۵۲

انسان نیز دیکھئے بشر

انسان اللہ تعالیٰ کے احسانات کی گنتی نہیں کر سکتا ۱۶۸
نفس انسانی کو اللہ تعالیٰ نے پاک پیدا کیا ہے ۴۹
قرآن کریم بشریت کے تقاضوں کو انسانی تکمیل کے ذرائع قرار دے کر ان کی اصلاح پر زور دیتا ہے ۱۵۶
حضرت ابراہیم کے ذریعہ انسانی قربانی موقوف کی گئی ۱۷۵

وجہ تسمیہ

آدم کو انسان کا خطاب دینے کی وجہ ۲۹۲
جو لوگ اطاعت کا مادہ رکھتے ہیں ان کا نام انسان رکھا گیا ۲۹۷

با مقصد پیدائش

انسانی پیدائش کے ایک ارادہ کے تحت ہونے کا ثبوت ۲۷۶
قرآن کریم میں انسان کی پیدائش کے ذکر کے ساتھ بعث بعد الموت کا ذکر کیوں ہے ۲۷۴
پیدائش انسانی ہی حشر کا موجب ہے ۲۷۵
انسان کی پیدائش کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ کامل ہو کر الہام الٰہی کو حاصل کر سکے ۲۷۳
آنحضرت کی بعثت کا مقصد تمام انسانوں کو جمع کرنا ہے ۲۹۶
کیوں تمام مخلوق میں صرف انسان ہی حشر کا محتاج ہے ۲۷۶

پیدائش

انسانی پیدائش کے مختلف مدارج ۲۷۹
انسان کے مٹی سے پیدا ہونے کی حقیقت ۲۷۸،۲۷۹
انسان کو حمأٍ مسنون سے پیدا کرنے کی حقیقت ۲۷۲،۲۷۳
انسان میں صفت صلصالیت ۲۷۸
انسان کی پیدائش اسی قسم کے اجزاء سے ہے جو مٹی کے تیار کرنے میں خرچ ہوئے ۲۷۹
ارتقاء کے لحاظ سے اگر طینی ابتداء سے پہلے انسان کی ابتداء ناری وجود سے تسلیم کی جائے تو مستبعد نہیں ۲۹۹

فطرت انسانی

انسانی فطرت پاک ہے وہی گمراہ ہوتا ہے جو خود اس فطرت کو خراب کر کے شیطان کے پیچھے چل پڑتا ہے ۳۱۶
انسان میں خیر و شر کی طاقتیں موجود ہونے کی حکمت ۲۷۶،۲۷۷

انسان کی کمزوریاں

انسان کی طبیعت عجلت اور جلد بازی ہے ۲۹۸
کوئی انسان علی الاطلاق آزاد نہیں ہوتا ۲۲۶

انسان کے لئے الہام کی ضرورت

انسان میں جبلی طور پر الہام قبول کرنے کی قابلیت ۲۷۳
انسان میں فطری طور پر خدا تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہنے کی طاقت ہے ۲۷۳
انسان میں اخلاق اور روحانی امور کی موجودگی ۲۷۷
الہام انسان کی فطرت اور قلب کی حالت کے مطابق ہوتا ہے ۲۱۳

جسم انسانی کے اسرار

جسم انسانی کے لامتناہی اسرار ۳۶۰

انسان کی خصوصیت جو اسے دوسری مخلوق سے ممتاز کرتی ہے ۲۷۳
علم النفس کے ماہرین کہتے ہیں کہ انسان میں نقل کرنے کا مادہ سب سے بڑا خاصہ ہے ۲۲۶
انسان کے انیس حواس ۳۱۷

متفرق

ہر چیز کے خزانے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھے ہیں اور ضرورت کے مطابق وہ انسانی ذہن کو ادھر منتقل کر دیتا ہے ۲۶۶
فانی انسان کلام الٰہی کی حفاظت نہیں کر سکتا اس لئے یہ ذمہ داری خود خدا نے لی ہے ۲۶۸
موجودہ اور آئندہ انسان کے لئے روحانی غذا کی ضرورت اور اس کا انتظام ۲۶۵

انس

انس سے مراد جنوبی اور مشرقی دنیا کے لوگ ۲۹۷

انصار

انصار مدینہ کا اخلاص ۳۰

انفاق

اصل انفاق وہ ہے جو طبعی ہو ۱۶۸
صحابہ کرام کا انفاق ۱۶۸

اولاد

بہت سے گناہوں کا باعث اولاد کی محبت ہوتی ہے ۱۷۱
اولاد سے محبت اس حد تک ہونی چاہیے کہ وہ بگڑ نہ جائے ۱۷۱

اہل قرآن

السلام علیکم کہنے پر چکڑالوی اہل قرآن کے ایک اعتراض کا جواب ۶۳

ائمۃ الکفر

ائمۃ الکفر خود انبیاء کی مجالس میں نہیں آتے بلکہ دوسرے کے ذریعہ نبی کی تعلیم معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۲۵۶

ایام اللہ

ایام اللہ سے مراد خاص انعامات اور خاص سزاؤں کے ایام ہیں ۱۱۲

ایثار

حضرت ابوذر غفاری کے ایثار کا واقعہ ۱۰۳

ایفائے عہد

ایک صحابی کے ایفائے عہد کا ایک بے مثال واقعہ ۱۰۳

ایمان

ایمان وہی نفع دیتا ہے جو سمجھ کر لایا گیا ہو ۳۵۴
خشیت اللہ ہو تو پھر ایمان نصیب ہوتا ہے ۲۳۲
کفار کے ایمان سے محروم رہ جانے کی وجہ ۳۱
خوف سے پیدا ہونے والا ایمان ۱۱۲
عمل صالح ایمان کو ترقی دیتا ہے ۱۵۳

ب

بادشاہت

قرآن کریم نے بادشاہت کی جگہ خلافت کو قائم کیا ہے ۷۳

باطل

باطل کی مثال جھاگ سے ۴۹

بائیبل

عہد قدیم کی کتب سب کی سب کلام الٰہی پر مشتمل نہیں ۲۴۸

اگر بائیبل کے سارے نسخے جلا دیئے جائیں تو اس کے پیرو اس کا بیسواں حصہ بھی دوبارہ جمع نہیں کر سکتے ۲۲۰
تحریف وتبدیل کا ثبوت ۳۳۱
بائیبل میں رطب ویابس ۳۳۲، ۳۴۰
آدم کے واقعہ کے بیان میں قرآن کریم اور بائیبل کا موازنہ ۳۰۵
حضرت لوط کے واقعہ میں بائیبل کی غلط بیانی ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲
بائیبل میں فرشتوں اور بدارواح کا ذکر ۲۸۲
حضرت ابراہیم کے متعلق بائیبل کے ایک بیان پر جرح ۱۷۶

بحث ومباحثہ

نبی کو ایک وقت تک بحث ومباحثہ کی اجازت ہوتی ہے مگر حجت تمام ہو چکنے کے بعد اسے بحث ومباحثہ سے روک دیا جاتا ہے ۳۶۱

بجلی

بجلی کی چمک کے فوائد اور نقصانات ۳۳

بحر محیط

تفسیر بحر محیط کا تعارف پیش لفظ

بخاری جامع صحیح

حضرت مصلح موعود کا حضرت خلیفۃ المسیح الاول سے بخاری پڑھنا پیش لفظ

بدی

بدی کی تعریف یہ ہے کہ وہ صفات الٰہیہ کے خلاف ہو ۹۲
کوئی شخص ایسی نیکی یا بدی نہیں کرتا جس میں دوسرے لوگ کسی نہ کسی رنگ میں شریک نہ ہوں ۶۱

برکت

مسیح موعود علیہ السلام کی برکت سے قرآنی علوم کی فراوانی ۱۵۸

بعث بعد الموت (نیز دیکھئے قیامت)

قرآن کریم میں عموماً خلق آدم کے ذکر کے ساتھ بعث بعد الموت کا ذکر کیوں ہے ۲۷۴
بعث بعد الموت کے لئے حشر کا لفظ کیوں استعمال ہوتا ہے ۲۶۹
پیدائش انسانی ہی حشر کا موجب ہے ۲۷۵

بہائیت

ہر ملک میں بہائیت کی تعلیمات مختلف ہیں ۱۶۱
بہائیت پر عامل کسی شخص نے خدا تعالیٰ سے ہمکلامی کا دعویٰ نہیں کیا ۱۶۰
بہاء اللہ نے دو شادیاں جائز قرار دی ہیں لیکن عباس نے اسے تبدیل کر دیا ہے ۱۶۰
بہائیت کے متعلق حضرت مصلح موعودؓ کی ایک عورت سے گفتگو ۱۶۱
بہائیت کی تعلیم پر کہیں عمل نہیں ہوتا ۱۶۰، ۱۶۱
بہائیت اور احمدیت کا موازنہ ۱۶۰

پ

پاکیزگی

قرآن کریم میں ظاہری اور باطنی پاکیزگی پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے ۱۴۹، ۱۵۰
اسلام کے نزدیک پاک جسم سے پاک روح پیدا ہوتی ہے ۱۵۰

پانی

کلام الٰہی کی پانی سے مشابہت ۲۷۳
حق کی مثال پانی سے ۴۹

پہاڑ

پہاڑوں کے فوائد ۱۵
بعض انسانی وجودوں کی پہاڑوں سے مشابہت ۱۵
استعارۃً پہاڑ سے مراد مصائب اور مشکلات ۷۳

پیدائش

سائنس کا یہ دعویٰ کہ صرف حیات سے ہی حیات پیدا ہو سکتی ہے خود قابلِ تحقیق ہے ۲۷۸
زمین و آسمان کی پیدائش انبیاء کی کامیابی اور ان کے دشمنوں کی ناکامی کی دلیل ہے ۳۵۹
زمین و آسمان کی پیدائش قیامت کی بھی دلیل ہے ۳۵۹
قرآن کریم میں عموماً خلق آدم کے ذکر کے ساتھ بعث بعد الموت کا ذکر کیوں ہے ۲۷۴
پیدائش انسانی ہی حشر کا موجب ہے ۲۷۵
انسانی پیدائش کے مختلف مدارج ۲۷۹
انسانی پیدائش میں ارتقاء ۲۷۳
قرآن کریم خلق عالم کی تدریجی پیدائش پر بار بار زور دیتا ہے ۲۷۸
انسان کے مٹی سے پیدا ہونے کی حقیقت ۲۷۳
پیدائش کے چار مراتب ۱۲۰

پیشگوئی

پیشگوئیوں کے اصول

پیشگوئی کا مقصد لوگوں کا ہدایت پانا ہوتا ہے ۱۰۸
پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں اور تازہ آسمانی نشانات نبی کے دو گواہ ہوتے ہیں ۹۷

بنیادی اصول

عذاب ہمیشہ کھلی پیشگوئیوں کے بعد آتا ہے ۲۰۵

قرآن کریم کی پیشگوئیاں

قرآن کریم میں مادی تغیرات کی زبردست پیشگوئیاں موجود ہیں ۷۳
غلبہ اسلام کی پیشگوئی ۷۵، ۷۶، ۷۷
قرآنی تعلیم کی دنیا میں فوری اشاعت کی پیشگوئی ۷۴
مکہ سے آنحضرتؐ کی ہجرت اور پھر فاتحانہ طور پر واپس آنے کی پیشگوئی ۷۶
دشمنانِ اسلام کے لئے سخت عذاب کی پیشگوئی ۳۵

اسلام کی فتح اور کفر کی شکست کی پیشگوئیاں

اسلامی حکومت کے قیام کی پیشگوئی ۲۲۳
آنحضرت کے ہاتھ پر آپ کی قوم کی جمع ہونے کی پیشگوئی ۲۶۹

آخری زمانہ کے متعلق قرآن کریم کی پیشگوئیاں

قرآن کریم میں پیشگوئیاں ہیں کہ مسلمان جب بھی اسلام سے غافل ہوں گے اللہ تعالیٰ مامور بھیجتا رہے گا ۲۲۵
جب بھی مسلمان قرآنی مطالب کے سمجھنے سے قاصر ہو جائیں گے اور اس کے مطالب کو بگاڑ دیں گے اللہ تعالیٰ مامور مبعوث کر کے ان کے شر اور فتنہ سے قرآن کریم کو محفوظ کرے گا ۲۴۶
آخری زمانہ میں سائنسی ترقیات کی پیشگوئی ۲۸۹
نہر سویز کے ذریعہ دو سمندروں کے ملنے اور بڑے بڑے جہازوں کے چلنے کی پیشگوئی ۲۸۹
قوم لوط کی بستیوں کے پاس سے گذرنے والا راستہ ہمیشہ قائم رہے گا ۳۵۳

ت

تابع

تابع کی طاقت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب آقا پاس نہیں ہوتا ۴۳

تبلیغ

اصل غرض تبلیغ ہے اس لئے ہر امر تبلیغ کے مقصد کے تابع ہی رکھا جائے گا ۹۴

مبلغ کی تبلیغ میں اس کے بیوی بچوں کا بھی حصہ ہوتا ہے ۶۱
ہر مخلص مومن کو چاہیے کہ وہ خدا سے دعا کرے تا تبلیغ اسلام کے لئے آسانیاں میسر ہوں ۱۶۸
سچائی کی تبلیغ اس وقت کہیں بھی نہیں ہو سکتی ۱۶۸

تبیین

تباہی کا فتویٰ اسی وقت لگتا ہے جب تبیین ہو چکی ہو ۱۱۰

تثلیث

تثلیث کے رد میں حضرت مصلح موعود کی ایک عیسائی سے گفتگو ۸۰

تربیت

کامل تربیت ایک نظام کو چاہتی ہے ۳۶۷

ترتیل

قرآن مجید کی عبارت ایسی ہے کہ اس کو بغیر ترتیل کے پڑھنے کے چارہ نہیں ۲۱۹

تمثل

انسانی اعمال عالم روحانی میں نہروں کی صورت میں متمثل ہوں گے ۸۴
اگلے جہاں میں ناپاک شہوتیں متمثل ہو کر زخموں کے دھوون کی شکل میں سامنے آئیں گی ۱۳۰

تدبیر

انبیاء ہمیشہ موعود امور کے لئے دعا اور تدبیر سے کام لیتے ہیں ۱۲۹
دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس کی تدابیر کا علم حاصل کرنا ضروری ہے ۲۶

ترقی

دنیا کی ترقیات طبعی قوانین سے وابستہ ہیں نہ کہ اخلاقی اور روحانی امور سے ۲۷۷
تمام ترقیات شکر کے ساتھ وابستہ ہیں ۱۱۴
جب تک صحابہ کی طرح انفاق نہ ہو ترقی نہیں ہو سکتی ۱۶۸
قومی ترقی کا ذریعہ توکل اور دعا ہے ۷۱
یورپین قوموں کی ترقی کا سبب ۳۸

تعبیر الرؤیا

حضرت ابراہیمؑ کی رویا کی تعبیر ۱۷۵

تعلیم

انبیاء کی اعلیٰ تعلیمات کو لوگ اپنی تعلیمات ظاہر کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں ۲۴۲
انسان کی بنائی ہوئی تعلیم میں غلطیاں اور جھوٹ ہوتے ہیں ۳۷
قرآن کریم تورات اور انجیل کی تعلیمات کا موازنہ ۵۹
قرآنی تعلیم سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اولی الالباب ہیں ۵۳
اشاعت تعلیم انسانی ظرف کے مطابق ہوتی ہے ۵۰

تفسیر

اس زمانہ کے مامور نے قرآن کریم کی تفسیروں کو حشو وزوائد سے پاک کر کے قرآن کو اس کی اصلی صورت میں پیش کیا ہے ۲۲۲
مفسرین عام طور پر ظاہری لطافت وفصاحت وبلاغت اور معجزات پر بحث کرتے ہیں اور قرآن کریم کی تعلیمی خوبیوں پر بہت کم بحث کرتے ہیں ۲۰۱
شیاطین اور جنوں کے وحی چرانے اور ان پر شہاب ثاقب گرنے کے متعلق مفسرین کی آراء ۲۵۱

تفسیر قرآن

پہلے مفسرین کی خدمات کا اعتراف پیش لفظ
پہلے مفسرین کی دو اہم غلطیاں پیش لفظ
آنحضرتؐ کی ہر حرکت اور ہر سکون قرآن کی تفسیر تھا پیش لفظ

سب معانی پر مشتمل تفسیر لکھنے کا غیر ممکن ہونا — پیش لفظ

تفسیر کبیر مصنفہ حضرت مصلح موعودؓ

اس تفسیر کا بہت سا مضمون میرے غور کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے — پیش لفظ

تفسیر کبیر کے تین ماخذ اللہ تعالیٰ محمد مصطفیٰ ؐ اور حضرت مسیح موعودؑ — پیش لفظ

خصوصیت

اس میں زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق انکشافات ہیں — پیش لفظ

اس تفسیر میں آیات اور سورتوں کی ترتیب کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے — پیش لفظ

تفسیر کبیر کی اشاعت کے متعلق جماعت کو نصیحت — پیش لفظ

تقدیر

انبیاء کے زمانہ میں تقدیر خاص جاری ہوتی ہے — ۳۰۲

تقدیر اللہ کے ہاتھ میں ہے نہ کہ فرشتوں کے — ۳۳۱،۳۳۲

تقدیر کا ٹلانا خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے — ۳۶،۳۸

جو شخص اللہ تعالیٰ سے تعلق نہیں رکھتا تقدیر اس کی مؤید نہیں ہوتی — ۳۹

تمثیل

تمثیل میں بات کرنا سمجھانے کے لئے زیادہ موثر ہوتا ہے — ۳۰۴

سابقہ کتب میں صفات الٰہیہ کو بھی تمثیلی رنگ میں بیان کیا گیا ہے — ۳۰۴

تورات اور ہندو لٹریچر میں خیر و شر کی قوتوں کا ذکر مکالمہ کی صورت میں بیان ہوا ہے — ۳۰۵

آدم کا واقعہ تمثیلی رنگ میں بیان ہوا ہے — ۳۰۴

تمدن

حضرت آدم کے ذریعہ تمدن کی بنیاد — ۲۹۷

الہام کا تعلق تمدن اور اخلاق سے ہے — ۲۹۸

تمسخر

ہر نبی سے تمسخر ہوتا چلا آیا ہے — ۲۲۷

استہزاء کے نتیجہ میں دل سخت ہو جاتے ہیں — ۲۲۹

توحید

مذہب کا خلاصہ توحید ہے

آنحضرتؐ کی آمد کا مقصد توحید ہے — ۳۷۴

نبی کی تعلیم کا مرکزی نقطہ توحید ہوتا ہے — ۸۶

حضرت ابراہیم نے مکہ کی بنیاد اس غرض سے رکھی تھی کہ یہ توحید کا مرکز ہو — ۱۰۰

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ توحید کا دور ہمیشہ شرک کے دور سے پہلے ہوتا رہا ہے — ۸۱،۱۷۰

توحید الہامی اور شرک تنزل کا ایک مقام ہے — ۱۷۰

تورات (نیز دیکھئے بائبل) — ۵۹،۱۰۸

نبیوں کے سپرد تورات کی حفاظت کی گئی تھی — ۲۴۷

علمی قوم میں آنے کے باوجود تورات محفوظ نہیں رہی — ۲۱۸

تورات کو زبانی یاد کرنے والا کوئی نہیں — ۱۹۵

تورات میں خیر و شر کی قوتوں کا ذکر مکالمہ کی شکل میں بیان ہوا ہے — ۳۰۵

توکل

قومی ترقی کا ذریعہ توکل اور دعا ہے — ۷۱

لوگوں کا خدا تعالیٰ پر توکل نہ کرنے کی وجہ کامل یقین کی کمی ہے — ۱۲۳

باوجود کمال کے اللہ تعالیٰ پر سہارا رکھنا چاہیے — ۱۷۱

ث

ثقلان

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم اور اپنی اولاد کو ثقلان قرار دیا ہے ۲۹۰

ثقلان سے مراد وہ دو گروہ ہیں جو آخری زمانہ میں دنیا پر غالب ہوں گے ۲۹۰

ثمود

ثمود عرب قوم میں سے تھے ۳۵۵

دیارِ ثمود کا دوسرا نام حجر ہے ۳۵۳

ثواب

اخروی ثواب عمل کا نہیں ہوتا بلکہ عمل کے ساتھ کے اخلاص باللہ کا نتیجہ ہوتا ہے ۱۳۴

محدود عمل کا غیر محدود ثواب کیونکر مل سکتا ہے ۶۲

ج

جبر

جبر اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے ۲۶۹

جبر کے نتیجہ میں اشاعت دین کے نقصانات ۲۷۰

ہدایت اور گمراہی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جبر نہیں ۶۶، ۶۷

جذبات

عارضی جذبات کی بجائے مستقل جذبات انسان کو فائدہ پہنچاتے ہیں ۲۰۳

جرم

جرم کے معنی اور گناہ کو جرم قرار دینے کی حقیقت ۲۲۸

جزا نیز دیکھئے سزا

ایک دن سب اگلے پچھلے لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور جمع کئے جائیں گے اور اپنے اپنے اعمال کی جزاء پائیں گے ۲۷۰

بغیر حجت کے جزا و سزا بے معنی ہوتی ہے ۲۷۶

مخلوقات میں صرف انسان ہی کیوں جزاء سزا کا مستحق ہے ۲۷۶

جزیہ

مسلمانوں نے شام کے عیسائیوں کا جزیہ واپس لوٹا دیا ۱۰۳، ۱۰۴

جماعت احمدیہ

آج کل احمدیوں کو یہی نظارہ دیکھنا پڑتا ہے کہ (دوسرے انبیاء کی جماعتوں کی طرح) سب دنیا انہیں مرتد کرنا چاہتی ہے ۳۱۴

جماعت کو دوسروں سے بغض نہ کرنے کی نصیحت ۳۲۰

جماعت احمدیہ سے اللہ تعالیٰ کا خاص سلوک ۱۵۸

جماعت کے سینکڑوں افراد خدا تعالیٰ سے ہمکلام ہوتے ہیں ۱۶۰

جماعت کے متعلق غیروں کا رویہ کہ یا ہم احمدیت چھوڑ دیں ورنہ ملک سے نکل جائیں ۱۲۵، ۱۲۶

غیر مبایعین کی طرف سے ایک الزام کی تردید ۱۱۰

بہائیت سے احمدیت کا موازنہ ۱۶۰

جماعت احمدیہ کو حضرت مصلح موعود کی خاص نصائح ۱۰۴

قرآن کریم پر عمل کرنے اور تفسیر کبیر کی اشاعت کے متعلق جماعت کو نصیحت پیش لفظ

کاش جماعت احمدیہ اپنی ذمہ داری کو سمجھے اور اسلام کے کھوئے ہوئے متاع کو پھر واپس لے آئے ۱۰۴

جماعت احمدیہ بے شک چندے دیتی ہے لیکن صحابہ والا انفاق اور تھا ۱۶۸

جب جماعت احمدیہ میں دین کی راہ میں خرچ کرنا طبعی تقاضا نظر آئے گا تب ان کے لئے ترقیات کے راستے کھلیں گے ۱۶۸

جمعۃ المبارک

جمعہ عید کا دن ہے ۲۰۱

جمہوریت

اسلام میں جمہوریت ۷۳، ۱۰۳

جن

جن سے مراد

قرآن کریم میں جنات کا ذکر ۲۸۳
احادیث میں جنوں کا ذکر ۲۸۳
وضع لغت کے لحاظ سے ہر وہ شے جن ہے جو دوسری شے کو پوشیدہ کردے اس پر پردہ ڈال دے یا اس کو تاریک کردے ۲۸۱
قرآن کریم میں جن کئی چیزوں کا نام آیا ہے ۲۸۶
شَیَاطِیْنُ الْجِنّ ۲۸۴
جن ارواح خبیثہ کا نام بھی ہے جو شیطانی خیالات کے لئے محرک ہوتی ہیں ۲۸۶
جن سے مراد خیالی اور ذہنی وجود ۲۸۶
بشری ترقی کے دور کے اس حصہ کا نام جن ہے جو تمدن سے عاری تھے اور نظام کو قبول کرنے کے ناقابل تھے ۲۹۲
جن سے مراد Caveman یعنی انسان کے قابل الہام ہونے سے پہلے جو بشر زیر زمین رہتا تھا ۲۹۲
قرآن کریم نے غیر قوموں اور غیر مذاہب کے لئے بھی جن کا لفظ استعمال کیا ہے ۲۹۰
جو لوگ ناری طبیعت کے ہیں اور اطاعت سے گریز کرتے ہیں ان کا نام جن رکھا گیا ۲۹۷
جن سے مراد غیر ملکی ۲۹۱
جن سے مراد ڈیما کریسی اور ڈکٹیٹر شپ ۲۹۰
آنحضرتؐ پر ایمان لانے والے جنوں سے مراد نصیبین کے یہودی ۲۹۲
سورۃ رحمٰن میں یورپ کے باشندوں کو جن کہا گیا ہے ۲۸۹
شمال و مغربی علاقوں کے ایسے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے میل ملاپ نہ رکھتے تھے ۲۸۹
یہود کا عقیدہ تھا کہ جن شمالی علاقوں میں رہتے ہیں ۲۸۹
شر کی ربی الیعذر (یہودی) نے لکھا ہے کہ جن شمالی علاقوں میں رہتے ہیں ۲۸۲، ۲۸۹
ہندو قوم بھی جنوں کا مقام شمال میں بتاتی ہے ۲۸۹

جنوں کے متعلق عقائد

جنوں کے متعلق امام بخاری، امام ابوحنیفہ، امام مالک اور حضرت ابن عربی کا مذہب ۲۸۳
جنات کے بارہ میں حضرت مصلح موعود کا ذاتی تجربہ ۲۹۹
جن بزرگوں نے جنات کا ذکر کیا ہے وہ ان کے کشوف ہیں اور عالم مثال میں ان کو یہ باتیں نظر آئی ہیں ۲۹۸، ۲۹۹
جنوں کے متعلق مختلف عقائد ۲۸۱
جنوں کے متعلق عوام مسلمانوں کا نظریہ ۲۸۲
لوگ جس قسم کے جن مانتے ہیں ان کا وجود خیالی ہے ۲۸۷
جو لوگ جن دیکھتے ہیں وہ ان کا اعصابی کرشمہ ہوتا ہے ۲۹۹
مشرکین کے ہاں جنوں کی پوجا کی جاتی تھی ۲۱۰، ۲۸۶
یہودی کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ پر جن سوار ہیں ۲۱۰

جنوں کا انبیاء پر ایمان لانا

قرآن کریم کی رو سے جنوں میں بھی انبیاء مبعوث ہوئے ۲۹۴
موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والی جنوں کی جماعت انسان ہی تھی ۲۸۳
حضرت سلیمانؑ کے ماتحت جن ۲۸۳
آنحضرتؐ کی مجلس میں جنوں کا آکر قرآن سننا ۲۸۶

جنوں کی صفات

جنات کو آگ سے پیدا کرنے کا مفہوم ۲۹۸
جنوں کے ایک دوسرے پر چڑھ کر آسمان کی خبریں معلوم کرنے کا مطلب ۲۵۶
اس بات کی تردید کہ جن اخبار غیبیہ کو زبردستی اچک لیتے ہیں ۲۵۱
جنوں کو غیب کا علم حاصل نہیں ۲۵۴
ہڈی گوبر وغیرہ جنوں کی غذا ہے (حدیث) ۲۸۳
ابلیس کی ناری طینت اس کے جنوں میں سے ہونے کے سبب سے تھی ۲۸۴

جنت

مومن کامل کا مقصود جنت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے ۱۴۱
جنت کا ملنا خدا کے فضل اور رحمت سے ہے نہ کہ استحقاق ہے ۱۴۱
اخلاق حسنہ اور نیکیاں اگلے جہان میں جنت کے دروازوں کی شکل میں متمثل ہوں گی ۶۲
جنت میں سلام کا تحفہ ۱۴۱
اصل گھر جنت ہے یہ دنیا تو عارضی سفر ہے ۵۹
تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ کا مطلب ۸۳

جنت کی حقیقت

جنت ایک روحانی مقام ہے جس کی نعمتوں کی حقیقت انسانی دماغ نہیں سمجھ سکتا ۳۲۲
جنت عبودیت کا مقام ہے جہاں انسان کامل عبد بن جائے گا ۳۲۲
جنت سے مراد رضاالٰہی کا وہ مقام جو نبی کی بعثت سے پہلے لوگوں کو حاصل ہوتا ہے ۳۰۹
اصل جنت کی علامت یہ ہے کہ اس میں گناہ کا صدور نہیں ہوسکتا ۳۰۵

جنت کی شرط یہ ہے کہ وہاں دلوں میں غل (بغض) نہیں ہوگا ۳۲۰

صفات

جنت کی صفات ۳۲۰
جنت میں بھی انسان کام کریں گے ۳۲۱
جنت سست الوجودوں کی سرائے نہیں بلکہ اس میں رہنے والے بھی کام کریں گے ۳۲۲
جنت میں تھکاوٹ اور فنا نہ ہوگی ۳۲۱
جنت میں دوسروں کی محکومی سے نجات ملے گی ۳۲۱
جنت میں داخل ہونے کے لئے مختلف نیکیوں کے لحاظ سے الگ الگ دروازے ہوں گے ۳۱۷

جنت میں داخلہ

وہی جنتی بن سکتا ہے جو اس دنیا میں اپنے مومن بھائی کا بغض دل سے نکال دے ۳۲۰

آدم کی جنت

آدم کو جس جنت میں رکھا گیا تھا وہ اخروی جنت نہ تھی ۳۰۵

جہنم (نیز دیکھئے دوزخ)

جہنم کے سات دروازوں سے مراد ۳۱۷
جہنم کے انیس داروغوں کی تعداد کی حکمت ۳۱۷
اس دنیا کی جہنم ۳۱۹
جہنم خالص عربی لفظ ہے ۵۱
جہنم ایک شفاخانہ ہے وہاں حصول صحت کی خاطر رکھا جائے گا ۵۱

جھاگ

باطل کی مثال جھاگ سے ۴۹

جیالوجی Geology

علم جیالوجی سے یہ امر ثابت ہے کہ دنیا میں مٹی کا چھلکا بعد میں بنا پہلے دنیا ایک گرم آگ کا کرہ تھی ۲۹۹

چ

چکڑالوی (اہل قرآن)

السلام علیکم کہنے پر چکڑالویوں کے ایک اعتراض کا جواب ۶۳

ح

حجت

بغیر حجت کے جزا و سزا بے معنی ہوتی ہے ۲۷۶

نبی کو قوم پر حجت تمام ہونے کے بعد ان سے بحث و مباحثہ سے روک دیا جاتا ہے ۳۶۱

جس شخص پر حجت تمام نہ ہوئی ہو اس کے متعلق فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا ۱۱۰

حدیث

علم حدیث

علم حدیث قرآن مجید کی خدمت کے لئے شروع ہوا ۲۲۱

جلد ہذا میں مذکور احادیث

اَتُحِبُّونَ اَنْ تَكُوْنُوْا مِثْلَ حَمِيْرِ الضَّالَةِ ۲۷۱

اَصْحَابِي كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمْ اِقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ ۲۳۹

اِنَّهَا (اَلْفَاتِحَةَ) السَّبْعُ الْمَثَانِي وَ اُمُّ الْقُرْآنِ وَ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ وَ سُمِّيَتْ بِذَالِكَ لِاَنَّهَا تُثْنٰى فِي كُلِّ رَكْعَةٍ ۳۶۳

بُعِثْتُ اِلَى الْاَسْوَدِ وَ الْاَحْمَرِ ۱۰۹

سَبْعَةٌ فِي ظِلِّ الْعَرْشِ ۴۰

اَلْكَافِرُ يَسْجُدُ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَ ظِلُّهٗ يَسْجُدُ اللّٰهَ ۴۰

لَقَدْ اُوْتِيْتُ اللَّيْلَةَ خَمْسًا ۲۹۵

لَوْ كَانَ الْاِيْمَانُ مُعَلَّقًا بِالثُّرَيَّا لَنَالَهٗ رَجُلٌ مِنْ فَارِسَ ۷۳

مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ الْخَبِيْثَةِ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَجْلِسَنَا ۱۵۹

مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَ كَذَا فَهُوَ كَافِرٌ بِي وَ مُؤْمِنٌ بِالْكَوَاكِبِ ۲۶۲

اَحْيَانًا يَاْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَ دِدْنَا اَنْ مُوْسٰى كَانَ صَبَرَ حَتّٰى يَقُصَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا مِنْ خَبَرِهِمَا ۲۷۱

هِيَ اُمُّ الْقُرْآنِ وَ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَ هِيَ الْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ ۳۶۴

يَرَاهَا الْمُؤْمِنُ اَوْ تُرٰى لَهٗ ۳۲۵

قرآن کریم کے سات بطن ہیں اور ہر بطن کے کئی معانی ہیں پیش لفظ

یہود کی روایات کے متعلق آنحضرتؐ کا فرمان لا تصدقوھم و لا تکذبوھم پیش لفظ

عربد بن قیس اور عامر بن طفیل کا آنحضرت کی خدمت میں قتل کی ارادہ سے آنا اور ناکام ہونا ۲۹

نوح اول الرسل تھے ۳۵۴

احادیث میں جنت کے متعلق آتا ہے کہ مختلف نیکیوں کے الگ الگ دروازے ہوں گے ۳۱۷

احادیث میں جنوں کا ذکر ۲۸۳

حس/حواس

انسان کے انیس حواس ۳۱۷

حساب

سوء الحساب کا مفہوم ۵۱

حسد

کفار کی آنحضرتؐ سے دشمنی محض حسد کی وجہ سے تھی ۲۰۰

حشر

حشر بعث بعد الموت کے معنوں میں کیوں استعمال ہوتا ہے ۲۶۹

ایک دن سب اگلے پچھلے لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور جمع کئے جائیں گے اور اپنے اپنے اعمال کی جزا پائیں گے ۲۷۰
قرآن کریم میں خلق آدم کے ذکر کے ساتھ حشر اور بعث بعد الموت کا ذکر کیوں ہے ۲۷۴
حشر اجساد کا مسئلہ کلی طور پر آدم کی پیدائش کے ساتھ وابستہ ہے ۲۷۶
حشر کا تقاضا ہے کہ کوئی شریعت ہو ۲۷۶
فرشتے اور حیوانات حشر کے محتاج نہیں ۲۷۶
حشر کا لفظ اس اجتماع کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو نبیوں کے ذریعہ اس دنیا میں ہوتا ہے ۲۶۹
آنحضرتؐ کے زمانہ میں حشر ۲۶۹

حفاظت

آنحضرتؐ کی حفاظت کا معجزہ ۲۹
خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر انسان کی حفاظت کا انتظام ۳۱

حفظ ۳۱

الہامی کتابوں میں سے صرف قرآن کریم حفظ کیا جاتا ہے ۱۹۵
حفظ قرآن کریم کی حفاظت کا ایک ذریعہ ہے ۲۱۸
قرآن کریم سہولت سے حفظ ہوتا ہے ۲۱۹

حق

حق کی مثال پانی اور معدنیات سے ۴۹

حکمت

جبر حکمت کے خلاف ہے ۲۶۹

حکومت

خلافت راشدہ کی حکومت کی مثال دنیا میں نہیں ملتی ۱۰۳
شرعی انبیاء کو ان کے زمانہ میں ہی حکومت ملتی ہے ۲۲۶، ۲۲۷
شرعی کلام جب تک اپنے ابتدائی ایام میں کسی حکومت سے متعلق نہ ہو اس کی تعلیم کے عملی حصہ کی خوبیاں پورے طور ظاہر نہیں ہو سکتیں ۲۲۳
مسلمان حکمران کے خواص ۲۲۳

خ

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نیز دیکھئے عنوان محمد اور نبوت
یہ کہنا کہ ظلی نبوت خاتم النبیین کی نبوت کو توڑ دیتی ہے بالکل غلط ہے ظلی نبوت تو اصل کے وجود کو ثابت اور روشن کرتی ہے ۴۳

خشیت

دل میں خشیت اللہ نہ ہو تو انسان نشانات دیکھ کر بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ۲۳۲
ایک تباہ شدہ بستی سے عبرت حاصل کرنا کوئی باریک مضمون نہیں بلکہ صرف دل کی خشیت سے تعلق رکھتا ہے ۳۴۸
خشیت اور خوف میں فرق ۵۵
خشیت میں خوف کے ساتھ تعظیم بھی شامل ہوتی ہے ۵۴

خلافت

قرآن کریم نے بادشاہت کی جگہ خلافت کو قائم کیا ہے ۷۳
خلافت راشدہ کے دور کی بے مثال حکومت ۱۰۳
عربد بن قیس کا خلافت دیئے جانے کی شرط پر مسلمان ہونے کی پیشکش کرنا اور آنحضرتؐ کا فرمانا کہ اب تمہیں اور تمہاری قوم کو خلافت کبھی نہیں ملے گی ۲۹

خلق

خلق انسانی کے حشر کی دلیل ہونے کے متعلق بعض دلائل ۲۷۶

تخلیق کائنات کے چار مراتب ۱۲۰
حضرت مسیحؑ کو پرندوں کا خالق قرار دینے کا عقیدہ ۴۶

خواب نیز دیکھئے رویا کشف اور تعبیر

حضرت یعقوبؑ کا ایک خواب ۲۸۲

خودغرضی

خودغرضی کے نتیجہ میں کلام الٰہی کو قبول کرنے سے
محرومیت ۱۹۳

خوف

خوف سے پیدا ہونے والا ایمان ۱۱۲

د

دابۃ الارض ۲۵۵

دارالجزاء

انسانی تخلیق میں ارتقاء ایک دارالجزاء کا تقاضا
کرتا ہے ۲۷۶

دعا

قوم لوط کے عذاب سے بچنے کے لئے
حضرت ابراہیمؑ کی دعا ۳۳۵،۳۳۶
انبیاء نبوت کے انعامات کے متعلق بھی دعا میں
لگے رہتے ہیں ۱۷۱
انبیاء ہمیشہ موعود امور کے لئے دعا اور تدبیر سے کام
لیتے ہیں ۱۲۹
دعا انہی کی سنی جائے گی جو اسلام کے لئے مالی
قربانیاں کرنے والے اور اقامت صلوۃ کرنے
والے ہوں ۱۶۸
قومی ترقی کا ذریعہ توکل اور دعا ہے ۷۱
حضرت ابراہیم کی شرک سے بچنے کی دعا ۱۷۰
حضرت ابراہیم کی اپنی اولاد کے لئے دعا ۱۷۳، ۱۷۴
حضرت ابراہیم کی دعا کا مقصود آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ۱۷۵
حضرت مصلح موعود کی دعا کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام سے
اپنے بندوں کو فائدہ پہنچائے پیش لفظ
تبلیغ اسلام کے لئے آسانیاں میسر ہونے کے لئے
دعا کی تلقین ۱۶۸

دماغ

الہام انسانی دماغ کا زوج ہے ۱۶

دنیا

دنیا عارضی سفر ہے ۵۹

دل (نیز دیکھئے قلب)

جب تک دل میں مناسبت نہ پیدا ہو جائے انسان
محض نمونہ دیکھ کر فائدہ نہیں اٹھا سکتا ۲۳۱
استہزاء کے نتیجہ میں دل سخت ہو جاتے ہیں ۲۲۹
سماء دنیا سے مراد نبی کی مجلس ہے ۲۵۵
زمین و آسمان کی پیدائش انبیاء کی کامیابی اور
ان کے دشمنوں کی ناکامی کی دلیل ہے ۳۵۹
اللہ تعالیٰ کی حکمت اور علم نے اس دنیا کو اصل روز جزا
نہیں بنایا ۲۷۰
دنیا کی پیدائش قیامت کی دلیل ہے ۳۵۹
دنیا کی ترقیات طبعی قوانین سے وابستہ ہیں نہ کہ
اخلاقی اور روحانی امور سے ۲۷۷

دین

اس زمانہ میں دین سے غفلت انتہا کو پہنچ چکی ہے ۲۲۲
دین کے کاموں کے متعلق غیرت سے کام لینا چاہیے ۱۲۳

دوا

دواؤں کا اثر اجرام فلکیہ کے تابع ہے ۷۹

دوزخ نیز دیکھئے جہنم

شیطان دوزخ میں کیوں جائے گا ۱۴۰

ڈ

ڈکٹیٹر شپ ۲۹۰

ڈھیل

نبی کے مخالفوں کو عذاب میں ڈھیل ضرور ملتی ہے لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں ۲۰۶

ڈیما کریسی ۲۹۰

ذ

ذکر

قرآن کریم قیامت تک الذکر رہے گا ۲۴۶

قرآن کریم کا الذکر ہونے کا مفہوم ۲۴۶

ذکر محفوظ کی یہ علامت ہے کہ جب کوئی اس میں دخل دینا چاہتا ہے تو اس کی حفاظت کے لئے شہاب اترتے ہیں ۲۴۵

ذکر سے مراد ایسی کتاب جو اللہ اور بندوں میں تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہو ۲۴۶

قرآن مجید کا نام الذکر کفار میں بھی معروف تھا ۲۰۸، ۲۰۹

پہلے مذاہب میں انبیاء کی بعثت بند ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کتب الذکر نہیں رہیں ۲۴۶

ذہن

ہر چیز کے خزانے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھے ہیں اور ضرورت کے مطابق وہ انسانی ذہن کو ادھر منتقل کر دیتا ہے ۲۶۶

ر

رزق

کروڑوں جانداروں کے لئے رزق کا نظام ۲۶۵

رسوم ورواج

رسوم ورواج فطرت کو گندہ کر دیتے ہیں ۴۹

رسم ورواج اور قشر خدا کا نور نہیں کہلا سکتا ۱۰۱

رسول نیز دیکھئے نبی اور نبوت

نوح اول الرسل تھے (حدیث) ۳۵۴

غیب کا پہلا اظہار اللہ کے منتخب رسولوں پر ہوتا ہے ۲۵۴

ایک رسول کے انکار کو قرآن کریم نے تمام رسولوں کا انکار قرار دیا ہے ۳۵۴

جو شخص ایک رسول پہچان کر اور سمجھ کر مانے گا وہ سب رسولوں کو مان لے گا ۳۵۴

رسولوں کے ساتھ بیوی بچے اور دیگر حوائج بشریہ ۸۹

حضرت ابراہیم کی رؤیا کی تعبیر ۱۷۵

رویاء کے ذریعہ مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کی شہادت ۷۴

رمل

علم نجوم ورمل گو لغو اور فضول ہیں مگر حسابی اصول پر قائم ہیں ۲۶۰

روح

روح کے مختلف معانی ۳۰۰، ۳۰۱

جبریل کو روح کہا گیا ہے ۳۰۱

کلام الٰہی بھی روح ہے جو انسان کو نئی زندگی بخشتا ہے ۳۰۱

روح وہ چیز ہے جس کے ذریعہ کسی کو حیات ممتاز ملے ۳۰۱

نفخ روح

آدم اور انبیاء کے نفخ روح سے مراد نزول الہام ہے ۳۱۰

بنو آدم کے نفخ روح سے مراد نفس ناطقہ کی تکمیل ہے ۳۱۰

نفخ روح ہر انسان میں ہوتی ہے ۳۰۶، ۳۰۷

علم الارواح

بعض لوگ انسانی دماغ کی باریکیوں کو نہ سمجھتے ہوئے بعض باریک روحانی قویٰ کو عالم اخروی کی ارواح کا عمل اور تاثیر قرار دے دیتے ہیں ۲۶۰

یونانیوں میں نیک اور بدارواح کا تصور ۲۸۱

زردشتیوں میں نیک اور بد ارواح کا تصور ۲۸۱

یہود میں بدارواح کا عقیدہ ۲۸۲،۲۸۱

روز جزا

ایک دن سب اگلے پچھلے لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور جمع کئے جائیں گے اور اپنے اپنے اعمال کی جزاء پائیں گے ۲۷۰

اللہ تعالیٰ کی حکمت اور علم نے اس دنیا کو اصل روز جزا نہیں بنایا ۲۷۰

رؤیا نیز دیکھئے خواب

یوسف علیہ السلام کی رؤیا اور اس کی تعبیر ۲۴۰،۲۳۹

مومن کو اپنے متعلق کبھی خود رؤیا آتی ہے کبھی دوسرے کو اس کے متعلق دکھائی جاتی ہے ۳۲۵

روح المعانی

تفاسیر میں علوم نقلیہ کی جامع کتاب ہے پیش لفظ

ز

زکوٰۃ

شریعت اسلام میں زکوٰۃ مقرر کئے جانے کی وجہ ۶۱

زمین

زمین پہلے گرم آگ کا کرہ تھی مٹی کا چھلکا بعد میں بنا ہے ۲۹۹

زمین نئی نئی طاقتیں دوسرے ستاروں سے حاصل کرتی رہتی ہیں ۲۶۳

زمین کا حجم بڑھ رہا ہے ۲۶۳

بیرونی کھاد زمین کی طاقت کو بڑھاتی رہتی ہے ۲۶۳

تمام زمینی کاروبار آسمانی طاقتوں کے ملنے سے چلتے ہیں ۱۴

زمین کی قوت متاثرہ اور آسمان کی قوت موثرہ ۱۵، ۲۶۳

زمین کی زرخیزی میں بیرونی سیاروں کے ذرات اضافہ کا موجب ہوتے ہیں ۱۴

انسانی طبائع روحانی سماء (آسمان) کے لئے بمنزلہ زمین کے ہوتی ہیں ۱۵

زمین کے اطراف کو کم کرنے کا مفہوم ۹۵

زندگی نیز دیکھئے حیات

قرآنی اصطلاح میں روحانیت کے بعد موت اور اس کا حصول زندگی کہلاتا ہے ۷۵

زوج

زوج سے مراد ایسے ساتھی جو نیکی میں مد اور معاون رہے ہوں ۶۱

نبی کا زوج صدیق ہوتا ہے ۶۲

ژ

ژنداوستا ۱۹۵

س

سات

سات اور ستر کا ہندسہ عربوں میں تکمیل یا کثرت کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے ۳۱۷

سادگی

صداقت کو قبول کرنے کے لئے سادگی کو اپنانا ضروری ہے ۲۰۳

ساعت

ساعت کا لفظ قیامت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس موعود گھڑی کے لئے بھی جو انبیاء کے دشمنوں کی تباہی کے لئے مقرر ہوتی ہے ۳۵۹

سائیکو انیلسس Psychoanalysis

ایک جدید طریق علاج ۱۳۰

سائنس

متفرق حالات کا ایک دوسرے پر قیاس کرنا سائنس نہیں کہلا سکتا ۲۷۸

سورۃ رحمٰن میں سائنسی ترقیات کی پیشگوئی ۲۸۹

سائنس کا یہ دعویٰ کہ حیوانی مادہ حیوان سے ہی پیدا ہوتا ہے خود قابل تحقیق ہے ۲۷۸

سائیکالوجی

ماہرین علم النفس کہتے ہیں کہ انسان میں نقل کرنے کا مادہ سب سے بڑا خاصہ ہے ۲۲۶

سبت

عیسائیت نے رومیوں کے مطالبہ پر ہفتہ کی بجائے اتوار کو سبت قرار دیا ۱۶۲

سبع مثانی

سبع مثانی سے مراد سورۃ فاتحہ ہے ۳۶۳، ۳۶۴

سپر چولسٹس Spiritualists

ماہرین علم الارواح ۲۶۰

سپر چول ازم Spiritualism

یورپ میں سپر چولزم کی طرف رجحان کی وجہ ۷۴

ستارہ نیز دیکھئے اجرام فلکی

حضرت عیسیٰ اور آنحضرت کی بعثت کے زمانہ میں کثرت سے ستارے ٹوٹنے کا نشان ظاہر ہوا تھا ۲۴۸

ستاروں کی تاثیرات

ستاروں کی تاثیرات کے متعلق ایک حدیث کا صحیح مفہوم ۲۶۲

ستاروں کی حرکات میں تاثیرات یقیناً ہیں ۲۶۲

ہر ستارہ کشش ثقل کے اصول سے اور دیگر ایسے ذرائع سے جن کا علم بندوں کو ابھی تک حاصل نہیں ہوا آسمان کی حفاظت کر رہا ہے ۲۴۰

علم نجوم و رمل گو لغو اور فضول ہیں مگر حسابی اصول پر قائم ہیں ۲۶۰

سب نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد ستاروں کی طرح چکر کھاتے ہیں ۲۳۹

صحابہ کرام آنحضرتؐ کے لئے بمنزلہ ستاروں کے تھے ۲۳۹

ستر

سات اور ستر کا ہندسہ عربوں میں تکمیل یا کثرت کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے ۳۱۷

سجع

قرآن میں سجع اصل مقصود نہیں ۱۹۶

سزا

سزا کی ضرورت ۱۵۵

انبیاء کے اختیار میں سزا دینا کیوں نہیں رکھا گیا ۹۱

سزا کا اصول اصلاح اور انصاف ہے نہ کہ غصہ نکالنا ۹۳

جس قوم کو کسی بات کا یقینی علم نہ پہنچے اس وقت تک اسے نہ ماننے کی سزا نہیں دی جا سکتی ۱۱۰

سماء نیز دیکھئے آسمان

سماء دنیا سے مراد نبی کی مجلس ہے ۲۵۵

سلام

جنت میں سلام کا تحفہ ۱۴۱

سوسائٹی

اہل یورپ کے اسلام قبول کرنے میں روک ان کی سوسائٹی ہے ۲۰۳

سورج

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بطور سراج منیر ۲۳۹

سورۃ نیز دیکھئے قرآن مجید

بسم اللہ ہر ایک سورت کی کنجی ہے ۲۷۶

۱۔سورۃ فاتحہ

سبع مثانی سے مراد سورۃ فاتحہ ہے ۳۶۴

سورۃ فاتحہ کا نام قرآن عظیم بھی ہے ۳۶۵

اس سورت میں قرآن کی قوتوں اور طاقتوں کا نچوڑ ہے اور سارے قرآن کریم کے مطالب اجمالاً اس میں آگئے ہیں ۳۶۴

ان لوگوں کی تردید جو سورۃ فاتحہ کو قرآن کریم کا حصہ نہیں سمجھتے ۳۶۴

۲۔سورۃ بقرہ

حضرت مصلح موعود کو سورۃ بقرہ کے مضامین کے متعلق القاء ۲۷۵

۳۔سورۃ توبہ

سورت توبہ علیحدہ نہیں بلکہ سورۃ انفال کا حصہ ہے ۷۶

سورۃ ابراہیم

سورۃ ابراہیم میں واقعات سے مسائل کا استخراج کیا گیا ہے ۹۹

سورۃ رعد

وجہ تسمیہ ۲، ۳

خدا تعالیٰ زبردست حملوں سے آنحضرت ؐ کی سچائی کو ظاہر کردے گا

سورۃ رعد کا پہلی سورت سے تعلق ۱، ۲

سورۃ رعد کے مضامین کا خلاصہ ۲

ریورنڈ وہیری کا سورۃ رعد پر اعتراض اور اس کا جواب ۳

سورۃ حجر

سورۃ حجر مکی ہے اور مستشرقین بھی یہی رائے رکھتے ہیں ۲۱۵، ۳۶۵

پہلی سورت سے تعلق ۱۹۳

مضامین کا خلاصہ

سورۃ حجر میں ان قوموں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں تحریر کا رواج کم تھا اور جنہوں نے حفظ کے ذریعہ سے قرآنی علوم سے فائدہ اٹھانا تھا ۱۹۷، ۳۵۵

سورۃ نحل

اس سورت میں ان قوموں سے خطاب ہے جن میں لکھنے کا رواج زیادہ تھا ۱۹۷

۶۔سورۃ رحمٰن

اس سورۃ میں آخری زمانہ کے تغیرات کا ذکر ہے ۲۸۹

سورۃ رحمٰن میں دو مشرق اور دو مغرب سے مراد ۲۸۹

سیاست

قرآن کریم نے پرانی سیاست کو بالکل بدل دیا ہے ۷۳، ۷۴

باطل پرست اقوام مذہب کو سیاست کے میدان میں گھسیٹ لاتی ہیں ۱۲۵

ش

شادی

صغر سنی کی شادی کے متعلق مسودہ قانون ۲۰۱

شراب

بندش شراب کی خواہش ۲۰۱

شرک

قرآن کریم کی رو سے پہلے توحید تھی اور پھر شرک پیدا ہوا ۸۱

شرک کے رد میں دلائل ۷۹

شرک کے رد میں انسان کی فطرت سلیمہ سے اپیل ۸۱

اقامت صلوٰۃ شرک کے مخالف ہے ۱۶۶

جتنے لوگوں کو دنیا نے خدا بنایا ان کی زندگی دکھ اور تکلیف میں ہی گذری ہے ۴۵

شرک انسانی ترقی میں زبردست روک ہے ۳۸

نبی بچپن سے ہی شرک سے محفوظ ہوتا ہے ۱۲۶

شریعت

حشر کا تقاضا ہے کہ کوئی شریعت ہو ۲۷۶

شرعی کلام جب تک اپنے ابتدائی ایام میں کسی حکومت کے ساتھ متعلق نہ ہو اس کی تعلیم کے عملی حصہ کی خوبیاں پورے طور پر ظاہر نہیں ہوسکتیں ۲۲۳

شرعی انبیاء کو ان کے زمانہ میں ہی حکومت مل جاتی ہے ۲۲۶، ۲۲۷

مامورین نہ صرف نشانات سے شیطان کے حملوں سے شریعت کو بچاتے ہیں بلکہ بوجہ الہام سے موید ہونے کے ان کی تشریحات سے مومنوں کو کلام الٰہی کے صحیح معنی بھی معلوم ہوتے ہیں ۲۴۶

انسانی زندگی کا کوئی حصہ نہیں جس پر اسلامی شریعت نے روشنی نہ ڈالی ہو ۲۰۱

کامل شریعت کی علامات ۱۴۶

تمام احکامات شریعت صفات الٰہیہ پر مبنی ہیں ۹۱

شریعت ان امور کو بیان کرتی ہے جو انسان کے اپنے فائدہ کے لئے ہیں ۱۲۳

شفقت

شفقت علیٰ خلق اللہ کی حقیقت ۵۵

شکر

شکر کے معنی خدا کی دی ہوئی چیز کو عمدگی کے ساتھ برمحل استعمال کرنا ۱۱۴

تمام ترقیات شکر کے ساتھ وابستہ ہیں ۱۱۴

شہاب ثاقب

شہاب کے تین معنی ۲۴۵

قرآن کریم میں مختلف مواقع پر آسمانوں کی حفاظت اور شہب گرنے کا ذکر ۲۵۰

شیاطین پر شہاب گرنے سے مراد ۲۵۶

شیاطین اور جنوں پر شہب گرائے جانے کے متعلق مفسرین کی آراء ۲۵۰

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہب کا گرنا نبی کی علامات ظہور کے لئے بطور سنت مقرر کر رکھا ہے ۲۴۹

حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانہ میں کثرت سے شہاب ثاقب گرنے کا نشان ظاہر ہوا تھا ۲۴۹

آنحضرت کی بعثت کے وقت اہل طائف کا شہاب ثاقب گرنے پر گھبرا جانا ۲۴۹

تعجب نہیں کہ نبی کے زمانہ میں کثرت سے شہب گرنے کی روحانی تاثیرات بھی ہوں ۲۵۰

ظاہری شہب ثاقبہ کو انبیاء سے تشبیہ دینے کا مطلب ۲۴۸

شہاب سے مراد انبیاء جو آسمانی تائیدات اور نشانات لے کر آتے ہیں ۲۴۱

کلام الٰہی کی حفاظت کے لئے شہاب بھیجنے سے مراد مامورین کی بعثت ۲۴۶

اس زمانہ میں شہاب ثاقب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپ کے اظلال قیامت تک یہ کام کریں گے ۲۴۴

انبیاء کے متبعین میں سے بعض کو شہاب ثاقب کے طور پر مامور کیا جانا ۲۴۳، ۲۴۴

شہادت

تازہ آسمانی نشانات اور پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں نبی کے دو گواہ ہوتے ہیں ۳۰۶

شیطان

شیطان کی حقیقت

وہ شیطان جو بطور محرک بدی پیدا کیا گیا ہے اور ایک غیر مرئی وجود ہے وہ خود آ کر لوگوں سے باتیں نہیں کیا کرتا ۳۰۶

بدی کے دوسرے محرکات بھی شیطان کہلاتے ہیں ۳۰۶

شیاطین الانس اور شیاطین الجن ۲۵۶، ۲۶۰

آدم کے نظام کے تابع نہ ہونے والے انسانوں کے سردار کو شیطان اور ابلیس کے ناموں سے پکارا گیا ہے ۳۰۶

انسان کے سوا جو بھی شیطان ہے وہ کسی سزا کا مستحق نہیں کیونکہ وہ اپنا فرض پورا کر رہا ہے ۲۷۶

شیطان کی حقیقت ۱۳۹

شیطان انسان کی بدی کے معیار کو ظاہر کرتا ہے نہ کہ بد بناتا ہے ۱۳۹

شیطان دوزخ میں کیوں جائے گا ۱۴۰

شیطان کا کام

لاغوینھم سے مراد انبیاء کے دشمنوں کی کوششیں ۳۱۴

شیطان اور اس کے اتباع کو انبیاء کے کاموں پر اس وقت تک نکتہ چینی کا موقعہ ملتا ہے جب تک ان کی کامیابی کا مقدر زمانہ نہیں آجاتا ۳۱۱

مس شیطان

یہ عقیدہ درست نہیں کہ مس شیطان سے صرف حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ محفوظ ہیں ۲۴۱

آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ میرا شیطان مسلمان ہو چکا ہے ۳۰۶

اس گروہ کا ذکر جو نبوت کے مقام پر تو نہیں ہوتا مگر شیطان سے محفوظ رہتا ہے ۳۱۶

جب انسان کو نفس مطمئنہ مل جائے تو شیطان بندے سے مایوس ہو جاتا ہے ۳۱۱

شیطان کا تصرف

شیطانوں کا کوئی تصرف انبیاء اور ان کے کامل متبعین پر نہیں ہو سکتا ۲۴۱

شیطان کے پیچھے وہی چلتا ہے جو اپنی فطرت کو خراب کرتا ہے ۳۱۶

القائے شیطانی

القی الشیطٰن فی امنیتہ کی حقیقت ۲۴۴

کلام الٰہی کو چرانا

اس بات کی تردید کہ شیاطین زبردستی اخبار غیبیہ کو اچک لیتے ہیں ۲۵۳

شیاطین کے کلام الٰہی کو اچک لینے کی غیر معقولیت ۲۵۹

کلام الٰہی اور معجزات ونشانات پر شیطان کو تصرف حاصل نہیں ہوتا ۲۴۱

شیطان آسمانی علوم کے سننے کی بھی طاقت نہیں رکھتے ۲۵۳

شیطان کا کلام الٰہی کو اچکنے کا کام کلام الٰہی کے اعلان کے بعد ہوتا ہے ۲۵۵

شیاطین پر شہب کا گرنا

شیاطین پر شہاب گرنے سے مراد ۲۵۶

شیاطین پر شہب گرائے جانے کے متعلق مفسرین کی آراء ۲۵۲

مہلت کی حقیقت

شیطان کی مہلت کی حقیقت ۳۱۲

شیطان کو یوم قیامت تک مہلت کا مفہوم ۳۱۱
شیطان کا خدا سے مہلت مانگنا بھی زبان حال سے ہے ۳۰۶

شیطان کی ہلاکت

شیطان کی ہلاکت کا موجب وقت کا نبی ہوتا ہے یا وہ نبی جس کی نبوت زندہ ہو ۲۴۴
شیطانی وساوس سے پاک کرنے کے لئے ماموریں کا آنا ضروری ہے ۲۴۶

متفرق

شیطان کی تحریک ملائکہ کی نسبت محدود ہوتی ہے ۲۹۷
بائیبل میں شیطان کا ذکر ۲۸۲

ص

صبر

جرأت اور طاقت کے ہوتے ہوئے خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر رکنا صبر ہے ۵۸
صبر کے معنی گناہ سے بچنا نیک اعمال پر استقلال اور جزع فزع سے بچنا ۵۸
صبر بری حالت سے بچنے کا نام ہے نہ کہ اس پر راضی ہو جانے کا ۱۳۷
مسلمانوں کو صبر کی تلقین ۱۱۱
مومن کی شان یہی ہے کہ صبر سے کام لے ۱۲۳
اپنی ذات کے متعلق صبر سے کام لینا چاہیے اور دین کے کاموں کے متعلق غیرت سے ۱۲۳

صحابہ رضی اللہ عنھم

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم
جزوی اختلافات کے باوجود ان میں سے جس کی بھی اتباع کرو گے ہدایت پا جاؤ گے ۲۳۹
سابق بالایمان صحابہ غزوہ خندق کے موقعہ پر صحابہؓ میں غذا کی کمی ۲۹۳
صحابہ کا ایثار اور ایفائے عہد ۱۶۸
صحابہ کرام کا انفاق فی سبیل اللہ ۱۶۸
صحابہ کوشش کر کے اپنے اوپر غربت لاتے تھے ۱۶۸

صدیق

صدیق نبی کا زوج ہوتا ہے ۶۲
عورت صدیقیت کا مقام حاصل کر سکتی ہے ۶۲

صداقت

صداقت کو قبول کرنے کے لئے کن چیزوں سے بچنا ضروری ہے ۲۰۳
صداقت سے محرومی کا ایک سبب ۱۹۳
لاکھوں آدمی اپنی تحقیق کا مدار اپنے لیڈروں کے بیانات پر رکھتے ہیں اور ذاتی تحقیق گوارا نہیں کرتے اور اس طرح صداقت سے محروم رہ جاتے ہیں ۲۵۸
آیت انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون اکیلی ہی قرآن مجید کی صداقت کا بین ثبوت ہے ۲۱۴

صلح حدیبیہ ۱۳۱، ۱۸۴

اسلام کی آزادی اور ترقی کی بنیاد ۴۲

صلصال

صفت صلصالیت سے مراد قوت ناطقہ ۲۷۷
انسان میں قبولیت الہام کی صفت ۲۷۸

ط

طب

دواؤں پر ستاروں کا اثرات ۷۹
طب کی بنیاد بھی قرآن مجید کی توجہ دلانے پر ہوئی ۲۲۱

طبیعت

طینی اور ناری طبیعت کی حقیقت ۲۹۸

طلاق

ایک یورپین کے دل میں خیال آتا ہے کہ ہمارے ہاں بھی طلاق کا قانون بننا چاہیے ۲۰۱

طول امل

صداقت کو قبول کرنے کے لئے طول امل سے بچنا ضروری ہے ۲۰۳

طہارت

قرآن کریم کی حفاظت محض ظاہری علوم پر مبنی نہیں بلکہ قلبی طہارت سے تعلق رکھتی ہے ۲۶۸

ظ

ظل

اگلے جہان کی زندگی اس جہان کی ظل ہوگی ۱۸۹

ظل کے لئے اصل کا ہونا ضروری ہوتا ہے ۴۳

ظلی نبوت

یہ کہنا کہ ظلی نبوت خاتم النبیین کی نبوت کو توڑ دیتی ہے بالکل غلط ہے ظلی نبوت تو اصل کے وجود کو ثابت اور روشن کرتی ہے ۴۳

ظلمت

ظلمات سے نور کی طرف لانے کے طریق ۱۱۲

ع

عبد

کامل عبودیت کا مقام جنت ہے جہاں انسان کامل عبد بن جائے گا ۳۲۲

عبرت

ایک تباہ شدہ بستی سے عبرت حاصل کرنا کوئی باریک مضمون نہیں بلکہ صرف دل کی خشیت سے تعلق رکھتا ہے ۳۴۸

عدد

دوزخ کے انیس داروغوں کی تعداد کی حکمت ۳۱۷

سات اور ستر کا ہندسہ عربوں میں تکمیل یا کثرت کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے ۳۱۷

دوزخ کے سات دروازوں سے مراد ۳۱۷

عدل

سزا کا اصول اصلاح اور انصاف ہے نہ کہ غصہ نکالنا ۹۳

عذاب

آگ اور پتھر کے محاورہ سے مراد آسمانی عذاب ہے ۲۳۸

موجبات عذاب

کونسا عذاب نبی کی بعثت علامت ہوتا ہے ۲۰۵

عذاب ہمیشہ کھلی پیشگوئیوں کے بعد آتا ہے ۲۰۵

عالمگیر عذاب ایسے نبی کی علامت ہوتا ہے جو ساری دنیا کی طرف مبعوث ہو ۲۰۵

نبی کی بعثت کے بعد اس کے مخاطبین کی سب بستیاں عذاب کی مستحق ہو جاتی ہیں ۲۰۵

آخری زمانہ کا عالمگیر عذاب

آخری زمانہ میں بے دینی کی وجہ سے عذاب نازل ہوگا ۲۹۰

عذاب ٹل سکتا ہے

اللہ اپنے مقرر کردہ عذابوں کو بدل بھی دیتا ہے ۳۳۱

خدا تعالیٰ کا حضرت ابراہیم کو فرمانا کہ اگر لوط کے شہر میں دس صادق بھی ہوں تو میں شہر کو عذاب سے بچا لوں گا ۳۳۶

عذاب کو عقاب قرار دینے کی وجہ ۲۱

ندامت، حسرت اور خدا سے دوری بھی عذاب ہیں ۱۳۲

عذاب کی غرض

اگر ہدایت سے پہلے عذاب آئے تو ھادی کی صفت باطل ہو جائے ۲۲

عذاب سے اصل غرض اصلاح ہے ۱۳۱

عذاب کا سبب

قوموں پر عذاب ان کے اعمال کے نتیجہ میں آتا ہے ۲۱

عذاب سے قبل تنبیہ

عذاب کا ٹلنا

مقررہ عذاب ٹل سکتا ہے اور کم بھی ہو سکتا ہے ۹۲

عرب (قوم)

لوط، ابراہیم، شعیب علیہم السلام عربوں کے اجداد میں سے تھے ۳۵۵

عرب اپنے خیالات کی نزاکت اپنے ادب کی بلندی اور اپنے ذخیرہ الفاظ کی کثرت کی وجہ سے سب اقوام پر فوقیت رکھتے ہیں ۱۴۸

عربوں نے سب سے پہلے کھجور کے نر و مادہ کا علم حاصل کیا ۱۵

عرب اپنی ہمسایہ قوموں کی نظر میں نہایت حقیر سمجھے جاتے تھے ۱۰۱

آنحضرتؐ کے ذریعہ عربوں میں انقلاب ۱۰۱

اسلام قبول کرنے کے بعد عربوں کی علمی ترقی ۱۰۲

عربی زبان

قرآن مجید کے نزول کے بعد علمی عربی زبان کی تبدیلی بند ہو گی ۲۲۱

عربی زبان کی گریمر کی ابتداء حضرت علیؓ سے ہوئی ۲۲۰

جن الفاظ کا مادہ عربی میں استعمال ہوتا ہے ان کو معرب کہنا درست نہیں ۳۴۶

بعض ضروری قواعد

ماضی کے صیغہ سے آئندہ کی خبر دینا اس کے یقیناً واقع ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے ۱۹۹

رب کا لفظ مستقبل کے معنی میں بھی آتا ہے ۱۹۹

عطف بالعموم مغائر اشیاء میں ہوتا ہے ۱۹۴

بدل میں مقصود دوسرا اسم ہوتا ہے اور پہلا اسم مفہوم کو قریب لانے کے لئے ہوتا ہے اور عطف بیان میں مقصود اسم اول ہوتا ہے ۲۷۳

بعض دفعہ مسبب کا نام سبب کو دیا جاتا ہے ۳۰۱

کسی واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے مکالمہ کا رنگ دے دیا جانا ۳۰۳

قدر کا لفظ اللہ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہوتے ہیں اور انسان کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی اندازہ اور قیاس ہوتے ہیں ۳۳۰، ۳۳۱

عربی کا عام محاورہ ہے کہ جو شے کسی کی طبیعت میں داخل ہو اس کے بارہ میں کہتے ہیں کہ وہ اس سے پیدا کیا گیا ہے ۲۹۸

خصائص

عربی زبان کے ام الالسنہ ہونے کی ایک دلیل ۱۰۹

عربی ادبیات عالیہ اور ذخیرہ الفاظ کی کثرت کی وجہ سے ممتاز ہے ۱۴۸

عربی کے الفاظ کو غیر زبانوں کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ۵۱

صنم کا لفظ معرب نہیں خالص عربی ہے ۱۶۹

عربی لغات

عربی زبان میں زیادۃ نون فی وسط الکلمۃ کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں ۵۱

قواعد

عربی زبان کا عام قاعدہ ہے کہ مقابل کا فقرہ لفظاً چھوڑ دیا جاتا ہے اور معناً اسے مدنظر رکھا جاتا ہے ۷۸

مستقبل کے لئے ماضی کے صیغے مستقبل کے یقینی ہونے پر دلالت کرتے ہیں ۱۳۶

حروف زائدہ بے کار نہیں بلکہ معنوں میں زیادتی کا موجب ہوتے ہیں ۱۷۵
س۔زور دینے کے لئے آتا ہے ۹۷

عرش

عرش کی حقیقت ۱۱
عرش سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات تنزیہیہ کا مجموعی نظام ہے ۱۳
اللہ تعالیٰ کے استوی علی العرش سے مراد ۱۱

عرفہ

عرفہ کا دن عید کا دن ہے ۲۰۱

عصمت

عصمت انبیاء ۱۸۰

عفت

عفت اس کی ہے جس کے اندر بدی کی طاقت ہے اور اس کے باوجود وہ بدی سے مجتنب رہتا ہے ۵۸

عقل

جب عقل صحیح اور الہام آسمانی مل جائیں تو انہیں باردار ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا ۱۶
جو لوگ دینی لب اور عقل رکھتے ہیں وہی قرآنی تعلیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۵۳
عدم استعمال سے عقل مر جاتی ہے ۵۳
عقلمند (اولوالالباب) کی علامات ۵۳ تا ۵۸

علاج

قرآن کریم میں علاج بالمثل کی طرف اشارہ ۱۳۰
علاج بذریعہ سائیکو انیلسس ۱۳۰

علم

قرآن کریم اور بخاری میں سب دنیا کے علوم آجاتے ہیں حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ پیش لفظ
قرآن کریم نے پرانے علوم کو بالکل بدل دیا ہے ۷۳
علم اور رویت میں فرق ۵
دنیوی علوم میں مسلمانوں کا کمال ۱۰۲
عربوں نے سب سے پہلے کھجور کے نر و مادہ کا علم حاصل کیا ۱۵
یورپین محققین کا اعتراف کہ اگر مسلمان عرب نہ ہوتے تو آج دنیا علم کی اس منزل پر نہ ہوتی جس پر اب ہے ۱۰۲
سچا علم نبوت سے حاصل ہوتا ہے ۳۲۶
اسلامی علوم کی بنیاد قرآن مجید پر قائم ہوئی ۲۲۰
ہر زمانہ کی ضروریات کے مطابق قرآن کریم میں علم موجود ہیں ۲۶۵
مسلمانوں میں دنیوی علوم کے ماہر ہمیشہ قرآن مجید کے خادم رہے ہیں ۲۲۱
مسلمانوں میں تعلیم کے رواج کو زیادہ کرنے کی تلقین ۱۹۸

علم تاریخ

مسلمانوں نے علم تاریخ قرآن مجید کی خدمت کے لئے ایجاد کیا ۲۲۰

علم جیالوجی ۲۹۹

علم منطق

علم منطق قرآن مجید کی خدمت کے لئے ایجاد ہوا ۲۲۱

علم النحو

علم نحو کی ابتداء ۲۲۰
علم نحو قرآن مجید کی خدمت کے لئے پیدا ہوا ۲۲۰

علم النفس ۲۲۶

علم ہیئت

علم ہیئت میں حکمتیں ۲۶۲

علم ہیئت سے ثابت ہے کہ دوسرے سیاروں کے ذرات زمین پر گرتے رہتے ہیں اور اس کا حجم بڑھ رہا ہے ۲۶۳

علم نجوم

علم نجوم یا تاثیرات نجوم کا جہاں تک تعلق حقائق سے ہے یہ ہرگز اسلام کے خلاف نہیں ۲۶۲

علم نجوم و رمل وغیرہ گو لغو اور فضول ہیں مگر حسابی اصول پر قائم ہیں ۲۶۰

عمل

ایک دن سب اگلے پچھلے لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور جمع کئے جائیں گے اور اپنے اپنے اعمال کی جزاء پائیں گے ۲۷۰

مومن کے اعمال میں وسعت ۸۴

عمل صالح سے مراد موقعہ اور محل کے مطابق ایسے اعمال جن سے بدی مٹ جائے ۵۹

عمل صالح ایمان کو ترقی دیتا ہے ۱۵۳

انسان کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی ضائع نہیں ہوتا ۷۸

محدود عمل کا غیر محدود ثواب کیونکر مل سکتا ہے ۶۲

روحانی عالم میں عمل کا تمثل نہر کی صورت میں ظاہر ہوگا ۸۴

کوئی شخص اپنے عمل سے جنت میں نہیں جائے گا ۱۴۱

انسان کے اعمال بھی خدا کے فضل سے ہی پیدا ہوتے ہیں ۱۴۱

عورت

عورت صدیقیت کا مقام حاصل کر سکتی ہے ۶۲

عید

حجۃ الوداع کے موقعہ پر دو عیدیں ۲۰۱

حضرت عمرؓ سے ایک یہودی کا کہنا کہ قرآن مجید میں ایک آیت ہے اگر وہ ہماری کتاب میں اترتی تو ہم عید مناتے ۲۰۱

عیسائیت

اسلام پر اعتراضات

انک مجنون کے متعلق عیسائیوں کا اعتراض ۲۰۹

آنحضرتؐ پر عیسائیوں کا اعتراض اپنا عیب چھپانے کے لئے ہے ۲۱۰

مسیحی مصنفین کے اعتراض کا جواب کہ قرآنی تعلیمات دوسری الہامی کتب کا سرقہ ہے ۲۴۳

تثلیث کے رد میں حضرت مصلح موعودؓ کی ایک عیسائی سے گفتگو ۸۰

ہر قوم کے آگے عیسائیت کو مختلف رنگ میں پیش کیا جاتا ہے ۱۶۲

عیسائیت نے رومیوں کے مطالبہ پر اتوار کو سبت قرار دیا ۱۶۲

مسیحی راہب اپنی غلاظت پر فخر کیا کرتے تھے ۱۵۰

غ

غذا

کروڑوں جانداروں کے لئے غذا کا نظام خدا تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت ہے ۲۶۵

کھانے پینے میں سادگی صداقت کا قبول کرنے کے لئے ضروری ہے ۲۰۳

انسان کے لئے روحانی غذا کی ضرورت ۲۶۵

آئندہ آنے والوں کے لئے روحانی غذا کا انتظام ۲۶۵

غزوہ

آنحضرت کے غزوات کے مقصد ۱۲۹

غزوہ بدر

غزوہ بدر میں آنحضرت کی ظاہری و باطنی حفاظت ۳۰

آنحضرتؐ کا غزوہ بدر میں کفار کی طرف منکرین کی مٹھی پھینکنے کا معجزہ ۳۴۷

غزوہ تبوک

غزوہ تبوک پر جاتے ہوئے آنحضرتؐ حجر مقام سے گذرے تھے ۳۵۳

غزوہ خندق

غفران

غفران کے معنی بشریت کو الوہیت کی چادر سے ڈھانپ لینا ۱۷۹

غلبہ

جب اللہ تعالیٰ کسی کو غالب کرنا چاہے تو اس کے لئے ظاہری سامانوں کی ضرورت نہیں ہوتی ۹

آنحضرتؐ اور دوسرے لوگوں کے غالب آنے میں فرق ۹،۱۰

کفار کے نزدیک غلبہ حاصل کرنے کے ذرائع ۱۰

غیب نیز دیکھئے پیشگوئیاں

غیب کا پہلا اظہار اللہ کے منتخب رسولوں پر ہوتا ہے ۲۵۴

جنوں کو غیب کا علم حاصل نہیں ۲۵۳، ۲۵۴

غیرت

اپنی ذات کے متعلق صبر سے اور دین کے متعلق غیرت سے کام لینا چاہیے ۱۲۳، ۳۲۷، ۳۲۸

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی غیرت ایمانی ۳۲۷، ۳۲۸

ہر مومن کو دین کے معاملہ میں غیرت پیدا کرنی چاہیے ۳۲۸

غیر مبائعین

غیر مبایعین کی طرف سے ایک الزام کی تردید ۱۱۰

ف

فاشزم ۲۹۰

فترۃ

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے کا زمانہ ۲۵۱

فرشتہ

تمام اسباب کی علت اولیٰ ملائکہ ہیں ۳۰۱

فرشتوں کو آدم کا سجدہ کرنے سے مراد اس کی اطاعت اور تعاون ۲۹۲

فرشتوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کے آدم یعنی نبی وقت کی تائید کریں ۲۹۲

ملائکہ نیک تحریکوں کے محرک ہوتے ہیں ۲۸۶

ملائکہ کی تحریک وسیع ہوتی ہے اور شیاطین کی محدود ۲۹۷

فرشتے تمام بنی نوع انسان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں ۳۰۷

ملائکہ کو مومنوں سے محبت اور انس ہو جاتا ہے ۳۱۹

فرشتے ہر ایک کے مناسب حال نازل ہوتے ہیں ۲۳۱

ملائکہ کا کلام انسان کے قلب کے مطابق ہوتا ہے ۲۱۳

تقدیر اللہ کے ہاتھ میں ہے نہ کہ فرشتوں کے ۳۳۰، ۳۳۱

بدر کے موقعہ پر عذاب کے فرشتے کفار کو کشفاً نظر آئے تھے ۲۱۳

کفار کو فرشتے نظر نہ آنے کی وجہ ۲۱۳

کیوں فرشتے جزا و سزا کے مستحق نہیں اور نہ حشر کے محتاج ہیں ۲۷۶

یہود میں فرشتوں کے متعلق عقیدہ ۲۸۱

کیا مشرکین فرشتوں کو معبود سمجھتے تھے ۲۱۰

فطرت

فطرت انسانی کو اللہ تعالیٰ نے پاک بنایا ہے ۴۹، ۳۱۶

شرک کے رد میں انسان کی فطرت سلیم سے اپیل ۸۱

انبیاء کے ذریعہ فطرت کے نیک تقاضے بیدار ہوجاتے ہیں ۴۹
انسانی فطرت پاک ہے اور وہی گمراہ ہوتا ہے جو اس فطرت کو خود خراب کر کے شیطان کے پیچھے چل پڑتا ہے ۳۱۶
الہام انسان کی فطرت کے مطابق ہوتا ہے ۲۱۳

فضل

جنت کا ملنا اور جہنم سے بچایا جانا خدا کے فضل اور رحمت سے ہے نہ کہ استحقاق سے ۱۴۱

فلسفہ

علم فلسفہ کی تجدید قرآن مجید پر اعتراضات کے دفعیہ کے لئے ہوئی ۲۲۱

ق

قانون

تمام اشیاء کے وجود قانون الٰہی کے ماتحت ہیں ۴۲

قرآن کریم

نزول وترتیب

پہلی الہامی کتب کی موجودگی میں قرآن کریم کے نزول کی ضرورت ۲۶۷
قرآن کریم آج بھی اس ضرورت کو پورا کر رہا ہے جس کے لئے وہ نازل کیا گیا تھا ۲۲۵
قرآن کریم میں ترتیب مضامین ۲۷۵
قرآن میں سجع اصل مقصود نہیں ۱۹۶

قرآن مجید کے اسماء وصفات

قرآن کریم کا نام ذکر کیوں رکھا گیا ہے ۲۲۳
قرآن مجید کا نام الذکر کفار میں بھی معروف تھا ۲۰۸
قرآن مبین اور الکتٰب میں فرق ۱۹۴
قرآن کے مبین ہونے کا مفہوم ۱۹۴

قرآن کریم کی آیات میں تقدیم وتاخیر نہیں ہے ۹۰
مضامین قرآن کی ترتیب کو خاص اہمیت نہ دینا مفسرین کی غلطی ہے پیش لفظ
قرآن کریم کے نزول کی اصل غرض ۹۹
قرآن کریم کے عَرَبِیًّا ہونے سے مراد اس کے معانی کی وسعت ہے ۸۸

صداقت

قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کے ثبوت ۱۴۴، ۲۱۸

فطرت انسانی کے مطابق

قرآن کریم کی تعلیم فطرت کے مطابق ہے اور طبعی مناسبتوں کی وجہ سے فطرتیں اسی کو قبول کریں گی ۲
قرآن کریم بشریت کے تقاضوں کو انسانی تکمیل کے ذرائع قرار دے کر ان کی اصلاح پر زور دیتا ہے ۱۵۶

خصوصیات

قرآن کریم کی صفات ۷۳
قرآنی علوم کی وسعت اور جامعیت ۱۵۵
قرآنی مضامین کی وسعت اور اثر انگیزی ۱۴۹
قرآنی تعلیمات میں تضاد نہیں ۱۵۲
قرآن کریم کے سات بطن ہیں اور ہر بطن کے کئی معانی ہیں پیش لفظ

قرآنی محاورات

قرآن کریم بعض دفعہ درمیانی وسائط کا ذکر چھوڑ دیتا ہے ۲۷۹
قرآن مجید میں قریۃ بول کر نبی کے تمام مخاطب مراد ہوتے ہیں ۲۰۴
قرآن کریم نے غیر قوموں اور غیر مذاہب کے لوگوں کے لئے بھی جن کا لفظ استعمال کیا ہے ۲۹۰

تعلیم

سب سے بڑی چیز جس کے لئے قرآن کریم آیا ہے وہ اس کی کامل اور دلکش تعلیم ہے ۲۰۱
قرآن کریم اخلاق، عبادت، روحانیت، تقویٰ، تمدن اقتصاد اور سیاست کے مضامین پر حاوی ہے ۲۲۳
قرآن کریم ظاہری نظام اور روحانی نظام میں شدید مماثلت و مشابہت کا دعویٰ کرتا ہے ۲۳۷
قرآن کریم خلق عالم کی تدریجی پیدائش پر بار بار زور دیتا ہے ۲۷۸
قرآن کریم انسانی پیدائش میں ارتقاء کا قائل ہے مگر ایسے ارتقاء کا نہیں جو اتفاقاً ہو گیا ہو ۲۷۳
قرآن کریم میں جنات کا ذکر ۲۸۳
قرآن خدا تعالیٰ کی صفات کو بیان کرنے میں بے مثل ہے ۱۵۰
قرآن کریم نہ صرف طبعی نتائج بلکہ مافوق الطبعی نتائج پیدا کرتا ہے ۱۵۷
قرآنی تعلیمات پر عامل آسمانی امور کو بچشم خود دیکھتا ہے ۱۵۴
قرآن کریم زندہ کتاب ہے ۱۵۷
قرآن کریم سے حسب ضرورت نئے نئے مطالب کھلتے رہتے ہیں ۱۵۱
قرآن کی اخلاقی تعلیم ۱۵۴
قرآن کریم کی تعلیم تخریبی نہیں بلکہ تعمیری ہے ۱۹۲
قرآن کریم نیکی اور بدی کو ممتاز کر کے دکھا دیگا ۵۰
قرآن زمانہ کی رو کی ترجمانی نہیں کرتا ۱۵۴
قرآن کریم میں ظاہری اور باطنی پاکیزگی پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے ۱۵۰
قرآنی اصول کی برتری کو دنیا تسلیم کرنے پر مجبور ہے ۱۵۳
قرآنی تعلیم کے پھیلنے کی ایک مثال ۱۶

فضائل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم اور اپنی اولاد کو ثقلان قرار دیا ہے ۲۹۰
فضائل القرآن ۲۴۸
قرآن کریم کی عظمت ۲۱۴
قرآن سب دنیا کی طرف ہے ۱۹۷
قرآنی علوم ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق ہیں ۲۶۵
مختصر الفاظ میں وسیع مطالب ۳۶۲
قرآن کریم غیر محرف و غیر مبدل ہے (نولڈک) ۲۱۷
قرآن کریم سب کا سب کلام اللہ ہے ۲۴۸
قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس میں اہم امور کو صاف اور واضح زبان میں بیان کیا جاتا ہے ۳۰۴
قرآن کریم سچے علوم کا دشمن نہیں موید ہے ۲۲۱
قرآن کریم کا دوسری الہامی کتب سے امتیاز ۱۹۴
قرآن کریم نزول کے معاً بعد دنیا میں پھیل گیا تھا ۲۲۰
ایک یہودی کا حضرت عمرؓ سے کہنا قرآن مجید میں ایک آیت ہے اگر وہ ہماری کتاب میں اترتی ہے تو ہم عید مناتے ۲۰۱

نسخ

قرآن کریم ہمیشہ نسخ سے محفوظ رہے گا ۲۲۵
قرآنی تعلیمات قیامت تک کے لئے قابل عمل ہیں ۱۵۲
قرآن کریم کی بعض آیات کو منسوخ قرار دینا مفسرین کی غلطی تھی پیش لفظ

حفاظت

آنحضرتؐ کے شعب ابی طالب میں محصور ہونے کے زمانہ میں آپ کو قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ دیا گیا ۲۱۶
قرآن کریم کی حفاظت اللہ تعالیٰ بذات خود کرتا ہے ۲۱۵، ۲۳۱

کیونکر تسلیم کیا جائے کہ قرآن کریم ہمیشہ محفوظ رہے گا ۲۲۴
کیا یہ بے نظیر حفاظت دنیا کی اور کسی مذہبی کتاب کو حاصل ہوئی ہے ۲۱۶
قرآن واحد کتاب ہے جو کتاب کی صورت میں بھی پڑھا جاتا ہے اور حفظ بھی کیا جاتا ہے ۱۹۴
قرآن مجید سہولت سے حفظ ہو جاتا ہے ۲۱۹
اگر قرآن کے سارے نسخے بھی تلف کر دیئے جائیں تو بھی حفاظ کے ذریعہ اسے دوبارہ لکھوایا جا سکتا ہے ۲۲۰
قرآن کریم کی حفاظت محض ظاہری علوم پر مبنی نہیں بلکہ قلبی طہارت سے تعلق رکھتی ہے ۲۶۸
حفاظت کے ذرائع ۲۱۹
قرآن کریم کی دائمی حفاظت کا انتظام ۲۲۲
قرآن کریم قیامت تک الذکر رہے گا ۲۴۶
الذکر کی حفاظت کے لئے ایک حاکم قوم کی ضرورت تھی ۲۲۳
قرآن کریم کی معنوی حفاظت ۲۲۶، ۲۴۶، ۲۴۸
قرآن مجید کی معنوی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام سے اس کو ظاہر فرمانے کا ذمہ لیا ہے ۲۲۲
اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی حفاظت کیسے لوگوں کے سپرد کرتا ہے ۲۶۹
قرآن کریم کی تائیدات کے لئے ہمیشہ مامورین آتے رہیں گے ۲۲۱
تازہ بتازہ الہامات کے ذریعہ سے قرآن کریم کی حفاظت ۲۲۱
محفوظ کلام ہونے کا ثبوت ۲۲۲، ۲۲۳
قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے کلام کے الفاظ اور اس کی حرکات تک محفوظ ہیں ۲۴۸
قرآن کریم کے محفوظ ہونے کے متعلق سر ولیم میور کا اعتراف ۲۱۶

قرآن کریم اور ظاہری علوم

سیاروں کی کشش ثقل کا ذکر ۸
قرآن اس بات میں منفرد ہے کہ اس نے بتایا ہے کہ ہر چیز کا جوڑا ہے ۱۵
قرآنی تعلیمات کے ذریعہ انسان کو ہر قسم کی ترقی ملے گی ۵۲
قرآن کریم نے پرانی سیاست اور پرانے علوم کو بالکل بدل دیا ہے ۷۳
قرآن کریم نے بادشاہت کی جگہ خلافت کو قائم کیا ہے ۷۳
علمی اخلاقی روحانی تمدنی اقتصادی سیاسی اور قومی مشکلات کا حل قرآن کریم نے پیش کیا ہے ۷۳
مردوں کا زندہ ہونا قرآنی تعلیم کے خلاف ہے ۷۴
قرآنی تعلیمات کی طرف جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا رجوع ۷۴

جامعیت و برکات

صرف قرآن کریم کے ماننے والے ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ سے براہ راست الہام پانے کے مدعی ہوتے چلے آئے ہیں ۲۲۲

قرآن کریم اور آنحضرتؐ

آنحضرتؐ پر قرآن نازل ہوا اور آپ نے قرآن کو اپنے نفس پر وارد کیا حتیٰ کہ آپ قرآن مجسم ہو گئے پیش لفظ
مجسم قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۱۵۷

قرآن کریم اور جماعت احمدیہ

اس زمانہ کا قرآنی پھل ۱۵۷

اس زمانہ کے لئے علوم قرآنیہ کا ماخذ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود کی ذات ہے پیش لفظ

قرآن کریم کی شان پر اطلاع پانے کے لئے اسلامی اصول کی فلاسفی آئینہ کمالات اسلام اور احمدیت یعنی حقیقی اسلام کے مطالعہ کی تلقین ۱۵۵

مجھے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علوم سے بہت کچھ دیا ہے (مصلح موعود) پیش لفظ

اس تفسیر میں قرآن کریم کی سورتوں اور آیات کی ترتیب کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے پیش لفظ

قرآن کریم پر اعتراضات

روسی حکومت کا قرآن کریم کو جہاد کی آیات نکال کر چھپوانے کا ارادہ ۲۲۰

اس اعتراض کا جواب کہ قرآن کریم نے دوسری الہامی کتب کی تعلیمات چرائی ہیں ۲۴۳

ان لوگوں کا رد جو قرآن کریم میں ترتیب نہیں سمجھتے ۳۲۴

ان لوگوں کی تردید جو سورۃ فاتحہ کو قرآن کریم کا حصہ نہیں سمجھتے ۳۶۴

اعتراضات کے جوابات

مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے ماہرین سے قرآن کریم کا اختلاف ۸۰

صداقت

آیت اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ اکیلی ہی قرآن مجید کی صداقت کا بین ثبوت ہے ۲۱۴

لغویت سے پاک ہونا قرآن کریم کے خدائی کلام ہونے کا ثبوت ہے ۳۳۶

قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کی شہادت ۲۱۸

مثل لانے کا مطالبہ

قرآن کے مثل بنانے سے انسان کی عاجزی کا ایک واقعہ ۸۸

دنیا کی کوئی دوسری کتاب قرآن کی تعلیم کا مقابلہ نہیں کرسکتی ۷۳

قرآن کریم کا حسن انسانی قوت تخلیق سے بالا ہے ۱۴۹

پیشگوئیاں

قرآنی تعلیم کی دنیا میں فوری اشاعت کی پیشگوئی ۷۴

قرآن کریم میں مادی تغیرات کی زبردست پیشگوئیاں موجود ہیں ۷۳

پیشگوئیاں

قرآن کے لفظ میں اس کے بکثرت پڑھے جانے اور تحریراً محفوظ ہونے کی خبر ۱۹۵

قرآن کریم کے ذریعہ سے اس کے ماننے والوں کو شرف عزت اور تقویٰ ملنے کی بشارت ۲۲۳

قرآن کریم میں جہاں کہیں اسلام کی آئندہ ترقی اور عالمگیر تبلیغ کا ذکر ہے وہاں مسیح علیہ السلام کا ذکر ضرور ہوتا ہے ۲۷۵

قرآن مجید کی حفاظت کے لئے امت محمدیہ میں مجددین اور مامورین کی بعثت ۲۲۱

جب بھی مسلمان قرآنی مطالب کے سمجھنے سے قاصر ہوجائیں گے اللہ تعالیٰ مامور مبعوث فرما کر قرآن کریم کو محفوظ فرمائے گا ۲۶۱

بائیبل سے موازنہ

تورات، انجیل، زبور وغیرہ قرآن کریم کی طرح بے نظیر کیوں نہیں ۲۱۴

آدم کے واقعہ کے بیان کرنے میں قرآن کریم اور بائیبل کا موازنہ ۳۰۴، ۳۰۵

حضرت لوطؑ کے واقعہ کے بیان میں قرآن کریم کا بائیبل سے اختلاف ۳۳۵

آداب قرآن
قرآن پڑھنے پڑھانے اور عمل کرنے کے لئے ہے (مصلح موعود) پیش لفظ
اس کلام کو سوائے ان کے جس خدا تعالیٰ نے پاک کیا ہو کوئی پوری طرح سمجھ نہیں سکتا ۱۵۱

آداب تلاوت
قرآن مجید کی عبارت ایسی ہے کہ اس کو بغیر ترتیل کے پڑھنے کے چارہ نہیں ۲۱۹
بغیر معنی سمجھنے کے قرآن کریم پڑھنا ۲۲۰

فہم قرآن
اس زمانہ کے مامور نے کلی طور پر قرآن کی تفسیروں کو حشو وزوائد سے پاک کر کے اسے اصلی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے ۲۲۲
میرے نزدیک قرآن کریم کے مضامین کی ایک نہ ایک کنجی ضرور ہوتی ہے ۲۷۵
قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے پرانی لغتوں کی ضرورت نہیں ہے ۲۲۱
مفسرین عام طور پر ظاہری لطافت، فصاحت وبلاغت اور معجزات پر بحث کرتے ہیں اور قرآن مجید کی تعلیمی خوبیوں پر بہت کم بحث کرتے ہیں ۲۰۱
قرآن کریم کی موجودگی میں الہام کی ضرورت ۲۶۷
اسلامی علوم کی بنیاد قرآن مجید پر قائم ہوئی ۲۲۰
قرآن کریم کی موجودگی سے مسلمانوں کو مغرور نہ ہونے کی نصیحت ۲۶۸

قربانی
حضرت ابراہیم کے ذریعہ انسانی قربانی موقوف کی گئی ۱۷۵، ۲۷۹

قسم
اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کی قسم کھاتا ہے تو اس کا مقصد اس چیز کو بطور شہادت پیش کرنا ہوتا ہے ۳۴۲
انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بھی قسم کھانا درست نہیں ۳۴۲

قلب
غیب اس قلب پر نازل ہوتا ہے جو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہو ۲۵۳
ملائکہ کا کلام انسان کے قلب کے مطابق ہوتا ہے ۲۱۳
طہارت قلب قرآنی علوم تک رسائی کے لئے ضروری ہے ۲۸۹
قرآن کریم کی حفاظت پر ظاہری علوم پر مبنی نہیں بلکہ قلبی طہارت سے تعلق رکھتی ہے ۲۶۹

قوم/اقوام
قوموں کا عروج وزوال ۱۳۵
قوم سے مراد ۲۹۵

تنزل
قوموں کی تباہی کی علامات ۳۲
قومیں اس قدر اپنی کمزوریوں کی وجہ سے تباہ نہیں ہوتیں جس قدر ان کمزوریوں کے ظاہر ہونے کے سبب سے ۱۳۷

قومی ترقی
قومی ترقی کا ذریعہ توکل اور دعا ۱۷
جس قوم نے زندہ رہنا ہوتا ہے وہ گرتے گرتے بھی کوشش جاری رکھتی ہے ۱۳۷

قوم شعیب ۳۵۳

قوم صالح ۳۵۳

قوم لوط ۳۵۳

انبیاء اور اقوام

ہر قوم کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ مامور بھیجتا ہے ۲۲

متفرق

باطل پرست اقوام مذہب کو سیاست کے میدان میں گھسیٹ لاتی ہیں ۱۲۶

جس قوم کو کسی بات کا یقینی علم نہ پہنچے اس وقت تک اسے نہ ماننے کی سزا نہیں دی جاسکتی ۱۱۰

قیامت (نیز دیکھئے بعث بعد الموت اور حشر)

قیامت کے لئے ساعة کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے ۳۵۹

زمین و آسمان کی پیدائش قیامت کی بھی دلیل ہے ۳۵۹

ک

کافر/کفار

آنحضرتؐ کے توکل کو دیکھ کر کفار کا تاثر ۲۰۲

کفار کا مسلمان ہونے کا جذبہ عارضی نوعیت کا ہوتا ہے ۲۰۳

ایمان سے محروم ہونے کی وجہ ۲۲۹

کفار کی آنحضرتؐ سے دشمنی محض حسد کی وجہ سے تھی ۲۰۰

کفار کو فرشتے نظر نہ آنے کی وجہ ۲۱۳

بدر کے موقعہ پر کفار کو عذاب کے فرشتے کشفاً نظر آئے تھے ۲۱۳

کفار کی طرف سے آنحضرتؐ پر مجنون کا الزام لگانے کی وجہ ۲۱۲

کفار کی تباہی کی خبر ۲۲۳

کفار کے لئے موعود عذاب سے محفوظ رہنے کا طریق ۲۰۶

کامیابی

دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس کی تدابیر کا علم حاصل کرنا ضروری ہے ۲۶

کفار کے نزدیک کامیابی کے لئے ضروری امور ۹

کتاب

قرآن کریم اور دوسری کتب میں فرق ۱۵۳

خدا کی طرف سے آنے والی کتاب وہ ہے جو علاوہ طبعی نتائج کے مافوق الطبعی نتائج بھی پیدا کرے ۱۵۷

کتاب نیز دیکھئے قرآن کریم اور کلام الٰہی

الٰہی کتاب کے خصائص ۲۶۵

الہامی کتابوں میں صرف قرآن کریم ہی حفظ کیا جاتا ہے ۱۹۵

کتاب سے فائدہ اٹھانے والے زیادہ ہوتے ہیں بہ نسبت حفظ سے فائدہ اٹھانے والوں کے ۱۹۵

الکتب کے ساتھ مبین کی صفت لانے کی حکمت ۱۹۵

کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ سے مراد وہ مدت ہوتی ہے جو انبیاء کے ذریعہ سے بتادی جاتی ہے ۲۰۶

کثرت

کیا (عددی) کثرت ہمیشہ مفید ہوا کرتی ہے ۴۵

کشف

آنحضرت کا ایک کشف جس میں آپؐ کو بعض رؤسا مکہ کا انجام دکھایا گیا ۳۷۳

بدر کے موقعہ پر کفار کو عذاب کے فرشتے کشفاً نظر آئے تھے ۲۱۳

کشاف

علامہ زمخشری کی بلند پایہ تفسیر کی تعریف پیش لفظ

کشش ثقل

سیاروں کی باہمی کشش ثقل کا ذکر ۸

کفر

اللہ تعالیٰ کی ذات کے انکار کی ایک قسم ۱۴۳

کلام الٰہی نیز دیکھئے الہام وحی

خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے کلام کی پانچ علامات ۱۴۴

مومنوں کی جماعت کلام الٰہی کے لئے بمنزلہ زمین کے ہوتی ہے ۱۴۶

زندہ کلام الٰہی کی علامت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا کرے جو اس کا پھل کھلا سکتے ہوں ۱۴۷

کلام الٰہی کے متعلق آریوں کے عقیدہ کا رد ۱۱۰

خصائص

سچے کلام کا امتیاز ۱۵۳

کلام الٰہی کی طاقت ۱۹۳

افادیت

کلام الٰہی ایک دنیا ہے جو ہزاروں خزانوں پر مشتمل ہے جو مختلف زمانوں کے لوگوں کے لئے ہیں ۲۶۶

کلام الٰہی بھی روح ہے جو انسان کو نئی زندگی بخشتا ہے ۳۰۱

کلام الٰہی اور نبوت

ہر نبی نے اپنے وجود اور اپنے تابعین کے وجود سے کلام الٰہی کی برتری اور تاثیر کو ثابت کیا ہے ۲۴۰

ہر ایک نبی کا کلام اس کی شان کے مطابق ہوگا ۲۱۴

قرآن کریم کا کلام الٰہی ہونا

قرآن کریم سب کا سب کلام اللہ ہے ۲۴۸

قرآن کریم کے مطالب سمجھانے کے لئے الہام کی ضرورت ۲۶۸

حفاظت

اللہ تعالیٰ کلام الٰہی کو نازل کر کے اس سے بے تعلق نہیں جاتا ۲۶۶

ہر نبی کے کلام کی حفاظت کی جاتی ہے ۲۲۴

فانی انسان کلام الٰہی کی حفاظت نہیں کر سکتا اس لئے یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لی ہے ۲۶۹

کلام الٰہی کی حفاظت کے لئے مامورین کا آنا ضروری ہے ۲۴۶

قہری نشانوں کے ذریعہ کلام اللہ کی حفاظت ۲۴۳

کلام الٰہی کی حفاظت کا ایک ذریعہ حکومت بھی ہے ۲۲۷

انبیاء کے متبعین میں سے بعض افراد کے ذریعہ کلام اللہ کی حفاظت ۲۴۴

شیطان کا تصرف

کلام الٰہی اور معجزات پر شیطان کو تصرف حاصل نہیں ہوتا ۲۴۱

شیطان کے کلام الٰہی چرا لینے سے مراد ۲۴۱

شیاطین کے کلام الٰہی کو اچک لینے کی غیر معقولیت ۲۵۸

شیطان کا کلام الٰہی کو اچکنے کا کام کلام الٰہی کے اعلان کے بعد شروع ہوتا ہے ۲۵۴

کلام الٰہی کے خلاف شرارتیں کرنے والے دشمنوں کی دو قسمیں ۲۶۱

کلمہ

کلمہ طیبہ سے مراد انسانی دست و برد سے پاک کلام ۱۴۳

کھجور

عربوں نے سب سے پہلے کھجور کے نر و مادہ کا علم حاصل کیا ۱۵

کینہ

جماعت احمدیہ اور مسلمانوں کو دوسروں سے کینہ نہ کرنے کی نصیحت ۳۲۰

گ

گمراہ

گمراہ وہی ہوتا ہے جو اپنی فطرت کو خراب کر کے شیطان کے پیچھے چل پڑتا ہے ۳۱۶

گناہ

اسلام کے سوا دیگر مذاہب بشریت کے تقاضوں کو گناہ قرار دے کر ان کو کچلنے پر زور دیتے ہیں ۱۵۶

بہت سے گناہوں کا باعث اولاد کی محبت بھی ہوتی ہے ۱۷۱

اصل جنت میں گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا ۳۰۵

جب انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو گناہ کی نفرت اس کے دل سے کم ہو جاتی ہے ۲۲۹

اللہ تعالیٰ کسی کو گنہگار نہیں بناتا بلکہ گناہ کے طبعی نتائج نکالتا ہے ۲۲۹

کفار کے استہزاء کے نتیجہ میں گناہ ان کی غذا بن گیا اور ان کو اس میں لذت آنے لگی ۲۳۱

گناہ کو جرم کہنے کی حقیقت ۲۲۸

ل

لعنت

لعنت کے معنی دوری کے ہوتے ہیں ۳۱۰

م

مادہ

مادہ نیست سے وجود میں آیا ہے ۱۲۰

مادہ کے اجتماع کے ذریعہ اس کے اندر مختلف طاقتیں پیدا ہوئیں ۱۲۰

مامور

ہر قوم کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ مامور بھیجتا ہے ۲۲

اس زمانہ کے مامور حضرت مسیح موعود علیہ السلام ۱۱۰

مامورین کی ضرورت ۲۴۶

مامورین نہ صرف آسمانی نشانات کے ذریعہ شیطان کے حملوں سے شریعت حقہ کو بچاتے ہیں بلکہ بوجہ الہام سے مؤید ہونے سے ان کی تشریحات سے مومنوں کو کلام الٰہی کے صحیح معنی بھی معلوم ہوتے ہیں ۲۴۶

قرآن کریم کی پیشگوئیوں کے مطابق مسلمان جب بھی اسلام سے غافل ہوں گے اللہ تعالیٰ مامور بھیجتا رہے گا ۲۲۵

جب بھی مسلمان قرآنی مطالب کے سمجھنے سے قاصر ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ مامور مبعوث فرما کر قرآن کریم کو ان کے شر سے محفوظ فرمائے گا ۲۶۱

قرآن مجید کی حفاظت اور تائید کے لئے امت محمدیہ میں مامورین کی بعثت ۲۲۱، ۲۴۶

اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ایسا مامور مبعوث کیا ہے جس نے کلی طور پر قرآن کریم کی تفسیروں کو حشو و زوائد سے پاک کیا ہے ۲۲۲

مایوسی

مایوسی کا لازمی نتیجہ ناکام ہونا اور حسرتوں کے جہنم میں جلنا ہے ۲۰

جو لوگ خود ساختہ قواعد کی پیروی کرتے ہیں ان کے لئے مایوسی کا شکار ہونا عجیب نہیں ۲۰

مٹی

مٹی سے انسان کے پیدا ہونے کی حقیقت ۲۷۳

مثال

حق کی مثال پانی سے اور باطل کی مثال جھاگ سے ۴۹

حق کی مثال معدنیات سے اور باطل کی مثال اس کی میل سے ۴۹

مثل

قرآن کی مثل بنانے سے انسان کی عاجزی کا ایک واقعہ ۸۸

مجدد

قرآن مجید کی حفاظت کے لئے امت محمدیہ میں مجددین کی بعثت ۲۲۱

مجنون

مجنون کے معنی ۲۰۷

اِنَّكَ لَمَجْنُوْن کے بارہ میں عیسائیوں کے غلط استدلال کا رد ۲۰۹

محبت

بہت سے گناہوں کا باعث اولاد کی محبت ہوتی ہے ۱۷۱

اولاد سے محبت اس حد تک ہونی چاہیے کہ وہ بگڑ نہ جائے ۱۷۱

مدیانی (قوم)

مدین بنو اسمٰعیل کے بنوالعم تھے اور بنو اسمٰعیل سے گہرا تعلق رکھتے تھے ۳۵۵

یہ قوم حضرت ابراہیمؑ کی بیوی قتورہ کے بطن سے تھی ۳۵۰

بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم بنو اسماعیل میں جذب ہوگئی تھی ۳۵۱

اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی قوم تھے ۳۵۱

مذہب

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب بشریت کے تقاضوں کو گناہ قرار دے کر ان کو کچلنے پر زور دیتے ہیں ۱۵۶

جھوٹے مذہب کی علامات ۱۶۰

کیا اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں نیک اور پارسا لوگ ہو سکتے ہیں ۱۰۵

مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے ماہرین سے قرآن کریم کا اختلاف ۸۱

موازنہ مذاہب کے ماہرین کی رائے کی تردید کہ شرک توحید سے پہلے موجود تھا ۱۷۰

مردہ

قرآن کریم میں روحانیت سے محروم لوگوں کو مردہ کہا گیا ہے ۷۵

مردوں کا زندہ ہونا قرآنی تعلیم کے خلاف ہے ۷۴

مس شیطان

یہ عقیدہ درست نہیں کہ مس شیطان سے صرف حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ محفوظ ہیں ۲۴۱

مستشرق

قرآن کریم کے محفوظ ہونے کے متعلق سر ولیم میور کا اعتراف ۲۱۶

نولڈک کا اعتراف کہ قرآن کریم غیر مبدل ہے ۲۱۷

مستشرقین کا قرآن کریم کے بارہ میں اندرونی شہادت Internal Evidence کا اصول بے بنیاد ہے ۲۱۵

کتاب ینابیع الاسلام کے مصنف کا رد ۲۴۳

مسلم/مسلمان

مسلمانوں کا زریں دور ۱۰۳، ۱۰۴

قرن اول کے مسلمانوں کے بے نفسی کا بے مثال نمونہ ۱۰۳، ۱۰۴

مسلمانوں کی علمی ترقیات ۱۰۲
مال کا غلط استعمال ۱۱۵
مسلمان خدا تعالیٰ کے طریق کو چھوڑ کر خود ساختہ طریقوں سے ترقی چاہتے ہیں ۲۰
موجودہ مصائب کا صحیح علاج اشاعت اسلام، اصلاح، اخلاق، دعا، انابت اور تسلیم لامر اللہ ہیں ۲۰

مسلم کے معنی

مسلم کے معنی امن دینے والا ۲۰۲
مسلم کے معنی سپرد کر دینے والا ۲۰۲

نصیحت و تلقین

مسلمانوں میں تعلیم کو رواج دینے کی تلقین ۱۹۸
قرآن کریم کی موجودگی سے مغرور نہ ہونے کی نصیحت ۲۶۸
مسلمانوں کو صبر اور شکر کرنے اور استقلال سے کام کرنے کی نصیحت ۱۱۱

مسیح موعود نیز دیکھئے (مہدی اور مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام)

اس زمانہ کے مامور (مسیح موعود) نے قرآن کریم کی تفسیروں کو حشو و زوائد سے پاک کر کے قرآن کو اصل صورت میں پیش کیا ہے ۲۲۲
مسیح موعود علیہ السلام کی اتباع کی برکت ۲۲۲

مشرک نیز دیکھئے مشرک

مشرکین مکہ اپنے معبودان باطلہ کی کسی تخلیق کو پیش نہیں کر سکے ۴۵

معرفت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کے بغیر معرفت الٰہی کا پیدا ہونا ناممکن تھا ۱۶

مقطعات نیز دیکھئے حروف مقطعات

آلمر کے معنی ۵

ملائکہ

ملائکہ سبب اول ہیں ۳۵
فرشتے انسان کے نیکی کے معیار کو ظاہر کرتے ہیں نہ کہ نیک بناتے ہیں ۱۳۹

منہاج نبوت

کسی مدعی نبوت کے دعویٰ کو پرکھنے کا آسان طریق یہ ہے کہ اس کے دعویٰ کو منہاج نبوت کے طریق پر پرکھا جائے ۲۲۷

موت

قرآنی اصطلاح میں روحانیت کے بعد موت اور اس کا حصول زندگی کہلاتا ہے ۷۵

مومن نیز دیکھئے ایمان

مومن کے اعمال میں وسعت ۸۴
مومن کے لئے نصائح ۱۲۳
مومن کامل کا مقصود جنت نہیں اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ۱۴۱
مومن کبھی خود بشارت پاتا ہے کبھی اس کے متعلق دوسروں کو الہاماً خبر دی جاتی ہے ۳۲۵
ملائکہ کو مومنوں سے محبت اور انس ہو جاتا ہے ۳۱۹
مومن کبھی خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا ۳۲۸
ہر مومن کو دین کے معاملہ میں غیرت پیدا کرنی چاہیے ۳۲۸

مہلت

منکرین کو مہلت بعثت انبیاء کی غرض یعنی خلق اللہ کی ہدایت کو پورا کرنے کے لئے ہے ۷۷

مہمان نوازی

مہمان نوازی ایک نیک فعل ہے ۳۳۹
مہمانوں کی تذلیل گناہ ہے ۳۴۱

حضرت ابراہیم کی مہمان نوازی ۳۲۸

ن

نبی/نبوت

نبوت کا مقصد

سچا علم نبوت سے حاصل ہوتا ہے ۳۲۶
نبی کے ذریعہ قوم کو وحدت کی رسی میں پرو دیا جاتا ہے ۲۶۹

ضرورت

ایک نبی بھی نہیں جو بے موقعہ بلا ضرورت آیا ہو ۲۴۰

خصائص

نبیوں میں مرتبہ کا تفاوت پایا جاتا ہے ۲۱۳
انبیاء کے زمانہ میں تقدیر خاص جاری ہوتی ہے ۳۰۲
نبی کی بعثت اور موت دونوں اہم امور ہوتے ہیں ۲۵۵
سچے نبی کی شناخت کا سہل ترین طریقہ منہاج نبوت کے مطابق مدعی کے دعویٰ کو پرکھنا ہے ۲۲۷
انبیاء کے ظہور کی علامات میں شہب کا گرنا ۲۵۰
ہر ایک نبی کا کلام اس کی شان کے مطابق ہوگا ۲۱۴
ہر نبی کا ایک معین کام تھا جو اس کے بغیر کوئی نہیں کر سکتا تھا ۲۴۰
ہر نبی کے کلام کی حفاظت کی جاتی ہے ۲۲۴
نبی کی بستی کو ام القری قرار دیا جاتا ہے ۲۰۴
نبی کو ایک وقت بحث ومباحثہ کی اجازت ہوتی ہے لیکن حجت تمام ہو چکنے کے بعد اسے بحث ومباحثہ سے روک دیا جاتا ہے ۳۶۱
نبی اپنی طاقت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طاقت سے کام کرتا ہے ۲۴۷
آدم اور انبیاء کے نفخ روح سے مراد نزول الہام ہے ۳۱۰
ہر نبی نظام روحانی کے لئے زینت کا موجب ہے ۲۴۰
انبیاء کو ظاہری شہاب ثاقب سے تشبیہ دینے کا مطلب ۲۴۸
سماء دنیا سے مراد نبی کی مجلس ہے ۲۵۵
نبیوں کے ذریعہ ہونے والے اجتماع کو بھی حشر کہا جاتا ہے ۲۶۹
یہ خیال کہ شیطان نبی کی زبان پر بھی بعض الفاظ جاری کر دیتا ہے درست نہیں ۲۵۹

صفات

انبیاء کی غیرت ایمانی کا مقام ۳۲۸
نبی کبھی کسی کی تباہی پر خوش نہیں ہوتا ۳۶۶

تعلیم

انبیاء کی اعلیٰ تعلیمات کو لوگ اپنی تعلیمات ظاہر کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں ۲۴۲، ۲۴۴

نبوت کی اقسام

شرعی انبیاء کو لازماً حکومت عطا کی جاتی ہے ۲۲۶، ۲۲۷
غیر تشریعی انبیاء کو فوری حکومت کا ملنا ضروری نہیں ۲۲۷
امت محمدیہ میں تابع کی ضرورت اور بعثت ۲۴۳
ہر قوم میں نبی ہوئے ہیں ۲۲
نبی کی قوم کسی خاص نسل کے لوگ یا کسی خاص ملک کے باشندے ۲۹۴، ۲۹۵
آنحضرتؐ سے پہلے جو نبی گزرے ہیں وہ صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے آنحضرتؐ بلا استثناء تمام اقوام کی طرف مبعوث ہوئے ۲۹۵

نبوت جاری ہے

نبوت کا سلسلہ قیامت تک چلے گا ۳۱۰
پہلے مذاہب میں انبیاء کی بعثت بند ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کتب الذکر نہیں رہیں ۲۴۶

نبوت محمدیہ

دوسرے انبیاء کی نبوتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بطور ارہاص کے تھیں ۲۳۹

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نظام نبوت کے لئے بطور مرکز کے ہیں ۲۳۹

نبوت پر ایمان

ایک نبی کا انکار تمام نبیوں کا انکار قرار دیا گیا ہے ۲۵۴، ۳۵۳

انبیاء کے متبعین

ہر نبی نے اپنے وجود اور اپنے تابعین کے وجود سے کلام الٰہی کی برتری اور تاثیر کو ثابت کیا ہے ۲۴۰

تمام انبیاء اور ان کے اتباع مس شیطان اور اس کے تصرف سے محفوظ ہیں ۲۴۱

اس گروہ کا ذکر جو نبیوں کے طفیل صداقت پا کر شیطان سے محفوظ ہو جاتا ہے ۳۱۶

انبیاء کے دشمن

ہر نبی کے زمانہ میں انسان شیطانوں اور جن شیطانوں کو چھوڑ رکھنا الٰہی مشیت ہے ۲۵۴

نبی کے دشمنوں کا مشغلہ ۲۶۰

سب دشمنوں نے ان سے استہزاء کیا ۲۲۷

ہر نبی کے الہام کو اس کے مخالف بگاڑ کر پیش کرتے ہیں ۲۴۳

دشمنوں پر عذاب

نبی کے مخالفین کے سرداروں کے نام کو مٹا دیا جاتا ہے اور انبیاء کے ذکر کو اجمالاً یا تفصیلاً قائم رکھا جاتا ہے ۳۱۰

نبی کے مخالفوں کو ڈھیل ضرور ملتی ہے لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں ۲۰۶

شیطان کی ہلاکت کا موجب وقت کا نبی ہوتا ہے یا وہ نبی جس کی نبوت زندہ ہو ۲۴۴

نبی کی بعثت کے بعد اس کے مخاطبین کی سب بستیاں عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے ۲۰۵

نسخ (نیز دیکھئے قرآن مجید)

قرآن کریم ہمیشہ نسخ سے محفوظ رہے گا ۲۲۵

نشان

نشانات کو دیکھنے کے باوجود ان سے فائدہ نہ اٹھانے کی وجہ خشیت اللہ کی کمی ہے ۲۳۲

نصیحت

جماعت احمدیہ اور مسلمانوں کو بغض و کینہ سے بچنے کی تلقین ۳۲۰

نظام

کامل تربیت ایک نظام کو چاہتی ہے ۳۶۶

روحانی نظام کا جزو بننے سے ہی انسان ہلاکت سے بچ سکتا ہے ۳۶۰

ظاہری اور روحانی نظام میں مماثلت و مشابہت ۲۳۷

نظام کائنات

نظام کائنات قیامت کی بھی دلیل ہے اور نبیوں کی کامیابی ان کے دشمنوں کی ناکامی کی بھی ۳۵۹

روحانی نظام کی نظام شمسی سے مشابہت ۲۴۰

الہامی زبان میں خاندانی یا مذہبی نظام کو نظام شمسی سے مشابہت دی جاتی ہے ۲۴۰

نفخ

انبیاء کے نفخ روح سے مراد نزول الہام ہے ۳۱۰

بنو آدم کے نفخ روح سے مراد نفس ناطقہ کی تکمیل ہے ۳۱۰

عصمت انبیاء ۱۸۰

امت محمدیہ میں نبوت

یہ کہنا کہ ظلی نبوت خاتم النبیین کی نبوت کو توڑ دیتی ہے بالکل غلط ہے ظلی نبوت تو اصل کے وجود کو ثابت اور روشن کرتی ہے ۴۳

مقصد بعثت

انبیاء کے بھیجنے کی غرض ۲۱
بعثت انبیاء کی غرض خلق اللہ کی ہدایت ہے ۷۷
نبی کی تعلیم کا مرکزی نقطہ توحید ہوتا ہے ۸۶
نبیوں کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں میں خدا تعالیٰ کے متعلق یقین پیدا کر کے انہیں متوکل بنا دیں ۱۲۳، ۱۲۴
انبیاء کے ذریعہ فطرت کے نیک تقاضے بیدار ہو جاتے ہیں ۴۹
نبی کی آمد کا وقت ۹۷

خصوصیات

ابراہیمی زمانہ میں بھی غیر قوموں میں نبی آتے رہے ہیں ۱۱۸
نبی کا زوج صدیق ہوتا ہے ۶۲
نبی بچپن سے ہی شرک سے محفوظ ہوتا ہے ۱۲۶
نبی خدا کے فضل سے معصوم ہوتا ہے ۱۷۹
انبیاء کے ساتھ بیوی بچے اور دیگر حوائج بشریہ ۸۹
انبیاء کے اختیار میں سزا دینا کیوں نہیں رکھا گیا ۹۱

اسوہ حسنہ

انبیاء نبوت کے انعامات کے متعلق بھی دعا میں لگے رہتے ہیں ۱۷۱
انبیاء ہمیشہ موعود امور کے لئے دعا اور تدبیر سے کام لیتے ہیں ۱۲۹
انبیاء کی استغفار کی حقیقت ۱۷۱

فضیلت اور افضلیت

نبی کی فضیلت ذاتی فضیلتوں کے سبب سے نہیں ہوتی ۱۲۲، ۱۲۳

وحی والہام

نبی پر اس کی قومی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں الہام ۱۰۶
انبیاء کے لئے تازہ آسمانی شہادات اور پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں فتح کا باعث بنتی ہیں ۹۷، ۹۸

مخالفین انبیاء

انبیاء کے منکرین کو مہلت دیئے جانے کی وجہ ۷۷

نماز نیز دیکھئے عبادت

جو شخص ایک نماز بھی جان بوجھ کر چھوڑتا ہے وہ نمازی نہیں کہلا سکتا (مصلح موعود) ۱۶۵
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز با جماعت پبلک میں کئی سال بعد شروع کی ہے ۲۵۵
نماز پڑھنے کے متعلق ایک ان پڑھ مزدور کو الہام ۲۱۳

نور

نور وجود رکھتا ہے اور ظلمت عدم نور کا نام ہے ۴۵
قرآن ایک نور ہے ۱۰۰
نور خدا تعالیٰ کی طرف جانے کا نام ہے ۱۰۱

نہر (نیز دیکھئے جنت)

جنت کے نیچے نہریں جاری ہونے کی حقیقت ۸۳

نیکی نیز دیکھئے عمل

نیکی کی تعریف یہ ہے کہ وہ صفات الٰہیہ کی نقل ہو ۹۲
کوئی شخص ایسی نیکی یا بدی نہیں کرتا جس میں دوسرے لوگ کسی نہ کسی رنگ میں شریک نہ ہوں ۶۱

و

وحدت

نبی کے ذریعہ قوم میں وحدت پیدا ہوتی ہے ۲۶۹

آنحضرتؐ کے ذریعہ وحدت کا قیام ۲۶۹

وحی نیز دیکھئے الہام

وحی کی ضرورت

وحی الٰہی کا انکار انسان کو سزا کا مستحق بنا دیتا ہے ۲۰۵

وحی نبوت

قرآن کریم جس وحی پر مشتمل ہے اس کی دوسری الہامی کتب سے خصوصیت ۲۴۷

مورد وحی (رسول) تک وحی الٰہی محفوظ پہنچتی ہے ۲۵۷

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلصلۃ الجرس کی طرح وحی کا نزول ۲۷۱

وعدہ

جن باتوں کا خدا تعالیٰ وعدہ کرتا ہے ان کے لئے زیادہ دعا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۱۲۹

انبیاء ہمیشہ موعود امور کے لئے دعا اور تدبیر سے کام لیتے ہیں ۱۲۹

وعظ نیز دیکھئے نصیحت

زبانی وعظ موثر نہیں ہوتا۔ اصل چیز عملی نمونہ ہے ۵۹

وعید میں تخلف کرم کہلاتا ہے ۱۲۷

وید

ویدوں کو یاد کرنے والے چھوڑ ان کے معنی جاننے والے بھی شاذ ہیں ۱۹۵

وید جس زبان میں نازل ہوئے ہیں وہ زبان محفوظ نہیں رہی ۲۲۲

وید کتاب کامل ہونے کے لحاظ سے محفوظ نہیں ۲۲۱، ۲۲۲

ہ

ہجرت

ہجرت حبشہ کے وقت نجاشی کا قبول اسلام ۸۵

ہجرت

ہجرت کی پیشگوئی

آنحضرتؐ کی ہجرت کی طرف ایک باریک اشارہ ۳۶۷

حضرت لوطؑ اور حضرت ابراہیمؑ عراق سے ہجرت کر کے کنعان آئے تھے ۳۲۵

ہدایت

قرآن کریم کے نزول کی اصل غرض ہدایت ہے ۹۹

اگر ہدایت سے پہلے عذاب آئے تو اللہ کی ھادی کی صفت باطل ہو جائے ۲۲

ہندو مذہب

ہندو مذہب میں پاکیزگی کے احکام کی کمی ۱۵۰

ہندوؤں کے تنزل کی وجہ ۳۸

ہندو قوم کی ترقی کی ایک وجہ ۱۱۵

غیر مرئی مخلوق کے متعلق ہندوؤں کے عقائد ۲۸۱

ہندو قوم جنات کا مقام شمال میں بتاتی ہے ۲۸۹

ہندو لٹریچر میں خیر و شر کی قوتوں کا ذکر مکالمہ کی صورت میں کیا گیا ہے ۳۰۵

ایک ہندو ممبر اسمبلی کا اعتراف کہ ہندو مذہب میں شادی کا مفصل قانون موجود نہیں ۲۰۱

ی

یقین

انبیاء لوگوں میں خدا تعالیٰ کے متعلق یقین پیدا کرتے ہیں ۱۲۳، ۱۲۴

حضرت ابراہیمؑ کا خدا پر یقین ۱۷۷
لوگوں کا خدا تعالیٰ پر توکل نہ کرنے کی وجہ کامل یقین کی کمی ہے ۱۲۳

یوم البعث

یوم بعث سے مراد انبیاء کی کامیابی کا دور ۳۱۱

یہودیت

عقاید

یہود میں فرشتوں اور شیاطین کا عقیدہ ۲۸۱
یہود کا عقیدہ تھا کہ جن شمالی علاقوں میں رہتے ہیں ۲۸

یہود کے ملعون ہونے کی وجوہات

یہودی کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ پر جن سوار ہے ۲۱۰

یہود اور اسلام

آنحضرت پر ایمان نہ لانے کی ایک وجہ ۳۰۵
حضرت عمرؓ سے ایک یہودی کا کہنا کہ قرآن مجید کی ایک آیت اگر ہماری کتاب میں اترتی تو ہم عید مناتے ۲۰۱
یہود مسلمانوں کو مرتد کرنا چاہتے تھے ۳۱۴
نصیبین کے رہنے والے یہود آنحضرتؐ پر ایمان لائے تھے ۲۹۲، ۲۹۳
آنحضرت کا یہود کی روایات کے متعلق فرمانا لَا تُصَدِّقُوْھُمْ وَلَا تُکَذِّبُوْھُمْ پیش لفظ

☆☆☆☆☆

اسماء

آ

آدم علیہ السلام ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۴۱، ۲۹۱

آدم کے انسان کہلانے کی وجہ ۲۹۲

آدم سے پہلے انسان سطح زمین کی بجائے غاروں میں رہتے تھے ۲۹۱

آدم اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ بھی دنیا میں مخلوق تھی جو آدم کے نظام کے تابع نہ ہوئی تھی ۳۰۶

آدم کی ذریت سے مراد وہ بشر جنہوں نے آدم کے پیش کردہ نظام کو قبول کیا ۲۹۲

آدم کو جس جنت میں رکھا گیا تھا وہ حقیقی جنت نہ تھی ۳۰۵

آدم اور ابلیس کے واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے مکالمہ کا رنگ دیا گیا ہے ۳۰۳

فرشتوں کے لئے آدم کا سجدہ کرنے سے مراد اس کی اطاعت اور اس سے تعاون ۳۰۱

آپ پہلے انسان تھے جنہوں نے اخلاقی اور تمدنی کمال حاصل کیا اور آپ پر الہام نازل ہوا ۲۹۷

آدم اور دوسرے انبیاء کے نفخ روح سے مراد نزول الہام ہے ۳۶۰

آدم سے مراد نبی وقت ۳۰۲

حشر اجساد کا مسئلہ کلی طور پر آدم کی پیدائش کے ساتھ وابستہ ہے ۲۷۴

قرآن کریم خلق آدم کے ذکر کے ساتھ بعث بعد الموت کا عموماً ذکر کرتا ہے ۲۷۴

ا

ابراہیم علیہ السلام

۷۴، ۹۹، ۱۱۸، ۱۷۰، ۱۷۳، ۱۹۶، ۳۱۴

آپ نے شرک سے بچنے کی دعا کیوں کی؟ ۱۷۰

خدا تعالیٰ پر یقین ۱۷۷

آپ نے اس نیت سے مکہ کی بنیاد رکھی تھی کہ یہ توحید کا مرکز ہو ۱۰۰

آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انسانی قربانی موقوف کی ۱۷۵

اپنی اولاد کے لئے دعا ۱۷۴

مکہ کے متعلق آپ کی دعا کی قبولیت ۱۷۴

آپؑ عربی قبائل میں سے تھے اور عراق ان کا مولد تھا ۱۹۷

اہل مکہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی ذریت سمجھتے تھے ۳۲۴

حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے رشتہ دار تھے ۳۵۵

قرآن کریم میں ہمیشہ حضرت ابراہیمؑ کے ذکر سے حضرت لوطؑ کا ذکر شروع کیا جاتا ہے ۳۲۳

مدین قوم آپ کی نسل سے تھی ۳۵۰

آپ کی تیسری بیوی کی اولاد ۳۵۰

آپ کے ہاں ایک صاحب علم بیٹے کی بشارت ۳۲۶

آپ کی غیرت ایمانی ۳۲۷

آپ بہت نرم دل تھے ۳۲۶

آپ کی مہمان نوازی ۳۲۴، ۳۲۸

آپ کے پاس آنے والے مہمان انسان تھے نہ کہ فرشتے ۳۲۷

یہ امر قابل تعجب نہیں کہ حضرت لوطؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی نسبت ان لوگوں میں سے کسی کو الہام ہوا ہو جو آپ کے پاس آئے تھے ۳۲۵

قوم لوط کے عذاب سے بچنے کے لئے آپ کی دعا ۳۳۶

ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا کی تفسیر ۳۱۸

ابن ابی حاتم ۲۵۷

ابن ابی کبشہ ۳۴۹

ابن اسحاق ۳۷۳

ابن جبیر ۱

ابن جریر ۳۴۳

ابن حیان

آپ کے نزدیک جنات سے مراد انسان ہیں ۲۹۸

ابن شہاب (زہری) ۳۷۳

ابن عباس

۱، ۹۹، ۱۲۰، ۲۵۱، ۲۷۱، ۲۸۰، ۳۴۳

آپ کے نزدیک سبع مثانی سے مراد سورۃ فاتحہ ہے ۳۶۳

جنوں کے متعلق آپ کا قول

ابن عرفہ ۳۷۰

ابن عطیہ ۱۴۳، ۳۶۳

ابن کثیر علیہ الرحمۃ پیش لفظ

آپ کی خدمات قرآنیہ کا اعتراف پیش لفظ

ابن مسعود رضی اللہ عنہ

آپ کے نزدیک سبع مثانی سے مراد سورہ فاتحہ ہے ۳۶۳

ابن ناطور ۳۴۰

ابن ہشام ۲۱۵

ابو احمد العسکری ۲۷۱

ابو الاسود الدولی

علم نحو کے ابتدائی عالم ۲۲۰

ابو بکر رضی اللہ عنہ ۱۸، ۲۷۰، ۳۴۷

آپ کے تقویٰ، عقل و فہم، حسن انتظام، ایثار اور قربانی کا ذکر ۲۲۳

ابو البقاء علیہ الرحمۃ ۱۴۳، ۲۷۲

آپ نے اعراب قرآن کے متعلق املاء ما من بہ الرحمن لکھ کر احسان عظیم کیا ہے (المصلح الموعود) پیش لفظ

ابو جہل ۲۷۰، ۲۹۳، ۳۰۶، ۳۴۷

ابو حنیفہ (امام رحمۃ اللہ علیہ)

جنوں کے متعلق آپ کا عقیدہ ۲۸۳

ابو حیان علیہ الرحمۃ مصنف بحر محیط ۳۵۴، ۳۶۳

خدمات کا اعتراف پیش لفظ

ابو العاص

آنحضرتؐ کے داماد تھے ۳۴۴

ابو العباس احمد بن حسین (وزیر دولت عباسیہ) ۳۰۳

ابو عبد اللہ رازی ۱۹۹

ابو عبیدہ ۲۸۰

ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ ۹۵، ۱۰۳

ایک ناواقف کی ضمانت دنیا اور ایثار کا بے مثال نمونہ ۱۰۳

ابوسفیان رضی اللہ عنہ
قبولیت اسلام ۱۸۴
ابوالشیخ ۹۹
ابوفراس (ادیب) ۳۰۳
ابولہب
ابولہب کے دو بیٹے عتبہ اور عتیبہ دونوں آنحضرت کی بیٹیوں سے منسوب تھے ۳۴۴
ابومحمد یزیدی ۳۰۴
ابومنصور ثعالبی (امام لغت) ۳۰۳
ابونعیم ۲۹
ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۳۶۳، ۳۶۴
ابیداع
مدیان بن ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰
اپسرا
سمندری ارواح (ہندومت) ۲۸۱
احمد بن حسین
(ابوالعباس وزیر دولت عباسیہ) ۳۰۳
اسباق
قتورہ کے بطن سے حضرت ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰
اسحاق علیہ السلام
آپ بھی وقف تھے ۱۷۷
غلام علیم کے الفاظ میں آپ کی نبوت کی بشارت ۳۲۶
اسمٰعیل علیہ السلام
خواب میں اسماعیل کو ذبح کرنے سے مراد انہیں مکہ میں آباد کرنا تھا ۱۷۵
اسود بن عبد یغوث (رئیس مکہ) ۳۷۳
اسود بن المطلب (رئیس مکہ) ۳۷۳
اسوری
دوان بن یقسان بن ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰
افلاطون ۲۸۱
الیاس علیہ السلام ۲۱۳
ام کلثوم
آنحضرتؐ کی صاحبزادی جو عتیبہ بن ابی لہب سے بیاہی ہوئی تھیں ۳۴۴
اہرمزد
زردشتیوں کے نزدیک نیکی کا خدا ۲۸۱
اہرمن
زردشتیوں کے نزدیک بدی کا خدا ۲۸۱
ایوب علیہ السلام ۳۰۵

ب

برٹن
مصنف گولڈ مائنز آف مدین (Goldmines of Madian) ۳۵۰
بشیر الدین محمود احمد المصلح الموعود خلیفۃ المسیح الثانیؓ
اس تفسیر کا بہت سا مضمون میرے غور کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے ۲۲۲
اسی خدا نے اپنے فضل سے مجھے قرآن کریم کی سمجھ دی اور اس کے بہت سے علوم مجھ پر کھولے اور کھولتا رہتا ہے پیش لفظ
مجھے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علوم سے بہت کچھ دیا ہے پیش لفظ

قرآنی سورتوں اور آیات میں ترتیب کا مضمون
اللہ تعالیٰ نے مجھے خاص طور پر سمجھایا ہے پیش لفظ
حضرت خلیفۃ المسیح الاول سے قرآنی علوم حاصل کرنا پیش لفظ
اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرا دعویٰ ہے کہ اس مامور کی اتباع کی برکت سے کسی علم کا متبع خواہ قرآن کریم کے کسی مسئلہ پر حملہ کرے میں اس کا معقول اور مدلل جواب دے سکتا ہوں ۲۲۲
تثلیث کے رد میں آپ کی ایک عیسائی سے گفتگو ۸۰
انگلستان میں ایک بہائی عورت سے گفتگو ۱۶۱
میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے کلام کی خوبیوں سے اپنے بندوں کو نفع پہنچائے پیش لفظ
آپؓ کی ایک دعا پیش لفظ
جماعت احمدیہ کو نصائح ۱۶۸
آپ کے دل میں ڈالا جانا کہ بسم اللہ ہر ایک سورۃ کی کنجی ہے ۲۷۶
مجھے ایک روز بطور القاء بتایا گیا تھا کہ سورہ بقرہ کی کنجی يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ ہے ۲۷۵
جنات کے بارہ میں ذاتی تجربہ ۲۹۹
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت کا اظہار درود اور دعا کی شکل میں ۳۴۵

بنی اسرائیل نیز دیکھئے یہود

فرعون کا بنی اسرائیل سے ذلت آمیز سلوک ۱۱۳
بنی اسرائیل میں حفظ کا رواج کم تھا اور تحریر کا رواج زیادہ تھا ۱۹۷

بنو اسمٰعیل ۳۵۱

بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ مدین قوم بنو اسمٰعیل میں جذب ہو گئی تھی ۳۵۵

بنو تمیمن ۳۵۰

بنو قتورہ

حضرت ابراہیم کی تیسری بیوی کی اولاد ۳۵۰

بنو قریظہ (مدینہ کا یہودی قبیلہ) ۳۶۵،۳۶۶

بنو نضیر (مدینہ کا یہودی قبیلہ) ۳۶۵،۳۶۶

بہاء اللہ (بانی بہائی مذہب) ۱۶۱

بہاء اللہ نے دو شادیاں جائز قرار دی ہیں عباس نے اسے تبدیل کر دیا ہے ۱۶۰

پ

پولوس St.Paul ۲۱۱

ث

ثعالبی (ابو منصور مصنف فقہ اللغۃ) ۳۰۳

ثمود ۱۱۸

ج

جابر رضی اللہ عنہ ۱۰۹

جار اللہ (زمخشری) مصنف تفسیر کشاف ۱۹۹،۳۶۹

جبائی ۲۹۸

جبریل علیہ السلام ۲۵۷

جعفر (بن ابی طالب) رضی اللہ عنہ

حبشہ میں نجاشی کو قرآن کریم کا سنانا ۸۵

جنید بغدادی علیہ الرحمۃ

آپ کی وفات پر ایک مجذوب کے آپ کی مدح میں اشعار ۳۵۶

چ

چاسر Chaucer (انگریز ادیب) ۲۲۱

ح

حَبر ۹۹

حرث بن طلاطلہ (رئیس مکہ) ۳۷۳

حرث بن غیطلہ ۳۷۳

حرث بن قیس ۳۷۳

حسن بصری علیہ الرحمہ ۲۵۱

حسن ۱

حسین رضی اللہ عنہ (امام) ۴۵

حلیمہ (سعدیہ)

حضرت حلیمہ کے ہاں قیام کے دوران آنحضرتؐ سے ایک واقعہ کا پیش آنا ۲۱۰

حوا علیہا السلام ۲۸۲

حنوک

مدیان بن ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰

حورام ابی

صور کا ایک انجینیئر جس نے حضرت سلیمان کے پاس تعمیرات کے کام کی نگرانی کی ۲۹۰

خ

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ۹۲

اسلام کے لئے قربانیاں ۷۵

د

دوان

یقسان بن ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰

الدوعا

مدیان بن ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰

ڈ

ڈارون Darwin

ڈارون کا نظریہ ارتقا اور قرآن کریم ۲۷۳

ر

الراعی (عرب شاعر) ۳۰۳

راغب اصفہانی ۱۱

رامچندر جی ۴۵

رقیہ رضی اللہ عنہا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صاحبزادی ۳۴۴

روڈویل مترجم قرآن ۲۰۹، ۲۱۵

ز

زجاج نحوی

۱۹۹، ۲۰۰، ۲۳۶، ۲۵۱، ۳۶۳

زرتشت علیہ السلام ۲۱۸

زہری ابن شہاب ۳۷۳

زکریا علیہ السلام ۲۱۳

زمخشری علیہ الرحمہ صاحب کشاف ۴۳

آپ کی قرآنی خدمات کا اعتراف
پیش لفظ، ۱۹۹، ۳۶۹
آپ پر اعتزال کا داغ ہے پیش لفظ

زمران
قتورہ کے بطن سے حضرت ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰

زینب رضی اللہ عنہا
آنحضرتؐ کی صاحبزادی جو ابو العاص کی بیوی تھی ۳۴۴

س

سبا
ملکہ سبا ۲۸۵
سپرنجر مستشرق Sprenger ۲۱۵
سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ۳۱
سعید بن جبیر ۳۷۳
سلیم القشیری (عرب شاعر) ۱۹۹

سلیمان علیہ السلام
۲۵۵، ۲۸۳، ۲۹۳، ۲۹۷
آپ کے ماتحت کس قسم کے جن تھے
۲۸۳، ۲۸۵، ۲۹۰، ۲۹۱
آپ کے عہد میں غیر ملکیوں کی مردم شماری ۲۹۰

سلیمان ندوی سید
اصحاب الایکہ اور اہل مدین کے متعلق آپ کی تحقیق ۳۵۰

سندھی علامہ محمد
مصنف مجمع البحار ۲۸۳

سوخ
قتورہ کے بطن سے حضرت ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰

سیبویہ (نحوی) ۱۹۹، ۲۰۰
سیل۔ جارج مترجم القرآن ۲۰۹

ش

شرکی ربی الیعذر (یہودی)
جنوں کے متعلق عقیدہ ۲۸۲، ۲۸۹

شعیب علیہ السلام ۳۵۱
حضرت شعیب کی قوم کا دوسرا نام اصحاب الایکہ بھی ہے ۳۴۹، ۳۵۱
آپ کی قوم شہری اور صحرائی دو حصوں میں منقسم تھی ۳۵۲

شیبہ کفار مکہ کا ایک لیڈر ۳۴۷
شیکسپیر (انگریز ڈرامہ نویس) ۲۲۱

ص

صالح علیہ السلام
قوم صالح عرب تھی ۱۹۷

صبا
یقسان بن ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰

ط

طبرانی (مصنف معجم الکبیر) ۲۹

طبری (مفسر قرآن)
آپ کی خدمات قرآنیہ کا اعتراف پیش لفظ

ع

عاد ۱۱۸
عاص بن وائل رئیس مکہ ۳۷۳

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ۱۴۱
عامر بن طفیل ۲۹
عباس رضی اللہ عنہ ۱۸۴
عباس بن حسن ۳۰۴
عباس (بہاء اللہ کا بیٹا)
بہاء اللہ نے دوشادیاں جائز قرار دی ہیں
عباس نے اسے تبدیل کر دیا ۱۶۰
عبد اللہ بن عباس (نیز دیکھئے ابن عباس) ۲۵۲
عبد المطلب
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا ۱۷
عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ
آپ کی وفات پر آپ کا ترکہ ڈھائی کروڑ روپے تھا ۱۰۲
عبد یالیل ۲۴۹
عتبہ ۲۴۷
عتبہ بن ابی لہب
ابولہب کا بیٹا اس کی نسبت آنحضرتؐ کی ایک بیٹی سے ہوئی تھی ۳۴۴
عتیبہ بن ابی لہب
یہ بھی ابولہب کا بیٹا تھا اس کی نسبت بھی آنحضرتؐ کی ایک بیٹی سے ہوئی تھی ۳۴۴
عثمان بن عفان خلیفہ ثالث رضی اللہ عنہ
مصحف عثمانی غیر محرف و غیر مبدل ہے (نولڈک) ۲۱۸
عربد ابن قیس ۲۹
عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ۳۷۳
عطاء ۱
آپ نے اشاعت اسلام کے لئے جان تک کی پرواہ نہ کی ۷۵
عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ ۱، ۹۲، ۳۷۳
علی بن ابی طالب خلیفہ رابع رضی اللہ عنہ
خلیفہ چہارم ۱، ۱۶۳
علم نحو کی ابتدا آپ سے ہوئی ۲۲۰
آپ کے نزدیک سبع مثانی سے مراد سورۃ فاتحہ ہے ۳۶۳
عمر بن الخطاب خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ
۱۸، ۲۷۰
آپ کی اسلام کے لئے قربانی ۱۷۵
آپ کے تقویٰ، عقل و فہم، حسن انتظام، ایثار و قربانی کا ذکر ۲۲۳
آپ کی خلافت کا ایک واقعہ ۳۴۷
آپ کے نزدیک سبع مثانی سے مراد سورۃ فاتحہ ہے ۳۶۳
ایک یہودی کا آپ سے کہنا کہ قرآن مجید میں ایک آیت ہے اگر وہ ہماری کتاب میں اترتی تو ہم عید مناتے ۲۰۱
عمرو بن العاص ۱۹۲
عیسیٰ بن مریم علیہ السلام
۱۴۹، ۲۴۴، ۲۸۷
دکھ اور تکلیف کی زندگی ۴۵
مسیح کو پرندوں کا خالق قرار دینے کا عقیدہ ۴۶
آپ کے زمانہ میں کثرت سے شہب کا گرنا ۲۴۸
یہودی کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ پر جن سوار ہے ۲۱۰
یہ عقیدہ قابل افسوس ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریم کے سوا کوئی بھی مس شیطان سے پاک نہیں ۲۴۱
آپ نے دوسری اقوام کو اپنی جماعت میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی ۲۹۶

قرآن کریم میں جہاں کہیں اسلام کی آئندہ ترقی اور عالمگیر تبلیغ کا ذکر ہے وہاں حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر ضرور ہے ۲۷۵

عیفہ

مدیان بن ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰

غ

غفر ۳۵۰

مدیان بن ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰

غلام احمد قادیانی مسیح موعود و معہدی معہود علیہ السلام

رویاء کے ذریعہ مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کی شہادت ۷۴

آپ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا کی تازہ مثال ہیں ۱۵۸

آپ کی بعثت سے اسلام کی ترقی کے سامان ہو رہے ہیں ۱۷۴

آپ کے پیروؤں میں سے سینکڑوں لوگ خدا تعالیٰ سے ہمکلامی کا شرف رکھتے ہیں ۱۶۰

آپ پر غیر زبانوں میں الہامات بطور نشان اور معجزات کے ہیں ۱۰۷

آپ کے الہامات زیادہ تر اردو اور عربی زبان میں ہیں ۱۱۰

آپ کا الہام مَا اَنَا اِلَّا كَالْقُرْاٰنِ سَيَظْهَرُ عَلٰى يَدِيْ مَا ظَهَرَ مِنَ الْفُرْقَانِ ۱۵۷

آپ اس زمانہ کے لئے علوم قرآنیہ کا ماخذ ہیں پیش لفظ

قرآن کریم کی خدمت پیش لفظ

آپ کے نزدیک عفت کی تعریف ۵۸

آیت مثل کلمۃ طیبۃ کی تفسیر ۱۴۳

ایک مولوی سے مسیح کے پرندے پیدا کرنے کے عقیدہ پر سوال ۴۶

جس شخص پر مسیح موعود علیہ السلام کے پیغام کی تبیین نہ ہوئی ہو اس کے متعلق فتویٰ نہیں لگ سکتا ۱۱۰

غیطلہ ۳۷۳

ف

فراء نحوی ۳۵۲،۲۲۶

فرعون ۲۳۲

کیا موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف مبعوث ہوئے تھے جبکہ وہ بنی اسرائیل میں سے نہ تھا ۲۹۵

قوم فرعون کی تباہی ۳۶۲

فوطیمار

حضرت یوسف کو خریدنے والے شخص کا نام ۳۵۱

فیتس ۲۱۱

فیثا غورس (یونانی فلاسفر اور ریاضی دان) ۲۸۱

ق

قاضی منذر ۲۰۴

قتادہ ۳۳۶،۹۹،۱

قتورہ

حضرت ابراہیمؑ کی تیسری بیوی کا نام ۳۵۰

قیس ایک غلام ۳۷۳

ک

کسائی (نحوی) ۳۴۰

کلبی (ابن ہشام) ۱

کولمبس

کولمبس کی ذہانت کا ایک واقعہ ۲۱۹،۲۱۸

گ

گندھروا
خشکی کی ارواح (ہندو مذہب) ۲۸۱

ل

لطوسی
دوان بن یقسان بن ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰

لوط علیہ السلام
عراق کے علاقہ سے ہجرت کر کے آئے تھے ۳۲۵
حضرت ابراہیمؑ کے رشتہ دار اور عربوں کے اجداد میں سے تھے ۳۵۵
قرآن کریم میں حضرت ابراہیم کے ذکر سے حضرت لوط کا ذکر شروع کیا جاتا ہے ۳۲۳
حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے ماتحت رسول تھے ۳۲۴
حضرت لوطؑ کی بستیاں عین اس راستہ پر واقعہ ہیں جو عرب سے شام کو جاتا ہے ۳۴۸
قوم لوط کی بستیوں کے پاس سے گزرنے والے راستہ کے ہمیشہ قائم رہنے کی طرف اشارہ ۳۵۳
لوط کی قوم کو عذاب کی خبر پہلے دی جا چکی تھی ۳۳۳
قوم کے عذاب سے بچنے کے لئے حضرت ابراہیم کی دعا ۳۳۶،۳۳۵
لوط پر ایمان لانے والے دس سے کم افراد تھے ۳۳۶
عذاب سے لوط کے خاندان کا استثناء ۳۳۷
اس بات کا استدلال کہ حضرت لوط کے ساتھ ایک جماعت عذاب سے نجات پا گئی تھی ۳۲۹
قوم لوط حضرت لوط کے مہمانوں سے بدکاری کی نیت سے نہیں آئی تھی ۳۴۰،۳۳۹
آپ کے ھو لاء بنتی کہنے کا مطلب ۳۴۱
لوطؑ کے واقعہ کو آنحضرتؐ کے واقعات سے مشابہت ہے ۳۴۷
آپؑ کے دشمن آنحضرتؐ کے دشمنوں سے شریف تھے ۳۴۴

لومی
دوان بن یقسان بن ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰

م

مالک بن انس امام علیہ الرحمۃ
جنوں کے متعلق آپ کا عقیدہ ۲۸۳

ماوردی ۲۵۱

مجاہد ۲۷۱

محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم
۲۰۲، ۲۰۳، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۲۳
آپ حضرت ابراہیم کی دعا کا مقصود ہیں ۱۷۵
آنحضرت کی وحی کے بغیر معرفت الٰہی کا پیدا ہونا ناممکن تھا ۱۶

ظہور کی بشارات
دوسرے انبیاء کی نبوتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بطور ارہاص کے تھیں ۲۳۹

حالات
حضرت حلیمہ کے ہاں قیام کے دوران آپ سے ایک واقعہ کا پیش آنا ۲۱۰
آنحضرت کی بعثت کے وقت کثرت سے ستارے ٹوٹنے کا نشان ظاہر ہوا تھا جس پر اہل طائف گھبرا گئے تھے ۲۴۹،۲۴۸
عبد یالیل کا آنحضرت کو ابن ابی کبشہ کا نام دینا ۲۴۹

آنحضرت کی بعثت بلا استثناء سب اقوام کی طرف ہوئی ۲۹۵
آنحضرت کی بعثت کے وقت عالمگیر عذاب ۲۰۵
صلصلة الجرس کی طرح آنحضرت پر وحی کا نزول ۲۷۱
رسول کریم نے نماز باجماعت پبلک میں کئی سال بعد شروع کی ہے ۲۵۵
شعب ابی طالب میں محصور ہونے کے زمانہ میں قرآن کریم کی حفاظت کا الٰہی وعدہ ۲۱۶
حضور کی دو صاحبزادیوں کو ابولہب نے طلاق دلوائی اور تیسری صاحبزادی کو مکہ سے ہجرت کے وقت سخت تکالیف پہنچائیں ۳۴۴
آنحضرت کا ایک کشف جس میں آپ کو بعض روساء مکہ کے انجام کی خبر دی گئی ۳۷۳
غزوہ تبوک پر جاتے ہوئے حضور حجر مقام سے گزرے تھے ۳۵۳
آنحضرت پر ایمان لانے والے جنوں سے مراد نصیبین کے یہودی ۲۹۲

مقام

دَنٰی فَتَدَلّٰی کا مقام ۵۵
آنحضرت کا مقام رجولیت روحانی ۲۴
آپ خدا تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان واسطہ بن گئے ۵۵
آپ نظام نبوت کے لئے بطور مرکز کے ہیں ۲۳۹

بعثت

آنحضرت کی بعثت کے متعلق ایک دعا اور پیشگوئی ۱۷۸
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ساری دنیا کی طرف ہونے کے پانچ دلائل ۱۰۸
آپ کی بعثت اسود و احمر کی طرف ہے (حدیث) ۱۰۹
آنحضرت کی بعثت کی ایک غرض ۷۰
آنحضرت کے غزوات کا مقصد ۱۲۹

نزول ملائکہ

آنحضرت پر رحمت کے فرشتے نازل ہوتے تھے ۲۱۳
آنحضرتؐ کا فرمانا کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا ہے ۳۰۶
آپؐ کا چال چلن ایسا اعلیٰ اور پاکیزہ ہے کہ آپ سے شیطان کو کوئی تعلق ہی نہیں ہوسکتا ۲۵۳
لوط کا واقعہ کو آنحضرت کے واقعات سے مشابہت ہے ۳۴۷

اسوہ حسنہ

آپؐ کے توکل کو دیکھ کر کفار کا تاثر ۲۰۲
آنحضرتؐ کے حساس دل میں اپنی قوم کی خیر خواہی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۳۶۶
کفار مکہ کی تباہی پر حضور کا افسوس ۳۶۶

مقصد بعثت

آنحضرتؐ کی آمد کا مقصد توحید ہے ۳۷۴
آنحضرتؐ کی بعثت کا مقصد تمام انسانوں کو جمع کرنا ۲۹۶
بطور نذیر عریان ۳۶۹

صداقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معجزانہ حفاظت ۲۹
آنحضرت کے خداداد رعب کی وجہ سے ایک کافر کا حملہ سے رک جانا ۲۹

کامیابی

آنحضرت کی کامیابی قابل تعجب نہیں ۱۹
آنحضرت اور دوسرے غالب آنے والے لوگوں میں فرق ۱۰

آنحضرت اور قرآن کریم

قرآنی علوم کا دوسرا ماخذ حضرت محمد مصطفیٰ کی ذات ہے پیش لفظ

آپ پر قرآن نازل ہوا اور آپ نے قرآن کو اپنے نفس پر وارد کیا حتی کہ آپ قرآن مجسم ہو گئے — پیش لفظ
آپ کی ہر حرکت اور سکون قرآن کی تفسیر ہے — پیش لفظ

آنحضرت اور قرآن مجید

آنحضرت کا لایا ہوا قرآن مجید غیر محرف و غیر مبدل ہے (نولڈک) — ۲۱۷
قرآن کریم آنحضرتؐ کی زندگی سے ہی تحریراً محفوظ ہے — ۱۹۸
آنحضرتؐ نے قرآن کریم اور اپنی اولاد کو ثقلان قرار دیا ہے — ۲۹۰

اعتراضات

اس اعتراض کا جواب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری الہامی کتب سے تعلیمات اخذ کی ہیں — ۲۴۳

خلق

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنِ — ۱۵۷
تعلق باللہ اور شفقت علی خلق اللہ — ۵۵

فتوحات

آپ کی ترقی کے لئے خدائی سامان — ۳۶۳

اہل مکہ کو امان — ۱۸۴، ۱۸۵

آنحضرت کا فرمانا کہ میں بھی خدا کے فضل سے ہی جنت میں جاؤں گا — ۱۴۱

مخالفین کی تباہی

یہود کا آنحضرتؐ پر ایمان نہ لانے کی ایک وجہ — ۳۰۵
کفار کی آپ کے مقابل پر تدابیر — ۲۰۳
آنحضرتؐ سے کفار کی دشمنی محض حسد کی وجہ سے تھی — ۲۰۰
آنحضرتؐ کے دشمنوں نے لوط کے دشمنوں جتنی شرافت بھی نہیں دکھائی — ۳۴۴

آنحضرتؐ کے زمانہ میں حشر — ۲۶۹

بعثت ثانیہ

اس وقت آپ شہاب ثاقب ہیں کیونکہ آپ کے اظلال قیامت تک یہ کام کریں گے — ۲۴۴

مصلح موعود کا آنحضرتؐ سے عشق

حضور کے لئے حضرت مصلح موعود کی محبت و فدائیت کا اظہار درود اور دعائیں — ۲۴۵

متفرق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اطمینان و سرور — ۶۸
آنحضرت کا غزوہ بدر سے پہلے انصار اور مہاجرین سے مشورہ — ۳۰

مخالفت

کفار کے آنحضرت کو خوفزدہ کرنے کے دو طریق — ۲۷
کفار کی طرف سے صلح کی پیشکش — ۱۲۵
عیسائیوں کے اس اعتراض کا جواب کہ آنحضرت صرف عرب کے لئے مبعوث ہوئے تھے — ۱۰۷
ایک یہودی عورت کے زہر دینے کا واقعہ — ۶۸
عیسائیوں کا انک مجنون سے استدلال کہ آنحضرتؐ میں ضرور کوئی جنون تھا اس کا رد — ۲۰۹
آنحضرت کی ذات میں مرگی کے مرض کی نفی — ۲۱۰

محمد (سندھی)

مصنف مجمع البحار — ۲۸۳

محمد بن اسماعیل (امام بخاری)

جنون کے متعلق آپ کا مذہب — ۲۸۳

محمد سلیمان ندوی — ۳۵۰

محی الدین ابن عربی علیہ الرحمہ

جنوں کے متعلق آپ کا قول — ۲۸۳

مدان
قتورہ کے بطن سے حضرت ابراہیمؑ کا بیٹا ۳۵۰
مدیان
قتورہ کے بطن سے حضرت ابراہیمؑ کا بیٹا ۳۵۰
مریم علیہا السلام
یہ عقیدہ قابل افسوس ہے کہ عیسیٰ اور مریم کے سوا
کوئی بھی مس شیطان سے پاک نہیں ۲۴۱
مسیلمہ کذاب ۱۶۰
مقاتل ۱
منذر بن سعد (قاضی) ۱، ۲۰۴
موسیٰ علیہ السلام
۱۱۱، ۱۱۵، ۱۴۹، ۱۹۸، ۲۱۸، ۲۴۴، ۲۷۵،
۲۸۲، ۲۸۳، ۲۹۲
بعثت کی غرض ۹۹
کیا موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف مبعوث ہوئے
تھے جبکہ وہ بنی اسرائیل میں سے نہ تھا ۲۹۵
جن موسیٰ پر ایمان لائے تھے ۲۸۳
میور سر ولیم Sir.W.Muir
قرآن کریم کے محفوظ ہونے کا اعتراف ۲۱۶

ن

نادر شاہ (شاہ ایران) ۱۰
ناصر احمد مرزا (خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ)
گیارہ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا ۲۱۹
نپولین ۱۰
نجاشی رضی اللہ عنہ
آپ کا قبول اسلام ۸۵
نحاس ۹۹، ۲۱۲
نوح علیہ السلام
آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ نوح اول الرسل تھے ۳۵۴
نور الدین خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ
آپ عاشق قرآن تھے اور آپ کا دل چاہتا تھا
کہ سب قرآن پڑھیں پیش لفظ
آپ کا ایک مزدور کو نماز پڑھنے کی تلقین فرمانا ۲۱۳
نولڈک مستشرق ۲۱۵
قرآن کریم کے غیر مبدل ہونے کا اعتراف ۲۱۷

و

وان ہیمر Van Hammer
مستشرق ۲۱۷
ولید بن مغیرہ رئیس مکہ ۳۷۳
ولیم میور سر مترجم قرآن Sir W.Muir
قرآن کریم کے محفوظ ہونے کا اعتراف ۲۱۶
وہیری Wherry
قرآن کریم پر اعتراضات ۳
آنحضرت کی ذات پر وہیری کے اعتراضات کا
جواب ۱۰۷

ھ

ہاروت وماروت ۲۸۲
ہرقل Heraclius
ہرقل کا بتانا کہ اس نے وہ علامات دیکھی ہیں
جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی الزمان ظاہر ہو گیا
ہے ۲۴۹، ۲۵۰

ہریش چندر
ہریش چندر کا واقعہ تمثیلی ہے ۳۰۵
ہندہ زوجہ ابوسفیان ۱۹۹

ی

یاما
ہندو عقیدہ کے مطابق پہلا انسان ۲۸۱
یامی
ہندو عقیدہ کے مطابق پہلی عورت ۲۸۱

یعقوب علیہ السلام ۲۸۲
یقسان
قتورہ کے بطن سے حضرت ابراہیم کا بیٹا ۳۵۰
یوتیانوس (بنوتیمن) ۳۵۰
یوسف علیہ السلام ۲۱۳
آپ کا فروخت کیا جانا ۳۵۱
آپ کا رویا اور اس کی تعبیر ۲۳۹

☆☆☆☆☆

مقامات

ا

آرمینیہ ۱۰۱
اٹلی ۱۷۴
اوزعات ۳۸۵
اسرائیل نیز دیکھئے فلسطین ۲۹۰
افریقہ (شمالی) ۱۰۱
افغانستان ۱۰۱
امریکہ ۱۶۱، ۲۱۸
کولمبس کے ذریعہ امریکہ کی دریافت ۲۱۹
اناطولیہ ۱۰۱
انگلستان ۱۶۱
اُور (اعراق)
حضرت ابراہیمؑ کی جائے پیدائش ۳۲۵
ایران ۱۰، ۱۶۱
حضرت عمر کے زمانہ میں ایران پر چڑھائی ۱۰۱
ایشیا (براعظم) ۲۸۹، ۲۹۷
ایشیا کے لوگ شمالی علاقوں کے باشندوں کو الگ مخلوق سمجھتے تھے ۲۸۹
ایلیا
ہرقل کا ایلیا مقام پر آکر نبی آخر الزمان کے ظہور کی خبر دینا ۲۴۹

ب

بدر ۲۰۰، ۲۱۳
باڑہ (صوبہ سرحد) ۱۸
بصریٰ ۳۸۵
بغداد ۳۵۶
بمبئی ۳۵۷

ت

تبوک ۳۵۳
تہامہ ۲۵۲

ٹ

ٹیکسلا (پاکستان) ۲۸۹

چ

چین ۱۰۱

ح

حجر
دیار ثمود کا دوسرا نام حجر ہے آنحضرت نے غزوہ تبوک پر جاتے ہوئے صحابہؓ کو یہاں کے پانی کے استعمال سے منع فرمایا تھا ۳۵۳

خ

خلیج عقبہ ۳۵۰

خلیج عیلانہ ۳۵۰

د

دیار ثمود
اس کو حجر بھی کہا جاتا ہے ۳۵۳

ر

روس
جہاں اسلام کی ترقی کے راستے مسدود ہیں ۱۶۸
روسی حکومت کا قرآن مجید کو جہاد کی آیات کو نکال کر چھپوانے کا ارادہ ۲۲۰

روم
رومیوں کے مطالبہ پر عیسائیت نے اتوار کو سبت قرار دیا ۱۶۲

س

سپین ۱۰۱

سندھ (دریا) ۲۸۱

سویز (نہر) ۲۸۹

ش

شام (اسیریہ) ۱۰۱،۱۷۴،۳۵۲
مسلمانوں کا شام کے عیسائیوں کو ان کا جزیہ واپس کر دینا ۱۰۳
مکہ سے شام جانے والے راستہ پر اہل لوط کی بستیوں کے آثار ۳۴۸
عرب سے شام کو جانے والا راستہ اصحاب الایکہ کے مقام سے گزرتا تھا ۳۴۹

شعب ابی طالب
آنحضرتؐ اور آپؐ کے ساتھی اس گھاٹی میں ۷ نبوی میں داخل ہوئے تھے ۲۱۶

ط

طائف ۲۷۳
آنحضرتؐ کی بعثت پر کثرت سے شہاب ثاقب گرنے پر اہل طائف کا گھبرا جانا ۲۴۹

ع

عراق ۱۰۱
عراق حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کا مولد تھا ۱۹۷
حضرت ابراہیمؑ اُور (عراق) سے ہجرت کر کے کنعان آئے تھے ۳۲۵

عرب
آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت عرب پر خصوصاً عذاب آیا تھا ۲۰۵
قرآن کریم کی حفاظت کے لئے عرب کی سابقہ حکومتوں کی تباہی لازمی تھی ۲۲۳

عقبہ (خلیج) ۳۵۰

عیلانہ (خلیج)
خلیج عقبہ کا دوسرا نام ۳۵۰

ف

فرانس ۱۷۴

فلسطین ۱۰۱،۳۲۶

ق

قادیان ۲۱۳
قادیان میں حفاظ قرآن کریم ۲۱۹
قاف (کوہ) ۲۸۹

ک

کنعان
حضرت ابراہیمؑ عراق سے ہجرت کر کے کنعان آئے تھے ۳۲۵
کشمیر ۱۷
کوہ قاف ۲۸۹

گ

گندھروا ۲۸۱
دریائے سندھ کے پار کا علاقہ ۲۸۹
گنگا (دریا) ۳۸

م

مدین
خلیج عقبہ کے سر پر واقع ایک قدیم شہر ۳۵۰
حضرت شعیبؑ کا شہر ۳۴۹
عربوں کے قافلے مصر اور شام جاتے ہوئے مدین کے پاس سے گزرتے تھے ۳۴۹
مدینہ منورہ
۳۰، ۱۰۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۳۴۴، ۳۶۳، ۳۷۲
مصر ۱۰۱، ۳۵۱
عرب سے مصر کو جانے والا راستہ اصحاب ایکہ کے مقام سے گزرتا تھا ۳۴۹
مکہ مکرمہ ۱۰، ۱۸، ۲۴، ۳۲۴
حضرت ابراہیم نے مکہ کی بنیاد اس نیت سے رکھی تھی کہ یہ توحید کا مرکز ہو ۱۰۰
حضرت ابراہیم کی دعا کے نتیجہ میں مکہ میں دنیا کے بہترین پھل ملتے ہیں ۱۷۴
مشرکین مکہ معبودان باطلہ کی کسی تخلیق کو پیش نہیں کر سکے ۴۵
فتح مکہ کی پیشگوئی ۷۶
فتح مکہ کے لئے دعا اور تدبیر ۱۲۹
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ پر لشکر کشی کے موقعہ پر اہل مکہ اچانک اسلامی فوج دیکھ کر حیران رہ گئے ۱۸۴
فتح مکہ کے موقع پر اہل مکہ کو امان ۱۸۵
مکہ کی نئی نسل کثرت سے آنحضرتؐ کے خدام میں داخل ہوئی اور بزرگ ان کو دیکھ کر جلتے رہے ۲۴
اہل مکہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے سمجھتے تھے ۳۲۴
مکہ میں مخالفت کا طوفان ۳۵۴
کفار مکہ کی تباہی کی خبر ۳۶۰
کفار مکہ کی تباہی کی خبروں پر آنحضرتؐ کا افسوس فرمانا ۳۶۶
آنحضرتؐ پر استہزاء کرنے والے پانچ روساء مکہ اور ان کا انجام ۳۷۳
آنحضرتؐ کی مکہ سے ہجرت کے خدائی سامان ۳۶۳
مکہ کے معاشرتی طبقات میں انقلاب ۳۴۷

ن

نصیبین ۲۹۲

ہ

ہزارہ (پاکستان) ۲۸۹

ہسپانیہ ۱۰۳

ہندوستان ۱۰۱، ۱۷۴

ہندوستان کی آئندہ زبان اردو ہوگی ۱۱۰

سارے ہندوستان میں صرف چار آدمی ویدوں کا ترجمہ سمجھ سکتے ہیں ۱۹۵

ہندوستان کی لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک ہندو ممبر کی طرف سے اسلام کی برتری کا اعتراف ۲۰۱

ترقی میں پیچھے رہ جانے کی وجہ ۳۸

ی

یروشلم ۳۲۶

یمن

یمن کے بعض یہودی اور عیسائی بھی اسلام میں داخل ہوگئے تھے ۹۵

یورپ ۲۰۱

ترقی کی وجوہات ۳۸

یورپ میں سپر چولزم کی طرف رجحان کی وجہ ۷۴

سورۃ رحمٰن میں یورپ اور شمالی علاقوں کے باشندوں کو جنّ کہا گیا ہے ۲۸۹

یاجوج وماجوج سے مراد شمالی ایشیا اور مشرقی یورپ کی اقوام ۲۹۷

اسلام قبول کرنے میں روک ان کی سوسائٹی ہے ۲۰۳

یورپین علماء کو یقین نہیں آتا کہ قرآن حفظ ہوسکتا ہے ۲۱۹

یورپ کے لوگ اسلامی مسائل کی برتری کو مانتے ہیں ۲۰۳

یورپین علماء قرآن کریم کو محرف ومبدل ثابت کرنے میں ناکام ہوئے ہیں (نولڈک) ۲۱۸

☆☆☆☆☆

حلّ اللّغات

ا

اَبَانَ یَبِیْنُ ۱۹۴
اَبْصَار/بَصَر ۲۳۰
اِبْلِیْس ۳۰۲
اَتْبَعَ یُتْبِعُ ۲۳۵
اَتٰی یَاْتِیْ ۹۴
اَثْبَتَ یُثْبِتُ ۹۱
اِجْتَثَّ یَجْتَثُّ ۱۵۹
اَجَلٌ ۸۹
اُجْنُبْنِیْ ۱۶۹
اَحْزَابٌ م حِزْبٌ ۸۵
اَخْرَجَ یُخْرِجُ ۱۰۰
اَخْلَفَ یُخْلِفُ ۱۳۸
اِذْنٌ ۸۹،۱۴۰
اِزْدَادَ یَزْدَادُ ۲۳
اَسَاغَ یُسِیْغُ ۱۳۱
اِسْتَجَابَ یَسْتَجِیْبُ ۳۶،۵۰
اِسْتَحَبَّ یَسْتَحِبُّ ۱۰۴
اِسْتَرَقَ یَسْتَرِقُ ۲۳۵
اِسْتَفْتَحَ یَسْتَفْتِحُ ۱۲۸
اِسْتَوٰی ۷
اُسْتُهْزِیَ ۷۶
اِسْتِهْزَاء ۲۲۷
اَسْلَمَ یُسْلِمُ ۲۰۰
اَشَقُّ ۸۳
اَصْبَحَ یُصْبِحُ ۳۵۷
اصدع ۳۷۲
اَلْاَصْفَادُ ۱۸۹
اَصْفَحَ ۳۶۹
اَصْنَام ۱۶۹
اُصَال ۴۱
اَضَلَّ یُضِلُّ ۱۰۶
اَطْرَافٌ م طَرْف ۹۴
اِطْمَاَنَّ یَطْمَئِنُّ ۶۷
اَعْرَضَ یُعْرِضُ ۳۵۴
اغْفِرْلِیْ ۱۷۹
اَغْنٰی یُغْنِیْ ۱۳۶
اَغْنٰی عَنْہُ ۳۵۸
اَغْوَیْتَنِیْ ۳۱۳
اَغْوٰی یُغْوِیْ ۳۱۳
اَفْئِدَۃٌ م فُؤَادٌ ۱۷۳
اِفْتَدٰی یَفْتَدِیْ ۵۰
اِقْتَسَمَ یَقْتَسِمُ ۳۶۸
اَقْنَعَ یُقْنِعُ ۱۸۲
اَلْاَکْل ۱۷
اَلْاٰم ۹۱
اَلْاِمَام الْمُبِیْن ۳۵۲
اَمْطَرَ یُمْطِرُ ۳۴۶
اَلْاَمَل ۲۰۲
اَلْاُمَّۃ ۲۰۶
اَمْلٰی یُمْلِیْ ۷۶

اَنَابَ یُنِیْبُ ۶۶
اَنْبَتَ یُنْبِتُ ۲۶۳
اِنْتَقَمَ یَنْتَقِمُ ۱۸۸
اَنْدَادٌ م نِدٌّ ۱۶۴
اَنْشَاَ یُنْشِاُ ۳۲
اَنْذِرْنِیْ ۳۱۰
اَوْدِیَۃٌ م وَادٍ ۴۷
اَوْلِیَاءُ م وَلِیٌّ ۴۴
اَھْطَعَ یُھْطِعُ ۱۸۲
اَھْوَاءٌ م ھَوٰی ۸۸
اَیْئَسَ یَیْئَسُ ۷۲
اَیْدِیْ م یَدٌّ ۱۱۷
اَلْاَیْکَۃُ ۲۲،۳۴۸

ب

بُرُوْج /بُرْج ۲۳۳
بَعَثَ یَبْعَثُ ۳۱۰
بَغٰی یَبْغِیْ ۱۰۵
بَلَاءٌ ۱۱۳
بَلَاغٌ ۱۹۱
بَوَارٌ ۱۶۳
اَلْبُیُوْتُ ۳۵۶

ت

تَاَذَّنَ یَتَاَذَّنُ ۱۱۴
تُخْزُوْن ۳۳۹
تَجَرَّعَ یَتَجَرَّعُ ۱۳۱
تَحِیَّۃ ۱۴۱
تَخْرُجُ ۱۰۰
تَزْدَادُ ۲۳
تَذَکَّرَ یَتَذَکَّرُ ۵۲
تَشَخَّصَ شَخَّصَ ۱۸۱
تَطْمَئِنَّ اِطْمَاَنَّ ۶۷
تَعُوْدُنَّ ۱۲۴
تَغِیْضُ ۲۳
تُفْضِحُوْنَ ۳۳۸
تمدن ۳۶۵
تَکْسِبُ کَسَبَ ۹۶
تِلْكَ ۴
تُنَبِّئُوْنِ ۷۸
تَوَسَّمَ یَتَوَسَّمُ ۳۴۷
تَوَفّٰی یَتَوَفّٰی ۹۳
تَھْوِیْ ھَوٰی ۱۷۳

ث

ثَبَتَ یَثْبِتُ ۱۶۲
ثَمَرَاتٌ م ثَمَرَۃ ۱۷۳

ج

اَلْجَانّ ۲۸۰
جَبَّارُ ۱۲۸
اَلْجِبَالُ ۱۸۷
جَرَمَ یَجْرِمُ ۲۲۸
جُفَاءٌ ۴۸
اَلْجَمِیْلُ ۳۵۹
جَھَنَّم ۵۱،۳۱۷
جَنّٰت م جنۃ ۶۰،۳۱۸
جَنَبَ یَجْنِبُ ۱۶۹

ح

اَلْحِجْر ۳۵۳
الحَدِیْث ۸۳
حَشَرَ یَحْشُرُ ۲۶۹
حِزْبٌ ج اَحْزَابٌ ۸۵
اَلْحُسْنٰی ۵۰
اَلْحَقّ ۳۶،۱۳۸
حق ۲۱۲،۲۱۳،۳۵۸
حَلّ یحل ۷۳
حَمَأ ۲۷۲

خ

خَابَ یَخِیْبُ ۱۲۸
اَلْخَطْب ۳۲۸
خَبِیْثَة ۱۵۹
خَشِیَ یَخْشٰی ۶۴
خِلَال ۱۶۵
الخَشِیّة ۵۴
اَلْخَلَّاقُ ۳۶۱

د

الدَّابِرُ ۳۳۷
دَائِبِیْنَ ۱۶۶
دَرَأَ یَدْرَءُ ۵۷
دَعْوَة ۳۶

ذ

ذَبَحَ یَذْبَحُ ۱۱۳
الذِّکْر ۲۰۶
ذِکر ۱۱۱
ذُوْانْتِقَام ۱۸۸

ر

رَابِیًا ۴۸
ربّ ۵،۴۴
رُبَّمَا ۱۹۸
اَلرَّعْدُ ۳۴
رَجِیْم ۲۳۳،۳۰۸
رَفَعَه ۷
اَلرَّوَاسِیَ ۱۴
اَلرُّوْح ۳۰۰

ز

الزَّبَد ۴۸
الزیادة ۲۴

س

سَارِبٌ ۲۶
سَامَ یَسُوْمُ ۱۱۲
سَبَّحَ یَسُبِح ۳۴
سَبِیْل مُقِیْم ۳۴۸
سَجَدَ یَسْجُدُ ۳۹
سٰجِدِیْن ۳۰۱
سِجِّیْل ۳۴۶
السَّحَاب ۳۳
سَحَرَ یَسْحُر ۲۳۰
سَخَّرَ یَسْخُرُ ۶
سَرَابِیْل ۱۹۰
سِرَرٌ ۳۲۰

سریٰ ۳۳۴
سَکُرَت ۲۳۰
سَلَامٌ ۳۱۹
السُّلْطَان ۳۱۶
سَلَكَ يَسْلُكُ ۲۲۸
السَّمَاء ۲۳۲
سَمِعَ يَسْمَع ۲۳۵
السَّمْع ۲۳۵
السَّمُوْم ۲۸۰
السُّنَّة ۲۲۹
سَوّٰى يَسوِى ۳۰۰
سَوَّيْتُ ۳۰۰
سُيِّرَتْ ۷۲
السَّيْل ۴۸

ش

شَخَّصَ يَشْخص ۱۸۱
شَكُوْر ۱۱۱
شِهَابٌ ۲۳۶
شِيَع/شعة ۲۲۶
الشيطان ۲۳۳

ص

صَبَّارٌ ۱۱۱
صَبَرَ يَصْبِرُ ۵۷
صَدَعَ يَصْدَعُ ۳۷۲
الصَّدِيْد ۱۳۰
صَفَحَ يَصْفَحُ (عنه) ۳۵۹
صَلْصَال ۲۷۰
صِنْوَانٌ ۱۷
الصَّوَاعِق ۳۴
الصَّيْحَةُ ۳۴۵

ض

ضَرَبَ الْمَثَل ۱۸۶،۱۴۲
ضِلَال ۳۶

ط

طَرْفٌ ج اَطْرَافٌ ۹۴
طُوبٰى ۶۹
طَيِّبَةٌ ۱۴۲

ظ

ظِلَال م ظِلّ ۳۹

ع

عَاصِفٌ ۱۳۲
عَدْن ۶۰
العَذَابُ ۳۲۳
عَرَبِى ۸۶
عَرَجَ يَعْرِجُ ۲۳۰
عَرْشٌ ۷
العَزِيْزُ ۱۳۵
عِضِيْنَ ۳۷۰
عُقْبٰى ۵۷
العَلِيْمُ ۳۶۱
العُمُرُ ۳۴۲
عَمَدٌ ۶
عَنِيْدٌ ۱۲۸
العَهْدُ ۵۳

غ

الغَابِرُ ۳۳۰
غِلّ ۳۲۰
غَاضَ یَغِیۡضُ ۲۳
غَفَرَ یَغۡفِرُ ۱۷۹
الغِلّ ج اَغۡلَال ۱۹
غَلِیۡظٌ ۱۳۱
غَنِیّ ۱۱۵
الغَیۡبُ ۲۵

ف

فَضَحَ یَفۡضَحُ ۳۳۸
فَاطِرٌ ۱۱۹
فُوَاد ج اَفۡئِدَةٌ ۱۷۳

ق

القَارِعَةُ ۷۲
قَائِمٌ ۷۸
قَدّرَ یَقۡدِرُ ۷۲،۷۳
قَدرٌ ۲۶۶
قَدَرَ یقدر ۳۳۰
قَرَارٌ ۱۵۹،۱۶۴
القَرۡیَة ۲۰۴
قَضٰی یَقۡضِی ۳۳۷
قَنَطَ یَقۡنُطُ ۳۲۷
قَطِرَان ۱۹۰
قَطَعَ ۳۳۴
قطع ۱۷
قُطِعَتۡ ۷۲
قَهَّار ۴۵

ك

الۡكِتَاب ۴،۸۹
کَسَبَ یَکۡسِب ۹۶،۳۵۸
کَفَرَ یَکۡفُرُ ۱۱۴

ل

اللعنة ۶۴،۳۰۹
لَعُمُرَكِ ۳۴۲
لَوَاقِحُ ۲۶۷
لَوۡمَا ۲۱۲

م

المَاٰب ۶۹
مَتَاب ۶۹
مُبِیۡن ۱۹۴،۲۳۶
مُتَجٰوِرٰت ۱۷
المُتَعَال ۲۵
مُتَوَسِّمِین ۳۴۷
المَثَانِی ۳۶۳
المَثل ۸۳
مُجۡرِمِیۡنَ ۲۲۸
المَجۡنُوۡن ۲۰۷
مَحَا یَمۡحُو ۹۱
المُحَال ۳۴
مَدَّ یَمُدُّ ۲۶۲
مَدَدۡنَاهَا ۲۸۲
المَدِیۡنَة ۳۳۸
مَحِیۡص ۱۳۶

المَثُلٰث ۲۰
مَدَّ یمد ۱۴
مَرَد ۲۸
مُرِیْب ۱۱۷
مَسْحُوْرُوْن ۲۳۰
مُسْلِم ۱۳۹
مَسْنُوْن ۲۷۲
مُشْرِقِیْنَ ۳۴۵
مُصْبِحِیْن ۳۵۷
المُصْرِخُ ۱۳۹
مَعَایِش مَعِیْشَۃ ۲۶۴
مُعْرِضِیْنَ ۳۵۴
مُعَقِّبَات ۲۸
المُقْتَسِمِیْن ۳۶۸
مُغْنُوْنَ ۱۳۶
مُنْظِرِیْنَ ۲۱۲
مُنْکِرُوْنَ ۳۳۲
المقَام ۱۲۶
مُقَرَّنِیْنَ ۱۸۹
مُقْنِعِی رُؤُوْسِھِمْ ۱۸۲
مُقِیْمِ الصَّلٰوۃ ۱۴۸
مَکَرَ یَمْکُر ۹۶
المِلَّۃ ۱۲۴
المِھَاد ۵۱
مُوْزُوْنَ ۲۶۳
مَوْعِد ۳۱۷
مُھْطِعِیْنَ ۱۸۲

ن

نَأْتِیْ ۹۴
نَاظِرِیْنَ ۲۳۳
النَّبَأُ ۱۱۷
نَبَّأَ یُنَبِّأُ ۷۸
نَتَوَفّیَن ۹۳
نَحَتَ یَنْحَتُ ۳۵۶
نِدّ ج اَنْدَاد ۱۲۴
نَزَلَ یَنْزِلُ ۲۶۵
نَسْلُکُ ۲۲۸
نَصَب ۳۲۱
نَظَرَ یَنْظُرُ ۲۳۳
نَفَخَ یَنْفُخُ ۳۰۰
نُزُّلُ ۲۶۵

ہ

ھَدٰی یَھْدِی ۱۱۲
الھَوَاء ۱۸۳
ھَوٰی ج اھواء ۸۸
ھوی یھوی ۱۷۳

و

الوَارِثُ ۲۶۸
وَادٍ ج اَوْدِیَۃٌ ۱۷۳
وَجِلُوْنِ ۳۲۴
وَالٍ ۲۹
وَرَاء ۱۲۹
وَصَلَ یَصِلُ ۵۴
وَعِیْد ۱۲۷
وَلِی ج اَوْلِیَاء ۴۴
وَھَبَ یَھِبُ ۱۷۷
الوَیْلُ ۱۰۲

ی

یَبْعَثُوْنَ ۳۱۰
یَبْغُوْنَ بَغٰی ۱۰۵
یَتَجَرَّعُ تَجَرَّعَ ۱۳۱
یَتَذَکَّرُ تَذَکَّرَ ۵۲
یُثَبِّتُ اَثْبَتَ ۹۱
یُثْبِتُ ثَبَتَ ۱۶۲
یَحْشُرُ حَشَرَ ۲۶۹
یَخْشَوْنَ ۵۴
یَدٌ ج اَیْدِی ۱۱۷
یَدْرَأُوْنَ ۵۷
یُذَبِّحُوْنَ ۱۱۳
یُذْھِبْکُمْ ۱۳۴
یُسَبِّحُ سَبَّحَ ۳۴
یَسْتَجِیْبُوْنَ اِسْتَجَابَ ۳۶
یَسْتَحِبُّوْنَ ۱۰۴
یَسْتَھْزِأُ ۲۲۷
یَسْجُدُ سَجَدَ ۳۹
یَسُوْمُوْنَ ۱۱۲
یُسِیْغُ اَسَاغَ ۱۳۱
یَصْلَوْنَ ۵۴
یَضِلّ اَضَلَّ ۱۶۲،۱۰۶
یُفَصِّلُ فَصَّلَ ۸
یَعْرُجُوْنَ ۲۳۰
یَقْدِرُ قَدَرَ ۶۵
الیَقِیْن ۳۷۴
یَکْسِبُوْنَ ۳۵۸
یَمْتَرُوْنَ ۳۳۳
یَمْحُوْ مَحَا ۹۱
یَمْلِکُوْنَ ۴۴
یَنْحِتُوْنَ ۳۵۶
ینشی انشا ۳۲
یَوْم ۳۰۹
یَھْدِی ھَدٰی ۶۶
ییأس یئس ۷۲

☆☆☆☆☆

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفاسیر

تفسیر ابن کثیر

تفسیر البحر المحیط

الدر المنثور

تفسیر روح المعانی

تفسیر القرطبی

تفسیر فتح البیان

تفسیر الکشاف

تفسیر القرآن از وھیری

تفسیر کبیر لامام رازی

تفسیر البغوی

مجمع البیان

ترجمۃ القرآن از روڈویل

ترجمۃ القرآن از ای ایچ پامر

حدیث

صحیح البخاری

صحیح مسلم

سنن الترمذی

مشکاۃ المصابیح

مسند الامام احمد بن حنبل

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام وخلفاء سلسلہ

آئینہ کمالات اسلام

اسلامی اصول کی فلاسفی

تحفہ گولڑویہ

سیر روحانی از حضرت مصلح موعودؓ

احمدیت یعنی حقیقی اسلام

تاریخ وسیرت

السیرۃ الحلبیۃ

السیرۃ النبویۃ لابن ھشام

اصابۃ فی تمیز الصحابۃ

اسد الغابۃ

استیعاب فی معرفۃ اصحاب

مروج الذھب للمسعودی

سیرت عمر مصنفہ عبد الرحمن

- Life of Muhammad by sir W.M

اسلامیات

ارض القرآن سید سلیمان ندوی

الفاروق علامہ شبلی

کتب اہل کتاب

بائیبل (عہد نامہ قدیم وجدید)
شبات طالمود

متفرق

ستیارتھ پرکاش
ینابیع الاسلام
● Gold-Mines of Madian by Burton

لغات و انسائیکلوپیڈیا

اقرب الموارد
مجمع البحار
تاج العروس
لسان العرب
المفردات فی غریب القرآن لامام
راغب الاصفہانی
فقہ اللغۃ ابو منصور ثعالبی
القاموس العصری
انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا
انسائیکلوپیڈیا ببلیکا
جیوش انسائیکلوپیڈیا
انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس
● The Illustrated Bible Dictionary

☆☆☆☆☆